Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مدیرنامہ — فہمیدہ — 12
وادیاں اور ویرانے — ٹھاکر پونچھی — 15
ہم ہی شمع ہم ہی پروانے — اظہر راہی — 93
دلدل — الف صدیقی — 99
پسند — شہاب شیخ — 136
بہن — صفیہ سلطانہ — 145
چیخیں — نوشاد عادل — 155
گلابوں کی جنگ — اشتیاق فاطمہ — 164
حویلی — شہناز شورو — 184
پرائیویٹ جاسوسی — شہاب شیخ — 193
خدا گواہ — قرۃ العین سید — 205
اچھا دوست جو روٹھ گیا — ایم الیاس — 209
تو وہ کون تھی؟ — سید امتیاز احمد — 212
آتش فشاں — ایم اے راحت — 217

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

قلب و روح کو منور کرتا ہوا اسلامی سلسلہ

روشنی

الوداع اے وطن!

مدینہ کے ہر خاندان کی تمنا تھی کہ رسول خدا کو اپنا مہمان بنائے ہر قبیلہ سامنے آکر عرض کرتا:

"اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے یہاں ٹھہریں۔ دیکھئے، یہ گھر ہے، یہ مال ہے، یہ جان ہے۔"

رسول خدا مسکراتے ہوئے شکریہ ادا فرماتے اور ان کے لیے دعائے خیر کرتے۔ اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم اونٹنی پر سوار تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی مہار ڈھیلی کر دی اور فرمایا:

"میں وہاں ٹھہروں گا، جہاں اللہ ٹھہرائے گا۔"

اونٹنی مدینہ کی گلیوں میں چل رہی تھی۔ اور صحابہؓ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اردگرد تھے۔ لوگوں کا ایک انبوہ تھا، جو جوش میں نعرہ لگا رہا تھا:

"اللہ اکبر، محمد صلی اللہ علیہ وسلم آگئے۔ اللہ اکبر، رسول خدا آگئے۔"

ننھے ننھے لڑکے اور معصوم بچیاں دف بجا رہی تھیں۔ اور خوشی میں گاتی جا رہی تھیں۔

طَلَعَ الْبَدْرُ عَلَيْنَا	مِنْ ثَنِيَّاتِ الْوَدَاعِ
چودھویں کا چاند ہمارے سامنے نکل آیا	وداع کی گھاٹیوں سے
وَجَبَ الشُّكْرُ عَلَيْنَا	مَا دَعَا لِلّٰهِ دَاعِ
ہم پر خدا کا شکر واجب ہے	جب تک دعا مانگنے والے دعا مانگیں
اَيُّهَا الْمَبْعُوْثُ فِيْنَا	جِئْتَ بِالْاَمْرِ الْمُطَاعِ
اے ہم میں آنے والے!	یہاں تیری باتیں سنی جائیں گی

عورتیں گھروں کی چھتوں پر چڑھ گئی تھیں، اپنے معزز مہمان کو ایک نظر دیکھ لینے کے لیے۔ مرد بھی اونچی اونچی جگہوں پر چڑھ گئے تھے اور اس طرح خراج عقیدت پیش کر رہے تھے۔

پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنی چلتی رہی، چلتی رہی۔ پھر ایک جگہ آکر ٹھہر گئی اور وہیں بیٹھ گئی۔ یہ خاندان نجار کے دو یتیموں کی زمین تھی۔ اس میں کچھ قبریں تھیں۔ کچھ کھجور کے درخت تھے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اونٹنی بیٹھی تو پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اتر آئے۔ پھر فرمایا:

"یہ زمین کس کی ہے؟" (آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہاں مسجد بنانا چاہتے تھے)

عفراء کے بیٹے معاذؓ آگے بڑھے۔ عرض کیا:

"رسول خدا! سہل اور سہیل دو بچے ہیں۔ یہ زمین انہی کی ہے۔ باپ کا سایہ سر سے اٹھ چکا ہے اور اب وہ دونوں میری ہی پرورش میں ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم خوشی سے یہاں مسجد بنوائیں۔ میں انہیں راضی کر لوں گا۔"

لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ان یتیموں کو بلا بھیجا۔ ان دونوں نے سنا تو یہ زمین مفت دینی چاہی۔ مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ پسند نہ فرمایا اور قیمت دے کر خرید لی پھر زمین برابر کی گئی اور مسجد بننی شروع ہو گئی۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابو ایوب انصاریؓ کے مہمان ہوئے۔ اب کیا تھا! وہ خوشی سے نہال ہو گئے۔ حضرت ابو ایوبؓ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا بہت خیال رکھتے اور ہر طرح کا آرام پہنچانے کی کوشش کرتے۔ سات مہینے آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہاں ٹھہرے رہے۔

اس مدت میں مسجد بن کر تیار ہو گئی۔ پھر مسجد کے قرب ہی امہات المؤمنین کے لیے کچھ کوٹھڑیاں بنیں، جن کو حجرہ کہتے ہیں۔ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہیں چلے آئے۔

رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم قبیلۂ نجار میں ٹھہرے، تو قبیلہ والوں کو کتنی خوشی ہوئی، اس کا اندازہ کون کرے؟ نجار کی لڑکیاں خوشی سے اچھلتی تھیں اور بے خود ہو کر یہ گیت گاتی تھیں:

نَحْنُ جَوَارٍ مِّنْ بَنِي النَّجَّارِ
ہم خاندانِ نجار کی لڑکیاں ہیں
يَا حَبَّذَا مُحَمَّدًا مِّنْ جَارِ
اے ہے، محمدؐ ہمارے پاس رہیں گے

☆☆

پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں رہنے لگے، رہتے رہتے کافی دن ہو گئے۔ یہ دن بہت سکون سے گزرے۔ ہر طرح کا آرام تھا۔ کسی طرح کا خوف اور خطرہ نہ تھا۔ پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے امہات المؤمنین کو بھی بلا لیا۔ پیاری صاحبزادیاں بھی آگئیں۔ حضرت ابوبکرؓ نے اپنے بیٹے عبداللہؓ کو لکھ دیا۔ وہ بھی ماں، بہنوں کو لے کر مدینہ آگئے۔ دوسرے ساتھیوں نے بھی اہل و عیال کو بلا لیا۔ جو مسلمان مکہ میں رہ گئے تھے، وہ بھی مدینہ چلے آئے۔ ساتھ میں بیوی بچوں کو بھی لائے۔ مگر یہ لوگ مدینہ آئے تو بالکل خالی ہاتھ تھے۔ ساتھ میں کچھ بھی نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انصار اگرچہ ان کی بہت مدد کرتے اور ان کے آرام کا پورا خیال رکھتے۔ لیکن پھر بھی بڑی تنگی سے گزارا ہوتا تھا۔

اللہ اکبر! حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حسن تدبیر کو کیا کہیے! بس سنیے اور داد دیجیے! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار اور مہاجرین کو جمع کیا پھر انصارؓ سے فرمایا:

"یہ مہاجرین تمہارے بھائی ہیں۔"

اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک انصاری کو بلاتے۔ پھر ایک مہاجر کو بلاتے اور فرماتے:

"یہ اور تم بھائی بھائی ہو۔"

اب وہ سچ مچ بھائی بھائی تھے۔ انصار اپنے اپنے بھائیوں کو گھروں پر لے گئے۔ انہیں اپنے یہاں ٹھہرایا۔ رہنے کے لیے گھر دیا۔ مال و جائیداد میں ان کا حصہ لگایا۔ اور ہر طرح کا آرام بہم پہنچایا۔ اب مدینہ ان کا اپنا وطن تھا جہاں ان کے لیے ہر طرح کی سہولت تھی۔ غرض اس بھائی چارہ سے انصار اور مہاجرین کے تعلقات بہت مضبوط ہو گئے اور دونوں میں گہری محبت اور الفت ہو گئی۔ ہر ایک دوسرے کو دل سے چاہنے لگا۔ ہر ایک جو اپنے لیے پسند کرتا، وہی بھائی کے لیے بھی پسند کرتا اور جو چیز خود ناپسند ہوتی، وہ بھائی کے لیے بھی ناپسند ہوتی، یوں سمجھئے، اب وہ ایک جان دو قالب تھے۔

مہاجرین تو ہاتھ پیر مارنے کے عادت تھے، موقع پاتے ہی کاروبار میں لگ گئے۔ کوئی تجارت میں لگ گیا اور کوئی انصار کی زمین میں کاشت کرنے لگا۔

حرکت میں برکت تو ہوتی ہے۔ اللہ نے کاروبار میں برکت دی اس طرح بہت جلد اپنے پیروں پر کھڑے ہو گئے اور پھر سے اپنے گھر بسا لیے۔

کچھ مسلمان ایسے بھی تھے، جو بہت زیادہ مفلس تھے ان کے رہنے کے لیے کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ کسی کاروبار کے بھی وہ لائق نہ تھے۔ اس طرح دو، دو، تین، تین دن ان کے فاقہ میں گزر جاتے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کا بہت خیال رکھتے اور بیت المال سے انہیں وظیفہ بھی دیتے۔ مسجد نبویؐ کے ایک کنارہ پر ایک چبوترہ تھا، رات میں یہ بیچارے وہیں پڑ رہتے۔

مدینہ میں یہودیوں کی بھی اچھی خاصی آبادی تھی اور یہی عرب کے مہاجن تھے۔ اس لیے مدینہ پر انہی کی حکومت تھی۔ ایسی حالت میں وہاں امن کی صرف ایک ہی صورت ہو سکتی تھی۔ یہ خوش رہیں اور تعلقات ان سے خوشگوار رہیں۔ اس لیے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سوچا کہ ان سے سمجھوتہ ہو جائے اور مدینہ میں مسلمان، یہودی سب آزادی سے رہیں۔ کوئی کسی کے مذہب کی توہین نہ کرے، کوئی کسی کے مال کو ہاتھ نہ لگائے، کوئی دشمن شہر پر حملہ کرے تو مقابلہ میں دونوں ایک ہوں۔ مال غنیمت ملے، تو اس میں بھی برابر کے شریک ہوں۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودیوں سے بات چیت کی اور وہ بخوشی راضی ہو گئے۔ پھر سب ایک جگہ جمع ہوئے اور ایک معاہدہ تحریر ہو گیا۔ مگر یہ معاہدہ زیادہ دنوں قائم نہ رہ سکا۔ کیونکہ یہودیوں کی باطل آرزوؤں کے بے بنیاد قلعے زمین پر آ رہے اور انہوں نے ذات گرامیؐ سے جو توقعات وابستہ کی تھیں، وہ پوری ہوتی نظر نہ آئیں۔

یہودی مدت سے ایک نبی کے منتظر تھے۔ چنانچہ جہاں انہیں "نبی" کے آنے کی امید تھی، وہاں وہاں وہ جا کر بستے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ آنے والا نبی ہمارے ہی مذہب کا پیرو ہو گا اور جب وہ آئے گا، تو ہمارے مذہب کے پیرو جم جائیں گے اور ہر طرف اسی کا بول بالا ہو گا اور عیسائی مذہب دنیا سے مٹ جائے گا۔ کوئی نام لیوا بھی نہ ہو گا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ شروع میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ تشریف لانے سے بہت خوش تھے اور خوشی خوشی معاہدے پر بھی راضی ہو گئے تھے۔ مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بالکل ہی بنیادیں پیش کیا اور نئی نئی باتیں بتائیں۔ جو یہودیوں کے بالکل خلاف تھیں۔ بھلا اب برداشت کی کہاں تاب تھی؟ اب صبر و سکوت کا کیا سوال تھا؟

اب آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے لیے حلق کا کانٹا بن گئے۔ معاہدہ کا انہوں نے کوئی خیال نہ کیا اور مخالفت میں سارا زور لگا دیا۔ لگانے بجھانے میں تو وہ ماہر تھے ہی۔ "دوسروں کو لڑاؤ، پھر اپنا کام بناؤ" یہ ان کا اصول تھا۔ اسی اصول سے یہاں بھی کام لیا اور مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنے کی کوشش کی۔ لیکن ناکامی ہوئی۔ پھر بھی وہ مایوس نہ ہوئے اور ایک دوسری چال چلی۔ یعنی اب وہ مدینہ کے مشرکوں کے کان بھرنے لگے۔ چنانچہ وہ ان کی باتوں میں آ گئے اور ان کے ساتھ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہو گئے لیکن جو مسلمان تھے، وہ تو ایک دوسرے پر جان دیتے۔ خود دکھ اٹھاتے، مگر اپنے بھائی کو آرام پہنچاتے۔ وہ بھلا ان بدبختوں کی باتوں میں کیسے آتے۔ بری طرح انہیں پھٹکار دیا اور نفرت سے منہ موڑ لیا اور اسلام پھیلانے میں تن من سے لگے رہے۔

☆☆

دعوتِ حق تلوار کی چھاؤں میں

ترجمہ: "جن سے لڑائی کی جاتی ہے (مسلمان) ان کو بھی اب لڑنے کی اجازت دی جاتی ہے۔ کیونکہ ان پر ظلم کیا جا رہا ہے اور خدا ان کی مدد پر یقیناً قادر ہے۔" (الحج: 39)

مدینہ پہنچ کر مسلمان زور پکڑنے لگے۔ یہ دیکھ کر مشرکوں کے دل جلنے لگے۔ چنانچہ انہوں نے مسلمانوں کا زور توڑنے کا فیصلہ کر لیا اور مدینہ پر چڑھائی کے منصوبے بنانے لگے۔ اس وقت اللہ نے مسلمانوں کو بھی جنگ کی اجازت دے دی اور حکم ہوا کہ اب طاقت کا جواب طاقت سے دو سختی کے مقابلہ میں سختی کرو۔ دشمن تمہاری طرف بڑھیں، تو ان کے دانت کھٹے کر دو۔

ادھر مدینہ میں بھی ایک نیا گروہ پیدا ہو گیا تھا۔ یہ تھا منافقوں کا گروہ..... مسلمانوں کا کٹر دشمن..... ان کے ایمان کے لیے سخت خطرہ! یہ کبھی کھل کر سامنے نہ آتا۔ اندر ہی اندر اسلام سے کوستا اور دوست بن کر مسلمانوں کو ورغلاتا۔ اللہ نے اس کے ساتھ بھی سختی کرنے کا حکم دیا۔

مکہ پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا وطن تھا۔ بہت سے مسلمانوں کا بھی وطن تھا اور اپنے وطن سے انہیں بے پناہ محبت تھی۔ لیکن وہاں کی سرزمین ان پر تنگ ہو گئی اور سانس لینا تک ان کے لیے دوبھر ہو گیا۔ مجبوراً ان کو بے وطن ہونا پڑا۔ اور دولت اور جائیداد سب سے ہاتھ دھونا پڑا۔ حد یہ ہے کہ کعبہ بھی چھن گیا اور حج اور طواف پر پابندی لگ گئی۔ اس کا پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت رنج تھا۔ مسلمانوں کو بھی سخت صدمہ تھا۔ لہٰذا اب ان کی نظریں مکہ کی طرف اٹھنے لگیں۔

ظالموں سے جنگ کرنے کا حکم تو آ ہی چکا تھا۔ اس لیے مسلمانوں نے عزم کیا کہ اب ظلم کی آگ بجھائیں گے۔ مشرکین اور منافقین کی طرف سے دین کو جو خطرہ درپیش ہے۔ اس خطرے کو دبائیں گے۔ کعبہ کو آزاد کریں گے۔ اور حج کی پابندی کو ختم کریں گے۔

چنانچہ مکہ والوں میں کیا باتیں ہو رہی ہیں؟ ان کے کیا ارادے ہیں؟ یہ معلوم کرنے کی مسلمانوں نے دوڑ دھوپ شروع کر دی۔ وہ ٹولیاں بنا بنا کر مدینہ سے باہر نکل جاتے اور جہاں کہیں قریش کے قافلے ملتے، ان سے چھیڑ چھاڑ کرتے۔

یہ ٹولیاں سو سو، پچاس پچاس آدمیوں کی ہوتیں۔ جن میں پانچ زیادہ مشہور ہیں۔ ایک کے تو امیر حمزہؓ تھے۔ دوسری کے حضرت عبیدہؓ بن حارث، تیسری کے حضرت سعدؓ بن ابی وقاص، چوتھی کے حضرت عبداللہ بن جحشؓ اور پانچویں میں خود پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم شریک تھے۔ ان ٹولیوں سے قریش کا کبھی جم کر مقابلہ نہ ہوا۔ ہمیشہ یا تو بچ بچاؤ ہو گیا۔ یا وہ بچ کر نکل گئے۔ پھر ان ٹولیوں نے ایک کام اور کیا۔ انہوں نے آس پاس کے قبیلوں سے دوستی کر کے ان سے امن و امان کے معاہدے کر لیے۔ کیونکہ ان کے بگڑ جانے سے مدینہ میں بدامنی پھیل جانے کا اندیشہ تھا۔ ان قبیلوں نے آسانی سے معاہدے کر لیے اور ضرورت پڑنے پر مدد کرنے کے بھی وعدے کیے۔

(جاری ہے)

ماخذ کتاب، **محمد عربی ﷺ** ..... مترجم محمد عنایت اللہ سبحانی

مدیر نامہ

قارئین کرام! السلام علیکم!

امید ہے کہ آپ سب لوگ بخیریت و عافیت ہوں گے۔ ہر ماہ اس محفل میں آپ کے بھیجے ہوئے خطوط کے ذریعے آپ سے آدھی ملاقات ہو جاتی ہے۔ آپ سب ہی یقیناً ساون کے اس موسم سے لطف اندوز ہو رہے ہوں گے لیکن بارانِ رحمت کو ترسے ہوئے علاقوں سے جب یہ خبر آئے کہ بارش رحمت بننے کے بجائے زحمت بن گئی تو ایسے میں دل خون کے آنسو روتا ہے۔ کاش ہمارے ملک میں کوئی مون سون ایسا بھی آئے جو اس ملک کے باسیوں کے لیے تباہیوں کی نہیں بلکہ خوشیوں کی نوید لے کر آئے۔ (آمین) آپ لوگ یقیناً بے چینی سے اپنے جوابات کے منتظر ہوں گے اس لیے اب آپ کو مزید انتظار کی کوفت سے بچاتے ہوئے محفل کا آغاز کرتے ہیں۔ اس ماہ کی کہانیوں کے بارے میں ہمیں اپنی رائے سے ضرور آگاہ کیجیے گا کہ ہماری یہ کوشش کس حد تک آپ کے معیار پر پوری اتری۔ آپ کے بھیجے گئے مشوروں کی روشنی میں ہم رسالے کے معیار کو مزید بہتر بنانے کی کوشش کرتے رہیں گے۔ آپ کے تعاون کی منتظر۔

اعظم خاں ایبٹ آباد سے لکھتے ہیں۔

قابل احترام ایڈیٹر صاحب! امید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے۔ ہماری تو یہی دعا ہے کہ خدا آپ کو تندرستی و صحت دے اور آپ کے توسط سے ہمیں اسی طرح دلچسپ و سنسنی خیز کہانیاں پڑھنے کو ملتی رہیں۔ ماہ اگست کا شمارہ ہمیں بروقت مل گیا تھا۔ حسین رنگوں سے سجا سرورق بے حد پسند آیا۔ سب سے پہلے اپنی پسندیدہ سلسلے وار کہانی گلابوں کی جنگ پڑھی۔ کہانی اب بہت دلچسپ موڑ پر آ چکی ہے مصنفہ بہت خوبصورتی سے کہانی آگے لے کر چل رہی ہیں۔ مختصر کہانیاں بھی پسند آئیں۔ شہناز شورو میری پسندیدہ مصنفہ ہیں جنہوں نے اپنے قلم کے ذریعے ہمیشہ معاشرے کی تلخ سچائیوں کو بے نقاب کیا ہے۔ اس ماہ کی کہانی خواب اور تعبیر بھی ایسے خوابوں کے بارے میں تھی جنہیں ابھی شرمندہ تعبیر ہونا ہے۔ آئیڈیل یقیناً ایک نصیحت آموز کہانی تھی جسے پڑھ کر بے اختیار یہ گنگنانے کو دل چاہا شاید کہ تیرے دل میں اتر جائے میری بات' قلب و روح کو منور کرتا ہوا سلسلہ روشنی دلوں میں روشنیاں بکھیر رہا ہے۔ باقی مستقل سلسلے ابھی نظر سے نہیں گزرے اس لیے ان پر تبصرہ اب اگلے ماہ کے شمارے کی کہانیوں کے ساتھ ہی ہوگا۔ اگلے ماہ تک کے لیے اجازت فی امان اللہ۔

زاہد ابڑو حیدرآباد سے لکھتے ہیں۔

جناب ایڈیٹر صاحب اسلام علیکم امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔ اگست کا مسٹری میگزین قدرے تاخیر سے ملا لیکن رسالے میں اپنے پسندیدہ مصنفین کی کہانیاں دیکھ کر دل خوشی سے جھوم اٹھا۔ سب سے پہلے اپنے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پسندیدہ سلسلے روشنی کا مطالعہ کیا پھر سلسلے وار کہانیوں آتش فشاں اور گلابوں کی جنگ کی طرف بڑھے۔ دونوں ہی کہانیاں بہت اچھی جا رہی ہیں۔ گلابوں کی جنگ کی کہانی اب سست رفتاری سے آگے بڑھ رہی ہے لیکن پھر بھی ناول کی دلچسپی برقرار ہے۔ دیگر کہانیوں میں جذبہ' سراب اور خواب اور تعبیر بھی پسند آئیں جبکہ دریا میں بھٹی صاحب نے اندرون سندھ کے مخصوص ماحول کو بے حد خوبصورتی سے اجاگر کیا ہے۔ مجموعی طور پر اب رسالے میں کہانیوں کا معیار پہلے سے بہتر ہوتا جا رہا ہے امید کرتا ہوں کہ آپ اس معیار کو برقرار رکھیں گے۔ آپ کے لیے خصوصی دعاؤں کے ساتھ اگلے شمارے کا منتظر ہوں۔

حامد علی سکھر سے لکھتے ہیں۔

محترم ایڈیٹر صاحب السلام علیکم آپ کے رسالے کا دیرینہ قاری ہوں اور آپ کی محفل میں بھی شرکت کرتا رہتا ہوں۔ ماہ اگست کا شمارہ ملتے ہی سب سے پہلے سرورق پر نظر دوڑائی۔ سرورق پر سجی حسینہ کی آنکھوں سے سجے قوس و قزح کے رنگ بے حد پسند آئے حسب معمول سب سے پہلے روشنی جیسے بصیرت افروز سلسلے کا مطالعہ کیا۔ اس کے بعد اس ماہ کی خاص کہانی مہرہ پڑھی گو کہ کہانی بہت خوبصورتی سے لکھی گئی تھی لیکن پھر بھی اس سائنٹیفک دور میں اس طرح کی کہانیاں بے حد عجیب محسوس ہوتی ہیں سلسلے وار کہانیاں حسب معمول تھیں۔ دیگر کہانیوں میں حالات گزیدہ' دریا اور آئیڈیل بھی بے حد پسند آئیں۔ سزا ایک عبرت آموز کہانی تھی جس سے ہم سب کو سبق حاصل کرنا چاہیے۔ دلدل اب اپنی دلچسپی کھوتی جا رہی ہے۔ نشانہ زیادہ پسند نہیں آئی۔ کہانیوں کے معیار پر مزید محنت کرنے کی ضرورت ہے۔ امید ہے کہ آپ میری کی گئی تنقید کا برا نہیں مانیں گے اگلے شمارے کا بے چینی سے انتظار ہے آپ کا مخلص اور خیر اندیش۔

فرید خان پشاور سے لکھتے ہیں۔

جناب ایڈیٹر صاحب السلام علیکم امید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے۔ مسٹری میگزین میرا پسندیدہ میگزین ہے میں ہر ماہ اس کا بے چینی سے انتظار کرتا ہوں۔ بے حد انتظار کے بعد اگست کا شمارہ ملا تو دل خوشی سے جھوم اٹھا۔ سب سے پہلے سرورق پر نظر دوڑائی' سرورق بس ٹھیک تھا آپ کو سرورق کا معیار مزید بہتر کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ کیونکہ تمام قارئین یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے پسندیدہ رسالے کا معیار ہمیشہ بہترین ہو۔ اگست کے شمارے کی تمام کہانیاں اچھی تھیں۔ خواب اور تعبیر' آئیڈیل اور سزا ایسی کہانیاں تھیں جنہوں نے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا۔ سلسلے وار کہانیاں گلابوں کی جنگ اور آتش فشاں اپنی دلچسپی برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ آتش فشاں کی کہانی اب بہت دلچسپ موڑ پر آ چکی ہے اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمارا پسندیدہ رسالہ اسی طرح دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی کرتا رہے اگلے شمارے کا بے چینی سے انتظار ہے۔ اللہ حافظ

آفاق احمد کراچی سے لکھتے ہیں۔

محترمی و مکرمی ایڈیٹر صاحب السلام و علیکم امید کرتا ہوں کہ آپ بخیریت و عافیت ہوں گے۔ میں تو ہر لحہ آپ کی

خیریت کے لیے دعا گو رہتا ہوں تا کہ ہمیں اسی طرح اپنا پسندیدہ میگزین پڑھنے کو ملتا رہے۔ اگست کا شمارہ ملتے ہی ابتدا روشنی کے سفر سے کی' یہ سلسلہ میگزین کا سب سے بہترین سلسلہ ہے۔ اس کے بعد اپنی پسندیدہ کہانی آتش فشاں پڑھی، اس ماہ کی خصوصی کہانی مہرہ بھی بے حد پسند آئی۔ گلابوں کی جنگ اب کچھ بور ہوتا جا رہا ہے۔ مختصر کہانیاں بھی اچھی تھیں۔ دریا اور آئیڈیل بے حد پسند آئیں جبکہ حالات گزیدہ نے زیادہ متاثر نہیں کیا۔ اباسین ایک ایسی کہانی تھی جس نے روح کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ سرورق بے حد خوبصورت تھا خدا کرے کہ ہمارا پسندیدہ میگزین اسی طرح ترقی کرتا رہے۔ اگلے شمارے تک کے لیے اجازت دیجیے فی امان اللہ۔

غلام سرور ٹنڈو الہ یار سے لکھتے ہیں۔

محترم ایڈیٹر صاحب مسٹری میگزین میرا پسندیدہ میگزین ہے اسی لیے اس دفعہ دل چاہا کہ میں بھی خطوط کی اس محفل میں شامل ہو جاؤں۔ آپ کی دن رات کی کاوشوں کے بعد اب میگزین میں کہانیوں کا معیار پہلے سے کافی بہتر ہو چکا ہے۔ ماہ اگست کی خاص کہانی مہرہ بے حد پسند آئی۔ سلسلے وار کہانیوں میں آتش فشاں اور دلدل کی کہانی بہت خوبصورتی سے آگے بڑھ رہی ہے۔ گلابوں کی جنگ اپنی طوالت کی وجہ سے اپنی دلچسپی کھوتا جا رہا ہے۔ مختصر کہانیوں میں سزا ایک عبرت آموز کہانی تھی۔ دریا اور اباسین نے زیادہ متاثر نہیں کیا۔ حالات گزیدہ بھی بس ٹھیک تھی۔ کہانیوں کے معیار پر کچھ توجہ دیں کیونکہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے پسندیدہ رسالے کا معیار کسی دوسرے رسالے سے کسی طرح بھی کم نہ ہو۔ سرورق پر بھی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ میری طرف سے آپ کو اور ادارے کے تمام اراکین کو بہت بہت دعائیں اور پیار۔ اللہ حافظ۔

اشفاق احمد جیکب آباد سے لکھتے ہیں۔

مجھے کہانیاں پڑھنے کا بہت شوق ہے لیکن ہمارے شہر میں آپ کا رسالہ بے حد تاخیر سے پہنچتا ہے۔ مجھے آپ سے یہ پوچھنا ہے کہ رسالے کی بروقت فراہمی کو کسی طرح سے ممکن بنائیں۔ مجھے آپ کا رسالہ بے حد پسند ہے۔ اگست کا رسالہ ملتے ہی سب سے پہلے اپنے پسندیدہ سلسلے روشنی سے مستفید ہوئے۔ اس کے بعد سلسلے وار کہانیوں نے توجہ اپنی جانب کھینچ لی۔ آتش فشاں بہت دلچسپی سے آگے بڑھ رہی ہے۔ گلابوں کی جنگ کا تو کوئی اختتام نظر ہی نہیں آ رہا کچھ بھی ہو مصنفہ بہت خوبصورتی سے کہانی کو آگے بڑھا رہی ہیں۔ رسالہ تاخیر سے ملنے کی وجہ سے ابھی تک مکمل پڑھ نہیں پایا۔ اس ماہ کی خاص کہانی مہرہ البتہ نظر سے گزری بے حد پسند آئی آپ اسی طرح کی کہانیاں شائع کرتے رہا کریں۔ باقی کہانیوں پر تبصرہ اگلے ماہ کی کہانیوں کے ساتھ ہی ہوگا۔ ابھی سے اگلے شمارے کا انتظار شروع ہو چکا ہے۔ آپ سب کی خیر و عافیت کے لیے دعا گو ہوں۔

یہ تھے قارئین کے خطوط اب اگلے ماہ تک کے لیے اجازت

فہمیدہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وادیاں اور ویرانے

محبت اک آفاقی جذبہ ایک انوکھی کیفیت اور ایسا احساس ہے جس کی تعریف لفظوں میں بیان کرنا شاید کسی دانشور اور شاعر کے لیے ممکن نہیں بلکہ یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ انسان کی تخلیق ہی محبت پر ہوئی اسی لیے کائنات کی ہر شے سے یہی جذبہ چھلکتا محسوس ہوتا ہے۔ یہ محبت ہی تو تھی جس نے تخت ہزارہ کے رانجھے کو فقیر لعل وگہر کے تاجر مہینوال کو اسیر' قیس کو دیوانہ اور سسی کو صحرا کی خاک چھاننے پر مجبور کردیا۔

ٹھاکر پونچھی

لافانی محبت کا فسانۂ حسن' جس نے خوشبوئیں بکھیرتی فضائوں میں جنم لیا تھا

اندر نگر کی بستی شہر کے مضافات میں تھی۔

شام کے دھندلکے میں اس پہاڑی نما ٹیلے پر جب خودرو' چھدرے گھنے جنگلوں کی شاخیں سوجاتیں اور قرب وجوار کی ساری فضا پر ایک دھندلی سی نیم خاموش نیم غنودگی طاری ہوجاتی تو شہر کی رنگ برنگی کاریں اور خوش پوش لوگ شام بن کی منقش چہار دیواری میں جمع ہونے لگتے اور پھر دن بھر کی سوئی ہوئی زندگی دفعتاً انگڑائیاں لیتی ہوئی جاگ پڑتی اور ایک چھناکے کے ساتھ گردونواح کی دھرتی کے سینے میں ارتعاش سا پیدا ہوجاتا۔ شوخ تبسم ریشم واطلس میں لپٹی ہوئی جوانیاں سرمستی میں ڈوبی ایک دوسرے کی جانب پھسلنے لگتیں اور سارا ماحول ایک دم شرابی رقص اور مدہوش کن مترنم قہقہوں اور گیتوں سے سرشار جھوم اٹھتا۔

پھر کس لیے کل کی بات۔

آج کے لوگ اپنا ماضی' حال اور مستقبل یکسر فراموش کرکے آج کی دنیا آج کی زندگی کی گہرائیوں میں غرق ہوجاتے اور تب تک نہ ابھرتے جب تک کہ آج کی صبح ان پر نہ مسکراتی' انہیں آج کا پیغام نہ سناتی ماضی کی یاد لاکھ حوصلہ افزا سہی' مستقبل کے خواب لاکھ سہانے سہی لیکن آج یادوں اور خوابوں کا حسین امتزاج ہے۔ ایک ان جانا سا تجسس زندگی کی اجنبی رعنائیوں سے بھرپور......

آج کا نام ہے زندگی' جوانی اور عمل۔

پھر کس لیے کل کی بات!

اور آج کی انہی فرحت آمیز اور حیات بخش بہاروں سے معمور ایک رنگین اجتماع کا نام تھا شام بن۔ اس اجتماع میں بڑے بڑے سیٹھ ہوتے اور بڑے بڑے سرکاری

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

افسر جو موجودہ نظام کے سیاہ و سفید کے مالک تھے۔ جہاں بیٹھ کر وہ رنگ رلیاں مناتے۔ اپنی تہذیب و اخلاق کا مذاق اڑاتے۔ اس میں خود بھی شامل ہوتے' ان کی بیویاں اور لڑکے لڑکیاں بھی۔ مشاعرے ہوتے' رقص کی محفلیں لگتیں' شراب کے دور چلتے' جوا کھیلا جاتا۔ لوٹ کا مال از سر نو لوٹا اور لٹایا جاتا اور اس کے لیے بہترین جگہ شام بن تھی۔ اس طرح شام بن موجودہ بیوپاری دور کا ایک بہترین اڈہ تھا۔ ایک ایسا مندر جہاں جنگ کی طوالت کی دعائیں مانگی جاتیں اور اس کے مالک تھے شہر کے مشہور بزنس مین سیٹھ رادھے شام۔

یہ کوٹھی شہر کی گہما گہمی سے دور ایک پہاڑی ٹیلے پر واقع تھی اور اپنی تمام تر جدتوں اور رنگینیوں کے لیے مشہور تھی۔ سیٹھ رادھے شام اپنی فراخ دلی اور بے پناہ خلوص کے لیے اپنے حلقہ احباب میں ایک نمایاں حیثیت کے مالک تھے۔ مقابلتاً وہ کوئی بڑے دولت مند نہ تھے لیکن جہاں تک سماجی شعور اور دیگر امور کا تعلق تھا۔ وہ اپنے ہم پیشہ لوگوں سے پیش پیش تھے۔ ان کے اپنے دوستوں کا حلقہ وسیع تھا۔ جس میں ان کے ساتھی سیٹھ تھے اور بڑے بڑے سرکاری افسر' جن کی موجودہ زندگی ایک دوسرے کی مرہون منت تھی۔ اردگرد بھی بہت سی کوٹھیاں تھیں جو نئے نئے سیٹھوں اور سرکاری افسروں کے آرام و آسائش کے لیے وقف تھیں لیکن ان میں زندگی کی ویسی جان دار جھلک نہ تھی۔ وہ سینی ٹوریم کا سا بے جان منظر پیش کرتی تھیں جیسے ان میں رہنے والے لوگوں کی زندگیاں بے کیف اور بے رس ہوں جو صرف کل کے انتظار میں آنکھیں موندے گم صم بیٹھے رہتے تھے۔ صرف موت کے خیر مقدم کے لیے' ان کی زندگیوں کی طرح ان کی دولت کے ذرائع بھی محدود تھے۔

اتنی بڑی کوٹھی میں قیام پذیر تھے سیٹھ رادھے شام۔ ان کی بیوی دھن وتی اور جوان بیٹی کیرتی۔ کیرتی کی ماں مدت ہوئے فوت ہو چکی تھی۔ اس وقت کیرتی کی عمر بہ مشکل تین برس کی تھی سیٹھ جی نے اپنی بچی کی پرورش و پرداخت کے لیے دھن وتی سے شادی کی تھی۔ جوان کی پہلی بیوی کی ایک قریبی رشتہ دار تھی۔ اس سے بھی ایک لڑکا تھا۔ جو پہاڑی مقام پر ایک کانونٹ میں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ جاڑے کے موسم میں ایک دو ماہ کے لیے ان کے پاس آتا اور چلا جاتا۔ اس کا نام کنور تھا۔ یہی کوئی تیرہ چودہ برس کا' بے حد شریف طبع اور ذہین۔ اس میں کوئی بات ایسی نہ تھی جو سرمایہ دارانہ ماحول کی پیداوار میں ہوتی ہے۔ ایسا ظاہر ہوتا تھا جیسے اس نے امیرانہ جاہ و جلال دیکھا ہی نہیں۔ دیکھا ہے تو اسے اپنانے کی کوشش نہیں کی۔ اپنے والدین سے زیادہ اسے کیرتی سے لگاؤ تھا۔ فرصت کا وقت اسی کے ساتھ گزارتا اور اسی کے ساتھ گھومتا پھرتا۔ اس طرح اس کی ذہنی نشو و نما میں کیرتی کے کردار کا ہاتھ تھا۔

شام بن کے رنگین ماحول نے اور کیرتی کے اپنے خوب صورت کردار نے اس کے گرد احباب کا ایک وسیع حلقہ بنا رکھا تھا جس میں عموماً رئیس زادے ہوتے تھے۔ یا پھر رئیسی کی شکار لڑکیاں جو دانستہ یا غیر دانستہ طور پر اپنے ہی پیدا کردہ ماحول کا شکار ہو چکی تھیں لیکن کیرتی سب کے قریب ہوتے ہوئے بھی اپنی ہی لگن میں مگن تھی۔ اسے مصوری کا شوق تھا جو اب جنون کی حد تک بڑھ چکا تھا۔ دن رات اپنے ہی خیالوں میں غلطاں رہتی۔ اسے اپنے ماحول کے گیتوں' مشاعروں اور دیگر رقص و سرور کی محفلوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ ان لوگوں میں سے تھی جن کی زندگی حسین خیالوں سے وابستہ ہوتی ہے جن کا لا متناہی سلسلہ ماضی کے دھندلکوں سے شروع ہوتا ہے اور حال کی پریشان کن تنہائیوں کو سنبھالا دیتے ہوئے مستقبل کی دلفریبیوں پر جا کر ختم ہو جاتا ہے۔ ویسے تو وہ ہر ایک تقریب میں شریک ہوتی۔ ہر ایک سے خندہ پیشانی سے مل کر دوسروں کو خوش فہمیوں میں مبتلا کر دیتی لیکن صرف دکھاوے کے لیے ورنہ اسے اپنے آرٹ کے مخصوص

دائرے سے باہر کسی دوسری سمت نظر اٹھانے کی بھی فرصت نہ تھی۔

وہ خود بھی ایک مکمل تصویر تھی۔ عظیم فن کار نے اس کی تخلیق میں اپنا تمام آرٹ' اپنی تمام رعنائیاں صرف کر دی تھیں۔ اپنے تعلیمی دور کے اختتام پر اس نے اپنی تمام تر توجہ آرٹ کی جانب مبذول کر دی۔ شام بن کی منقش دیواریں اس کی تصویروں سے اٹی پڑی تھیں۔ ان میں اپنا ہی انداز تھا۔ اپنی ہی نزاکت اور نفاست تھی۔ اس کے ہر خیال میں ایک جدت' ایک اپج تھی۔ جو کم سنی ہی میں اس کی بالغ نظری اور بلند پروازی کی غمازی کرتی تھی جیسے جو کچھ اس کی کم سن نگاہوں نے دیکھا وہاں تک کسی دوسری پختہ نظر کی بھی رسائی نہ تھی۔ مصوری کی لت اسے اپنی ماں سے ورثہ میں ملی تھی اور اب وہ جیسے اس خیال کو مکمل کرنا چاہتی تھی۔ جو اس کی ماں کی بے وقت موت نے ادھورا رہنے دیا تھا۔ اسے بھی آرٹ کا بے حد شوق تھا۔ اس کی بنائی ہوئی تصویریں اب بھی سیٹھ جی کے کمرے میں موجود تھیں۔ جن سے کیرتی کو ہمیشہ ایک نئی زندگی ایک نئی امنگ اور ایک نیا جذبہ ملتا تھا۔ لیکن وہ بے جان سے خالی خولی نقش اس کی ماں کو لے ڈوبے تھے۔ انہیں اپنے خون سے زندہ کر کے وہ خود دق کا شکار ہو گئی تھی اور پھر رفتہ رفتہ وہ اپنے ہی کھینچے ہوئے ہلکے دھندلے خطوط میں الجھ کر رہ گئی اور اب وہ جنون کیرتی کو اپنی لیکن پر ہول تنہائیوں میں گھسیٹ رہا تھا لیکن وہ اس سے بے خبر تھی۔ اس کی زندگی وہ چتر تھے' جنہیں اپنی ماں کی طرح اپنا خون دے کر زندہ کرنے میں منہمک تھی اور انہیں کے خیالوں میں اپنے آپ کو ڈبوتی چلی جا رہی تھی۔

کیرتی ویسے تو جسمانی طور پر بچپن ہی سے کمزور تھی۔ چھوئی موئی کی ڈالی کی طرح ہوا کے لطیف جھونکے ہی سے شرما جانے والی' لیکن ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ اگر وہ چتر بنانا چھوڑ دے اور اپنی توجہ کسی دوسری طرف لگا دے' تو وہ جسمانی طور پر بہت جلد مضبوط ہو سکتی ہے۔ لیکن وہ ان کی باتوں سے مرعوب نہ ہوئی۔ اس کی سگائی ہو چکی تھی۔ اس کا منگیتر ایک جاگیردار کا لڑکا تھا۔ تعلیم یافتہ' ذہین' اور خوب صورت' سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ نظام کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ دونوں کی بساط ایک سی ہے اور ایک ہی سے مہرے۔ چال میں تضاد ضرور ہے۔ البتہ ایک میدان کا کھلاڑی دوسرے میں با آسانی شریک ہو سکتا ہے لیکن سیٹھ جی شاید کیرتی کو اپنے ہم پیشہ لوگوں کی سیاہ کارانہ چالوں کا اہل نہ سمجھتے تھے۔ اسی لیے انہوں نے پڑھے لکھے اپنے ماحول کے رئیس زادوں پر ایک جاگیردار کے لڑکے کو ترجیح دی۔ حالاں کہ ان کے حلقہ میں ایسے لڑکے تھے جو اسے اپنا شریک حیات بنانے کے خواہاں تھے ایسے سیٹھ تھے جو اس ڈھنگ سے بھی شام بن سے کچھ سمیٹنا چاہتے تھے۔ سیٹھ رادھے شام ان حریص نگاہوں سے واقف تھے انہیں اپنی مالی دشواریوں کا بھی احساس تھا۔ وہ جانتے تھے کہ جاگیردار سونے چاندی کے اتنے بھوکے نہیں ہوتے' جتنے بیوپاری پیشہ لوگ' مدن رائے نے بھی انہیں متاثر کیا تھا۔ کیرتی اور مدن رائے نے ایک دوسرے کا بہ خوبی جائزہ لے کر شریک حیات بننا منظور کیا تھا۔ لیکن اس وقت کیرتی صحت مند تھی۔ اس میں جوانی کی وہ بھرپور زندگی بخش رمق تھی جو اپنی مقناطیسی کشش سے ہر راہرو کو اپنا گرویدہ بنا لیتی ہے۔ لیکن ایک ہی برس بعد اس کا رنگ و انداز ہی جیسے بدل گیا۔ اس کے وہ گدگدا دینے والے نقوش جیسے کسی گہری دھند میں ڈوب گئے۔ جنہیں دیکھ کر اس کے شکاری منگیتر کی آنکھیں چندھیا گئی تھیں۔ سیمابی نزاکت کے شیدائی اگر اب اسے دیکھ لیتا تو شاید اسے پہچان بھی نہ سکتے اور ہو سکتا ہے اسے اب پسند بھی نہ کرتے اس طرح ایک طرف آرٹ تھا' صرف ذہنی عیاشی' ایک خیالی زندگی' اور دوسری طرف مدن رائے تھا۔ ایک جامع حقیقی زندگی لیکن اس نے اپنی روح پرور ہنگاموں کی مسرتوں پر آرٹ کی روح فرسا تنہائیوں کو ترجیح دی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

☆

کیرتی کی آیا نے جو بچپن سے اس کے ساتھ رہی تھی۔ ایک دن سیٹھ جی کے کہنے سننے پر اسے ڈانٹ ڈپٹ کی' وہ خاموش بیٹھی سنتی رہی۔ وہ جانتی تھی' آیا نہیں بول رہی' سارے شام بن کا ایک دیرینہ جذبہ ایک لاوے کی صورت میں پھٹ رہا تھا۔ جب وہ اپنے دل کے وسوسے نکال چکی تو کیرتی نے نہایت دھیرج سے پوچھا۔

"تم چاہتی کیا ہو.....؟"

آیا نے ترش لہجے میں جواب دیا۔ "میں نے تمہیں اپنا خون دے کر پالا ہے۔ میری آنکھوں کے سامنے ہی تمہاری یہ حالت ہو جائے' میں نہیں دیکھ سکتی۔ اپنے پرائے سب مجھے ہی طعنے دے رہے ہیں کہ تم آج جو ہو' میری بدولت ہو میرا تو ڈوب مرنے کو جی چاہتا ہے۔"

اس نے حیران ہو کر پوچھا۔ "لیکن مجھے ہے کیا.....؟"

"روز آئینے میں اپنا منہ دیکھتی ہو۔ پھر اپنی ہی تصویر کو دیکھو جو ایک برس پہلے کی ہے۔ جب تم نے مدن بابو کو پسند کیا اور پھر آج کی اپنی صورت دیکھو' تمہیں دکھ کیا ہے؟ جانتی ہو ڈاکٹر کیا کہہ رہا تھا.....؟"

"یہی کہ اگر میں تصویریں بنانا چھوڑ دوں' تو عمر لمبی ہو سکتی ہے' خوب موٹی ہو سکتی ہوں۔ پتا جی کا کہنا ہے' میری ماں کو بھی ڈاکٹروں نے یہی مشورہ دیا تھا اور ان نے ان کے مشورے پر عمل بھی کیا تھا..... پھر.....؟"

"پھر کیا.....؟"

"کیا وہ بچ گئی تھی.....؟"

آیا نے جل کر کہا۔ "تمہارے ساتھ بحث کون کرے تم نے پرائے گھر جانا ہے۔ وہ لوگ کیا کہیں گے.....؟"

"وہ سب جانتے ہیں۔ مجھے چتر بنانے کا شوق ہے اور اب وہی شوق میرا جیون بن چکا ہے۔ وہ کیا کہیں گے.....؟"

آیا نے رندھے ہوئے گلے سے کہا ہے۔ "اچھا! تمہارے من میں جو آئے کرو لیکن میں یہ سب کچھ نہیں دیکھ سکتی۔ میں تو چلی جاؤں گی۔"

کیرتی ہنسی۔ "لیکن کہاں.....؟"

"جہاں جی چاہا۔ تمہیں اس حالت میں دیکھ کر جل بھن کر مرنے سے تو یہی اچھا ہے کہ تم سے دور ہو جاؤں۔ یہاں رہ کر میرا کیا کام؟ جوں جوں عمر میں بڑی ہوتی جا رہی ہو' من مانی کرتی جا رہی ہو۔"

"اچھا۔ اگر میں آپ سب کی بات مان جاؤں تو؟"

"کیا.....؟"

"یہی۔ شام بن کی محفلوں میں برابر کا حصہ لوں۔ لڑکے لڑکیوں کے ساتھ گھوموں پھروں' اور یہ چتر بنانا چھوڑ دوں۔"

"جو من میں آئے کرو۔ تم اب بچی نہیں ہو۔ لیکن بھگوان کے لیے یہ رنگوں کا تماشا بند کر دو۔ تمہارے یہ کھیلنے کودنے کے دن ہیں۔ گھر میں پڑے رہنے کے نہیں۔ اس عمر میں تمہاری صورت کا یہ حال ہے آگے کیا ہو گا؟"

"لیکن اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟"

"دو برس سے تم پہاڑ پر نہیں گئی ہو۔ اس بار بھی تمہاری مرضی نہیں' حالاں کہ تم جانتی ہو' وہاں کی آب و ہوا کی تمہیں کس قدر ضرورت ہے۔ تمہارا نہ یہاں من لگتا ہے اور نہ وہاں۔ تمہارے من میں آخر ہے کیا؟"

کیرتی خاموش بیٹھی اس کی باتیں سنتی رہی۔ آج وہ اس سے بہت سی باتیں کرنا چاہتی تھی لیکن انہیں پورا نہ کر سکی۔ سیٹھ جی کی آواز اس کے کانوں میں پڑی۔ آج معمول سے پہلے ہی دفتر سے لوٹ آئے تھے۔ وہ اپنی بات ادھوری چھوڑ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

سیٹھ جی کا اترا ہوا چہرہ دیکھ کر دھن وتی گھبرا گئی۔

"کیا بات ہے.....؟ آج آپ جلد ہی چلے آئے۔"

رادھے شام نے لفافہ اس کے ہاتھ میں دیا۔

"کس کی چٹھی ہے.....؟"

"مدن رائے کی۔"

"کیا لکھا ہے.....؟"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"بمبئی جا رہا ہے اور وہ شادی کے بعد کیرتی کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہے۔"

دھن وتی نے خط پڑھا۔

"لیکن کیرتی ان دنوں اتنی کمزور ہے کہ اسے دیکھ کر تو ڈر لگتا ہے اور پھر ڈاکٹر نے اسے مکمل آرام کرنے کے لیے کہا ہے۔"

سیٹھ جی نے پوچھا۔ "آج آیا تھا ڈاکٹر.....؟"

آیا نے جواب دیا۔ "ٹیلی فون آیا تھا۔ آنا ہی ہو گا لیکن اس حال میں کیرتی کی شادی ٹھیک نہیں۔ اس بار اسے پہاڑ پر بھیج دیجیے۔ وہاں اس کی صحت اچھی ہو جائے گی اور پھر بیاہ کی اتنی جلدی بھی کیا ہے؟ اس کی ہم عمر تو ابھی کالج میں پڑھ رہی ہیں۔"

سیٹھ جی نے آیا سے کہا۔ "چٹھی پڑھ لو۔ مدن رائے نے شادی کے لیے لکھا ہے۔ اس کے بھائی کا خط بھی آیا ہے۔ اس نے بھی ایسا ہی لکھا ہے۔ انہیں کیا جواب دیں؟"

دھن وتی نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ "اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے؟ گائے بکری تو ہے نہیں کہ جس حالت میں بھی ہے کسی کو سونپ دی جائے۔ لکھ دیجیے۔ کیرتی بیمار ہے۔ جب اچھی ہو جائے گی' ہم خود طے کر لیں گے۔ بمبئی ہی جا رہا ہے۔ ولایت تو نہیں جا رہا۔ اس کی واپسی پر ہم دے دیں گے شادی۔"

سیٹھ نے صوفے میں دھنستے ہوئے جواب دیا۔

"مدن رائے کے بھائی سے ٹیلی فون پر آج بات کر لوں گا۔"

دھن وتی نے پوچھا۔ "بمبئی کیوں جا رہا ہے؟"

سیٹھ جی نے جواب دیا۔ "کوئی ٹریننگ لینے جا رہا ہے ایک سال وہیں رہے گا۔"

ڈاکٹر بھی آ گیا۔

سیٹھ جی نے اسی لہجے میں پوچھا۔ "کیرتی کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟ وہ لوگ اس ماہ شادی کے لیے زور دے رہے ہیں۔ آخر اسے بیماری کیا ہے؟ روز بروز دبلی ہوتی جا رہی ہے۔"

ڈاکٹر نے جواب دیا۔ "میں نے پہلے بھی کہا تھا۔ چترکاری کا یہ شوق لڑکی کو لے ڈوبے گا۔ اس کی صحت بہت گر چکی ہے۔ میں نے اسے نفع نقصان اچھی طرح بتا دیا ہے۔ پڑھی لکھی اور ذہین ہے۔ لیکن ہمیشہ ہنس کر ٹال دیتی ہے۔ آپ بھی اسے مشورہ دیجیے۔ اب تک تو کوئی خطرے کی بات نہیں لیکن یہی حالت بدستور رہی تو اندیشہ ہے' کوئی خطرناک مرض مول نہ لے بیٹھے۔"

سیٹھ جی نے کیرتی کو بلوایا۔ اس کے سامنے بھی ڈاکٹر نے یہی بات دہرائی۔

کیرتی نے پوچھا۔ "ڈاکٹر صاحب! آپ کا خیال ہے' اگر میں تصویریں بنانا چھوڑ دوں تو اچھی ہو جاؤں گی۔"

ڈاکٹر نے انجکشن کا سامان تیار کرتے ہوئے جواب دیا۔

"خیال ہی نہیں' مجھے پورا یقین ہے۔ کیوں کہ تمہیں کوئی بیماری سرے سے ہے ہی نہیں۔ ضرورت سے زیادہ سوچنے کی عادت تمہیں تباہ کر رہی ہے۔ تمہارا دماغ اتنا بڑا نہیں جتنا تم اس سے کام لیتی ہو۔ خوب گھومو پھرو' کھاؤ پیو' پھر اپنا رنگ دیکھ لینا۔ تمہارے یہ بے فکری کے دن ہیں۔ نہ جانے یہ مصیبت کہاں سے مول لے لی۔"

"لیکن آپ نے بتایا تھا کہ میری ماں کو بھی یہی روگ تھا۔ اس نے آپ کے مشورہ پر عمل کیا تھا لیکن پھر بھی وہ نہ بچ سکی تھی۔"

ڈاکٹر نے کیرتی کو انجکشن دیتے ہوئے جواب دیا۔

"اس کی بات اور تھی اور پھر تم کسی ایسی ویسی بیماری میں مبتلا نہیں صرف خون کی کمی ہے۔ جو کھانے پینے' گھومنے پھرنے سے دور ہو سکتی ہے لیکن یہ کمزوری بھی کسی خطرناک مرض کی شکل اختیار کر سکتی ہے۔ یہ تصویریں بنانا چھوڑ دو۔ دن بھر مختلف خیالوں کے پیچھے بھاگتی رہتی ہو۔ چند دنوں کے لیے بند کر دو۔ ساری عمر پڑی ہے تصویریں

بنانے کے لیے اب کی بار کشمیر چلی جاؤ۔ واپسی پر اپنا رنگ روپ دیکھ لینا۔"

کیرتی نے سیٹھ جی کو دیکھا' جو ایک طرف سر جھکائے ہوئے بیٹھے تھے۔ ان کے چہرے پر تفکر کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ جیسے وہ کسی آنے والے اندیشہ سے باخبر تھے۔ انہوں نے آج تک کیرتی سے کبھی کچھ نہ کہا تھا اور نہ ہی اس نے کبھی پریشانی کا احساس دلوایا تھا۔ وہ اسے خوش دیکھنا چاہتے تھے۔ انہوں نے کبھی کسی بات کے لیے آج تک اسے روکا یا ٹوکا نہ تھا لیکن ان کے آج کے چہرے سے عیاں ہوتا تھا کہ وہ کیرتی کی زندگی کے لیے اس سے بہت کچھ کہنا چاہتے تھے۔ تاکہ وہ اس موت سے بچ سکے' جو اس کی ماں کی قاتل واقع ہوئی تھی۔ سب ہی اپنی بساط کے مطابق کسی نہ کسی خیال کو سلجھانے کی کوشش کر رہے تھے اور ڈاکٹر اپنا سامان سمیٹ رہا تھا۔

آخر سیٹھ جی نے سکوت توڑا۔ "دیکھو کیرتی! تم ہمارے پاس اب کسی کی امانت ہو۔ جب وہ چاہیں تمہیں یہاں سے لے جاسکتے ہیں۔ تمہیں آرٹ کا شوق ہے۔ میں نے کبھی منع نہیں کیا۔ لیکن آج تمہاری یہ حالت دیکھ کر مجھے کہنا ہی پڑتا ہے کہ تمہیں اپنی صحت کے ساتھ ساتھ ہماری عزت کا بھی خیال نہیں۔ اس حالت میں مدن رائے تمہیں دیکھ لے؟ اور تم یہ بھی جانتی ہو کہ اس رشتہ کے لیے میں نے اپنے بیگانوں کی دشمنی مول لے رکھی ہے۔ صرف تمہاری خوشی اور بہتری کے لیے۔ مجھے ہر روز ایک ہی سوال بار بار سننا پڑتا ہے کہ کیرتی کو کیا ہو گیا ہے؟ یہ سوال میرے لیے کتنا تکلیف دہ ہے' تم اندازہ لگا سکتی ہو۔ لیکن تمہیں تو اپنی تصویروں سے ہی فرصت نہیں ملتی۔ ڈاکٹر نے جو کچھ کہا تم نے سن ہی لیا ہے اور پھر......"

سیٹھ جی کا لہجہ بتدریج تند اور تلخ ہوتا جا رہا تھا اور کیرتی ویسی باتیں سننے کی عادی نہ تھی۔ وہ بیچ میں بول اٹھی۔

"میں نے اس بار کشمیر جانے کا فیصلہ کیا ہے۔ وہاں میں سب کے مشورے پر عمل کرنے کی کوشش کروں گی۔ آپ لوگوں کی حسرت نہ رہ جائے۔"

دھن وتی نے الجھے ہوئے تلخ موضوع کا خوش گوار اختتام دیکھ کر مدن رائے کی چٹھی کیرتی کو دی۔ اس نے سرسری طور پر خط کا جائزہ لیا۔ جیسے مضمون کا اسے پہلے سے ہی علم تھا۔ وہ یوں ہی مسکرائی اور پھر آیا کو دیکھ کر اپنے خیالوں میں ڈوب گئی۔ سب کی نظریں اس کے خاموش ہونٹوں پر لگی ہوئی تھیں۔

قدرے توقف کے بعد کیرتی نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ ٹھیک ہے پتا جی! آپ گھبرائیے نہیں۔ آپ جس طرح چاہیں گے ویسا ہی ہوگا۔ مجھے آپ سب کی ذمہ داریوں کا پاس بھی ہے اور احساس بھی۔"

وہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔

ڈاکٹر نے کہا۔ "اس کا اب یہی علاج ہے کہ آپ اس کی شادی جلد سے جلد کروا دیں۔ یہ آرٹ اور آرٹ کا شوق خود بہ خود ختم ہو جائے گا۔ ورنہ اس لڑکی کی زندگی سے ہی ہاتھ دھونے پڑیں گے۔ جوانی میں اس قسم کی سنجیدگی ویسے بھی خطرناک ہوتی ہے۔"

دھن وتی نے بھی ڈاکٹر کی ہاں میں ہاں ملائی۔

سیٹھ جی خاموش بیٹھے دیر تک سوچتے رہے۔ دل ہی دل میں کوئی بات طے کر کے بولے۔ "ڈاکٹر صاحب! آپ کا مشورہ ٹھیک ہے۔ مدن رائے کو بلوا لیتے ہیں۔ جس طرح مناسب ہوگا' اس سے بات طے کر لیں گے۔ کیرتی میں جو تنہائی پسندی کا جذبہ بڑھ رہا ہے۔ وہ اس کی کمزور صحت سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔ میں آپ سے متفق ہوں۔ آج ہی مدن رائے کو تار دیتا ہوں۔ وہ دو تین دن میں آجائے گا۔"

جب ڈاکٹر چلا گیا تو سیٹھ جی دھن وتی سے مخاطب ہوئے۔ "تمہارا کیا خیال ہے......؟"

دھن وتی نے گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے فیصلہ کن انداز میں جواب دیا۔ "کچھ بھی ہو۔ لیکن مدن رائے کو اس حالت میں بلانا ٹھیک نہیں ہوگا اور پھر کیرتی کی رضا مندی بھی تو ضروری ہے۔"

سیٹھ جی نے درشت لہجہ میں کہا۔ "اگر ہم ہر بات میں اس کی صلاح لیتے رہے تو پھر یہ معاملہ طے ہونے سے رہا۔ میں اب بھی چاہتا ہوں کہ کیرتی کے ہاتھ پیلے کر دیے جائیں چاہے کچھ بھی ہو۔"

دھن وتی کو جیسے ان کا فیصلہ پسند نہیں آیا۔ وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

☆

کیرتی اکیلی لان میں بیٹھی تھی۔ چاروں طرف گہرا تکدر تھا۔ سورج نے مغرب کی شفق آلود پنہائیوں میں اپنے آپ کو چھپا لیا تھا اور درختوں کی سوئی ہوئی شاخوں پر دن بھر کے تھکے ہارے پرندے اپنے پر سکیڑے ایک دوسرے سے سرگوشیاں کر رہے تھے۔ وہ انہیں "ملتے" ایک دوسرے کی جانب کھسکتے دیکھتی رہی۔ ایک دوسرے سے مل کر کتنے مسحور ہو رہے تھے۔ لیکن اسے کئی دن سے سکون کا سانس میسر نہ ہوا تھا۔ اسے اپنی صحت اور شادی سے زیادہ اپنے والدین کا خیال تھا۔ ان کی تشویش صحیح اور جائز تھی۔ جوان لڑکی کی گرتی ہوئی صحت اکثر والدین کا دل ہلا دیتی ہے اور پھر ایک ایسی لڑکی' جسے والدین نے بڑے لاڈ اور پیار سے پالا ہو اور جس کی شادی کے متعلق بلند ارادے اور خیال ہوں۔

جہاں تک اس کی اپنی زندگی اور محبت کا تعلق تھا اس نے سوائے اپنے ماں باپ کے کسی سے محبت نہ کی تھی بعد ازاں وہی محبت مختلف جذبوں میں تحلیل ہو کر اس کی تصویروں میں آ کر سمٹ گئی۔ مدن رائے سے اسے محبت نہ تھی۔ اس نے صرف اسے پسند کیا تھا۔ جس طرح ہر لڑکی اپنے آئندہ کے ساتھی کو پسند یا ناپسند کرتی ہے۔ اس کے خیال میں ہندوستانی لڑکی کے لیے محبت اتنی ضروری بھی نہ تھی۔ اس کی اپنی ٹھہری ہوئی زندگی میں ایسا کوئی حادثہ رونما نہ ہوا تھا جو محبت کی شکل میں منتقل ہو جاتا۔ اسکول اور کالج کا چنچل زمانہ بے فکر بچپن کی معصوم اداؤں کی طرح آنکھ جھپکتے ہی گزر گیا صرف ایک بار اس کے دل کو کوئی چھو گیا تھا۔ چھو کر ایک وقتی کسک پیدا کر گیا تھا اور پھر کیرتی کے بجھے بجھے سے جوان خیالوں میں کوئی مسکرا دیا۔ اسے سروپ یاد آ گیا۔ بھولا سا معصوم سروپ...... کالج کے لڑکوں نے اس کا اپریل فول بنایا۔ کیرتی کی طرف سے کسی لڑکی نے اسے خط دیا۔ جس میں لکھا تھا۔

"تم کالج بس اسٹاپ پر میرا انتظار کرنا۔ میں تمہیں اپنے ساتھ لے چلوں گی۔ چند ضروری باتیں کرنی ہیں۔ میری کار دیکھ کر ہاتھ دینا۔ ڈرائیور کار روک لے گا۔"

ان دنوں کیرتی تھرڈ ایئر میں پڑھتی تھی اور سروپ اس کا ہم جماعت تھا۔ اس کے قریب ہی بیٹھنے کی اکثر کوشش کرتا۔ خوش شکل اور ذہین لڑکا تھا۔ شاعرانہ ذوق رکھتا تھا۔ لیکن بے وقوفی کی حد تک معصوم۔

کیرتی کی کار دیکھ کر ہاتھ دیا۔ ڈرائیور نے کار روک لی۔ سروپ بغیر پوچھے کار میں بیٹھ گیا۔ وہ اس کی حرکت پر ششدر رہ گئی۔ ایک عجیب سی بات تھی۔ لیکن وہ خاموش بیٹھی رہی۔

سروپ نے کار میں بیٹھتے ہی سلسلہ کلام شروع کیا۔ "میں نے سوچا' آپ بھول جائیں گی لیکن آپ ٹھیک وقت پر آ گئیں۔"

کیرتی دل ہی دل میں ہنسی۔ لیکن خاموش رہی۔

اس نے مسرت بھرے لہجے میں کہا۔ "جب سے میں نے کالج کی آرٹ گیلری میں آپ کا چتر 'ہم بھی انسان ہیں' دیکھا ہے۔ آپ کا معتقد ہو گیا ہوں۔ کئی بار آپ سے ملنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ آپ سوچ رہی ہوں گی' کیسی باتیں کر رہا ہوں لیکن یقین مانیے اپنے دل کی گہرائیوں سے کہہ رہا ہوں۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ......"

کیرتی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "سروپ صاحب! پسینہ پونچھ لیجیے۔"

اس کے چہرے پر کامیابی کی ایک لہر سی مچل گئی۔ "ایک

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گھنٹہ سے دھوپ میں کھڑا تھا۔ آج میں اتنا خوش ہوں کہ خواب کا گمان ہوتا ہے۔ ایک مدت کی تمنا تھی۔ آج پوری ہوئی۔"

کیرتی نے چٹکی لی۔ "سالانہ جلسے میں آپ کا گیت کامیاب تھا۔"

سروپ نے شاعرانہ انداز میں جواب دیا۔ "کبھی کبھی یوں ہی اپنے جذبات کے ہاتھوں مجبور ہو کر لکھنے بیٹھ جاتا ہوں۔ میرا ایک نیا گیت اس پرچے میں بھی چھپا ہے اور ساتھ ہی میری تصویر بھی۔ میں خود پڑھ کر سناتا ہوں۔"

اس نے گیت سنانا شروع کیا۔

"زندگی تاریک تھی اپنی تاریک رہی۔"

☆

سُروپ اپنی دنیا میں غلطاں گیت پڑھ رہا تھا۔ گیت پڑھتے پڑھتے اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔ جیسے وہ خود اپنے ہی لکھے ہوئے گیت کی حدت سے جل رہا تھا۔ زندگی تاریک تھی اپنی تاریک رہی۔"

گیت ختم ہوگیا۔ دونوں ایک دوسرے کو کھوئی کھوئی نظروں سے دیکھتے رہے۔ جیسے انہوں نے وہ دھیمی دھیمی میٹھی میٹھی خلش پالی تھی۔ جو گیت کو اپنی دھن پا کر ملتی ہے۔ جو شگوفے کو کسی خار کے لمس سے حاصل ہوتی ہے۔ جو یخ بستہ برفانی چوٹیوں میں صبح دم تمازتِ آفتاب کے احساس سے جاگ اٹھتی ہے۔ گیت ختم ہوگیا تھا۔ لیکن اس کے بول جیسے اب بھی کار کے اندر تھرک رہے تھے۔

کیرتی نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ "مجھے معلوم نہ تھا آپ اس قدر جذباتی ہیں۔"

اس نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ "لیکن جذبات کے قدردان۔"

کیرتی نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔ "جذبہ ہی حقیقی زندگی ہے۔ جس نے خیال پالیا اس نے منزل بھی پالی۔"

دونوں ایک دوسرے کو پہچاننے لگے۔ دونوں ایک دوسرے کو بنظرِ غائر دیکھنے لگے۔ منزل کون تھی اور راہی کون؟ دونوں میں سے کوئی بھی نہ جانتا تھا۔ لیکن کی ان جانے سفر کی تحریک دونوں کے چہروں سے ظاہر ہو رہی تھی۔

سُروپ نے جیب سے خط نکالا۔ "آپ نے لکھا تھا۔"

کیرتی نے خط پڑھا۔ اس کی سادگی پر مسکرا دی۔ وہ جان چکی تھی' سب کیا ہے۔ لیکن اس کی سرتوں کو برقرار رکھا..... "آج تو آپ کے گیت ہی سنوں گی۔ باتیں تو پھر بھی ہو جائیں گی۔"

سُروپ گیت سناتا رہا۔ ان گیتوں میں کسی کی محبت تھی۔ کسی کے جذبات تھے اور یادوں کی دبی دبی سی آگ۔ جیسے اس نے وہ محبت پالی تھی۔ جو زندگی کو روگ لگا دیتی ہے۔

کیرتی اسے اپنے گھر لے آئی۔ اس کے بعد وہ بلا ناغہ کیرتی کے پاس آتا رہا۔ وہ اپنے چترووں میں رنگ بھرتی۔ سروپ ان پر گیت لکھتا۔ ان گیتوں اور چتروں میں ایک گہری مطابقت تھی۔ اس کا تعلق ان کی روح سے تھا۔ اس کا تعلق ایک لمبے درد سے تھا۔ لیکن وہ درد بھی ختم ہوگیا۔ سروپ چلا گیا۔ اس کا باپ فوج میں ملازم تھا۔ کسی حادثہ میں مارا گیا اور اسے اپنی تعلیم ادھوری چھوڑنی پڑی اور وہ سیکڑوں میل دور اپنے قصبہ میں لوٹ گیا۔ سروپ چلا گیا اور اس کے ساتھ ہی اس کی یاد' اس کا خیال اور اس کے گیت بھی' اور ان کی محبت جو ایک مذاق سے شروع ہوئی تھی' مذاق ہی پر ختم ہوگئی اور پہلے احساس محبت کی وہ دھیمی دھیمی میٹھی میٹھی سی خلش نہ جانے کون سے ارفع جذبے میں منتقل ہوگئی۔

کیرتی کے تصور میں سروپ کا نقش ابھر آیا۔ وہ اس سے محبت کرتا تھا۔ اس سے مل کر' چند لمحے گزار کر جیسے ابدی سرتوں میں گم ہو جاتا تھا۔ لیکن یکا یک آنکھوں کی دوری نے دل سے دور کر دیا۔ وہ کون سی چیز تھی جو ان کی پہلی پسند' پہلی محبت کے درمیان حائل ہوگئی۔ وہ کیسا جذبہ تھا جو اتنی شدت سے پیدا ہوا اور پھر حباب کی طرح مٹ گیا۔

کیا ہر اولین محبت ایسی ہی ہوتی ہے؟ کیا وہ وقتی پسند تھی یا پھر ابدی محبت کا حقیقی ازلی روپ' جو سینے کے نہاں خانوں میں چھپ جاتا ہے اور پھر دبی دبی سی آگ کی طرح تا ابد اپنی تابانی اور جلن سے کسی نامعلوم احساس کو زندہ رکھتا ہے۔ آگ جو کبھی نہیں سلگتی' کبھی ظاہر نہیں ہوتی۔ کیرتی کو چتر کاری کا شوق تھا۔ وہ اسی میں ہمہ تن مصروف تھی۔ محویت کے عالم میں ہر روز کسی نئے خیال کو نئے سانچے میں ڈھال کر جیسے دنیا جہان کی محبتیں ایک ساتھ پالیتی تھی اور سروپ گیت لکھ رہا تھا۔ کئی بار اس کے گیت مختلف اخبارات اور ماہناموں میں دیکھے اور پڑھے تھے۔ ان میں اب ٹھہراؤ تھا' سنجیدگی تھی' بلندی اور جدت تھی۔ اس نے اپنے گیتوں کا مجموعہ بھی بھجوایا تھا۔ لیکن کبھی خط نہ لکھا۔ کبھی یاد نہ کیا۔ کسی سے ذکر تک نہ کیا اور وہ بھی تو اسے بھول چکی تھی۔ لیکن آج کیوں وہ دو تین برس بعد اس کے خیالوں' اس کی دھڑکنوں' اس کی تنہائیوں میں کہیں سے آنکلا۔ آج پھر کیوں اسے دبی دبی سی خلش کا احساس ہونے لگا۔ کیا یہ زندگی کے چند مخصوص لمحے ہیں۔ جو غیر معمولی لمحاتی ثانوی بھولی بسری کہانیوں کے لیے وقف ہیں۔ وہ کچھ بھی نہ سوچ سکی۔

اور پھر اس کی شادی کی بات شروع ہوئی۔ مدن رائے' کو پہلی بار اس نے دیکھا۔ حالاں کہ نام کئی بار سنا تھا۔ پہلی ہی نظر میں اسے پسند کیا۔ حالاں کہ اس کی نگاہوں میں کہنہ مشق شکاری کا سا انداز تھا۔ اس کی جسمانی ساخت بے حد جاذب نظر تھی۔ ایک بے حد خوش اطوار اور پر سلیقہ نوجوان تھا۔ ان تمام صلاحیتوں کا مالک تھا جو پہلی ہی نظر میں اپنا گرویدہ بنا لیتی ہیں۔ کیرتی بھی اس سے متاثر ہوئی۔ مدن رائے کے دو بھائی فوج میں ملازم تھے۔ جواب کبھی کبھار ہی اپنے گاؤں جاتے تھے۔ وہ اپنے باپ کی جاگیر کا منتظم تھا اور حقیقتاً واحد مالک بھی۔ لیکن ظاہری طور پر اس میں جاگیردارانہ امارت پرستی کا شائبہ تک نہ تھا۔ وہ ایک اچھا شکاری تھا اور شکاری انداز اس کی حرکات و سکنات میں رچ چکا تھا۔ اس نے پہلی ہی ملاقات میں اپنی بلند کرداری اور مکمل انسانیت کا ثبوت دیا تھا۔ لیکن خوب صورت تصویر کا دوسرا رخ مختلف تھا۔

کیرتی نے پوچھا۔ "آپ کون سا شکار پسند کرتے ہیں؟"

اس نے اپنی شکاری نگاہوں کو جھکا کر نہایت انکساری سے جواب دیا۔ "شکاری کی منزل شکار ہے۔ کون سا اور کیسا بھی کیوں نہ ہو؟"

"مختلف راستے ہیں۔"

"کیسے؟"

"آپ شکار کے دلدادہ ہیں' میں آرٹ کی۔ آپ شکاری میں آرٹسٹ۔ آپ زندگی کو ختم کرتے ہیں۔ میں اس کی رچنا کرتی ہوں۔"

مدن رائے نے خود اعتمادی کا ثبوت دیا۔ "صرف ایک قدم درمیان پڑتا ہے۔ آپ کسی چیز کی تخلیق کرتی ہیں کہ ایک دن وہ فنا ہو جائے اور میں ایک چیز کو ختم کرتا ہوں تاکہ وہ آپ کے ہاتھوں سے دوبارہ جنم لے۔ اگر میں نہ ہوتا تو آپ کا وجود بھی نہ ہوتا۔"

کیرتی شاید پہلی بار کھل کر ہنسی۔ "زندگی اور موت کا یہ عجیب سا فلسفہ ہے۔ کم سے کم میری سمجھ سے تو باہر ہے۔"

اس نے اسی رو میں جواب دیا۔ "ویسے بھی حقیقی زندگی کی بہت سی باتیں آرٹ کی زد سے باہر ہیں۔"

دونوں خاموش رہے۔ دونوں ایک دوسرے کی ظاہری جسمانی خوب صورتی کا جائزہ لیتے رہے۔ ایک کی نگاہوں میں بے تکلفی تھی اور دونوں میں شرم اور جھجک۔

کیرتی نے شرماتے جھجکتے پوچھا۔ "ویسے آپ کو میرے چتر کیسے لگے؟"

مدن رائے نے بڑی بے باکی سے جواب دیا۔ "صرف اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ آپ کا خیال آپ سے زیادہ خوب صورت نہیں۔ اپنا تو یہ حال ہے کہ گھنے جنگل کی گھنی چاندنی رات دیکھی اور کسی سائے میں جنگلی جانور کو دبکا ہوا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پایا۔ واہ واہ کردی۔ وہ بھی دل ہی دل میں اور پھر چپکے سے اسے اپنی گولی کا نشانہ بنا دیا۔"

کیرتی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ "جان پڑتا ہے آپ صرف ظاہری خوبصورتی کے پرستار ہیں۔"

"یہ تو عمر کا تقاضہ ہے۔" اس نے جواب میں قہقہہ لگایا۔

"ویسے آپ کا اپنے متعلق کیا خیال ہے؟"

"میں تو بدصورتی میں بھی خوبصورتی ڈھونڈنے کی قائل ہوں اور وہ مجھے مل ہی جاتی ہے۔"

"کیسے......؟"

"جیسے آپ کی باتیں اتنی خوب صورت نہیں جتنے کہ آپ خود...... پھر بھی مجھے آپ کی ان باتوں میں ایک نئے پن کی جھلک دکھائی پڑتی ہے اور مجھے آپ کی باتیں پسند ہیں۔"

مدن رائے کا چہرہ تمتما اٹھا۔ "شکریہ! حقیقی معنوں میں آپ نے ایک آرٹسٹ کی نظر پائی ہے۔"

ان کی پہلی ملاقات تھی مختصر لیکن پرمعنی۔

کوئی ہفتہ بھر مدن رائے شام بن میں رہا۔ انہیں ایک دوسرے سے ملنے کا موقع ملتا رہا۔ مدن رائے ضرورت سے زیادہ اس کے قریب آنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن کیرتی خندہ پیشانی سے اسے نظر انداز کر رہی تھی۔ وہ قبل از وقت اسے اپنی بندوق کا نشانہ بنانا چاہتا تھا۔ شکاری نے اپنے جاگیردارانہ ماحول کی شکارگاہوں میں قسم قسم کے شکار دیکھے تھے۔ انہیں ذہنی' جسمانی یا روحانی طور پر موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ لیکن کیرتی ہر بار اس کے نشانے کی زد سے باہر ہو جاتی۔ شکاری کا اشتیاق شدت اختیار کرتا گیا۔ کیرتی اس کھیل میں اس قدر تاک تھی۔ لیکن ایسے کھیل میں دوسروں کے گھائل ہونے یا مر جانے کے قصے سنے تھے۔ مدن رائے کی حرکات اسے پسند نہ تھیں۔ لیکن وہ اسے پسند تھا۔ کیوں کہ اسی کے ساتھ زندگی کا طویل سفر طے کرنا تھا۔ یہ ایک ضروری امر تھا۔

اس کی تخیلی محبت اس کی اپنی پرواز سے بہت بلند تھی۔ اس نے مدن رائے کو تب پسند کیا تھا' جب پہلی بار اسے ملا تھا۔ اس کے ساتھ رہا تھا۔ لیکن اس پسند میں وہ محبت نہ تھی' محبت کی وہ کسک نہ تھی۔ جو تاریکیوں میں کسی جھلملاتی ہوئی کرن کی طرح روح کی خوشیوں کو منور کر جاتی ہے۔ کبھی کبھی مدن رائے اس کے خیالوں میں آتا۔ اسے پہچان کر مسکرا دیتی۔ صرف اس لیے کہ زندگی اس کے ساتھ گزارنی تھی۔ رہی محبت تو وہ اب بھی اپنی تصویروں کے لیے وقف تھی۔ جن کے رنگوں میں اس کا خون تھا۔ خیال تھا۔ جوان دھڑکنوں کی بے فکر لرزشیں تھیں اور اپنی لاغر اندام پژمردہ زندگی کا عکس جمیل۔

شادی کے بعد اس کی موجودہ زندگی اس سے جدا نہ ہوگی۔ مدن رائے نے ایسا ہی کہا تھا اور اسے اپنے پر بھی کامل اعتماد تھا۔ اس کا غم نہ تھا۔ لیکن اپنی گرتی ہوئی صحت نے اسے الجھن میں ڈال دیا تھا اور پھر جلدی شادی کا تقاضہ وہ عجیب کشمکش میں گرفتار تھی۔

دیر تک کیرتی اپنے ماضی اور مستقبل کے دھندلکوں میں الجھی رہی۔ مختلف باتیں مختلف نقوش اس کے تصور میں ابھرتے تھے اور پھر ایک دوسرے میں خلط ملط ہو کر ایک نرالے انداز سے اس کی پتلیوں میں اتر آتے تھے۔ بکھرے ہوئے خیالوں کا لامتناہی سلسلہ رانی کی آواز سے ٹوٹ گیا۔ وہ نہ جانے کب سے قریب بیٹھی اس پر مسکرا رہی تھی۔

کیرتی ٹھٹک گئی۔

"تم کب سے یہاں ہو......؟"

رانی نے جواب دیا...... "ہزار بار کہا۔ کلب سینما میں جایا کرو۔ تیرا تو سر پھرا ہوا ہے۔ صورت دیکھ کر ڈر لگتا ہے۔ اتنی کمزور ہو گئی ہے اور سننے میں آیا ہے کہ تیرے بیاہ کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔"

"کیرتی نے قدرے جھینپ کر اسے دیکھا۔ "تمہیں کس نے بتایا......؟"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

رانی کا بھائی نریندر بول اٹھا۔ "مدن لعل کے بڑے بھائی میجر صاحب ملے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ مدن رائے بمبئی جا رہا ہے اور شادی کے بعد آپ کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہے۔"

"وہ تمہیں کیسے جانتے ہیں......؟"

"ملبیر کے گھران سے ملاقات ہوئی۔ کسی سرکاری کام پر آئے ہوئے ہیں۔ شام کو بمبئی لوٹ رہے ہیں۔"

"چاچی کو تو نہیں ملے؟"

نریندر نے جیب سے خط نکالا۔ "یہ ملبیر نے دیا تھا۔ میجر صاحب کا ہوگا۔"

کیرتی نے لفافہ چاک کرتے ہوئے پوچھا۔ "ملبیر کا کیا حال ہے؟"

رانی نے جواب دیا۔ "ٹمپریچر تو نارمل ہو گیا ہے۔ لیکن کمزور بہت ہے ہفتہ دس دن تک گھومنے پھرنے کے قابل ہو سکے گا۔"

کیرتی نے خط پڑھا۔ اس میں شادی کا تذکرہ تھا اور مدن رائے ایک مہینہ کے لیے بمبئی جا رہا تھا۔

رانی نے پوچھا۔ "کیا لکھا ہے؟"

اس نے تھکی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ "وہی جو نریندر نے بتایا۔"

رانی نے حسرت بھری نگاہوں سے دیکھا۔ "تم رہ گئی تھیں۔ اب تمہارا بیڑا پار ہونے لگا اور مفت میں بمبئی کی سیر بھی۔ قسمت ہو تو ایسی۔ ہم تو بھاڑ جھونکنے کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔"

کیرتی اپنی ہنسی نہ روک سکی۔ "لیکن تمہارا بیڑا کب پار ہوگا۔"

اس نے بڑی بے پروائی سے جواب دیا۔ "ابھی تک تو جتنے ملے دل پھینک بدھو ہی ملے۔" پوچھا۔ "آپ مجھے پسند کیوں کرتے ہیں؟" جواب ملا۔ "آپ ڈانس اچھا کرتی ہیں۔ اچھا گا لیتی ہیں۔ آپ کو سینما اور کلب کی زندگی سے لگاؤ ہے آپ کے بالوں کی ترتیب مجھے بے حد پسند ہے۔ آپ کے ہونٹوں کی سرخ تراش قابل محبت ہے اور پھر......"

کیرتی نے بات کاٹ دی۔ "خیر تجربہ تو حاصل کر ہی لو گی کہ کتنی قسم کی محبتیں ہوتی ہیں اور کتنی قسم کے اس کے پجاری۔"

رانی نے ٹھنڈی آہ بھر کر جواب دیا۔ "میں نے تو حاصل بھی تجربہ ہی کرنا ہے۔ شادی کے بلاوجہ جھن جھٹوں میں کون پڑے جب تک پنچھی جال کے مہین دھاگوں سے باہر' شکاری کی محبت اور چاہت قدر کے قابل' جوں ہی وہ بیچارہ پھڑ پھڑانے لگا۔ سب وعدے' قول ختم' رہ گئی محبت بیچاری لونڈی بن کر۔ مردہ نہ زندہ۔ اچھی گزر رہی ہے۔ ملازمت ہے۔ دن کٹ رہے ہیں۔ شادی کر کے کیا لینا ہے؟ اور پھر آج کل کے لڑکے بہ قول سور گباشی کا منی بہ ذات خود لڑکیوں سے کم نہیں۔ وہی فیشن' وہی چال ڈھال ہیرو بنے پھرتے ہیں۔ چھوڑو ان کتھا کہانیوں کو ان کتابوں میں ہی اچھی دکھائی دیتی ہیں۔"

رانی خاموش ہو گئی۔

کیرتی نے پوچھا۔ "چپ کیوں سادھ لی؟"

"سوچتی ہوں۔ تمہاری سگائی ہوئی تب بھی میں یہاں نہ تھی۔ اب تمہاری شادی ہو رہی ہے۔ شاید اس میں بھی شامل نہ ہو سکوں۔"

"کیوں؟"

"پہلے ماما جی کی دوسری لڑکی کا بیاہ تھا۔ اب کی بار تیسری کا ہو رہا ہے اور ابھی دو باقی ہیں' اور وہاں جا کر ماں سے لے کر بہن تک سب کچھ مجھے ہی بننا پڑتا ہے اور اپنے ڈیڈی کی مصروفیت کا یہ حال ہے کہ وہ شاید میرے بیاہ میں بھی شامل نہ ہو سکیں گے۔"

کیرتی نے چٹکی لی۔ "کوئی ہو نہ ہو' مجھے تو تیری شادی میں خود شریک ہونا ہے۔"

رانی نے منہ بنا کر کہا۔ "لیکن ہم تو تیرے صاحب بہادر کو آج تک نہ دیکھ سکے۔"

کیرتی نے بھی اسی طرح منہ بنایا۔ ”فوٹو جو دیکھ رکھا ہے۔“

”پگلی! اصلی اصلی ہے اور نقلی نقلی۔ فوٹو سے کیا پتا چل سکتا ہے کہ کوئی کتنے پانی میں ہے۔ ویسے تصویر والی آنکھیں خطرناک ہیں۔ اصلی معنوں میں گھاگ شکاری دکھائی دیتا ہے۔ عجیب سا میل ہے۔ ایک آرٹسٹ‘ دوسرا شکاری۔“

شام ڈھل چکی تھی اور کاریں حسب معمول شام بن میں جمع ہو رہی تھیں۔

رانی نے گفتگو کا موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ ”آج بھی شاید کوئی خاص پروگرام ہے۔“

کیرتی نے جواب دیا۔ ”ہاں! بہت ہی اچھا پروگرام ہے مدراس کا ایک راگی آیا ہوا ہے اور تمہیں کلاسیکل سنگیت پسند ہے۔ جا اندر چلی جا۔“

اس نے بے دلی سے جواب دیا۔ ”نہ بابا! مجھے بڑے بوڑھوں کی نگاہوں سے ڈر لگتا ہے۔ ایسے گھور گھور کر دیکھتے ہیں‘ جیسے کچا ہی چبا جائیں گے۔ چھوڑو اس پروگرام کو میرے ساتھ گھومنے چلو۔“

”لیکن کہاں.....؟“

”کلب میں.....“

”نہیں۔ تم جاؤ۔ وہاں اتنا شور ہوتا ہے کہ میرا دل ہی ڈوبنے لگتا ہے۔“

رانی نے تہدیدی لہجے میں کہا۔ ”اپنا علاج کراؤ۔ ابھی سے یہ حالت ہے میری لاڈلی تو آگے کیسے گزرے گی؟ اچھا تو میں چلی۔ بائی بائی۔“

دونوں چلے گئے۔

کیرتی کو رانی کی باتوں سے سخت کوفت ہوتی تھی۔ وہ ایک متوسط گھرانے کی آوارہ مزاج لڑکی تھی۔ باپ وکیل تھا اور بھائی نیا نیا کالج کے ماحول سے باہر نکلا تھا۔ بھائی بہن دونوں ہی آوارگی پسند تھے۔ رانی کے دوستوں کا حلقہ وسیع تھا۔ جس میں ہر قماش اور عادات واطوار کے لڑکے تھے اور نر ندران کے ساتھ ہی گھوم کر زندگی کے سب لطف مزے لوٹتا اور لٹاتا۔ رانی کیرتی کی سہیلی تھی۔ دونوں نے اکٹھے ہی تعلیم حاصل کی تھی۔ لیکن دونوں کے راستے مختلف تھے۔ ایک ہی ماحول کی پروردہ تھیں۔ لیکن ایک شوخ تھی‘ دوسری متین۔ ایک پر اپنے ماحول کا رنگ غالب آچکا تھا اور دوسری اپنا رنگ ماحول پر بکھیر رہی تھی۔

اس کے چلے جانے کے بعد کیرتی نے اطمینان کا سانس لیا اور اپنے خیالوں کے ٹوٹے بکھرے تسلسل کو از سر نو ترتیب دینے لگی۔

اندر کی محفل ابھی پورے عروج پر نہ تھی۔ کسی ڈائریکٹر کو الوداعی پارٹی دی جا رہی تھی۔ ستار کی ہلکی دھیمی آواز روشن دان سے چھن چھن کر لان کی خاموشی کو اپنے ترنم میں سمو رہی تھی۔ وہ دیر تک باہر سردی ہی میں بیٹھی رہی۔ آج کشور کو بھی آنا تھا۔ لیکن ابھی تک نہیں پہنچا تھا۔

آیا اسے اپنے ساتھ اندر لے گئی۔ شال اڑھاتے ہوئے کہا۔ ”تمہاری سہیلیاں بلوا رہی ہیں۔ سیٹھ جی بھی پوچھ رہے تھے۔“

کیرتی نے جواب دیا۔ ”میری طبیعت ٹھیک نہیں اور میرے پاس ان سوالوں کے جواب بھی نہیں‘ جو وہ پوچھتی ہیں۔“

آیا نے جھجک کر پوچھا۔ ”شادی کے بارے میں تمہاری اپنی کیا رائے ہے۔“

”میری رائے کی کوئی قدر ہے۔“

”کیوں.....؟“

”سگائی کے بعد تو لڑکے والوں ہی کی سنی جاتی ہے اور پھر پتا جی جس طرح مناسب سمجھیں کریں۔ انہوں نے کوئی فیصلہ کر ہی لیا ہوگا۔“

آیا نے دبی زبان میں کہا۔ ”تمہاری یہ حالت دیکھ کر وہ چپ ہی ہو گئے ہیں۔ لیکن دوسرے لوگ تو اسی شادی کے لیے زور دے رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے اب سیٹھ جی بھی ہاں کر دیں۔ مگر تمہاری کیا مرضی ہے؟“

”میری سنو تو میں شادی کرنا ہی نہیں چاہتی۔ میں اپنے آپ کو اس قابل ہی نہیں سمجھتی کہ ایسی حالت میں بیاہ شادی کی ذمہ داری نبھا سکوں۔ کسی کا ساتھ دے سکوں اور اب مجھے یہ بھی محسوس ہونے لگا ہے کہ مجھے میری ماں کی طرح کھا کر ہی چھوڑے گا اور میں اس کے لیے تیار بھی ہوں۔“

آیا نے جل کر کہا۔ ”تمہیں روگ وگ کچھ بھی نہیں‘ یہ تصویریں تمہارا لہو چاٹ رہی ہیں۔ میرا بس چلے تو ان سب کو راکھ کا ڈھیر بنا دوں..... ایسا بھی کیا شوق ہوا کہ کوئی اپنی جان ہی گنوا دے۔ اچھی بھلی تھیں۔ یہ حالت بنا ڈالی۔“

کیرتی نے آنسوؤں بھری آنکھوں سے دیکھا۔ ”میری ماں ہو کر مجھے ہی جلا دینا چاہتی ہو۔“

”آیا نے اسی لہجہ میں کہا۔ ”اب کسے زندہ رکھیں تمہیں یا ان کاغذی مورتوں کو.....“

کیرتی نے پیار بھرے لہجے میں جواب دیا۔ ”دونوں کو۔“

”وہ کیسے؟“

”جب میں اچھی ہو جاؤں گی‘ بیاہ کروں گی اور پھر تمہیں بھی اور ان تصویروں کو بھی اپنے ساتھ لے جاؤں گی۔“

”لیکن تار پڑھ لیا تم نے.....؟“

”کیسا تار.....؟“

”مدن رائے کا۔ وہ ایک دو دن میں آ رہا ہے۔“

کیرتی نے قدرے توقف کے بعد ٹھہری ہوئی آواز میں کہا میں اسے جانتی ہوں۔ وہ میری بات مان جائے گا۔ اگر اپنے ساتھ مجھے بمبئی لے جانے کے لیے بضد رہا‘ میں اس کے لیے بھی تیار ہوں۔ ہو سکتا ہے اس میں میری بہتری ہو۔ کچھ بھی ہو میں گھر والوں کو پریشان کرنا نہیں چاہتی۔ اب میں نے یہی فیصلہ کیا ہے؟“

سیٹھ جی بھی کمرے میں آ گئے۔ چھوٹتے ہی کہا۔ ”تم نے یہ کیا صورت بنا رکھی ہے۔ سب پوچھ رہے ہیں۔ ذرا ان لوگوں سے مل آؤ۔“

کیرتی نے بے دلی سے جواب دیا۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“

سیٹھ جی نے اسے مدن رائے کا تار دیا اور کمرے سے چلے گئے۔

کیرتی نے تار پڑھا۔ مضمون پہلے ہی سے جانتی تھی۔ اسے محسوس ہوا جیسے اس کے جواب سے سیٹھ جی خوش نہیں ہوئے۔ جیسے وہ چاہتے تھے کہ وہ جس حالت میں بھی ہے‘ الوداعی پارٹی میں شریک ہو لیکن مجبور نہ کر سکے۔ اس نے ان کا دل رکھنے کے لیے لباس بدلا اور مانوس ماحول کی اجنبی لغزشوں میں شامل ہو گئی۔ راگ کے زیر و بم پر سب کے سر جھوم رہے تھے۔ سب کی نظریں انھیں اور جھک گئیں۔ لاغر اندام کیرتی اب بھی چمپہ کے پھول کی سی رنگت اور معصوم شگفتگی سمیٹے ہوئے تھی۔

پھول کے لیے پھلواری۔

تم نہیں آئے۔

جیسے شام بن کا ذرہ ذرہ گنگنا رہا تھا۔

☆

شام بن میں معمول سے زیادہ رونق تھی۔ مدن رائے کی آمد پر سیٹھ رادھے شیام نے شہر کے اپنے تمام لوگوں کو مدعو کیا تھا۔ سب لوگ شام ڈھلتے ہی پہنچ گئے۔ لیکن مدن رائے دیر سے آیا۔ ہر ایک سے مخصوص شکاری انداز سے ملا۔ ان میں چند صورتیں اس کی جانی پہچانی تھیں۔ انہیں اس نے بہت قریب سے دیکھا تھا کچھ اسے دیکھ کر جھینپ گئیں۔ چند مسرت اور حسرت کے ملے جلے جذبات تلے دبی ہوئی معنی خیز نگاہوں سے پٹ پٹ اسے دیکھتی رہیں۔ لیکن مدن رائے کے چہرے پر تذبذب اور اشتیاق کے آثار نمودار نہ ہوئے۔ رانی کو اس نے پہلی بار دیکھا تھا۔ نام اگرچہ کئی بار سنا تھا۔ رانی کے چہرے پر جیسے اس کی نگاہیں جم کر رہ گئیں۔ رانی اس کے لیے نئی تھی۔ کن

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آنکھوں سے دیکھنے کا انداز نیا تھا جو اس کے سینے میں اتر کر سوئیاں سی چبھو رہا تھا۔ وہ اس کے چہرے پر سے اپنی نظریں نہ ہٹا سکا۔ لیکن رانی نے بے اعتنائی برتی۔ جیسے وہ اس کے لیے نیا نہ تھا۔ اس کی شکاری نگاہیں نئی نہ تھیں۔ جیسے مدن رائے کی طرح کے کئی اس کی جوانی کی اٹھان میں غرق ہوئے تھے اور دوبارہ ابھرنے کا نام تک نہ لیا تھا۔ جیسے اسے اپنی اس آگ کی جلن کا احساس تھا۔ وہ جانتی تھی' آگ لگ جانے سے شعلے کب اور کہاں بلند ہوتے ہیں اور پھر وہ بھڑکتے سلگتے شعلے دھوئیں کی شکل کب اور کیسے اختیار کرتے ہیں۔ رانی سے ملتے وقت مدن رائے نے ٹھنڈی آہ بھری۔ تیر نشانے پر بیٹھا تھا۔ وہ اپنے غیر معمولی حسن سے دوسروں کو جلانے کی عادی تھی۔ کوئی جل رہا تھا اور وہ فاتحانہ انداز سے مسکرا رہی تھی۔

رانی نے ازراہ مذاق پوچھا۔ ”یہ ٹھنڈی آہیں کیسی؟“

مدن رائے نے اس کے چہرے پر متواتر نظریں گاڑے ہوئے جواب دیا۔ ”آگ کی تپش برداشت کرنے کا عادی نہیں۔ ایک جانے پہچانے شہر میں آپ جیسا خوب صورت اجنبی۔“

رانی نے نیم وا آنکھوں سے اسے دیکھا اور پھر یوں ہی مسکرا دی اس کی پریشان زلفیں ایک دوسرے سے الجھ رہی تھیں۔ شکاری شاید دیدہ دانستہ ان میں آ پھنسا تھا۔

کیرتی نے مدن رائے کی بات سنی۔ لیکن اپنی جگہ سے نہ ہلی۔ رانی اس کے پاس ہی بیٹھ گئی۔ مدن رائے اپنے دوستوں سے باتیں کرتا رہا۔ رانی کو دیکھتا رہا۔

رانی نے کہا۔ ”کیرتی! یہ تمہارے لیے ابھی سے ٹھنڈی آہیں بھرنے لگے ہیں۔ آگے کیا ہوگا؟ جیسا سن رکھا تھا' ویسا ہی پایا۔“

کیرتی مدن رائے کو دیکھ کر مسکرا دی لیکن وہ متوجہ نہ ہوا۔ وہ اس ماحول سے متاثر نہ ہوا۔ اس کے سینے میں سے ایک دھواں سا اٹھ رہا تھا۔ جس نے اس کے دل اور دماغ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ اس دھوئیں میں صرف ایک شعلہ شرر فشاں تھا۔ جو کبھی اس کے قریب لپکنے لگتا اور کبھی سمٹ کر دوسرے کونے میں چلا جاتا۔ لان کے دوسرے سرے پر ایک لڑکی پنجابی گیت گا رہی تھی اور ڈھولک کی ہلکی مدھم تھاپ پر بانسری کی پرسوز لے گیت کو اپنے میں مدغم کر رہی تھی۔ وہ غیر اختیاری طور پر رانی کی جانب کھسکتا گیا۔ اس کے لیے وہی ایک مجسم گیت بن گئی تھی۔ سوائے اس مجسم گیت کے وہاں کوئی دوسری ایسی چیز نہ تھی جو جاذب توجہ ہو۔ کیرتی کے متعلق جیسے پہلے ہی اسے علم ہو گیا تھا کہ وہ دائمی مریض ہے یا اس کا اہل نہیں کہ چند صحت مند لمحے اس پر صرف کیے جائیں۔ پھر جیسے وہ اپنی دنیا میں آ گیا۔ رانی ان کے درمیان سے اٹھ کر چلی گئی۔ وہ اسے دیکھتا ہی رہا۔ اس نے بلبیر سے بات شروع کر دی تھی لیکن کبھی کبھی اچٹتی سی نظر مدن رائے پر بھی ڈال دیتی۔ جیسے وہ چاہتی ہو کہ آگ کہیں بجھ نہ جائے جو ابھی ابھی اس نے سلگائی تھی۔ کیرتی خاموش بیٹھی ایک جانے پہچانے کھیل کو دیکھتے دیکھتے جیسے اس کے انجام سے بھی باخبر ہو گئی تھی۔ جب رانی نظروں سے اوجھل ہو گئی تو مدن رائے نے رسماً کیرتی سے پوچھا۔

”اب کیسی ہو......؟“

کیرتی نے جیسے سوال کا جواب تیار کر رکھا تھا۔ ”مجھے تھا ہی کیا......؟“

”اس قدر کمزور ہو گئی ہو کہ پہچانی بھی نہیں جاتیں۔ چہرے کا رنگ ہی بدل گیا۔“

”چند دنوں سے طبیعت کچھ گھبراتی ہے اور پھر......؟“

اس نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑا۔

مدن رائے کچھ کہنے والا تھا۔ لیکن رک گیا۔

کیرتی نے اپنا جملہ پورا کیا۔ ”بمبئی کب جا رہے ہو؟“

”اگلے مہینے۔“

کیرتی نے جھجکتے شرماتے پوچھا۔ ”تم نے یہ شادی کی شرط رکھ دی۔“

مدن رائے کی نگاہیں جیسے کسی کی جستجو میں تھیں۔ ”سوچا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ایسا ہی تھا۔ لیکن......“

وہ اپنا فقرہ پورا نہ کر سکا۔ جیسے کہیں سے اس نے کوئی شارہ پا لیا ہو۔ جس کا اسے انتظار تھا۔ وہ تیزی سے اٹھا ور مچلتے ابھرتے قہقہوں اور سرگوشیوں کے رقصاں سیلاب میں [illegible]ب گیا۔ جس کی ہر متلاطم لہر اس کی اپنی زندگی کی یک داستان لیے ہوئے تھی۔ کچھ لوگ اب چلے گئے تھے۔ کچھ جا رہے تھے۔ بہت سی لڑکیوں نے مدن رائے کو گھیرا ہوا تھا اور وہ ہر ایک کا جواب خندہ پیشانی سے دے رہا تھا۔ ہر ایک کو اپنا گرویدہ بنا رہا تھا۔ لیکن رانی اس کے لیے ایک سراپا سوال تھی۔ جس کا جواب ابھی تک اپنا گرویدہ نہ بنا سکا تھا۔ کیرتی نے وہاں سے اٹھنا ہی مناسب سمجھا۔ اسے دیکھ کر رانی بھی بڑے دروازے کی طرف بڑھنے لگی۔

مدن رائے نے اس کا ہاتھ کھینچا۔ ”آپ کہاں جا رہی ہیں؟“

رانی نے زلفیں جھٹکیں۔ ”کیرتی کے پاس......“

”کیوں......؟“

”آپ بھی عجیب آدمی ہیں۔ وہ کیا کہے گی۔ آپ کو تو اس کے پاس بیٹھنا چاہیے تھا۔ وہ اکیلی بیٹھی ہے۔ پہلے سے ہی وہ ٹھیک نہیں ہے۔“

”میں کیا کر سکتا ہوں؟“

”یہ آپ مجھ سے پوچھ رہے ہیں۔“

”ہو سکتا ہے جواب آپ ہی کے پاس ہو۔“

”آخر آپ کے ارادے کیا ہیں؟ کہیں......“

اس نے بات پھیر دی۔ ”صرف یہ ارادہ ہے کہ آج کا کھانا کسی اچھے سے ہوٹل میں اکٹھے کھایا جائے۔“

”لیکن آپ نے تو آج کا کھانا یہاں کھانا ہے۔ چلیے کیرتی کے پاس۔ آپ کو اس کے کمرے میں لے چلتی ہوں۔“

”کمرا تو میں بھی جانتا ہوں۔ میرا خیال تھا......“

سیٹھ جی کو دیکھ کر خاموش ہو گیا۔ وہ اسی کی طرف آ رہے تھے۔ رانی سوچنے لگی' کیرتی کے چہرے پر جس خدشے کی جھلک نمایاں تھی' وہ ٹھیک ہی تھا۔ مدن رائے کی باتوں سے ظاہر تھا کہ اسے کیرتی کی حالت کا پہلے ہی سے علم تھا اور آج کی ملاقات نے اس کی تصدیق بھی کر دی تھی۔ وہ کیرتی کو صورت حال سے واقف کرنا چاہتی تھی لیکن اس میں جرات ہی پیدا نہ ہوئی۔

سیٹھ جی مدن رائے کو اپنے ساتھ بڑے کمرے میں لے گئے جہاں دھن وتی اور آیا پہلے ہی سے بیٹھی تھیں۔

ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد سیٹھ جی نے کیرتی کے متعلق سارا حال بیان کیا اور اس کے بارے میں ڈاکٹر کے مشورے سے بھی آگاہ کر دیا۔ لیکن مدن رائے گم صم بیٹھا صرف دیکھتا رہا۔ جیسے وہ سب کچھ جانتا تھا۔ اس کے چہرے پر اکتاہٹ کے آثار تھے۔

آخر سیٹھ جی نے پوچھا۔ ”تمہارا اپنا کیا ارادہ ہے۔ ہماری طرف سے تیاری مکمل سمجھو لیکن اس حالت میں شادی کے بعد کیرتی تمہارے ساتھ بمبئی جانے کے قابل ہوگی یہ سوچنا تمہارا کام ہے۔“

مدن رائے خاموش رہا۔

دھن وتی نے بات بڑھائی۔ ”شادی آپ نے کرنی ہے۔ سیاہ و سفید آپ کے سامنے ہے۔ جو فیصلہ کریں گے ہمیں منظور ہوگا۔“

مدن رائے نے جواب دیا۔ ”جس طرح بھائی صاحب طے کریں گے' مجھے منظور ہوگا۔“

کھانا کھانے کی میز پر سب لوگ اکٹھے بیٹھے تھے۔ ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ صرف وقت کاٹنے کے لیے' ورنہ ان میں کسی کو بھی کوئی دلچسپی نہ تھی۔ مدن رائے نے جلدی جلدی کھانا کھایا اور چلا گیا۔ جیسے باہر کوئی انتظار کر رہا تھا۔

محفل کا شور و شغب ختم ہو گیا۔ بجلی کے قمقمے بھی بجھنے لگے۔ شام بن خاموشی میں ڈوب گیا۔ لیکن کیرتی کے کمرے کی بتی ساری رات جلتی رہی۔

☆

سیٹھ رادھے شام کو مدن رائے کے بھائی کی چٹھی کا شدت سے انتظار تھا۔ کیوں کہ وہ ساری ذمہ داری اسی پر ڈال گیا تھا وقت تیزی سے گزر رہا تھا اور ماحول کی سرگوشیاں اب مختلف آوازوں میں تبدیل ہو رہی تھیں کہ مدن رائے نے کیرتی کو ناپسند کر دیا۔ کیوں کہ وہ دائمی مریض ہے اور دق کا شکار اور یہ سیٹھ جی کی شکست تھی۔ کیوں کہ انہوں نے اپنے ماحول کے لوگوں کو چھوڑ کر جاگیردارانہ ماحول کے لڑکے کو اپنایا تھا اور ان کی پسند میں سرمایہ دارانہ ماحول کی تضحیک پوشیدہ تھی۔ جس کی وہ خود تخلیق تھے۔ یہ سارے شام بن کی شکست تھی اور اس نے بھی اپنی ہار تسلیم کر لی تھی۔ اس کی رونقیں سرد پڑ گئی تھیں۔ کیرتی نے بھی محسوس کیا تھا کہ مدن رائے اس کی متین مضمحل مسکراہٹ سے زیادہ رانی کی شوخ لہکتی ہوئی اداؤں سے متاثر ہو چکا ہے اور اپنی تمام توجہ اس کی جانب مبذول کر دی تھی۔ رانی کا یہ رنگ خلاف توقع نہ تھا۔ لیکن ایک خاندانی وجاہت کا پرستار اتنا پست ہو سکتا ہے۔ کیرتی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ اسے ایک بات کی خوشی ہوئی کہ سفر سے پہلے ہی ساتھی کی بلند کرداری اور خود اعتمادی اس پر واضح ہو گئی۔ اسے رنج ہوا' کیوں کہ اس میں سارے خاندان کی تضحیک تھی۔ شام بن کے ذرے ذرے کی توہین تھی۔ جس کے بوجھ تلے دبے کنور نے بھی مسکرانا چھوڑ دیا تھا وہ اس ہتک کا بدلہ لینا چاہتی تھی۔ یہ جذبہ اس کے تحت الشعور میں بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ کسی حد تک اس کی تشکیل بھی ہو چکی تھی لیکن اسے عملی جامہ کیسے پہنائے؟ یہ اس کی تخیل کی پرواز سے باہر تھا۔ والدین کی غمگین صورتیں اس کے سارے جسم میں سوئیاں سی چبھوتی رہتیں۔ اسے گمان ہونے لگتا جیسے اس کے جسم میں سے آگ نکل رہی ہو۔ کئی بار اسی آگ میں فنا ہو جانے کی آرزو بھی کی۔

ایک رات سیٹھ جی اور دھن وتی دیر تک اپنے کمرے میں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ کیرتی آپا کنور کے ساتھ پڑوس میں کسی شادی پر گئی ہوئی تھی سیٹھ جی کو جس خط کا انتظار تھا وہ موصول ہو چکا تھا۔ میجر صاحب نے معذرت کے ساتھ لکھا تھا کہ مدن رائے شادی کے لیے تیار نہیں۔ کیوں کہ اسے کسی نے بتا دیا ہے کہ کیرتی دق کا شکار ہے اور ہم میں سے کوئی بھی یہ خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہیں۔ مدن رائے نے کسی دوسری لڑکی کو پسند کر لیا ہے اور عنقریب ہی شادی بھی کر رہا ہے۔ سیٹھ جی نے کئی بار خط پڑھا ان کی آنکھیں ندامت سے جھکی ہوئی تھیں اور پیشانی پسینے سے تربتر......

دھن وتی نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔ ”کیرتی کو بتا دیں؟“

سیٹھ جی نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ ”اسے بتانا فضول ہے۔ آپا کو بتا دیں گے۔ بات یہاں سے آگے نہیں بڑھنی چاہیے۔ اپنے ہی لوگ تاک میں بیٹھے ہوئے ہیں کہ کب یہ رشتہ ٹوٹے اور ہماری کھلی اڑائیں۔“

دھن وتی نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”کیرتی انجان تو ہے نہیں۔“ اس دن کے برتاؤ سے وہ بھی مدن رائے کو سمجھ گئی ہے۔“

”کچھ بھی ہو۔ یہ ہماری عزت کا سوال ہے۔ اس میں چپ ہی اچھی ہے۔ کیرتی کو پتا چل گیا تو کیا معلوم وہ سنبھل بھی سکے یا نہیں پہلے ہی اس قدر کمزور ہو چکی ہے۔ تم کہو تو میجر صاحب سے ٹیلیفون پر بات کروں یا خود بمبئی چلا جاؤں......“

دھن وتی نے جواب دیا۔ ”فضول ہے' جو ہونا تھا ہو گیا۔ اب آگے کی سوچیے۔ کیا معلوم اسی میں کیرتی کی بھلائی ہو۔ کنور صبح جا رہا ہے۔ کیرتی کو بھی پہاڑ پر بھیج دیجیے۔ دنوں میں اچھی ہو جائے گی پھر سوچ لیں گے بیاہ شادی کی۔ سچ پوچھو تو اس کی عمر ہی کیا ہے؟“

کنور آ گیا۔ کیرتی اور آپا پیچھے تھیں۔

اس نے چھوٹتے ہی کہا کہ...... ”پتا جی! دیکھا کامنی کا دولھا۔ مریل سا۔ میں نے ذرا زور سے پوچھا۔ سنایئے صاحب! کیا بتاؤں پتا جی؟ لڑکیوں کی طرح شرما گیا اور کامنی اتنی موٹی۔ دولھا تو وہی دکھائی دیتی تھی۔“ اس نے کیرتی کو دیکھتے ہی شرارت آمیز لہجے میں کہا۔ ”اپنے بابو مدن رائے جی کا کیا مقابلہ۔ ساری برات میں ان جیسا ایک بھی نہیں دیکھا۔“

دھن وتی نے بات بدل لی۔ ”اب کی بار کون سا گیت سیکھا ہے۔“

اس نے کیرتی سے پوچھا۔ ”کیوں دیدی! ہو جائے وہی گیت جو گاؤں سے آئی ہوئی لڑکیوں نے اپنی بار میں گایا تھا۔“

کیرتی خاموش رہی۔ ماحول اکھڑا ہوا سا تھا۔

دھن وتی نے کہا۔ ”وہی سناؤ۔“

کنور نے گانا شروع کیا۔ کیرتی بھی مدھم سر میں ساتھ دینے لگی۔

دن کھیڈن دے چار گے

پل بھر بئی جا او مانوآ

زندگی کے اس طویل غیر رومانی سفر میں صرف چار دن کھیلنے کے لیے' امنگ بھرے دل' امنگ بھری تمنائیں اور امنگ بھری مسرتیں۔ لمحے بھر کے لیے بیٹھ جا میرے پاس میرے قریب...... گیت کے بول تھرتھرائے۔ ایک مدت کے بعد شام بن کی سوئی ہوئی فضاؤں میں ایک ارتعاش سا پیدا ہوا۔ گاتے گاتے کنور کا ساتھ دیتے' کیرتی جیسے اپنی معصوم یادوں کی تلخ مسکراہٹوں میں الجھ گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔ آواز دھیمی ہوتی گئی اور پھر یکبارگی رک گئی۔ سیٹھ جی نے اخبار سے اپنا منہ ڈھانپ رکھا تھا۔ کیرتی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

کنور نے سب کو خاموش اور مایوس دیکھ کر پوچھا۔ ”آپ سب چپ ہیں۔ کیا بات ہے؟“

دھن وتی نے بہ مشکل آواز نکالی۔ ”تم صبح جا رہے ہو' اس لیے۔“

وہ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن سیٹھ جی نے دوسری باتوں میں الجھا دیا۔ آپا کیرتی کے پاس چلی گئی۔

آپا نے کہا۔ ”سیٹھ جی آج بہت اداس دکھائی دے رہے ہیں۔“

کیرتی نے بڑی معصوم سی ہنسی ہنسی۔ ”آپا ظاہری بناوٹ کو پسند کرنے والے دل کی خوب صورتی کو نہیں ٹٹولتے۔“

اس نے حیران ہو کر پوچھا۔ ”میں سمجھی نہیں۔“

”یہی کہ پتا جی کو میجر صاحب کا جواب مل گیا ہوگا جس کے لیے کئی دنوں سے پریشان تھے۔“

آپا پر جیسے برف پڑ گئی۔ دوبارہ سیٹھ جی کے کمرے میں لوٹ گئی۔ دھن وتی نے اسے ساری بات بتا دی۔ آپا پر جیسے سکتہ طاری ہو گیا۔ آنکھوں سے آنسو امڈ آئے۔ زیادہ دیر ان کے پاس نہ ٹھہر سکی۔ واپس کیرتی کے پاس چلی آئی۔

کیرتی نے اس کی بھرائی ہوئی آنکھیں دیکھ کر کہا۔ ”تمہیں تو میری ڈھارس بندھانی چاہیے لیکن تم خود ہی رونے لگیں۔ میرا خیال ٹھیک تھا نا......؟“

آپا نے سنبھلنے کی کوشش کی۔ ”کیسا خیال......؟“

”پتا جی کو میجر صاحب کا خط مل گیا۔ مدن رائے نے انکار کر دیا۔“

”مجھے تو کسی نے بتایا نہیں۔ ہاں سیٹھ جی کی طبیعت ضرور خراب ہے اور اسی لیے آج سست دکھائی دے رہے ہیں۔“

کیرتی نے ڈوبی ہوئی آواز میں کہا۔ ”کچھ بھی ہو تم گھبراؤ مت۔ میں زندہ رہوں گی اور اپنی تصویروں کو سنبھالے ہوئے۔ وہ لوگ ٹھیک ہی تو سمجھتے ہیں' مجھے دق ہے' کمزور ہوں' اس حالت میں مجھے اپنا ساتھی کون بنائے گا؟ میجر صاحب اور مدن رائے کا اس میں کیا دوش؟ کسی نے مجھے سگائی کے بعد دھتکار دیا۔ ناپسند کیا' مجھے اس کا رتی بھر بھی دکھ نہیں جو کچھ ہوا اچھا ہی ہوا۔“

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آیا آنسوؤں بھری آنکھوں سے اس کے چہرے کو دیکھ رہی تھی جو ڈوبتے ہوئے چاند کی طرح زرد ہو چکا تھا۔

کیرتی نے اپنی بات پوری کی۔ ”دو تین دن میں ہم پہاڑ پر چلے جائیں گے۔ پتا جی سے بات کرو۔ دو تین مہینے وہیں آرام اور شانتی سے گزاریں گے۔ وہیں اپنے بھوش کے بارے میں سوچ لوں گی۔ تم گھبراؤ نہیں۔“

کنور آ گیا۔ اسے دیکھ کر آیا چلی گئی۔

کنور نے کیرتی کے پاس بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ ”تم بھی چپ ہو۔ پتا جی اور ممی بھی چپ ہیں اور پھر گاتے گاتے تمہیں کیا ہو گیا تھا؟“

کیرتی سنبھلی۔ ”ایسی تو کوئی بات نہیں۔ تم نہ جانے کیا سمجھ بیٹھے۔“

”ویدی! بات تو کوئی ضرور ہے۔ مجھے نہ بتاؤ تمہاری مرضی۔“

کیرتی اس کا دل رکھنے کے لیے ہنسی۔ ”سویرے تم جا رہے ہو۔ تمہاری کتنی رونق تھی؟ ورنہ اور کیا بات ہو سکتی ہے؟“

”لیکن پہلے بھی تو چھٹیاں ختم ہونے پر جاتا تھا۔“

کیرتی نے اس کا سر سہلایا۔

”اب تم جا کر سو جاؤ۔ صبح جلدی اٹھنا ہے۔“

لیکن کنور اسی کے کمرے میں بیٹھا رہا۔ کیرتی دیر تک پیانو بجاتی رہی اور وہ اس کی دھنوں کے بول ڈھونڈتا رہا۔ بھول گیا کہ علی الصبح سفر کی تیاری کرنی ہے۔

☆

پہاڑوں اور جنگلوں سے کیرتی کو لگاؤ تھا ہی۔ بچپن سے ہی اپنے والدین کے ساتھ پہاڑوں پر سیر و تفریح کے لیے جایا کرتی تھی۔ کشمیر کا کوئی ہی ایسا صحت افزا مقام ہو گا جہاں تک نہ پہنچی ہو لیکن اب کی بار وہ کشمیر کے ان پہاڑوں پر گئی جن کا براہ راست شہر سے رابطہ نہ تھا جو شہروں کی بستیوں سے بہت بلند تھے۔ بلبیر کے ماموں ریاست میں ملازم تھے۔ انہیں خبر دی گئی تھی لیکن وہ ان سے بھی نہیں ملی۔ سوائے آیا کے اس کے ساتھ دوسرا کوئی نہ تھا۔ وہ کسی کو بھی اپنا ساتھی نہ بنانا چاہتی تھی۔ اس کا بس چلتا تو وہ آیا کو بھی ساتھ نہ رکھتی۔

مدن رائے سے اس طرح جدا ہو جانے کا کیرتی کو بے حد دکھ تھا اور اس سے بھی زیادہ اپنے والدین کی عزت کا جو ایک ہی اشارے میں مٹی میں ملا دی گئی۔ اسے گھر کے کسی فرد نے میجر صاحب کے خط کا مضمون نہ سنایا تھا۔ آئندہ کے حالات اس پر واضح نہ کیے تھے لیکن اس نے خط کا مضمون بھانپ لیا تھا۔ شام بن میں تین چار دن کا وہ طویل وقفہ اس کے لیے بہت ہی اذیت ناک تھا۔ وہ ان افسردہ پریشانیوں سے مفلوج سی ہو گئی تھی لیکن جوں ہی اپنے بناوٹی ماحول کی پستیوں کو پھلانگ کر پہاڑوں کی مقدس بلندیوں کو چھو لیا۔ وہ جیسے بھول ہی بیٹھی کہ اس کے ساتھ کوئی بھیانک حادثہ ہوا تھا۔ اڑتی اڑتی خبر اس تک پہنچی تھی کہ مدن رائے رانی کو اپنی جاگیر میں لے گیا ہے اور اسی نے اس کے کان بھرے تھے۔

دوپہر ہی کو وہ رنگنو گڑھی کے نئے ڈاک بنگلے میں آ پہنچے تھے۔ وہاں کافی وزیٹر تھے۔ بنگلے کے اردگرد بھی خیمے تھے لیکن وہاں کیرتی کا دل نہ لگا۔ وہ بلندی پر پہاڑ کی اوٹ میں ایک پرانے ڈاک بنگلے کی طرف بڑھی جس کے متعلق اسے پہلے سے علم تھا لیکن جہاں تک وہ پہنچی تھی پرانے ڈاک بنگلے تک پہنچتے شام ڈھل چکی تھی۔ پہاڑی سفر نے اسے تکان سے چور چور کر دیا تھا لیکن اسے محسوس ہو رہا تھا کہ ماضی کی تلخیوں اور مایوسیوں نے اس کے دل، ذہن اور روح میں نشتر چبھو چبھو کر جو زخم پیدا کیے تھے وہ مندمل ہو رہے ہیں۔ ساری تھکن زائل ہو گئی ہے۔ وہ ڈاک بنگلے میں نہ بیٹھی۔ اس کے قدم غیر اختیاری طور پر ان بلندیوں کی جانب بڑھنے لگے جو برف سے ڈھکی ہوئی تھیں اور جن میں شفق کی لالی جذب ہو رہی تھی۔

وہ ایک چٹان پر بیٹھ گئی اور اپنی نئی پرانی یادوں کو اپنے تصور میں سمیٹنے لگی۔ کرید کرید کر کسی بات کو اپنے دل کے تہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گوشے میں سے نکالتی اور اسے اپنے ذہن کی کسوٹی پر اچھی طرح پرکھ کر ہمیشہ کے لیے اپنے سے دور کر دیتی جیسے اپنی زندگی کو از سرِ نو ترتیب دینے سے پہلے پرانی اور نئی یادوں کو یکسر فراموش کر دینا چاہتی ہو۔ اس کسک کو ہمیشہ کے لیے مٹا دینا چاہتی ہو جو اس کی نئی زندگی کے نئے ارادوں میں کبھی حائل ہونے کی جسارت کر سکتی تھی۔

..... دور تک پھیلی ہوئی جنگلی پہاڑی فضاؤں میں ہم آہنگی اور یک رنگی تھی۔ ایک ہی آواز اور مختلف زاویوں کا ایک ہی انداز بلندیوں کے متمنی بادل تھک ہار کر جنگل ہی میں ڈیرے ڈالے بیٹھے تھے اور حدِ نظر تک ستاروں کی بکھری ہوئی آبادیوں اور ان میں سے امڈتا ہوا دھواں یکجا ہو کر جیسے ان دھندلی دھندلی سی نشہ آلود خاموشی کو اپنے میں سمو کر ان بادلوں میں شریک ہونے کا متمنی ہو اور ان کے بیچ تیرتی ہوئی ابابیلیں..... کیرتی پہاڑی ماحول کا مزہ لیتی رہی اور پھر ان بلند قامت دیودار اور ان کے بغل میں دبکے ہوئے نازک اندام چیڑ کے درختوں کا بھی' جو نہ جانے کب سے کسی کے انتظار میں صم بکم کھڑے تھے۔

کیرتی سوچنے لگی حقیقی زندگی انہی پہاڑی وادیوں سے ابھرتی ہے اور انہی ندی نالوں کے شور میں ڈوب جاتی ہے۔ یہاں کے لوگ' یہاں کے گیت' یہاں کا ذرہ ذرہ ان زندگی بخش پوتر ہواؤں سے معمور ہے جو زندہ رہنے کی تحریک پیدا کرتی ہیں اور انسانیت کا وہ ازلی و ابدی پیغام سناتی ہیں جس میں دنیا کے خالق کا وجود اور اس کا نور مضمر ہوتا ہے۔ دیر تک کیرتی اپنی ویران زندگی کو آبشار کی رقصاں پھوار سے سیراب کرتی رہی۔ اب چاروں طرف اندھیرا دبے پاؤں گھاٹیوں کی اوٹ میں سے نکل رہا تھا اور اس میں رچی ہوئی نیند کا لطیف احساس پہاڑی وادیوں کو سلاتا ہوا نیچے پستیوں کی طرف بڑھتا پھیلتا چلا جا رہا تھا جہاں لہلہاتے ہوئے کھیتوں کے کناروں پر لیٹی ہوئی تھکی ماندی زندگی اس کا بے تابی سے انتظار کر رہی تھی۔ سوندھی موندھی خوشبوؤں میں لپٹی ہوئی۔

ڈاک بنگلے کا بوڑھا چوکیدار اس کے قریب آیا۔ ”رات پڑ گئی میم صاب! جنگلی جناوروں کا ڈر ہو جائے گا۔ اب چلیے بنگلے میں۔“

کیرتی نے دھندلی مٹیالی روشنی میں چوکیدار کا چہرہ دیکھا جس کی بوڑھی جھریوں میں دنیا جہان کا پیار اور خلوص اُبھر پھسل رہا تھا۔ پاؤں میں چمڑے کا نوک دار دیسی جوتا' تنگ پاجامہ' دھاری دار کھدر کی موٹی میلی قمیص اور سر پر گلناری رنگ کا صافہ۔ موٹی موٹی آنکھیں اور موٹے موٹے خدوخال۔ پہلے زمانے میں جیسے راجپوت سپاہی ہوا کرتے تھے ویسے ہی مڑی ہوئی سیاہ چمک دار مونچھیں' جن میں شجاعت اور سپاہیانہ عظمت کی جھلک نمایاں تھی۔ چوکیدار راجپوت تھا۔ اس کی برادری کے بیش تر افراد فوج میں ملازم تھے یا فوج سے پنشن یافتہ۔ اس نے بھی جوانی میں بھرتی ہونے کا ارادہ کیا تھا لیکن حالات نے یاوری نہ کی۔ وہ صرف چوکیدار ہی بن گیا۔ کیرتی اسے دیکھتی رہی۔ اس کی نگاہوں کے سامنے کتھا کہانیوں کے ان بہادر راجپوت سپاہیوں کی تصویر گھوم گئی جو اپنے ملک' اپنی قوم' اپنی عورتوں کی عصمت و عزت کی خاطر اپنی جان پر کھیل جاتے تھے۔ چوکیدار خاموش کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ سپاہیانہ انداز سے' کسی حکم کا منتظر۔

کیرتی نے پوچھا۔ ”چوکیدار تم ہی ہو؟“

اس نے پہاڑی لہجے میں جواب دیا۔ ”ہاں جی! میں ہی ہوں۔“

”تمہارا نام کیا ہے؟“

”اصل نام تو میرا جی چوہدری کرم سنگھ رسیال ہے' لیکن جانتے ہیں سب مجھے کرما کے نام سے ہی۔ میرے پتا چوہدری دھرم سنگھ جنگی میں صوبیدار میجر تھے۔ مجھے تو سال گھٹ ہی ہے۔ تنا جرور ہے' چنگے بھلے جوان تھے۔ کوٹ مارشل ہو گیا تھا ان کا۔“

کیرتی نے حیران ہو کر پوچھا۔ ”کورٹ مارشل کیوں ہوا؟“

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

”میم صاب! بڑی لمبی کہانی ہے پھر کبھی سناؤں گا۔“

کیرتی اس پگڈنڈی کی طرف چل دی جو ڈاک بنگلے کی طرف جاتی تھی۔ کرما جلدی وہاں پہنچنا چاہتا تھا۔

کھانا کھا کر کیرتی نے چوکیدار کو اپنے پاس بٹھا لیا۔

”تم نے سارا جیون اسی پہاڑ پر گزار دیا؟“

کرما نے چلم پھونکتے ہوئے جواب دیا۔ ”ہاں جی۔ ساری زندگی اسی پہاڑ پر گزار دی۔ اپنے دل کی باتیں اب اگلے جنم میں ہی پوری کروں گا۔“

”چوکیداری کب سے کر رہے ہو۔“

”جس دن سے سرت سماپلی ہے۔ بڑے بڑے لوگ دیکھے۔ لاٹ صاب' جنگی کے افسر' بڑے بڑے جنٹلمین بابو' ریاست میں اب تیسرا تلک ہو رہا ہے۔ راج بدل گئے' لوگ بدل گئے۔ پہلا سا پریم بھاؤ اور آدر ستکار نہیں رہے۔ چنگے لوگ گجر گئے اب میرا نمبر ہے۔ گنتری کے ساتھی سمبندھی رہ گئے ہیں۔ وہ بھی باری باری آؤ جائیں گے چڑیاں دا جھر مر ہے سب نے ہی چلے جانا ہے۔“

وہ اداس ہو گیا۔

”چڑیں دا جھر مر بابلا۔ سب نے اڈ جانا۔“ کرما زیرِ لب گنگنانے لگا۔ (چڑیوں کا یہ وقتی شور ہے' آخر سب نے اڑ جانا ہے)

کیرتی اسے دیکھتی رہی جیسے اپنی زندگی کا جو حسین ترین پاکیزہ دور اس نے دیکھا تھا' وہ اس کی نگاہوں کے سامنے دوبارہ گھوم گیا جو بعد ازاں بھیانک کھیل ان پہاڑوں پر دیکھے تھے وہ اس کے سامنے دوبارہ جاگ اٹھے۔ وہ اپنی کسی پرانی دنیا کی یادوں میں کھو گیا' جیسے ان لوگوں سے مل گیا جو اس سے بچھڑ گئے تھے۔ کرما کو اُداس دیکھ کر کیرتی نے بات بدل دی۔

”چوکیدار! یہ ڈاک بنگلہ اتنی اونچائی پر ہے اور وہ بھی جنگل کے بیچ۔ عام طور پر تو سرکاری ڈاک بنگلے سڑکوں کے آس پاس ہی ہوتے ہیں' شاید اسی لیے یہاں لوگ کم آتے ہیں۔“

کرما نے زور زور سے گردن ہلائی۔ ”یہ بنگلہ سرکاری تھوڑا ہی ہے۔ ایک انگریز صاب کا ہے۔ ڈوور صاب کا۔ جرنیلی سڑک اور پکا پل اسی نے بنوایا تھا دس بارہ برس کا تھا' اس کی حاضری میں رہنے لگا۔ یہ بنگلہ اس نے کوئی سات مہینوں میں بنوایا تھا اور پھر سرکار کے نام لکھت لکھ دی۔ بڑے بڑے اہل کار اور شکاری بھی پہلے آتے جاتے تھے۔ اب بدلا ہی کوئی آتا ہے۔“

”جگہ تو سندر ہے۔ سڑک سے دور ہے اسی لیے۔“

اس نے کھانستے ہوئے نفی میں گردن ہلائی۔ کرتہ کی جیب سے تمباکو کی ایک میلی کچیلی تھیلی نکالی۔ چلم تیار کر کے ایک چھوٹے سے میلے چیتھڑے کو پانی میں بھگو کر چلم کے گرد لپیٹا اور پھر چھوٹے چھوٹے کش لے کر چلم پینے لگا۔

کیرتی اسے بہ غور دیکھتی رہی۔ وہ چلم پیتا رہا لیکن کیرتی کے سوال کا جواب نہ دیا' جیسے وہ چلم کے کش لے لے کر سوچنا چاہتا ہو کہ سوال کا جواب دیا جائے یا نہیں۔ اس کی چپ نے کیرتی کو اُکسایا۔ وہ اپنے سوال کا جواب چاہتی تھی۔ اس نے دوبارہ پوچھا۔

کرما نے ایک لمبا کش لیا اور دیر تک منہ اور ناک سے ایک ساتھ دھواں نکالتا رہا۔ ”بات یہ نہیں۔ لوگوں کو وہم ہو گیا ہے کہ اس بنگلے میں ڈوور صاب کی روح پھرتی ہے۔“

کیرتی کے سارے جسم میں جھرجھری سی دوڑ گئی۔

”تمہارا مطلب ہے بھوت.....“

وہ ہنس پڑا۔ ”دھرم کی بات ہے۔ میں نے کچھ نہیں دیکھا۔ سنی سنائی بات کر رہا ہوں۔ جب صاب کا کام پورا ہو گیا تو وہ اسی بنگلے میں رہنے لگا۔ نکی نکی لو میں ہی جاگ پڑتا تھا اور اس پسارے میں بیٹھ کر تصویریں بناتا رہتا۔ ایک تصویر تو کوئی مہینہ بھر بناتا رہا۔“

”کیسی تصویر تھی وہ.....؟“

”ہونا کیا تھا جی۔ تصویر تو بنا ڈالیں لیکن خود نہ رہا۔“

”اسے کیا ہوا؟“ کیرتی نے پھٹی پھٹی سی آنکھوں سے

اسے دیکھا۔ بوڑھا کرما اب کسی الف لیلوی داستان کا جادوگر دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے چہرے کی جھریوں نے اب خوف ناک شکل اختیار کرلی تھی۔ کرما نے چلم پھونکتے ہوئے گمبھیر سُر میں جواب دیا۔ ”مجھے پتا تھا‘ میم صاحب میری باتوں سے خوف کھا جائیں گی۔ وہی ہوا‘ مگر آپ کو سب کچھ بتا دینا چاہتا ہوں تاکہ ڈر کر آپ چلی نہ جائیں۔ لوگ تو کبھی کبھی آتے ضرور ہیں لیکن جلدی چلے جاتے ہیں اور میرا من بڑا دکھی ہوتا ہے۔“

کیرتی کی قدرے ڈھارس بندھی۔ وہ حقیقت جاننا چاہتی تھی کیونکہ اس نے ڈاک بنگلے میں ٹھہرنے کا ارادہ کرلیا تھا۔ اس نے کہا۔ ”تم گھبراؤ نہیں چوکیدار! مجھے ایسی کہانیاں پسند ہیں تم نے اچھا کیا مجھے بتا دیا ورنہ میں بھی وہم میں پڑ جاتی۔“

کرما نے اپنی بات جاری رکھی۔ ”صاب وہ تصویر بناتا رہا۔ بڑا خوش رہا۔ جب بن گئی ایک دم اداس ہوگیا۔ اتنا سیانا تو میں تھا نہیں۔ اَن پڑھ ڈنگر ہی تھا لیکن اس کی بدلی ہوئی شکل دیکھ کر ایک روز جوں توں کرکے پوچھ ڈالا۔ صاب تم اداس کیوں رہتا ہے۔ پہلے تو بڑا خوش خوش تھا۔ گھر کی یاد آتی ہے تو ٹہر ٹور کو کیوں نہیں بلوالیتا۔ بڑا حیران ہوکر مجھ کو دیکھنے لگا پھر مسکایا۔

”کرما! کسی سے بولنا مت۔ میری گھر والی مجھے چھوڑ کر چلی گئی۔“ وہ زور زور سے ہنسنے لگا۔ ہنستے ہنستے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ میں بھی ساتھ گیا۔ وہاں اس نے بہت سے روپے اُچھال اُچھال کر میری گود میں ڈالے اور پھر اپنے کمرے کو بند کرکے انگریزی وائلن بجانے لگا۔ سونے سے پہلے وہ ہر روز وائلن بجاتا تھا اور اسی رات اس نے سنکھیا کھا کر خودکشی کرلی۔ پورن ماشی تھی اس دن۔ سُرگ میں گیا۔ ایک چٹھی لکھ کر چھوڑ گیا۔ ایک کتاب بھی انگریزی میں بنا رہا تھا۔ مجھے تو اب بھی پتا نہیں وہ سب کیا تھا؟ پولیس لاش کے ساتھ ہی سب کچھ لے گئی۔ مجھے تو صرف ان بیس روپوں کا پتا ہے‘ جو ہر مہینے مجھے ملتے ہیں۔

شہر کے کسی بینک سے اور وہاں کا ہی آدمی ہر سیزن میں بنگلے کی مرمت کروا جاتا ہے۔“

کیرتی نے رک رک کر پوچھا۔ ”اس کے بعد یہاں کوئی نہیں آیا؟“

کرما نے کھانستے ہوئے اسی انداز میں جواب دیا۔ ”ڈوور صاحب کے گجر جانے کے بعد بھی لوگ آتے جاتے رہے۔ رنگڑ گڑھی کی یہ سامنے والی رکھ شکار کے لیے بڑی مشہور ہے لیکن ایک دو دن ہی ٹھہرتے ہیں۔ چار پانچ برسوں سے برلا ہی کوئی آتا ہے۔“

”صرف اس وجہ سے کہ ڈاک بنگلے میں ڈوور صاحب نے آتم ہتیا کی تھی یا کوئی دوسرا کارن ہے؟“

”میم صاب! گاؤں والوں کو تو کوئی کام دھندہ ہوتا نہیں۔ بس کہانیاں گھڑتے رہتے ہیں۔ اب یہ کہانی گھڑ ماری ہے کہ چاندنی راتوں کو بنگلے میں انگریزی وائلن بجتی ہے اور کوئی جنانی رات بھر ہنستی رہتی ہے اور وہ جنانی ”موراں“ ہے۔“

کیرتی کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ ”موراں کون.....؟“

آیا دوسرے کمرے میں سامان سنبھال رہی تھی۔ کیرتی نے اسے آواز دی جیسے وہ کرما کی باتوں سے ڈرنے لگی تھی۔

کرما نے چلم میلے چیتھڑے میں لپیٹ کر ایک طرف رکھ دی۔

”برہمنی تھی موراں! نئی پور کے میلے میں اس نے بھی کچھ کھا لیا تھا۔ گاؤں والے کہتے ہیں موراں اور صاب میں پریم ہوگیا تھا۔ جھوٹ سچ بھگوان ہی جانتا ہے۔ صاب نے تو کبھی میرے ساتھ ایسی ویسی بات نہیں چلائی۔“

”صاحب نے تصویر وہی ایک بنائی تھی؟“

”نہیں جی۔ اس کا دھندہ ہی تصویریں بنانا تھا۔ کبھی سڑکوں کی تصویریں‘ کبھی پلوں کی تصویریں‘ جو مجبور کام کرتے تھے ان کی تصویریں۔ جنانہ بھی بناتا تھا‘ مردانہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ی۔ کچھ تو پولیس لے گئی کچھ اب بھی اس کے کمرے میں ی ہوئی ہیں۔ یہ ساتھ کا کمرا ہے۔ میں نے بند کر رکھا ے۔ سویرے آپ کو دکھاؤں گا۔“

”موراں کی تصویر بھی بنائی تھی صاحب نے؟“

”کوئی تصویر بھی اس کی شکل سے نہیں ملتی۔ کسی میں بھی م جنانہ منہ نہیں ہے لیکن لوگ کہتے ہیں سب جنانہ ویریں موراں کی ہیں۔“

”بہت سندر تھی وہ.....؟“

کرما نے بڑی متانت سے جواب دیا۔ ”بڑی سندر اور ں تھی۔ یتیم تھی۔ محنت مجوری کرکے روٹی کپڑا چلاتی ۔ عجیب سا سبھاؤ تھا۔ بچہ بچہ اسے جانتا تھا۔ کوئی میلہ کسی کے گھر بیاہ کا رج ہوتا وہ جا پہنچتی۔ سادھوں پر ر دیے جلاتی‘ بڑی رونق تھی اس کی۔ اب وہ زمانہ ں؟“

”عمر کیا تھی اس کی.....؟“

”آپ کی عمر کی تھی۔ بیس سے کم کی ہوگی۔“

”اور ڈوور صاحب کی عمر.....؟“

”گبھرو جوان تھا‘ مگر دھرماتما سروپ۔ یہاں وہ تین برس رہا ہوگا۔ ہمارے ساتھ گھل مل گیا تھا۔ کبھی کبھی ے کپڑے پہنتا۔ بیاہ کار جوں میں شامل ہوتا۔ اسے ی گیت سننے کا بھی شوق تھا۔ صاب لوگ بڑے دیکھے ں نے‘ لیکن ویسا صاب پھر نظر نہیں آیا۔“

کیرتی سحر زدہ ہستی کی طرح اس کی باتیں سنتی رہی۔ ہر ں گاؤں کی ہر گھاٹی‘ کسی داستانِ پارینہ کا کوئی بکھرا رق ہوتے ہیں۔ وہ جانتی تھی لیکن موراں اور ڈوور ب کی کہانی عجیب سی محبت تھی جو ادھوری بھی تھی اور بھی‘ جس کا کسی کو علم نہ تھا پھر بھی گاؤں کا بچہ بچہ جانتا وہ موراں کا نقش ذہن میں اتارتی رہی۔ دبی زبان چھا۔

تم یہاں اکیلے رہتے ہو؟“

کرما بلند آواز میں ہنسنے لگا۔ اس کا قہقہہ ایک ہی بار گونج کر جنگل کی سرابوں میں ڈوب گیا جیسے اسے کچھ یاد آ گیا ہو‘ جیسے اس کا یہ سوال بھی کسی ایسی ہی دوسری داستان کے ساتھ وابستہ ہو۔ کیرتی کو ڈوور صاحب کی کہانی سے اتنا خوف محسوس نہیں ہوا جتنا کرما کے وحشی قہقہے سے۔ جب وقتی ارتعاش مٹ گیا تو کرما نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔

”ایک جانگلی ہے۔ لاریوں کے اڈے پر کام کرتا ہے۔ چند دمڑے کما لیتا ہے۔ آپ کا سامان لے کر نہیں آیا۔ شاید کہیں گیا ہوگا۔“

”تمہارا بیٹا ہے؟“

کرما خاموش ہوگیا جیسے جواب دینے سے پہلے سوچنا چاہتا ہو۔ قدرے توقف کے بعد شرماتے ہوئے کہا۔

”ہاں بیٹا ہی ہے۔“

”یہاں کبھی نہیں آتا؟“

”یہاں کوئی کام دھندہ تو ہے نہیں۔ بے کار بیٹھ کر کیا کھائے گا؟“

”اسے کہہ دو جب تک ہم یہاں ہیں چلا آئے۔ جتنی مزدوری اڈے پر مل جاتی ہے اتنی ہی ہم دے دیں گے اور پھر ہمیں گھومنے ہی میں آرام رہے گا۔“

”کہہ دوں گا میم صاب! لیکن ڈنگر ہے جو منہ میں آتا ہے بک دیتا ہے۔“

کیرتی نے اس کی جھریوں پر نظر جماتے ہوئے کہا۔ ”دیکھو چوکیدار مجھے میم صاحب نہ کہا کرو۔ میں تو تمہاری بیٹی جیسی ہوں۔“

بوڑھے کرما کی آنکھیں وفورِ محبت سے چمک اٹھیں۔ آیا بھی آ گئی۔ چھوٹتے ہی کہا۔ ”اب سو جاؤ۔ دن بھر کی تھکاوٹ دور ہو جائے گی۔“

کیرتی نے اپنی کہی۔ ”چوکیدار کا ایک بیٹا بھی ہے۔ چھوٹا موٹا کام کر دیا کرے گا۔ میں نے چوکیدار سے کہہ دیا کہ اسے بلا لے۔“

آیا جیسے اس اجنبی ماحول سے مایوس ہو چکی تھی۔ جھٹ

جواب دیا۔ ”ان اَن پڑھ لوگوں سے چھوٹا موٹا کیا کام ہوگا۔ نیچے والے ڈاک بنگلے ہی میں چلنا پڑے گا۔ سڑک کے کنارے تو ہے یہاں تو رہنا کٹھن ہو جائے گا۔“

”وہ دیکھ لیں گے۔“ کیرتی نے جواب دیا۔ ”چوکیدار کے بیٹے کو بلوا لیتے ہیں۔ ہرج ہی کیا ہے؟“

آیا خاموش رہی۔

کیرتی نے چوکیدار سے کہا۔ ”میں ڈوور صاحب کی تصویریں دیکھوں گی۔“

چوکیدار نے پوچھا۔ ”ابھی۔“

”ہاں۔“

چوکیدار نے چابیوں کا گچھا نکالا اور ڈوور صاحب کے خاص کمرے کا تالا کھولا۔ لیمپ کی مدہم روشنی میں دیر تک کیرتی کمرے کا جائزہ لیتی رہی۔ وہ اس کہانی کو ڈھونڈتی رہی جس کا تعلق موراں سے تھا لیکن وہاں چند دھندلی پھیکی تصویروں کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔

چوکیدار نے کہا تھا۔ بنگلے میں ڈوور صاحب کی روح پھرتی ہے۔ وائیلن کی دھن پر نسوانی قہقہے سنائی دیتے ہیں لیکن وہاں رات بھر کچھ نہ ہوا حالاں کہ وہ قہقہوں کے اس رقص کو دیکھنا چاہتی تھی۔ وائیلن کی تاروں میں کون سی چیخیں پوشیدہ تھیں، انہیں سننا چاہتی تھی لیکن وہاں سوائے ایک مہیب سناٹے کے کچھ بھی نہ تھا جس میں سے کبھی کبھار ایک سرد خراش چلاہٹ سی نکلتی جیسے جنگل کی ہواؤں کا دم گھٹ گیا ہو اور لیمپ کی روشنی جھپک سی جاتی لیکن یہ حقیقت تھی کہ ڈوور صاحب کی تصویروں میں ایک ہی نقش تھا، صرف انداز اور زاویے مختلف تھے لیکن خیالی دھند میں ملفوف نہ جانے اس دھند کے پیچھے کس قدر کہانیاں تھیں۔ کتنی یادیں تھیں، کتنے گیت تھے۔ مجروح تخیل کی کتنی تلخیاں اور حلاوتیں تھیں۔ کسی تصویر میں بھی چہرہ سالم صاف دکھائی نہ دیتا تھا۔ موراں اور صاحب کی محبت کی داستان کہاں تک سچ تھی اور وہ کیسی محبت تھی؟ کیرتی رات بھر سوچتی رہی۔ جب سوئی تو صبح ہونے کو تھی۔

☆

کیرتی کے کہنے پر کرما نے دوسرے دن مادھو کو بلوایا لیکن وہ نہ آیا۔ اس نے کہہ دیا کہ شہری لوگوں کی خدمت میں چوبیس گھنٹے حاضری نہیں دے سکتا اور پھر وہ پانچ دن کے لیے اپنے دوست کی شادی پر کسی دوسرے گاؤں جا رہا ہے۔

کیرتی کو رنگڑ گڑھی کی ہوا راس نہ آئی۔ پانچ چھ دن میں اس کی حالت دگرگوں ہوگئی۔ ہلکا ہلکا سا بخار رہنے لگا۔ وہاں علاج کا بھی انتظام نہ تھا۔ آیا گھبرائی۔ کیرتی کا بخار بڑھتا چلا جا رہا تھا جیسے آخری دموں پر ہو۔ چوکیدار بھاگ دوڑ کرتا رہا لیکن کوئی افاقہ نہ ہوا۔ اس کی صحت بگڑتی گئی۔ آیا نے گھر والوں کو اطلاع دینے کی کوشش کی لیکن اس نے منع کر دیا۔ اب وہ اپنی پریشانیوں میں دوسروں کو شریک نہ کرنا چاہتی تھی۔ چوکیدار نے مادھو کو دوبارہ بھیجا۔ اب کی بار یہ بہانہ کر کے کہ وہ خود علیل ہے نہ آ سکا۔

وہ رات بہت ہی لرزہ خیز تھی۔ بارش اور طوفان جنگل کی راتیں ویسے بھی بڑی ہول ناک ہوتی ہیں اسے اس طرح چیختے چنگھاڑتے پہلی بار کرما نے تھا۔ ایک بھیانک خوف کے زیر اثر وہ رات بھر پلک جھپک سکا۔ اٹھ اٹھ کر کیرتی کو دیکھتا۔ اس کی ڈھ بند ہوتا۔ کرما کو آج مادھو کا شدید انتظار تھا۔ شاید موت پر بھی اس کا اتنا انتظار نہ کرتا۔ کیرتی کو اس بیٹی کا پیار دیا تھا۔ وہ اس پیار کو قائم رکھنا چاہتا تھا جب آیا رات آدھی سے زیادہ بھیگ چکی تھی۔ کرما کو جگایا جو کیرتی کی زندگی کی منتیں مانگتے اونگھ

”کیا ہوا باپو.....؟“

”میں تو بھلا چنگا ہوں۔“ کرما نے جواب دیا۔ لڑکی بہت بیمار ہے، جو شہر سے آئی ہوئی ہے۔ بس سانس اٹکے ہوئے ہیں۔ پارگاؤں کا ڈاگدار آ جاتا ہی ہوتا، مگر نالے میں تین چار دن سے باڑ آیا ہو میری تو ہمت نہیں پڑتی۔“

مادھو جھنجلایا۔ ”فضول مجھے برکھا اور جھگڑ میں خراب کیا۔ کوئی نئی بات ہے۔ پہاڑ پر جو بھی کوئی آیا صحت بنانے یا گنوانے آیا۔ تو دوسروں کی بلا اپنے سر نہ لیا کر۔“

کرما کی آنکھوں سے آنسو پھوٹ پڑے۔ ”چلا جا یہاں سے اب کبھی مجھے منہ نہ دکھانا۔“

اسے روتے دیکھ کر مادھو پگھل گیا۔ وہ اس سے بہت محبت کرتا تھا۔ اسی کے لیے محنت مشقت کرتا تھا۔ اس سے دور بھی نہ رہنا چاہتا تھا حالاں کہ مادھو کے سارے ساتھی فوج میں بھرتی ہو چکے تھے۔ وہ چاہتا تو بہ آسانی فوج میں ملازم ہو سکتا تھا۔ وہ جوان تھا۔ تھوڑا بہت پڑھا لکھا بھی تھا لیکن اس کی اپنی زندگی اپنے باپو کے لیے وقف تھی۔ اس کے احسانوں کا پورا پورا احساس تھا۔ اسے روتے دیکھ کر ساری تکان بھول گیا۔ ہم دردانہ لہجے میں پوچھا۔

”کہاں ہے وہ.....؟“

”ہال کمرے میں۔“

”دیکھ آؤں اُسے.....؟“

”میں بھی ساتھ چلتا ہوں۔ اچھا ہوا آنکھ لگ گئی ہو۔“

کرما اسے ساتھ لے کر کیرتی کے کمرے میں گیا۔ وہ بھی تک سو نہ سکی تھی۔

کرما نے اس کے قریب جا کر کہا۔ ”آ گیا ہے مادھو! ابھی ابھی پہنچا ہے۔ برکھا کے کارن رک گیا تھا۔ لے آؤں اسے اندر.....؟“

کیرتی نے اپنی گردن کو ہلکی سی جنبش دی۔

مادھو نے ڈرتے جھجکتے کمرے میں قدم رکھا۔ نہایت سلیقے سے جھک کر سلام کیا۔ لیمپ کی روشنی ہوا کے جھونکے سے تیز ہوگئی۔ جھکی جھکی سی نظروں سے ایک بار کیرتی کے بجھے ہوئے چہرے کو دیکھا جس پر مسکراہٹ تھی نہ زندگی کی کوئی زندہ رمق صرف برف کی سی سفیدی تھی اور پت جھڑ کی سی ویرانی، جو اس کی آنکھوں سے اُمڈ اُمڈ کر چہرے پر پھیلتی جا رہی تھی۔ مادھو کی آنکھیں اسے زیادہ دیر نہ دیکھ سکیں لیکن کیرتی اسے بہ غور دیکھتی رہی۔ مادھو کے چہرے پر شگفتگی اور جوانی تھی۔ موٹی موٹی آنکھیں، جن کے دیکھنے کے انداز میں ایک مقناطیسی کشش تھی لیکن پہاڑوں کی طرح وہ خود جیسے اس کشش سے بے خبر تھا جیسے اسے اپنی خوب صورتی اور جاذبیت اور شگفتہ جوانی کا احساس نہ تھا۔ وہ خاموش دیوار سے لگا کھڑا تھا اور کرما اس کے بارے میں باتیں کر رہا تھا اور کیرتی اسے قریب سے دیکھ رہی تھی۔ اس کی سانسوں کے زیر و بم کا جائزہ لے رہی تھی جو اس کے لباس کی طرح بھیگا بھیگا سا تھا۔ صرف کھدری موٹی سی ایک دھاری دار قمیص، خاکی رنگ کی مٹیالی پتلون، بھیگے ہوئے لمبے بال، ہاتھ میں گہرے سرخ رنگ کی پرانی فوجی ٹوپی تھی جس سے وہ کھیل رہا تھا جسے کبھی سر پر رکھ لیتا، کبھی ہاتھ میں گھمانے لگتا۔ گلے میں الفوزے کی جوڑی لٹک رہی تھی جب وہ اپنی فوجی ٹوپی سے اپنے سر کو کھجانے لگتا تو الفوزے کی جوڑی جیسے جھنجنا اٹھتی۔ نہایت ہی خوب صورت گہری نیلی آنکھیں، بارش سے دھلے ہوئے چہرے کے حسین خدوخال، جاگیردارانہ ماحول کی آوارگی لیے ہوئے اور ڈرتے جھجکتے مسکرا دینے کا وہی معصوم انداز، بالکل سروپ کی طرح..... کیرتی کے تصور میں سروپ کا ایک دھندلا سا نقش اُبھر آیا، پھر نقش گنگنانے لگا۔ ”زندگی تاریک تھی اپنی تاریک رہی“ اور لیمپ کی روشنی مدہم پڑنے لگی۔ پھر وہ نقش مادھو میں منتقل ہوگیا..... مادھو آنکھیں جھکائے کھڑا تھا اور کرما فرش پر ہی بیٹھ گیا تھا اور آیا کیرتی کی چارپائی کے ساتھ لگی سو گئی تھی۔

کیرتی نے مسکرانے کی کوشش کی۔ ”تو یہ ہے جانگلی!“

مادھو نے قہر آلود نگاہوں سے کرما کو دیکھا۔ کمرے میں کھڑے کھڑے اسے گرمی کا جو احساس ہوا تھا وہ کافور ہوگیا۔ اس نے بڑی اونچی آواز میں کہا۔ ”میرا نام مادھو سنگھ ہے۔“

”اور چوکیدار جو تمہارا نام.....“

مادھو نے اسی لہجے میں بات کاٹ دی۔ ”باپو مجھے پیار

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے کہتا ہے جانگلی۔ مجھے سب مادھو نام سے پکارتے ہیں۔"

"تمہیں بلوایا تھا تم نہیں آئے۔"

"میرے دوست کا بیاہ تھا۔ آپ بیمار ہیں مجھے معلوم نہ تھا۔"

"ایسی کوئی بات نہیں۔ یہ لوگ یوں ہی گھبرا گئے۔ مجھے رات کو نیند نہیں آتی' شاید اسی وجہ سے حرارت سی ہو جاتی ہے ورنہ....."

مادھو گنواروں کی طرح ہنس پڑا۔ "یہ بھی کوئی روگ ہے۔ ایک دو دن میں آپ بالکل ٹھیک ہو جائیں گی۔ باپو تو ایسے ہی گھبرا جاتا ہے۔ عادت ہے اس کی۔"

کیرتی نے پوچھا۔ "پھر روگ کیا ہوتا ہے؟"

اس نے اونچی آواز میں جواب دیا۔ "یہ تو نہیں بتا سکتا لیکن روگی میں نے دیکھے ہیں۔ آپ کی شکل تو ان جیسی نہیں۔ بیماری کا کوئی نشان نہیں۔ شانت چہرہ ہے۔ روگ تو صورت بگاڑ دیتا ہے۔"

کرما آنکھیں موندے بیٹھا تھا۔ کڑک کر بولا۔ "لاریوں کا اڈہ نہیں ہے۔ ذرا آہستہ آواز میں گل کر۔ بات کرنے کی بھی تمیز نہیں۔ جانگلی کا جانگلی ہی رہا۔"

مادھو نے آگ بگولا ہو کر کہا۔ "باپو! تو ایک دن مان جائے گا جانگلی جو بات کرتا ہے کھری کرتا ہے۔"

کرما نے کمرے سے باہر آتے ہوئے کہا۔ "آپ امان کریں نیند آ جائے تو اچھا ہے۔ اس کی باتیں ایسی ہی ہیں۔ بنا سوچے سمجھے بک دیتا ہے۔"

مادھو اس سے پہلے سے کمرے سے نکل گیا۔

کیرتی کے پژمردہ ہونٹوں پر ایک اجیالی سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ دیر تک وہ جانگلی کے متعلق سوچتی رہی جسے چوکیدار نے اپنا بیٹا بتایا تھا لیکن جس کے خدوخال اور انداز گفتگو پہاڑی ہوتے ہوئے بھی پہاڑی نہ تھے..... اور باہر مادھو اپنے باپو سے جھگڑ رہا تھا کہ وہ غیروں کے سامنے اسے ذلیل کرتا ہے۔ جانگلی اور اجڈ گنوار بتاتا ہے اور باہر

بارش نے شدت اختیار کر لی تھی اور ہوائیں چیختی ہو ڈاک بنگلے کے گرد چکر کاٹ رہی تھیں۔ نازک لطیف ہوائیں بھی اس قدر جسیم اور مہیب ہو سکتی ہیں' کیرتی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ ان میں ڈوور صاحب کی روح بھی رقصاں تھی اور موراں کے قہقہوں کے گھنگھرو بھی' چیڑ کے نوکیلے جھومروں سے چھو کر اپنی جھنجناہٹ کا تھرکتی ہوئی بوندوں میں جذب کر رہے تھے اور وائلن کی ہلکی دھن ان طوفانی چیخوں میں سے نکل کر اس کے قریب ہوتی جا رہی تھی۔ اس کے تصور میں کسی کی باتوں کی چھن چھن ارتعاش پیدا کر رہی تھی اور دل کی دھڑکنوں میں بسی کئی تصویروں کے ٹیڑے میڑھے منحنی سے نقوش ہلکے پھیکے رنگوں میں الجھے ہوئے خود بہ خود نکھر رہے تھے۔ انہی جانی پرور خیالوں میں گم ہو گئی۔ نہ جانے آج ایک مدت کے بعد کس نے اسے میٹھی لوری دے کر سلایا تھا۔

☆

دوسرے دن صبح سویرے ہی کیرتی نے مادھو کو بلایا لیکن وہ وہاں نہ تھا۔ وہ کرما سے بغیر کچھ کہے سنے ہی کہیں چلا گیا تھا۔ اس کے ساتھ چند لمحے گزار کر کیرتی کو ایک عجیب آسودگی اور تازگی ملی تھی' ویسے ہی جیسے اپنی تصویروں کو دیکھ کر اسے گونا گوں راحت ملتی تھی۔ کیرتی یہ دیکھنے کی متمنی تھی کہ گنوار قسم کے اکھڑ جانگلی میں جو انسان چھپا ہے اس انسان سے کہاں تک مختلف ہے جو اپنے آپ کو مہذب کہلانے میں فخر محسوس کرتا ہے۔ مادھو کی شکل و صورت اور اس کی باتیں کرنے کا انداز یہ شک پیدا کرتا تھا کہ وہ چوکیدار کا بیٹا نہیں۔ وہ اس ماحول کا پروردہ ضرور ہے لیکن رگوں میں اس ماحول کا خون نہیں۔

جب وہ دوپہر تک بھی نہ لوٹا تو کیرتی نے کرما سے پوچھا۔

"تمہیں بتا کر نہیں گیا؟"

"کرما نے خفیف ہو کر جواب دیا۔" نکی نکی لو میں اٹھ کر چلا گیا۔ مجھے تو پتا ہی نہیں چلا۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''تمہیں تو بتا کر جاتا۔''

''اتنا سیانا ہوتا تو پھر کیا کمی تھی۔''

کیرتی کا اشتیاق بڑھتا گیا۔ ''کہاں گیا ہوگا۔ اڈے پر تو نہیں لوٹ گیا؟''

اتنے میں باہر مادھو کی آواز آئی۔ کرما باہر نکلا۔

اس نے درشت لہجے میں پوچھا۔ ''کہاں چلا گیا تھا؟''

مادھو نے اپنی کہی۔ ''میم صاحب کیسی ہیں باپو! اچھی ہیں نا؟ یہ لوتا کھ۔ سیب اور سبزی دودھ کے لیے مٹھو کو کہہ آیا ہوں۔ ڈاکٹر علم دین کو بھی فیس دے آیا ہوں۔ آج نالے میں بڑا زور ہے لیکن پانی اتر رہا ہے۔ شام کو جا کر ساتھ لے آؤں گا۔''

کرما کا سارا غصہ اتر گیا۔ اس کی باتیں سنتا رہا۔ کرما کا خیال تھا کہ دوبارہ اڈے پر چلا گیا لیکن وہ کیرتی کے لیے دوسرے گاؤں کا بھی چکر کاٹ آیا تھا۔ ایک نیا مادھو اس کے سامنے تھا۔ دیر تک اسے دیکھتا رہا جیسے کچھ کھو دیا ہو۔

کرما کو گم صم کھڑے دیکھ کر مادھو نے گھبرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔ ''باپو! چپ چپ ہو۔ کیا بات ہے؟ وہ میم صاحب......''

وہ اپنا فقرہ پورا نہ کر سکا۔ غیر اختیاری طور پر ڈاک بنگلے کے ہال کمرے کی طرف لپکا جہاں رات کو کیرتی سے ملا تھا۔ وہ آرام کرسی پر بیٹھی کھڑکی میں سے بادلوں کو اونچے اونچے درختوں پر جھکے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

''میم صاحب!'' کمرے میں داخل ہوتے ہی مادھو کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

کیرتی نے حیران ہو کر پوچھا۔ ''کیا ہوا؟''

وہ کھسیانا سا ہو گیا۔ سارے جسم سے پسینہ چھوٹنے لگا۔ گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''باپو کو گم چپ دیکھ کر گھبرا گیا سوچا......''

اس نے فوجی ٹوپی کو سر پر زور سے پٹکا اور باہر نکل گیا۔

آیا نے بتایا کہ مادھو فروٹ اور سبزیاں لے آیا ہے لیکن کیرتی نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ خاموش رہی۔ صبح کا مادھو رات سے بھی مختلف تھا۔ ایک نیا ہی انسان تھا جس کا تصور خیالی دنیا میں تو ابھارا جا سکتا ہے لیکن حقیقی دنیا میں اسے زندہ نہیں کیا جا سکتا۔

آیا نے پوچھا۔ ''تم سے پیسے لے گیا تھا؟''

کیرتی نے جواب دیا۔ ''چوکیدار سے لے گیا ہوگا۔''

مادھو باہر کھڑا ان کی باتیں سن رہا تھا۔ وہیں سے چلا[illegible] ''سب کچھ ادھار لایا ہوں۔ پہلی کو سارا حساب چکا دیں گے۔ غریب آدمی ہے اگر بیچ میں ضرورت پڑی تو ما[illegible] آئے گا۔ دے دینا۔''

کیرتی نے بھی اپنے کمرے سے ہی جواب دیا۔ ''حساب خود ہی رکھنا۔ کچھ پیسے اپنے پاس رکھ لو جیسے دے[illegible] ہوں گے دیتے رہنا۔''

مادھو نے کرما کے کان میں کہا۔ ''ہم حساب رکھتے با[illegible] ایک رتبے کے مالک نہ ہوتے۔ میم صاحب بڑی بھ[illegible] ہے۔ بگڑی اسامی ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے؟''

کرما نے جواب دیا۔ ''ٹھیک ہے۔ خاندانی آ[illegible] ہیں۔ ساکھشات دیوی! معلوم ہے تمہیں صبح کیا ہے؟''

مادھو نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''کیا ہے......؟''

کرما کا چہرہ کھل اٹھا۔ ''میم صاب نہ کہا کرو۔ تمہاری بیٹی جیسی ہوں۔''

مادھو نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہیں۔ ''باپو! بڑے سے جو بھی آیا دھن وان ہی آیا۔ ترس کھا کر ہمیں کچھ د[illegible] گیا اور ہم گود پھیلا پھیلا کر منگتوں کی طرح مانگتے رہے۔ کوئی ایسی گھڑی ہماری جندگی میں بھی آئے گی کہ ہم سے کوئی کچھ مانگے اور ہم بھی اس کی مدد کریں۔ گود بھر کر بانٹیں اور کوئی اتنا سمیٹے کہ اس کا من پرسن ہو جا[illegible] ہم تو بخششیں منہ سے مانگتے ہیں۔ کوئی صرف آنکھ سے ہی کچھ کہہ دے۔ اپنا گھر بار لٹی پٹی اس پر وار [illegible] باپو! کیوں ایسی گھڑی نہیں آئے گی کبھی......؟''

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کرما نے چلم پھونکتے ہوئے کہا۔ ''چھوڑو یار! یہ پادریوں کی سی باتیں۔ صبح سے گھونٹ پانی کا نہیں پیا۔ ان کی روٹی پتا نہیں کب بنے؟ تو دو روٹیاں لگا دے۔''

مادھو کے سارے سپنے ہی جیسے ٹوٹ گئے۔ جھنجلا کر بولا۔

''کبھی ہونے جینے کی باتیں بھی کرنے دیا کر۔ مجھے دیکھتے ہی تجھے چلم اور روٹی کا خیال آ جاتا ہے۔ رات کی گیلی لکڑیاں ہیں۔ آگ سلگاتے ہی شام ہو جائے گی۔ میں نے اسی لیے ڈاک بنگلہ چھوڑا ہے۔ مجھے یہ عورتوں کے کام اچھے نہیں لگتے۔''

کرما نے چٹکی لی۔ ''تو پھر کر لے بیاہ......''

مادھو سٹپٹایا۔ ''کر لوں گا جب ہمت ہوگی۔ تو اپنی روپیوں کی گٹھڑی سنبھال کر رکھ۔ ہوا نہ لگ جائے اسے۔''

اسے بگڑتا دیکھ کر وہ چلم پھونکتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ مادھو دیر تک وہیں کھڑا بڑبڑاتا رہا۔

دوپہر کا کھانا سب نے اکٹھے کھایا۔ کیرتی نے بھی ان کا ساتھ دیا حالاں کہ اسے بھوک نہ تھی۔ پھر بھی سب کے ساتھ بیٹھ کر اسے صحت مندانہ بالیدگی کا احساس ہوا۔ چھوٹے چھوٹے لقمے حلق سے نیچے اتارتی رہی۔

مادھو نے بات شروع کی۔ ''پار گاؤں کا ڈاکٹر علم دین شام کو آئے گا۔ بڑا سیانا ہے۔ شکل دیکھ کر ہی روگ بتا دیتا ہے۔ ہاتھ میں بھی بڑی شفا ہے۔ جو تکلیف ہے اسے صاف صاف بتا دیں۔ دوائی میں لے آیا کروں گا۔''

کیرتی نے کہا۔ ''چوکیدار کہتا ہے چھ سات میل دور ہے پار گاؤں اور راستے میں ایک نالہ بھی ہے۔''

''ایک دو بار ہی جانا ہے پھر آپ ٹھیک ہو جائیں گی۔''

کرما نے بھی بات سے بات جوڑی۔ ''جو کچھ کرنے پر آتا ہے اسے کر ہی ڈالتا ہے۔ ندی نالوں کی پروا کم ہی کرتا ہے۔''

مادھو اس سے مخاطب ہوا۔ ''باپو! وہ دھاری دار ریشمی کرتہ کہاں ہے جو تپی پور کے میلے پر سلوایا تھا۔ ہے یا کر دیا ختم؟''

اس نے جواب دیا۔ ''تیری چیز کو میں ہاتھ نہیں لگاتا جہاں رکھا ہوگا وہیں پڑا ہوگا مگر آج ضرورت کیا پڑی ریشمی کرتے کی؟''

مادھو نے بڑی متانت سے جواب دیا۔ ''پار گاؤں جانا ہے کپڑے ذرا اچھے ہی ہونے چاہئیں۔''

''سویرے تو ایسے ہی چلا گیا تھا۔ اب یہ شوقینی کس لیے؟''

''سویرے جلدی میں تھا۔ اب کرنیل صاحب سے بھی ملتا آؤں گا۔''

''ٹھیک ہیں یہ کپڑے۔ پتا نہیں کرتہ کہاں پڑا ہوگا۔ ڈھونڈ رکھوں گا۔ دوسری بار جائے گا تو پہن لینا۔''

''مجھے صندوق کی چابی دے میں نکال لوں گا۔''

''وہ بھی ڈھونڈ رکھوں گا۔ اب جا......''

مادھو جل گیا۔ ''باپو! کبھی کبھی تم......''

بڑھاپا اور جوانی جب ایک جگہ اکٹھے ہو جاتے ہیں تو بچپن کی معصوم ادائیں عود کر آتی ہیں۔ چھیڑ چھاڑ اور نوک جھونک کا جذبہ جاگ اٹھتا ہے جس میں بال پن کے تمام بے فکر لمحے ایک ساتھ سمٹ آتے ہیں۔ کرما اور مادھو بھی معصوم بچوں کی طرح جھگڑ رہے تھے اور کیرتی مادھو کے میلے کچیلے لباس کو دیکھ رہی تھی۔ اس میں بھی ایک انفرادیت جھلک رہی تھی۔ ایک نیا پن، ایک نیا انداز، ایک نیا رنگ تھا جو خالص فطری تھا۔ اس پر کوئی ملمع کاری نہ تھی۔

اپنے خیالوں میں کیرتی نے اسے شہری مہذب خوب صورت لباس پہنا کر اس کی ایک تصویر بنا ڈالی لیکن شہری لباس میں بڑا بھدا لگا۔ اس نے اسے اپنے ازلی فطری رنگ اور ہیئت میں رہنے دیا۔ پہاڑوں پر بھوکے ننگے لیکن خوب صورت لوگ پائے جاتے ہیں۔ کیرتی نے سنا اور دیکھا بھی تھا لیکن پہاڑ مادھو جیسے انسانوں کو بھی جنم دے سکتے ہیں، اس نے آج تک سنا نہ دیکھا تھا۔

اسے کسی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے دیکھ کر مادھو نے

پوچھا۔
"کس سوچ میں ہیں آپ؟"
کیرتی نے جواب دیا۔ "تم سمجھ نہیں سکو گے۔"
"پھر آپ ایسی باتیں سوچتی ہی کیوں ہیں جو دوسرا کوئی سمجھ ہی نہ سکے۔"
"عادت ہے سوچنے کی۔"
"اچھا تو پورے آٹھ دن کے لیے چھوڑ دیں اس عادت کو۔"
"کیوں.....؟"
"جب بھی آپ کسی سوچ میں ہوتی ہیں آپ کی شکل بدل جاتی ہے۔ رنگ بھی پیلا پڑ جاتا ہے۔ دو بار آج دیکھا میں نے اور اڈے کا استاد کہتا ہے جو سوچتا رہتا ہے وہ ہمیشہ روگی رہتا ہے۔"
کیرتی خاموش رہی۔
مادھو اور کرما باہر دھوپ میں بیٹھ گئے۔ مادھو کئی دنوں کے بعد اڈے سے آیا تھا۔ کرما نے کئی کہانیاں سنتی سنائی تھیں۔

☆

مادھو جیسے اپنی دنیا ہی بھول گیا۔ دن رات کیرتی کے آرام و آسائش کے لیے دوڑ بھاگ کرتا رہتا۔ اسے آس پاس کے گاؤں اور وادیوں کی کہانیاں سناتا۔ رومانی کھنڈروں کے بھوتوں کی کہانیاں اور ان کے وہ گیت جو برفانی راتوں کو سنائی دیتے ہیں۔ کیرتی اس کی باتیں بڑی دل چسپی سے سنتی۔ وہ ان قصے کہانیوں کا پس منظر ایسے پراثر انداز سے بیان کرتا جیسے وہ خود ان کا ہیرو ہو اور ہزار ہا سال سے اپنے ماحصل کے لیے سرگرداں ہو..... کیرتی اب روز بہ روز صحت مند ہوتی جا رہی تھی۔ اس کا وہ رنگ اب نکھر رہا تھا جو اس کی اپنی بنائی ہوئی تصویروں میں خلط ملط ہو گیا تھا۔ اسے اب ایسا محسوس ہونے لگا تھا جیسے ایک انوکھی سی خود اعتمادی اور قوت اس میں عود کر آئی ہو اور اس برتی طاقت کے زیر اثر اگر چاہے تو اودی اودی گھٹاؤں کو چیر کر فلک بوس پہاڑوں کی برفانی چوٹیوں کو بھی چھو لے جسارت کر سکتی ہے۔
آیا خوش تھی کہ کیرتی اپنی تخیلی دنیا کو خیرباد کہہ کر زندگی اپنانے کی سعی کر رہی تھی۔ چوکیدار حیران تھا کہ جانگلی میں اتنی تمیز و تہذیب کہاں سے آ گئی کہ جو بات ہے سلیقے سے۔ وہ ٹھہراؤ پہلے تو سرے سے ہی غائب مادھو خوش تھا کہ اس کی وجہ سے ایک پژمردہ بے جان بت میں زندگی حرکت کرنے لگی اور موت کا طالب زندگی کی جستجو میں ہمہ تن مشغول ہو گیا اور کیرتی اپنی تمام حسیات کو یک جا اکٹھا کر کے یہ عقدہ سلجھانے کی کوشش کر رہی تھی کہ اس کی زندگی بخش نورانی مسکراہٹوں کا محرک اس کی زندگی کا پہلا احساس ہے یا اجڈ گنوار مادھو کا بے نفس جذبہ محبت؟"
ایک دن وہ دونوں گھومتے' گھاٹیوں کو اترتے چڑھتے دوران وادیوں میں نکل گئے جو ہرے بھرے کھیتوں سے مزین تھیں۔ وہ وادیاں ان ہی کھیتوں میں سے بل کھاتی ہوئی نکلتی تھیں اور پھر گھاٹیوں اور پگڈنڈیوں کو پھلانگتی ہوئی برف پر سے پھسلتی پہاڑی نالے میں بہہ جاتی تھیں۔ اپنے ساتھ پہاڑی لوگوں کے خواب بھی لے جاتی تھیں اور ان کے کھیتوں کی سنہری بالیوں کا سونا بھی اور پیچھے ایک ویران بھوک رہ جاتی تھی اور بھوک کی کلبلاہٹ گیت بن کر جنگلوں میں گونجا کرتی۔ گھاٹیوں کی سلوٹوں میں پرورش پاتی اور ایک دن قحط میں منتقل ہو جاتی۔ بھوک اپنے پیچھے ایسے تاثرات چھوڑ جاتی جو صدیوں وادیوں کے حسن صبیح پر کوڑھ کے ان گنت داغوں کی طرح چسپاں رہتے۔ وہ باتیں کیرتی کے لیے نئی نہ تھیں۔ اس نے خود بھی ان کے متعلق سوچا تھا۔ اس کے لیے نیا تھا جذبہ جس کے زیر اثر مادھو باتیں کرتا اور اسے ایسا محسوس ہوتا کہ جیسے مادھو ایک سالم وادی ہے وادی کا احساس کمتر کا درد ہے اور اس کا علاج بھی۔ مادھو سوال سے پہلے جواب دینے کا عادی تھا جس طرح بات سنی ہو من و

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بیان کرتا لیکن چند دنوں سے وہ خود ہی ایک سراپا سوال بن گیا تھا۔ کیرتی نے کئی بار اس کے دل کو ٹٹولا لیکن کچھ نہ ملا۔ جوں جوں وہ زندہ ہوتی جا رہی تھی مادھو خاموش ہوتا جا رہا تھا حالاں کہ وہ چاہتی تھی کہ اسے طویل قصے کہانیوں میں الجھائے رکھے کیوں کہ اسی الجھن میں اس کی زندگی کا حل پوشیدہ تھا۔
کیرتی ایک گھاٹی پر بیٹھ گئی۔
مادھو الغوزے بجانے لگا۔ دیر تک الغوزے بجاتا رہا۔
کیرتی نے اس کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔
"آج کل تم کھوئے کھوئے سے رہتے ہو۔ اڈے کی یاد تو نہیں آتی۔"
مادھو نے الغوزے کی جوڑی گلے میں لٹکاتے ہوئے اپنی کہی۔
"تیتری اپنے ساتھی کو پکار رہی ہے۔"
کیرتی نے تیتری کی آواز پر اپنے کان لگاتے ہوئے کہا۔
"تمہارا بھی کوئی ساتھی ہے جسے تم نے کبھی اس طرح پکارا ہو۔"
اس نے نفی میں گردن ہلائی۔
کیرتی نے اپنی بات جاری رکھی۔
"تم نے کسی سے محبت کی ہے؟"
اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "کیا ہوتی ہے محبت؟"
"کبھی تم نے کسی عورت سے محبت کی ہے۔ اس سے مل کر پاس بیٹھ کر باتیں کر کے خوشی ہوئی؟"
مادھو نے آنکھیں جھپکیں۔ پٹ پٹ اسے دیکھنے لگا۔
"ہاں۔"
"کون ہے وہ.....؟"
"ایک پہاڑن....."
"نام کیا ہے اس کا.....؟"
"کملی چاچی..... مر گئی بے چاری۔"
کیرتی کی آنکھوں میں ایک اطمینان بخش مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ کوشش پر بھی اپنی ہنسی نہ روک سکی۔ "ہاں۔ وہ بھی ایک قسم کی عورت ہی تھی۔"
مادھو اپنی پرانی یادوں میں کھو گیا۔ "وہ مجھے کہانیاں سنایا کرتی تھی۔ لڑکے لڑکیوں کی کہانیاں۔ بڑی ہی مزے دار۔ لڑکیاں ہمارے پہاڑوں کی ہوتی تھیں اور لڑکے شہروں اور نگروں کے۔ جو پہاڑوں پر سیر کرنے آتے ان کہانیوں میں کملی چاچی کی کہانی بھی تھی وہ اور باپو جب چھوٹے چھوٹے تھے اکٹھے کھیلے تھے۔ دونوں بیاہ کرنا چاہتے تھے لیکن باپو بڑا غریب تھا۔ گھر بار نہ زمین باڑی' ٹوٹ گئی بات۔"
کیرتی نے پوچھا۔ "تمہاری کملی چاچی کا کیا ہوا پھر.....؟"
مادھو نے اسی لہجے میں جواب دیا۔ "جس سے اس کا بیاہ ہوا تھا اسے شکارگاہ میں سے چیتا اٹھا کر لے گیا' مگر یہ سب بتاتے ہیں کہ باپو نے ہی اسے گولی مار کر ختم کر دیا۔ کملی چاچی تو باپو پر شک نہیں کرتی تھی۔ کیا پتا ہے کسی کے دل کا' لیکن مجھ سے بڑا پیار کرتی تھی۔"
"چوکیدار اس سے کبھی نہیں ملا۔"
"کبھی نہیں۔ میرے ہاتھ روپے بھیجا کرتا تھا' خود نہیں ملتا تھا۔"
کیرتی نے پوچھا۔ "تمہاری ماں زندہ تھی تب۔"
"نہیں۔"
قدرے توقف کے بعد کیرتی نے اپنی بات دہرائی۔
"اور تم....."
سنبلو کی جھاڑیوں میں سے جنگلی خرگوش کا بچہ نکلا۔ مادھو اس کی طرف لپکا۔ "میں کیا....."
کیرتی اس کے پاس چلی گئی۔ دبی زبان میں پوچھا۔
"مادھو تم شادی کرنا نہیں چاہتے۔ گاؤں کی کسی خوب صورت سی پہاڑن کے ساتھ' جسے تم نے کبھی پسند کیا ہو۔"
وہ سنبلو کے ایک جھنڈ کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ "بیاہ

کرتے ہیں امیر لوگ' جن کے پاس جائداد ہو' جن کے ساتھی سمبندھی ہوں۔ روپے پیسے ہوں۔ ہمارے پاس تو ہے ہی کچھ نہیں اور پھر گاؤں والے مجھے ٹھیک آدمی نہیں سمجھتے۔"

کیرتی نے حیران ہو کر پوچھا۔ "کیوں.....؟"

"میرے ماں باپ کا جو کوئی پتا نہیں۔"

کیرتی کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ "مادھو....."

مادھو نے اپنی بات جاری رکھی۔ "کون لوگ تھے وہ.....؟ کہاں کے رہنے والے تھے؟ کیسے تھے' کوئی پتا نہیں۔"

"اور یہ چوکیدار کرما.....؟"

"میرا باپو ہے۔ اسی نے مجھے پالا ہے۔ میرے ماں باپ کا اسے بھی پتا نہیں۔ باپو تو سناتا ہے میں رنگڑ گڑھی کے جنگل میں پڑا تھا۔ کسی عورت نے پھینک دیا تھا اور باپو کو دیکھ کر ہی مجھے پھینکا تھا اور پھر نالے میں چھلانگ لگا دی۔ نالے میں باڑ ہوا تھا کچھ پتا نہیں چلا۔ باپو سناتا ہے یہ کہانی کبھی کبھی۔"

کیرتی خاموش بیٹھی سنتی رہی۔ اس کا شک یقین میں بدل گیا تھا۔

مادھو نے اپنی بات جاری رکھی۔ "مجھے تو باپو نے کہا تھا سنانا نہیں یہ کہانی کسی کو' لیکن سب کو معلوم ہے۔"

وہ مادھو کے بارے میں اور زیادہ سننا نہیں چاہتی تھی جیسے اسے پہلے سے ہی سب باتوں کا علم تھا۔ اس نے اپنی کہی۔ "چوکیدار تمہاری شادی کی بات نہیں کرتا؟"

"پیسے جمع کر رہا ہے۔ پہلے اپنا بیاہ کرنا چاہتا تھا مگر کچھ بھی جمع نہ کر سکا اور بیاہ کی عمر گزر گئی۔ اب میرے لیے لڑکی کسی غریب سے خریدے گا سٹھیا گیا ہے۔"

"اس میں برائی کیا ہے؟ کسی کو روپیہ دے کر لڑکی بیاہ لاؤ۔ میں تمہاری مدد کروں گی۔"

مادھو نے بلند آواز میں اپنے دل کی بات کہی۔ "مجھے بیاہ کرنا ہی نہیں۔ محبت پیار کی مجھے رتی بھر بھی خواہش نہیں۔ میرے کوئی سنگی ساتھی ہیں تو یہ پہاڑ۔ چاہتا ہوں ساری عمر میری آنکھوں کے سامنے رہیں۔ انہیں دیکھ کر مجھے سب کچھ مل جاتا ہے۔"

کیرتی بولی۔ "اپنا گھر بسانا نہیں چاہتے۔ تھوڑا بہت پڑھ لکھ لیتے ہو۔ کم سے کم اپنے باپو سے زیادہ سوچ سکتے ہو۔"

وہ خاموش رہا۔

اس نے اپنی بات جاری رکھی۔ "مجھ سے کچھ چھپا رہے ہو۔"

"میں جو کچھ کہہ رہا ہوں' سچ ہی کہہ رہا ہوں۔"

"تمہارے من میں ایسی کوئی خواہش نہیں' جسے پورا کرنا چاہتے ہو؟"

مادھو ایک گھاٹی پر کھڑا ہو گیا۔ "ہاں ہے ایک۔"

کیرتی اس کے پاس کھڑی ہو گئی۔ "کیا ہے وہ؟"

مادھو نے اپنی باہیں ہوا میں پھیلا دیں اور تن کر کھڑا ہو گیا۔

"یہ پہاڑوں کی اونچی اونچی چوٹیاں ایک دن چھولوں' بچوں کی طرح اپنے پاس بلاتی ہیں لیکن ان کے پاس جاؤں کیسے؟ جب بہت تنگ پڑ جاتا ہوں تو اپنی پگڈنڈیاں میری ڈھارس بندھاتی ہیں۔ اشاروں سے اپنے پاس بلاتی ہیں۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے میرا ہاتھ تھام کر اوپر چوٹیوں تک پہنچا دیں گی۔ اب تو آپ اچھی ہو گئی ہیں۔ خوب سیر کراؤں گا' سب سے ملاؤں گا' پہاڑی گیت کبھی سنے ہیں؟"

"نہیں....."

"میں سناؤں گا آپ کو۔"

"تم گا لیتے ہو۔"

"پہاڑی گیت کون نہیں گا لیتا۔ وہ تو ہمارے جنم جنم کے ساتھی ہیں۔ دکھ سکھ کے وہی تو سنگی ہیں۔ سننے سنانے والے کے ہوش ہی گم کر دیتے ہیں۔ اتنے میٹھے اور سریلے ہوتے ہیں۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"ایک اچھا سا گیت مجھے بھی سنا دو۔"

"ایک روز سناؤں گا آپ پسند کریں گی۔ گیت بھی بالکل ہماری کتھا کہانیوں کی طرح ہوتے ہیں جو مجھے کملی چاچی سنایا کرتی تھی۔"

مادھو کی نظریں ان برفانی چوٹیوں پر جم گئیں جہاں سے کملی چاچی کی کہانیاں شروع ہوتی تھیں اور جنگل کی چاندنی راتوں کو سمیٹتی ہوئی نیچے ہی نیچے پہاڑی ندی نالوں میں بہ کر نہ جانے کہاں جا کر ختم ہو جاتی تھیں۔ باتیں کرتے کرتے مادھو افسردہ سا ہو گیا۔ برفانی چوٹیوں سے نظریں اٹھیں اور کیرتی کے چہرے پر جم گئیں اور پھر ایک دم ہی افسردگی کافور ہو گئی۔ چہرے پر شرمیلی سی خوشیاں تھرک اٹھیں جیسے اپنا بال پن واپس مل گیا ہو اور اس چھوٹی سی بے فکر دنیا کی تمام مسرتیں' تمام دھڑکنیں' تمام رعنائیاں سمٹ سمٹ کر اس کے قریب آ کر بیٹھ گئی ہوں۔

وہ اپنے بال پن کو اپنے اتنے قریب دیکھ کر مسکرا دیا۔

کیرتی کو آج کل کھل کھل کر باتیں کرنے کا موقع ملا تھا۔ وہ بڑے خوب صورت ڈھنگ سے باتیں کرتا تھا۔ لب ولہجہ کرما کی طرح پہاڑی ہی تھا لیکن قدرے سلجھا ہوا۔ کرما تک تک کر' ٹھہر ٹھہر کر باتیں کرتا تھا جیسے اپنا مدعا بیان کرنے کے لیے موزوں الفاظ نہ ہوں لیکن مادھو بلا جھجک بولتا تھا جس طرح اس نے باتیں سنی ہوتیں اسی انداز میں بیان کرتا۔ جب اس کے انداز بیان میں غیر شعوری طور پر سنجیدگی آ جاتی اور اس میں فلسفیانہ رنگ اجاگر ہونے لگتا تو کیرتی کو اس کا سارا کردار ہی مشکوک دکھائی دینے لگتا اور وہ چونک اٹھتی اور پوچھتی تم نے یہ باتیں کہاں سے سیکھیں؟ وہ بے تکلف قہقہے لگانے لگتا اور پھر معصوم بچے کی طرح آنکھیں سکیڑ کر جواب دیتا۔ یہ میری باتیں نہیں پہاڑی گیتوں کے بول ہیں۔ کیرتی کو ایک دھچکا سا لگتا۔ اسے پھٹی پھٹی سی آنکھوں سے دیکھتی رہتی لیکن وہ اسے جانگلی ہی دکھائی دیتا۔ وہی اس کا اصلی حقیقی کردار تھا۔

کیرتی نے اس کے دل کی گہرائیوں میں اترنے کی کوشش کی۔ "مجھ سے مل کر تمہیں خوشی نہیں ہوئی۔"

مادھو جیسے اپنے بال پن کی شربتی پہنائیوں میں ڈوب گیا۔

"اتنی ہی خوشی جتنی کہ....." لیکن اس نے اپنا فقرہ پورا نہ کیا صرف اسے دیکھتا رہا۔

"چپ کیوں ہو گئے؟"

وہ ایک جھٹکے کے ساتھ اپنی حقیقی دنیا میں آ گیا۔ "چھوڑو ان باتوں کو۔ یہ سب نصیبوں کے کھیل ہیں۔" وہ گنگنانے لگا۔ 'چنے دی چانچی چنے کنے'۔

"میں سمجھی نہیں۔"

"نہیں سمجھ سکیں گی۔ یہ مادھو کی باتیں نہیں پہاڑی گیتوں کے بول ہیں۔"

"مطلب کیا ہے؟"

"چاند کی چاندنی چاند کے ساتھ ہی رہتی ہے۔"

کیرتی نے اسے گھور کر دیکھا اور ڈاک بنگلے کو جانے والی پگڈنڈی پر ہو لی۔

چاند ابھی جنگل کی پراسرار دھندلاہٹوں میں ہی الجھا ہوا تھا۔ گاؤں کے تین چار ہم عمر لڑکے مٹی کے گھڑے اٹھائے باؤلی سے پانی لینے جا رہے تھے۔ ایک گھڑا بجا رہا تھا۔ دوسرے ایک آواز ایک سر میں گا رہے تھے۔ چاروں طرف سناٹا تھا۔ چاند خاموش تھا۔ صرف ایک گیت تھا۔ ایک آواز تھی اور گھڑے کی تال۔ کیرتی کو محسوس ہوا جیسے ٹھنڈی ٹھنڈی ملائم برف کے گالے اس کے کانوں کی لوؤں سے چھو رہے ہیں۔ اس کے جسم میں ایک سرسراہٹ سی پیدا ہوئی۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ مادھو کنکر اچھالتا ہوا آ رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر بھی جیسے وہی گیت تھا۔ وہی خاموشی تھی۔ وہی بال پن تھا۔ کیرتی وہیں رک گئی۔ مدھم سر میں پوچھا۔ "یہ لڑکے کیا گا رہے ہیں؟"

مادھو نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ "یہ ان پہاڑوں کا گیت ہے جن پر سفید بادل جھکے ہوئے ہیں۔"

وہ کھیت کی مینڈھ پر کھڑی تھی اور مادھو ایک جھکی ہوئی

گھاٹی پر۔ وہ مادھو کے پاس آ گئی۔ دبی زبان میں پوچھا۔
”گیت کے بول کیا ہیں؟“
”گوری دا چت لگا جیہے دیاں تہاراں۔“
”کیا مطلب؟“
”ایک لڑکی کو پہاڑوں سے پیار ہو گیا۔“
کیرتی کے سارے جسم میں ایک جھرجھری سی دوڑ گئی۔
”کیا......؟“
مادھو نے اس کے دل کی دھڑکنیں گنتے ہوئے دوہرایا۔
”گوری دا چت لگا جیہے دیاں تہاراں۔“
اور تیزی سے آگے نکل گیا۔

سرسراتی ہوئی ہوائیں مچل کر کیرتی کے قریب سے نکل گئیں جیسے وہ بھی مسکراتی ہوئی' گنگناتی ہوئی' دبی زبان میں وہی گیت سنا گئی ہوں اور کیرتی بے اختیار ان کا تعاقب کرنے لگی۔ اسے محسوس ہوا جیسے اس کی ساڑھی کا کنارا ہواؤں سے الجھ گیا ہو اور وہ اسے اپنے ساتھ کھینچ رہی ہو۔ کیرتی ان کے ساتھ کھنچتی چلی گئی۔ ایک اجنبی سے احساس کے زیر اثر اپنی منزل کی طرف بڑھتی گئی۔ آج اس نے مادھو کے روپ میں پہاڑ کا رنگ دیکھ لیا تھا۔ آج اس نے پہاڑ کی محبت بھری دھڑکن کا لمس پالیا تھا۔ وادیوں اور گھاٹیوں میں مادھو کے نقوش تھے۔ پہاڑوں اور جنگلوں میں مادھو کے خد و خال تھے جنہیں غیر شعوری طور پر کیرتی نے اپنا لیا تھا۔

☆

دن بیتتے گئے۔ وادیوں اور گھاٹیوں کے گیت کیرتی کے قریب آتے گئے۔ ایک دن کیرتی خود بھی ایک سراپا پہاڑی گیت بن گئی۔ اب اس نے پہاڑوں کی بھاشا سمجھنا شروع کر دی تھی۔ ایک ایک وادی ایک ایک گھاٹی کو قریب سے دیکھ لیا تھا۔ دن رات مادھو کی آواز اس کے کانوں میں گونجتی رہتی۔ یہ رنگڑ گڑھی کی رکھ ہے جہاں دور دور سے آدمی شکار کے لیے آتے ہیں۔ اس شکار گاہ نے کسی کو ناامید نہیں کیا۔ یہ ہاتھی دروازہ ہے۔ پانڈوں نے ایک پہاڑ جیسی چٹان کو چیر کر بنایا تھا اور اس کے پاس جو پتھر کی مورتیاں ہیں یہ ایک جاگیردار کی بارات ہے۔ جاگیردار گھمنڈی تھا۔ ہاتھی دروازہ کے پاس پھول اگائے بغیر اس میں سے گزرنا چاہتا ہے۔ جاگیردار بھی سل پتھر ہو گیا۔ باراتی اور گھوڑے بھی۔ سب پتھر بن گئے۔ اس ندی کا نام دودھ پتھری ہے کیوں کہ ندی میں دودھ جیسے سفید چٹے پتھر ہیں جن سے مندر کی مورتیاں بنائی جاتی ہیں اسے بھانگڑہ کہتے ہیں اور اسے چھنج نامی پہلوانوں کی کشتی اور یہ رومانی کھنڈر' یہ رومانی ٹیلے' یہ پری محل اور یہ بھوتوں کا قلعہ اور وہ دور آسمان کو چھوتی ہوئی برفانی چوٹیاں جہاں پریاں رہتی ہیں جو پہاڑی لوگوں سے پیار کرتی ہیں اور انہیں بہلا پھسلا کر اپنے ساتھ ہی برف کی وادیوں میں لے جاتی ہیں اور...... کیرتی کسی سحرزدہ ہستی کی طرح مادھو کی باتیں سنتی۔ باتیں کرتے کرتے مادھو کبھی پہاڑ کا روپ دھارن کر لیتا' کبھی بوڑھے جنگل کا اور کبھی چاند بن جاتا اور کیرتی کسی الہڑ انجان کم سن دوشیزہ کے قالب میں ڈھل جاتی۔ اس کے سوچنے سمجھنے کی طاقتیں ہی سلب ہو جاتیں۔ وہ پریوں کا پرسکون دیش تھا۔ کیرتی پری بن کر وہاں گھومتی رہی۔ ایک روز دونوں گھومتے پہاڑی گیتوں کو سمیٹتے ہوئے نابن پھلواڑی کے چشمے دیکھنے لگے۔ چھوٹے چھوٹے درختوں کے جھنڈ میں جو جنگلی بیلوں اور خودرو پھولوں سے لپٹا ہوا تھا ایک ساتھ پانی کی دو باؤلیاں تھیں جو ایک ہی کالی سیاہ چٹان کے دو حصے تھے۔ دونوں میں سے ہلکی ہلکی بھاپ سی نکل رہی تھی۔ خودرو پھول اور جنگلی بیلیں بھی اسی چٹان میں سے پھوٹی ہوئی تھیں نیچے منوا اور کاؤ کے بڑے بڑے سایہ دار درخت تھے جن کے نیچے ڈھور ڈنگر ستانے کے لیے بیٹھے ہوئے تھے۔ وہیں کہیں لڑکے اور لڑکیاں شاید کوئی پہاڑی کھیل کھیل رہے تھے۔ ان کی چیخیں' قہقہے یا مدھم چلاہٹیں ہی صرف سنائی دیتی تھیں۔ کھیل کا میدان دکھائی نہیں دیتا تھا۔ وہ ان کی نگاہوں سے دور گھاٹی کی اوٹ میں تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بانسری کی بے چین ٹوٹی ہوئی سی لے تھکی ہاری کسی آوارہ پہاڑی کی طرح یوں ہی ادھر ادھر بھٹک رہی تھی اور نالے کی ساں ساں دور پیچھے رہ گئی تھی۔ پہاڑ کا وہ حصہ بہت ہی جاذب نظر تھا۔ کیرتی نے بہت سے فوٹو لیے ان پھولوں کی جانب گرتی پڑتی گھاٹیوں کے فوٹو جن کی سلوٹیں جہاں ایک دوسرے سے ملتیں۔ عجیب وغریب شکلیں ابھر آتیں۔ دیر تک وہ فوٹو لیتی رہی۔ اس کے بعد ان چشموں کے قریب آ کر بیٹھ گئی۔

مادھو نے کہا۔ ”بوجھیے بھلا' تتے پانی کا سوٹا کون سا ہے؟“

دونوں چشموں میں سے ہلکی ہلکی نیم گرم بھاپ اٹھ رہی تھی۔

کیرتی نے اپنی انگلی ایک چشمے میں ڈبو کر جواب دیا۔ ”یہ ہے۔“

مادھو نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ ”ایسے تو کل کا بچہ بھی بتا سکتا ہے۔ میرا مطلب بغیر چھوئے تھا۔“

کیرتی نے نیم گرم پانی میں اپنا ہاتھ ڈبوئے رکھا۔ کبھی وہ ہاتھ ایک چشمے میں ڈالتی کبھی دوسرے میں اور کبھی ایک مٹھی میں گرم پانی اور دوسری میں سرد پانی سمیٹ لیتی۔

مادھو نے بات شروع کی۔ ”یہاں جاڑے میں ہر برس میلہ لگتا ہے۔ دور دور سے لوگ آتے ہیں۔ بکروال ہوتے ہیں نا جو بکریاں پالتے ہیں' یہ ان کا تیوہار ہے۔ نیچے بکرے پیر کی قبر ہے۔ وہاں بکرے قربان کیے جاتے ہیں۔ اسے بکرے پیر کی قربانی کہتے ہیں۔ پیران کے مال مویشیوں کو وبا سے بچاتا ہے۔ پورنماشی کی برفانی رات کو جب میلہ پورے جوبن پر ہوتا ہے تو گاؤں کی جوان لڑکیاں قبر پر جا کر من کی مرادیں مانگتی ہیں جو کہتے ہیں پوری ہو جاتی ہیں۔“

کیرتی نے پوچھا۔ ”من کی مراد کیسے مانگی جاتی ہے؟“

مادھو نے اسی رو میں جواب دیا۔ ”ایک ہاتھ کی ہتھیلی پر تتا پانی لیتی ہیں اور دوسرے ہاتھ کی ہتھیلی پر ٹھنڈا پانی اور بکرے پیر کی قبر کی طرف منہ کر کے پانی پی لیتی ہیں پھر قبر پر جا کر اپنے من کی مراد مانگتی ہیں۔ کہتے ہیں نے بھی اسی طرح موت کی مراد مانگی تھی اور بکروالیو ساتھ ناچتے گاتے مرگئی تھی۔ صبح سویرے اس کی بکرے پیر کی قبر پر پڑی ملی۔“

”موراں نے موت کی مراد کیوں مانگی تھی؟“

”اصل بات کوئی نہیں جانتا' صرف ہوائی باتیں ڈوور صاحب کی خودکشی کے بعد لوگوں نے بنائیں بچہ بچہ یہ کہانی جانتا ہے لیکن یہ بات سچ ہے کہ اس مراد مانگی تھی۔“

کیرتی غیر اختیاری طور پر چشموں پر جھک گئی۔ آ بند کر کے دل ہی دل میں کوئی مراد مانگی۔ دونوں چ سے ایک ایک گھونٹ پانی پیا اور آنکھیں موندے بیٹھی رہی۔

مادھو نے پوچھا۔ ”آپ نے کیا مراد مانگی؟ آپ پاس کس چیز کی کمی ہے اور آج پورنماشی بھی تو نہیں۔“

کیرتی نے اسی طرح چشموں پر جھکے جھکے جواب ”میرے لیے آج ہی پورنماشی ہے۔“

وہ زور زور سے ہنسنے لگا۔ ”کیا مراد مانگی یہ تو آپ بتایا ہی نہیں۔“

کیرتی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے کیا مراد تھی اب جیسے اسے خود بھی معلوم نہ تھا لیکن وہ اداس ہوگئی۔ چہرہ اتر گیا۔ آہستہ قدم سے اس باؤلی کی بڑھنے لگی جہاں گاؤں کے بچوں کا شور تھا اور جہاں کھیتوں کی سیڑھیاں شروع ہوتی تھیں۔ مادھو کے میں کوئی بات نہ آ سکی۔ اس نے سامان اٹھایا اور پگڈنڈی سے باؤلی کی طرف ہولیا۔ نیچے بچے کھیل تھے۔ ان میں شریک ہوگیا۔ کیرتی ایک پرانے تھڑ بیٹھ کر بچوں کے کھیل سے لطف اندوز ہوتی رہی۔ چند جو تماشائی تھے اس کے اردگرد جمع ہوگئے اور اس کے لباس اور اجلے دھلے ہوئے چہرے کو اپنی معصوم نگا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے دیکھنے لگے۔ وہ ہر ایک سے بڑے پیار سے پوچھ تاچھ کرتی رہی۔ میلے کچیلے پھٹے پرانے چیتھڑوں میں بھی ان کے چہروں پر فرشتوں کی سی تقدیس تھی۔ کچھ بچے ننگ دھڑنگ اس کے پاس اکٹھے ہوگئے تھے۔ ان میں سے ایک چھوٹا سا بچہ اپنی گود میں اٹھالیا۔ دیر تک اسے اپنے رخساروں سے سہلاتی رہی۔ کیرتی کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس نے اپنا بچپن اپنی گود میں اٹھالیا ہو۔ دھرتی کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا اس کی چھاتی سے چمٹ گیا ہو۔ بچے کو چھاتی سے لگا کر اسے انوکھی سی ٹھنڈک کا احساس ہوا۔ مامتا کا لافانی جذبہ عود کر آیا ہے۔ ماں بچے کو سہلا رہی تھی اور دھرتی جنگل سے سرگوشیاں کر رہی تھی اور ننگ دھڑنگ بچہ اپنی ماں کی چھاتیوں سے چپک کر سو گیا تھا اور مادھو باؤلی میں اپنی ٹانگیں ڈالے الفوزے بجا رہا تھا۔ اب کھیل ختم ہوگیا تھا۔ برفانی چوٹیوں کے کنارے ہلکے سرخ ہوگئے تھے۔ دیکھتے دیکھتے گہرے سرخ ہوگئے۔ گہرا سرخ رنگ گہرے نیلے رنگ میں گڈمڈ ہوگیا اور فالسئی رنگ چاروں طرف پھیل گیا۔ خودرو جنگلی پھولوں کی بہکی بہکی سی مہک ایک دم جاگ اٹھی۔ پہاڑی پگڈنڈیاں اپنے گیتوں کو ڈھونڈنے نکل پڑیں۔ کیرتی نے اپنے سینے سے لگے ہوئے بچے کو چوما اور اسے ایک کم عمر لڑکی کے کندھے پر بٹھا دیا۔ دیر تک اسے اپنی آنکھوں سے اوجھل ہوتے دیکھتی رہی لیکن بچے نے اس کے بچپن کی طرح ایک بار بھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔

کیرتی سر جھکائے ایک پگڈنڈی پر ہولی جو کھیتوں میں سے ہوتی ہوئی سیدھی ڈاک بنگلے کو چلی جاتی تھی اور مادھو وہیں بیٹھا سوچ رہا تھا کہ یکایک کیرتی کو کیا ہوگیا جو ہنستے کھیلتے ایک دم خاموش ہوگئی لیکن وہ کچھ بھی نہ سمجھ سکا۔ جب وہ اکیلی ہی کافی دور نکل گئی اور مادھو اپنی جگہ سے ہلا ہی نہیں تو اس نے بلند آواز سے کہا۔

”وہاں بیٹھے کیا سوچ رہے ہو۔ اندھیرا ہو رہا ہے' اب آؤ۔“

وہ سر جھکائے اس کے پیچھے ہولیا۔

کیرتی چھوٹی پگڈنڈی سے ہو کر عقبی برآمدے میں چلی گئی جہاں وہ کئی دنوں سے ایک تصویر بنا رہی تھی جسے آج ہر حالت میں ختم کرنا چاہتی تھی۔ مادھو آبشار کے سرہانے ستانے بیٹھ گیا تھا۔ آیا بھاگتی ہوئی آئی۔

”کیرتی کہاں ہے؟“ اس کی آواز میں گھبراہٹ اور خوشی کے ملے جلے جذبات تھے۔

”کیوں.....؟“ آواز مادھو کے گلے میں پھنس کر رہ گئی۔

”شہر سے صاحب آیا ہے۔“

”صاحب کون؟“

”بابو مدن رائے سنگھ! کیرتی کا منگیتر۔“

”منگیتر کیا؟“

”جس سے اس کا بیاہ ہونا ہے۔“

مادھو نے سارے سوال ایک ہی سانس میں پوچھ ڈالے۔ اس کا سانس پھول گیا تھا۔ مفلوج سا ہو کر ہاتھ سے اشارہ کیا۔ ”اس طرف گئی ہیں۔“

آیا تیز تیز قدموں سے عقبی برآمدے میں چلی گئی۔

مادھو کے کندھے پر دس بارہ سیر کا بوجھ جیسے منوں میں بدل گیا اور دن بھر کی ساری تکان اس کی ٹانگوں میں آ کر جم گئی۔ وہ سر جھکائے ہوئے ڈاک بنگلے کی طرف بڑھا۔ اسے محسوس ہوا جیسے کیرتی نے جو مراد دوچشمی پر مانگی تھی وہ پوری ہوگئی۔ اس نے اپنے کسی بچھڑے ہوئے ساتھی سے ملنے کی منت مانگی تھی اور شہر سے صاحب آ گیا۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا چھوٹے چھوٹے کھیت آنکھوں سے دور ہوگئے تھے اور درختوں کے لمبے لمبے اونچے اونچے سائے تاریک اندھیرے دھندلکوں میں تحلیل ہو رہے تھے اور ستاروں کی روشنی پھیل رہی تھی۔ اس نے اندھیرے میں نظریں دوڑائیں۔ ایک خوش پوش لڑکا کیرتی کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے کھڑا تھا اور کیرتی جیسے اس کے سینے پر جھکی ہوئی تھی اور ادھیڑ عمر آیا پاس ہی کھڑی نوجوان

لڑکیوں کی طرح لہک لہک کر جیسے ایک ہی بار کسی کہانی کو سنا دینا چاہتی تھی۔ لڑکے نے کیرتی کے ہاتھ سے برش چھین لیا جس سے آج وہ کسی نامکمل نقش کو آخری رنگ دینا چاہتی تھی۔ لڑکے نے گیلے برش سے اس کے ماتھے پر رنگ کا نشان لگا دیا۔ آیا چلی گئی لیکن مادھو اندھیرے میں کھڑا دیکھتا رہا۔ لڑکے نے کیرتی کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں دبوچ لیا اور وہ شرما کر پاس پڑی کرسی پر بیٹھ گئی۔ لڑکا بھی اس کے پاس بیٹھ گیا۔ مادھو بھی ایک چبوترے پر بیٹھ گیا۔ دیر تک بیٹھا رہا۔

اسے وہاں اکیلے بیٹھا دیکھ کر کرما اس کے پاس آیا۔ ''یہاں دھونی مار کر بیٹھ گئے ہو اٹھ چل۔ تین ساب شہر سے آئے ہیں۔ نصیبا کھل گیا ہمارا بھی۔ اب جاڑوں میں یہاں بھی ڈھولے بجیں گے۔ تمہارے لیے ایک ننھی سی گڑیا لے آؤں گا۔ جا اندر جا کر رام ست کر آ۔''

مادھو نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا۔ وہ ان لوگوں کو سلام نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ عقبی برآمدے میں جا کر بیٹھ گیا جہاں اندھیرا تھا اندر لیمپ کی روشنی میں کیرتی اور صاحب آ کر بیٹھ گئے تھے جس کا نام آیا نے مدن رائے سنگھ بتایا تھا اور جو اس کے کانوں میں بھنبھناتا ہوا اس کے ذہن کی اسی کونے میں آ کر بیٹھ گیا تھا جہاں پہلے سے ہی مادھو سنگھ جما ہوا تھا۔ اس کے ذہن میں دو نام ایک ساتھ بھنبھنانے لگے۔ مدن رائے سنگھ...... مادھو سنگھ......

مدن رائے...... مادھو...... مدن...... جانکی...... اس نے اپنے سر کو زور کا جھٹکا دیا اور اس تصویر کو اندھیرے ہی میں ڈھونڈنے لگا جسے کئی دنوں سے کیرتی مکمل کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ کیرتی اور مدن رائے اسے صاف دکھائی دے رہے تھے۔

مدن رائے نے پوچھا۔ ''تم ان تنہا جنگلوں میں کہاں؟''

کیرتی نے جواب دیا۔ ''تم سے بھاگ کر یہی تو ایک ٹھکانہ تھا۔ تم نے تو مجھے مار ہی دیا تھا۔''

''یقین مانو' تمہیں یہاں دیکھ کر مجھے بہت کچھ مل گیا۔ عجیب اتفاق ہے تمہیں یاد کیا' اپنے قریب پا لیا۔''

''تم تو بمبئی جا رہے تھے؟''

''ارادہ ترک کر دیا۔''

''کیوں......؟''

''تم نے ساتھ جو نہیں دیا۔''

''میں نے یا تم نے؟''

مادھو ان کی باتوں پر کان لگائے بیٹھا ہوا تھا اس کی آنکھوں کے سامنے لیمپ کی لو ایک ہی بار بھڑکی اور مدھم پڑ گئی۔

مدن رائے نے بات بدل دی۔

''کب سے یہاں ہو؟''

''ایک مہینہ ہو گیا۔''

''ہوائیں یہاں کی خوب راس آئیں؟''

''ہاں۔ ہوائیں بھی اور ہواؤں کے گیت بھی۔''

''چتر کاری کے ساتھ شاعری بھی شروع کر دی ہے۔''

اس نے اپنی کہی۔ ''ان جنگلوں میں کیسے آ گئے؟''

''نریندر اور بلبیر ہمارے گاؤں آئے تھے' وہیں شکار پروگرام بنا' چلے آئے۔''

کیرتی نے معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ ''اس بار کس شکار کا ارادہ ہے؟''

مدن رائے نے مسکرانے کی کوشش کی۔ ''اس بار کس شکار کا ارادہ ہے' یہ تو نہیں جانتا۔ تم مل گئی ہو قدرتی طور پر پروگرام لمبا ہو گا۔''

''تمہارے لمبے پروگرام میں ساتھ دے سکوں گی؟''

مدن رائے نے اس کے قریب کرسی کر لی۔ ''میں تمہیں جی بھر کر دیکھنا چاہتا ہوں۔ آج تم وہی ہو جو پہلی ملاقات میں میرے دل کی گہرائیوں میں اتر گئی تھیں۔ حقیقی معنوں میں تم میرا سکون ہو۔ تم نے دیکھ ہی لیا تمہیں میں آج بھی تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔''

کیرتی بازاری قسم کی باتیں سننے کی عادی نہ تھی' اس نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''رانی نہیں آئی؟''

رانی کے نام پر وہ سنبھل گیا۔ اس کا شکاری انداز یکسر بدل گیا ''وہ تو گاؤں میں چند دن رہ کر اکتا گئی' جلدی لوٹ گئی۔''

''وہ تو اکتانے والی نہ تھی۔''

مدن رائے نے موضوع بدلنے کی کوشش کی جس میں اس کی اخلاقی پستیوں کو کھنگالا جانا مقصود تھا۔ اس نے اپنی کہی۔

''یہاں آ کر کوئی نئی تصویر بنائی......؟''

کیرتی نے سوچنے کے انداز میں جواب دیا۔ ''پورے ایک مہینے سے ایک تصویر مکمل کرنے کی کوشش کر رہی ہوں لیکن آج تک ادھوری ہی رہی اور اب تم آ گئے۔''

''کس کی تصویر ہے؟''

''ایک جانگلی کی۔''

''کہاں ملا تھا......؟''

''رنگوگڑھی کے جنگل میں۔''

''وہاں کیا کر رہا تھا؟''

''اپنی زندگی ڈھونڈ رہا تھا۔''

مدن رائے نے ہنستے ہوئے نیا سگریٹ جلانے کے لیے ماچس نکالی جس میں ایک بھی تیلی نہ تھی۔ خالی ڈبیہ کو زور سے ہلا کر کھڑکی سے باہر پھینک دیا جہاں مادھو بیٹھا تھا اور لائیٹر سے سگریٹ سلگاتے ہوئے پوچھا۔

''اسے اپنی زندگی مل گئی تھی؟''

کیرتی نے گمبھیر سُر میں جواب دیا۔ ''پوچھا تو نہیں لیکن اس کے چہرے کی رنگت ظاہر کرتی تھی کہ اپنی زندگی کے قریب پہنچ گیا ہے۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ......''

جملہ پورا نہ ہوا۔ نریندر اور بلبیر بندوقیں کندھے پر ڈالے کمرے میں داخل ہوئے۔ مدن رائے نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

''کچھ ملا......؟''

بلبیر نے جواب دیا۔ ''ایک فائر سے دو خرگوش۔ جوڑا تھا۔''

نریندر کیرتی کے پاس بیٹھ گیا۔ ''اب تو آپ بالکل اچھی ہو گئی ہیں۔''

بلبیر نے اپنی کہی۔ ''نئے ڈاک بنگلے میں ٹھہرے ہوئے تھے کہ چوکیدار نے بتایا ایک لڑکی اور عورت گڑھی کے پرانے بنگلے میں ٹھہری ہوئی ہیں۔ میں نے اسی وقت جان لیا کیرتی ہے؟ مدن نے شرط لگائی' پچاس روپے مفت میں مار لیے۔'' اس نے بندوق خالی کر کے ایک طرف رکھ دی۔

نریندر نے دوبارہ بات چلائی۔ ''آپ تو پہچانی ہی نہیں جاتیں۔ ماتھے پر یہ سبز رنگ کا نشان' نظر نہ لگ جائے شاید اس لیے لگا رکھا ہے۔''

کیرتی جھینپ گئی۔ ''رانی اچھی ہے نا؟''

مدن رائے ان کی باتیں سن رہا تھا لیکن بلبیر ٹانگیں بچھائے سگریٹ کے کش پر کش لگائے جا رہا تھا اور سگریٹ کے دھوئیں میں لیمپ کی روشنی اتنی زرد ہو گئی تھی کہ ایک دوسرے کی شکل بھی بہ مشکل دکھائی دیتی تھی۔

نریندر نے کہا۔ ''رانی کو معلوم ہوتا کہ آپ یہاں ہیں تو وہ ضرور ساتھ آتی' اگر آپ کو چند دن اور ٹھہرنا ہو تو اسے بلا لیں؟''

مدن رائے نے جھکے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''یہاں ہم سیر و تفریح کے لیے تو آئے ہیں' شکار کے چکر میں نہ جانے کہاں کہاں بھٹکنا پڑے گا۔''

کیرتی نریندر سے مخاطب ہوئی۔ ''ہمارے گھر گئے تھے؟''

''گیا تو تھا لیکن وہاں کسی سے ملاقات نہ ہو سکی۔ رانی بھی ایک دن گئی تھی' سبھی شکایت کر رہے تھے۔ آپ نے کسی کو خط نہیں لکھا' کم سے کم اتنا تو لکھ دیا ہوتا کہ اب آپ کی صحت اچھی ہو گئی ہے۔''

کیرتی خاموش رہی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بلبیر آنکھیں بند کیے گنگنا رہا تھا۔ ”تجھے اٹھکیلیاں سوجھی ہیں ہم بے زار بیٹھے ہیں۔“

جب تینوں اپنی اپنی کہہ سن چکے تو بلبیر نے کہا۔

”سروپ تھانا‘ وہ شاعر جو ہمارے ساتھ کالج میں پڑھتا تھا۔“ بلبیر نے بات پوری نہ کی۔ وہ پھر گنگنانے لگا۔

”تجھے اٹھکیلیاں سوجھی ہیں ہم بے زار بیٹھے ہیں.....“

کیرتی نے اسے ٹوک دیا۔ ”پروفیسر! تم نے تو اس طرح تمہید باندھی جیسے صدیوں پرانا کوئی قصہ سنانے لگے ہو۔“

بلبیر نے طنزیہ لہجے میں جواب دیا۔ ”تم بھول جانے کے عادی ہو۔ سوچا‘ یہ بھولی بسری کہانی بھی تمہیں کہاں یاد ہوگی؟“

کیرتی نے بلند آواز میں پوچھا۔ ”لیکن ہوا کیا سروپ کو؟“

اس نے اسی لہجے میں جواب دیا۔ ”باپ کی بے وقت موت جو اثاثہ چھوڑ گئی تھی‘ اسے اپنی بہن کی شادی پر لگا دیا۔ اپنی زندگی کے بارے میں سوچنے لگا ہوگا کہ لگے ہاتھوں اسے بھی ترتیب دے ڈالے۔ لیکن شادی کے چھ مہینے بعد بہن کا آخری سہارا اور ناتہ بھی ٹوٹ گیا۔ وہ بھی مر گئی۔“

بلبیر نفسیات کا پروفیسر تھا۔ ”ٹھہر ٹھہر کر دھیرے دھیرے گفتگو کرنے کا عادی تھا۔ اس کے بچے تلے جملے صرف حساس لوگوں ہی کے لیے ہوتے جن میں نشتر کی سی جلن کی کاٹ ہوتی اور مرہم کی سی ملائمت کی ٹھنڈک بھی‘ لیکن وہ کسی کے سوئے ہوئے جذبات کو جگانے کا خواہش مند ہوتا۔ اس کے لہجے میں جانکنی کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی لیکن کیرتی بے حس نہ تھی۔ بلبیر کا ایک ایک لفظ آتشیں سیال کی طرح اس کے کانوں میں اتر رہا تھا۔ قطرہ قطرہ‘ بوند بوند‘ لیکن وہ چاہتی تھی کہ ایک ہی بار اس اذیت سے چھٹکارا پالے۔

کیرتی نے غصہ سے کہا۔ ”آج چھ مہینے بعد مجھے خبر سنا رہے ہو۔“

اس نے اسی رو میں جواب دیا۔ ”مجھے بھی تو پچھلے دنوں ہی پتا چلا جب وہ اپنے دکھ درد بیان کرنے کے قابل ہی نہ رہا۔ اب اسے مدن رائے کی مدد سے اسپتال داخل کرا دیا ہے۔“

کیرتی نے بلند آواز میں پوچھا۔ ”لیکن اسے ہے کیا.....؟“

بلبیر کے لہجے میں کوئی تبدیلی پیدا نہ ہوئی۔ وہ مری ہوئی یادیں ایسے ڈھنگ سے زندہ کرنا چاہتا تھا کہ دوبارہ مرنے پر کبھی مٹنے نہ پائیں۔ اس نے اسی رو میں اپنی بات جاری رکھی۔

”بہن کا غم برداشت نہ کر سکا۔ عرصہ تک بیمار رہا۔ صحت یاب ہوا تو اپنے گرد تنہائیوں کے سوا کچھ نہ پایا۔ اس کی زبان ہی گنگ ہو کر رہ گئی اور دماغ بھی چل نکلا۔ بری حالت ہے غریب کی۔“

رقت سے کیرتی کی آواز گلے ہی میں دب کر رہ گئی۔

”اب کہاں ہے؟“

”اسپتال میں۔ تمہارے متعلق پوچھتا تھا۔ میں نے تمہاری علالت کا ذکر نہیں کیا۔ کہہ دیا پہاڑ پر گئی ہے۔“

بلبیر گنگنانے لگا۔ ”آپ کا اعتبار کون کرے..... آپ کا اعتبار.....“

مدن رائے دھوئیں کے مرغولے چھوڑ رہا تھا اور سروپ پاگل ہو گیا تھا۔ وہ بے سہارا تھا۔ کیرتی کی آنکھوں کے سامنے بجلی سی کوند گئی۔ عہد رفتہ کی کوئی کہانی یاد آ گئی۔ اسے محسوس ہوا جیسے کمرے کی دھندلی دھندلی سی روشنی کسی کے گیت کے لیے سُر میں ڈوب گئی ہو۔ ”زندگی تاریک تھی اپنی تاریک رہی..... اور پھر لیمپ کی لو پر سروپ اور مادھو کا عکس ایک ساتھ تھرتھرایا۔ دونوں اپنی اپنی بانہیں فضا میں پھیلائے اپنے اپنے گیت گا رہے تھے اور آسمان کے ایک خاموش بھنور سے کچھ مانگ رہے تھے جہاں بلندی اور پستی ایک دوسرے سے بغل گیر ہو رہے تھے۔ لیمپ کی لو مادھو میں بدل گئی۔ وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں دو دلوں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کی کوئی داستان سنا رہا تھا..... کیرتی کے منہ سے بے ساختہ مادھو کا نام نکل گیا۔

”کیا ہوا.....؟“ مدن رائے اس پر جھک گیا۔

بلبیر آنکھیں بند کر کے گنگنا رہا تھا جیسے اپنی کاٹ کے ردعمل کا بہ خوبی علم تھا۔

کیرتی نے گھبرا کر مادھو کو آواز دی۔

مادھو اپنے بوجھل احساسات کو سنبھالے ہوئے کمرے میں داخل ہوا۔ کسی پیشہ ور گائیڈ کی طرح نہایت سلیقے سے سلام کیا اور دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔

تینوں کی نظریں مادھو کے چہرے پر جم گئیں۔

مدن رائے نے پوچھا۔ ”یہ کون ہے؟“

کیرتی نے اسی حالت میں جواب دیا۔ ”چوکیدار کا بیٹا!“

نریندر نے حیران ہو کر انگریزی میں پوچھا۔ ”پہاڑوں پر بھی اتنے خوب صورت لڑکے ہوتے ہیں۔ اتنے صاف ستھرے۔ اس کا لباس اور صورت تو کسی کالجیٹ کا سا ہے۔“

بلبیر کھل کھلا کر ہنس پڑا۔ ”تم نے شہر کی غلاظت سے باہر بھی کبھی جھانک کر دیکھا ہے اور جنگلوں میں ایسی ایسی حسین چیزیں جنم لیتی ہیں‘ ایک بار دیکھ لے تو انہی کے پیچھے دیوانہ وار بھٹکتا پھرے۔“

مدن رائے مادھو کی جسمانی ساخت‘ لباس اور معصوم کھلنڈرے خدوخال سے بے حد متاثر ہوا۔ ”پڑھا لکھا دکھائی دیتا ہے؟“

کیرتی نے جواب دیا۔ ”معمولی پڑھا لکھا ہے لیکن بہت ذہین ہے۔ ڈاک بنگلے کے ماحول سے بھانت بھانت کی بولیاں سن چکا ہے۔ اچھی باتیں جلد اپنا لیتا ہے۔“

مادھو کمرے کے باہر بیٹھ گیا۔

بلبیر کیرتی کے چہرے کا بہ غور جائزہ لیتا رہا۔ اس کا انداز گفتگو کسی خلش کی غمازی کر رہا تھا۔ مادھو کی باتیں کرتے اس کے چہرے پر یوں ہی ایک دو بار مسکراہٹ پھیل گئی تھی جس میں شاید وہ اپنی کسی داخلی کیفیت کو چھپا دینا چاہتی تھی۔ بلبیر نے اس کے چہرے سے نظریں ہٹا کر سگریٹ سلگایا اور پھر دھوئیں کے دائرے بناتے ہوئے کہا۔ ”بے موت مرنے والوں میں ایک اور حسین اضافہ.....“

ایک ساتھ ایک قہقہہ بلند ہوا اور ایک کہانی ایک قہقہے پر ختم ہو گئی۔ اس کے بعد پہاڑوں میں سے جو گونج پیدا ہوئی نہ ہی وہ کسی نے سنی اور نہ ہی وہ کانپتے ہوئے ہاتھ کسی نے دیکھے جو کیرتی نے اپنی ریشمی سلیک کی ہلکی نیلی سلوٹوں میں چھپا لیے تھے۔

رات کافی بیت چکی تھی لیکن کمرے میں لیمپ کی لو متواتر ٹمٹما رہی تھی اور قہقہوں کی آواز گونج رہی تھی اور مادھو باہر برآمدے میں لیٹا ان مہذب قہقہوں میں اپنی گنوار اجڈ قسم کی محبت کو ڈھونڈ رہا تھا۔ وہ ایک پل کے لیے بھی اپنی آنکھیں نہ موند سکا اور بوڑھا کرما اس کے قریب ہی لیٹا خراٹے لے رہا تھا۔ مادھو نے اسے آواز دے کر جگایا۔

کرما نے پوچھا۔ ”ابھی تک تمہیں نیند نہیں آئی۔ کیا بات ہے؟“

مادھو نے جواب دیا۔ ”پتا نہیں کیوں نیند ہی نہیں آ رہی۔“

”اڈے کی یاد آ رہی ہے کیا.....؟“

اس نے اپنی کہی۔ ”کیوں باپو! یہاں ڈوور صاحب کا سایہ ہوتا ہے؟“

کرما نے کھانستے ہوئے جواب دیا۔ ”سنا ہے مگر دیکھا نہیں۔ تم کیوں پوچھ رہے ہو؟ سایہ تو تم نے بھی کبھی نہیں دیکھا۔“

اس نے سہمی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ ”آج مجھے نئے ہی قہقہے سنائی دے رہے ہیں جو پہلے میں نے کبھی نہیں سنے اور پھر صاحب کی وائلن بھی ویسے ہی چیخ رہی

ہے۔"

کرمانے پہلو بدلا۔ "اندر صاب لوگ باتیں کررہے ہیں اور میم صاب خوش ہوکر ہنس رہی ہیں۔ چپ کر کے سو جا۔"

"لیکن مجھے تو موراں کی سی آواز سنائی دے رہی ہے۔"

"تم نے موراں کی آواز سنی ہے جو پہچان لی۔"

مادھو نے دبی زبان میں جواب دیا۔ "خود تو نہیں سنی تھی لیکن لوگوں سے باتیں تو سنی ہیں۔"

کرمانے کچھ کہنا چاہا لیکن کھانسی کے شدید دورے نے بات بننے نہ دی۔ دور کہیں کوئی بکروالی کتا چل چلایا جیسے اس نے کسی چیتے کی خوں خوار آنکھوں کے انگارے دیکھ لیے ہوں۔ پہلو بدلتے بدلتے آخر مادھو سو گیا۔ آج اس نے کھانا بھی تو نہیں کھایا تھا۔

☆

مدن رائے کو پا کر کیرتی نے جیسے مادھو کو اپنے دل سے دور کر دیا۔ اس کے احسان بھول گئی جن کی بہ دولت ایک نئی زندگی ملی تھی۔ وہ کن مجبوریوں میں جکڑی ہوئی تھی یہ جاننا مادھو کے لیے محال تھا' لیکن اس کی بے اعتنائی مادھو کے لیے پریشان کن تھی۔ وہ اس سے کچھ چاہتا نہ تھا' صرف اس بات کا خواہاں تھا کہ اس کی صحت اچھی رہے۔ عمر بھر صحت مند رہے۔ اسی طرح چہکتی رہے جس طرح پہلے پہاڑی پگڈنڈیوں کے پیچ وخم میں چہکا کرتی تھی لیکن اس نے خاموشی اختیار کرلی تھی۔ جب بھی بات کرتی سوچنے کے انداز میں کرتی جیسے وہ کسی فیصلہ کن نتیجہ پر پہنچنا چاہتی ہو۔

مادھو اب بنگلے کی چہار دیواری سے دور رہنے لگا تھا۔ بلبیر اور نریندر کے ساتھ دن بھر گھاٹیوں میں خرگوش اور کگڑ ڈھونڈتا پھرتا اور انہیں اپنی گولی کا نشانہ بنا کر ان کے خون سے اپنے گھاؤ بھرتا تاکہ اپنے زخم کہیں ناسور نہ بن جائیں۔ اس نے مستقل طور پر اڈے پر چلے جانے کا ارادہ ظاہر کیا تھا اور کیرتی نے اپنے منہ سے اس کے سوال کا جواب نہ دیا تھا' صرف آنکھوں ہی آنکھوں سے کہہ دیا تھا۔ نہیں..... نہیں..... جیسے زخمی کگڑ کا تعاقب کرتے ہوئے اسے محسوس ہوا تھا کہ وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں کہہ رہی تھی۔ نہیں..... اور بلبیر اور نریندر کے مجبور کرنے پر بھی وہ اس زخمی کگڑ کی راہ میں حائل نہ ہوا تھا حالاں کہ اسے زندہ پکڑ سکتا تھا یا دوسری گولی سے موت کے گھاٹ اتار سکتا ہے۔

مادھو جو کچھ دیکھ رہا تھا اسے برداشت کرنے کی طاقت زائل ہوتی جارہی تھی لیکن کیرتی کی اجازت لیے بغیر وہاں سے چلے جانا بھی مناسب نہ تھا۔ وہ عجیب سے تذبذب میں تھا۔ کوئی اس کے دل کا حال جاننے والا نہ تھا۔ اب اس کے اپنے گیت بھی دور ہو گئے تھے۔ کیرتی کی طرح انہوں نے بھی اسے تنہا چھوڑ دیا تھا۔ اس نے بلبیر کے کہنے پر کئی بار الغوزے بجانے کی کوشش کی لیکن اب اس میں جیسے وہ سانسیں ہی نہ تھیں جو آواز پیدا کرتی ہیں۔

ایک روز مدن رائے کے کہنے پر بڑے شکار کا پروگرام بنا۔ رنگڑ گڑھی کی رکھ میں شکاری پارٹی بہت دیر مچانوں پر بیٹھی رہی لیکن جنگل سے ریچھ یا دوسرا کوئی جانور باہر نہ نکلا۔ جب اندھیرا بھی پھیلنا شروع ہو گیا تو کیرتی نے واپسی کی تکرار کی۔ مدن رائے نے مادھو کو بلوایا جو دوسرے مچان پر نریندر کے ساتھ بیٹھا تھا۔

مدن رائے نے کہا۔ "اندھیرا ہو گیا لیکن کوئی چیز دکھائی نہ دی۔"

مادھو نے جواب دیا۔ "بادل چھٹ رہے ہیں' ابھی چاند نکل آئے گا اور جنگل سے کچھ نہ کچھ ضرور نکلے گا۔"

کیرتی جو مدن اور بلبیر کے ساتھ مچان پر بیٹھی تھی بولی۔ "لیکن رات کو ایسے خطرے میں پڑنے کا فائدہ ہی کیا ہے؟"

بلبیر بولا۔ "ایک گھنٹہ تک اور ٹھہر جاتے ہیں۔ شاید کچھ مل ہی جائے۔ اتنی دور آئے ہیں دیکھ لیتے ہیں۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مادھو اپنے مچان پر آ گیا۔ چاندنی اب بادلوں میں سے جھانکنے لگی تھی۔ دوسرے مچان پر ایک دھیما سا شعلہ اٹھا۔ مادھو نے دیکھا کیرتی لائیٹر سے مدن رائے کا سگریٹ سلگا رہی تھی۔ اس نے اپنی توڑے دار دیسی رفل کا نشانہ اس مختصر سے شعلہ پر باندھا۔

نریندر نے پوچھا۔ "یہ کیا کر رہے ہو.....؟"

مادھو نے اسی طرح نشانہ باندھتے ہوئے جواب دیا۔ "ایک فوجی سے سنا ہے کہ جنگ میں لڑتے ہوئے سپاہی اس طرح بھی کئی بار دشمن کو اپنی گولی کا نشانہ بناتے ہیں۔ دیکھ رہا ہوں اگر میں بھی جنگ میں ہوتا تو کیا اس شعلے کو گولی کا نشانہ بنا سکتا یا نہیں۔"

شعلہ بجھ گیا اور اس کے ساتھ ہی ایک ہلکی سی چیخ سنائی دی اور پھر سارا جنگل بندوق کی آواز سے تھرتھرا اٹھا۔ نریندر ڈر کر مادھو کے ساتھ لگ گیا۔ اس نے دیکھا ایک بوڑھے رنگ کا ریچھ چھپڑ کے قریب گر پڑا تھا۔ غیر متوقع طور پر ریچھ دوسرے مچان کے عقب سے نکلا تھا۔ مدن رائے نے ارد گرد نظریں دوڑا کر نیچے چھلانگ لگا دی۔ مادھو نے آواز دی۔ اس کے قریب جانے سے منع کیا لیکن مدن رائے ریچھ کے قریب ہی ایک درخت کے تنے سے لگ کر کھڑا ہو گیا اور دیکھنے لگا' مر گیا ہے یا ابھی جان باقی ہے۔ برقی سرعت کے ساتھ زخمی ریچھ مدن رائے پر جھپٹا۔ بندوق اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی تھی لیکن دوسری گولی نے اسے وہیں ٹھنڈا کر دیا۔ جنگل ایک بار پھر گونجا اور پھر خاموش ہو گیا۔ ریچھ کے خوں خوار پنجے میں صرف مدن رائے کے کوٹ کا ایک لمبا چیتھڑا تھا۔ کیرتی اس ہول ناک منظر کی تاب نہ لا سکی اس پر غشی طاری ہو گئی۔

مادھو اپنی مچان سے نیچے اتر آیا۔ چھپڑ میں پڑے ہوئے ریچھ کو اپنے پاؤں کی ٹھوکر لگائی اور پھر اس نے مدن رائے کو دیکھا جو شکاری ہوتے ہوئے بھی شکار کا سلیقہ نہ جانتا تھا۔ اس کی آدھی جان نکل چکی تھی۔ مادھو نے اسے جھنجوڑا۔ وہ پھٹی پھٹی سی آنکھوں سے دیکھنے لگا۔

مادھو نے کہا۔ "صاحب! ریچھ کے شکار میں اتنی جلد بازی۔ یہ کوئی کگڑ یا خرگوش تو تھا نہیں جو آپ کی نظریں دیکھ کر ہی مر جاتا۔"

بلبیر نے اپنے مچان سے آواز لگائی۔ "کیرتی کو نہ جانے کیا ہو گیا ہے اسے تو نیچے تارو۔"

مادھو نے اسے سہارا دے کر مچان سے نیچے اتارا۔ اب وہ ہوش میں تھی۔ اس نے اپنا سر مادھو کے کندھے پر رکھ دیا لیکن وہ اسے مدن رائے کے پاس لے گیا اور اونچی آواز میں کہا۔ "سنبھالیے میم صاحب کو۔"

کیرتی نے تھرماس میں سے پانی کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ حلق سے نیچے اتارتے ہوئے کہا۔ "اچھا شکار کھیلا۔ دعائیں دو مادھو کو ورنہ آج جنگل ہی میں ارتھی اٹھتی سب کی۔"

مدن رائے نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ "مادھو جان تو بچ گئی تمہاری بہ دولت' لیکن اب اس بھوت کو بنگلے تک کیسے پہنچائیں.....؟ ایسا خالم ریچھ تو میں نے پہلی بار دیکھا جو مردہ حالت میں بھی کسی پر جھپٹ سکتا ہے حالاں کہ میری گولی بھی بیچ سینے میں لگی ہے۔"

مادھو ہنسا۔ "سرکاری پنڈت بتاتا ہے ریچھ کی بھی آدمی کی طرح بہت سی قسمیں ہوتی ہیں۔ آپ کا آج تک شاید کسی شریف قسم ہی سے پالا پڑا ہے۔"

مدن رائے کیرتی سے باتیں کرنے لگا جن کا تعلق اس کی اپنی شجاعت سے تھا۔ کسی پہلے سیزن کے شکار کی باتیں تھیں اور بلبیر ٹکٹکی لگائے مادھو کے خاموش چہرے کو دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا یہ مادھو نہیں یہ جانگلی بھی نہیں۔ اس کی حقیقی تصویر وہ نہیں جو دکھائی دے رہی ہے۔ یہ صرف ایک دھندلا سا ٹیلا خاکہ ہے جو ایک چٹان سے ابھر رہا ہے' ابھارا جارہا ہے اور یہ کسی وقت بھی کسی مخصوص انداز میں ظاہر ہو سکتا ہے۔ ایسا انداز جو اس کا اپنا نہ ہوگا وہ زمانے کے حادثوں کا مرہون منت ہوگا۔ خاکے کے منحنی

سے خطوط ابھر رہے تھے' پھیل رہے تھے' مٹ رہے تھے لیکن اس میں جس دھنک کی بلبیر کو تلاش تھی وہ ابھی نہ بنی تھی لیکن اس کا عکس ان مہین لکیروں میں پنہاں تھا۔

ریچھ پر گھاس پھونس ڈال کر شکاری پارٹی نیچے اترنے لگی۔ چند گز کا فاصلہ نہایت خطرناک تھا۔ کیرتی کو جیسے مدن رائے پر اعتماد نہ رہا تھا۔ وہ مادھو کا ہاتھ تھامے چل رہی تھی۔ جنگل کی حدود سے باہر نکل کر بلبیر اور مدن خرگوش کا تعاقب کرتے دور آگے نکل گئے۔ نریندر ان کے پیچھے پیچھے تھا۔

مادھو نے کیرتی سے کہا۔ "چاندنی نے رات کو دن بنا ڈالا ہے۔ دوڑ لگا کر اپنے صاحب کو پکڑ لو۔ اب کوئی خطرے والی بات نہیں۔"

کیرتی نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ "کیوں.....؟"

"معلوم ہو جائے کہ ضرورت پڑنے پر آپ ایسا کر سکیں گی۔"

"میں تمہارا مطلب نہیں سمجھی۔"

اس نے بات پھیر دی۔ "آپ کا صاحب بھی آپ کی طرح اناڑی ہے۔"

"کیسے.....؟"

"اس نے مرنے کی ٹھان لی تھی۔ وہ تو بچ گیا لیکن آپ....."

اس نے اپنا فقرہ پورا نہ کیا۔ بھاگتے ہوئے خرگوش پر بندوق کا نشانہ باندھا۔

کیرتی اچھل پڑی۔ "چلا دو۔"

مادھو نے اسی طرح ایک آنکھ کیے اسے دیکھا۔

"کیوں.....؟"

"گولی چلا دیتے..... مزا آ جاتا۔"

اس نے بندوق کندھے پر ڈالی۔ "اگر بھورے ریچھ کے پنجے میں آپ کا صاحب مر جاتا' آپ پڑھی لکھی ہیں' تصویریں بناتی ہیں' بہت کچھ دیکھا سنا ہے اس کے جرنے پر صرف اس لیے مزا آ جاتا کہ یہ خرگوش ہے' ایک غریب جانور بے چارا۔"

کیرتی سر جھکائے نیچے اتر گئی۔

رات بھر شکار کی باتیں ہوتی رہیں۔ کیرتی تھک گئی تھی۔ وہ جلدی سو گئی لیکن مادھو ساری رات کروٹیں بدلتا رہا۔ اس کے دل میں رہ رہ کر ایک ہی سوال ابھرتا کہ اگر اسے سوچنے کا وقت ملتا تو کیا وہ مدن رائے کو موت کے پنجے سے چھڑاتا' لیکن دوسرے ہی لمحے وہ اپنے رکیک احساس کو کوستا۔ مدن رائے بے قصور تھا۔ اس سے کیا دشمنی؟ وہ دیر تک خلا ہی میں بھٹکتا رہا۔

☆

شکار کے اس خوف ناک حادثے کے بعد مادھو مدن رائے کے قریب آ گیا۔ اسے ساتھ ساتھ رکھتا۔ دن بھر اس کے ساتھ گرد و نواح کی پہاڑی گولائیوں اور سلوٹوں میں گھومتا رہتا۔ وہ اس کا رازدار بھی تھا۔ اپنے دل کی باتیں مادھو کو سنا لیا کرتا۔

مدن رائے کو پا کر جیسے کیرتی کو ان گنت خوشیاں مل گئی تھیں۔ کچھ بھی ہو وہ اس کا منگیتر تھا اور اسی کو اپنا شریک حیات بنا کر جہاں اپنے والدین کی عزت و توقیر کو بچا سکتی تھی وہاں شام بن کی سوئی ہوئی مسکراہٹوں کو بھی از سر نو زندہ کر سکتی تھی۔ مادھو کے متعلق اس کے دل میں اب بھی جگہ تھی۔ اسے اب بھی احسان مندانہ نگاہوں سے دیکھتی تھی۔ اس کے قریب بیٹھ کر اب بھی کیرتی کا دل دھڑکتا تھا۔ اس کی معصوم مسکراتی ہوئی صورت سے اب بھی پیار تھا۔ اسے پسند کرتی تھی' جس روپ کو وہ پسند کرتی تھی لیکن اس سے آگے کبھی نہ سوچا تھا' اگر ایسا کرنے کی کبھی کوشش بھی کی تھی تو کسی آخری فیصلے پر نہ پہنچ سکی تھی۔ اسے ایک خوشی ضرور تھی کہ مادھو مدن رائے کے دل میں اتر گیا۔ مادھو خاموش ہو گیا تھا لیکن اس کے چہرے پر ایک ابدی کش مکش کے آثار نمایاں تھے۔

کرما کی ابدی کھانسی اب کم ہی سنائی دیتی تھی۔ وہ صبح سویرے ہی چلا جاتا اور رات گئے گھر لوٹتا۔ وہ مادھو کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لیے ایک خوب صورت پہاڑن کی تلاش میں تھا۔ روزمرہ کی طرح وہ کسی گاؤں میں گیا ہوا تھا اور رات کو دیر سے آنے کو کہہ گیا تھا اور مادھو بھی مدن رائے کے کہنے پر نئے ڈاک بنگلے کو چلا گیا تھا اور وہاں سے شراب کی بوتلیں خرید لایا تھا۔ کیرتی نے اس سے پوچھا لیکن وہ ٹال گیا۔ مدن رائے عادتاً پیتا تھا لیکن وہاں اپنے قیام کے دوران اس نے ایک گھونٹ تک بھی نہ پیا تھا کیوں کہ کیرتی پسند نہ کرتی تھی لیکن اب وہ کیرتی سے چوری چوری اپنی خواہش پوری کرنا چاہتا تھا۔ جب شراب کی بوتلیں اس نے منگوا ہی لیں تو کیرتی نے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا لیکن وہ ان کے کمرے میں نہ بیٹھی۔ اپنے کمرے میں جا کر اکیلی بیٹھ گئی۔

بہت دیر بعد مادھو نشہ آلود محفل میں گیا۔ "میں نہیں پیتا۔ ایک بار پہلے بھی اڈے پر پینے کی کوشش کی تھی۔ پی نہیں سکا تھا۔ کڑوی زہر لگی۔"

نریندر نے ہچکی لیتے ہوئے کہا۔ "وہ شراب نہیں تھی ٹھرہ تھا۔ اس میں بو ہے نہ کڑواہٹ' صرف نیند گھلی ہوئی ہے۔ چند گھونٹ پیتے ہی گہری نیند سو جاؤ گے۔"

مادھو نے کئی راتیں پہلو بدلتے ہی کاٹی تھیں۔ آنکھ لگ بھی جاتی عجیب عجیب سے ڈراؤنے خواب اسے ڈرا کر چونکا دیتے۔ اس نے سوچا آج باپو بھی گھر پر نہیں ہے چلو پی کر رات کو آرام و سکون کی نیند سو جاؤں گا۔ وہ دیوار کا سہارا لے کر فرش پر ہی بیٹھ گیا۔ نریندر کی بات اس کے دل کو چھو گئی تھی۔

بلبیر نے پوچھا۔ "سوچ رہے ہو کہ واقعی شراب میں نیند گھلی ہوئی ہے۔"

مادھو آنکھیں جھکائے بیٹھا رہا۔

بلبیر نے ڈوبی ہوئی آواز میں کہا۔ "لیکن کب تک اپنی آنکھوں کو بہلا پھسلا کر بند کرنے کی کوشش کرتے رہو گے۔ کب تک اپنے آپ کو دھوکا دو گے۔ دھوکا دینے کے لیے کہاں سے لاؤ گے شراب؟ کہاں سے لاؤ گے پیسے؟ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ اپنے بے جان فقیر سے ساتھیوں سے اپنی نیند اپنے سکون کی بھیک مانگ لے جیسے پہاڑی گیت ہوئے' جنگل کی خاموشی ہوئی' جیسے پہاڑی نالے کی روانی کا مسلسل شور ہوا۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم اپنے الفوزے بجاتے بجاتے نیند کی آغوش میں چلے جاؤ۔"

مادھو خاموش رہا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے انگریزی شراب کی بوتل تھی اور شراب سے بھرے ہوئے گلاس تھے۔

مدن رائے نے بہکے ہوئے انداز میں رک رک کر کہنا شروع کیا۔ "جو کچھ پروفیسر بلبیر کہہ رہا ہے وہ بھی کسی حد تک درست ہے' جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہ بھی کسی حد تک درست ہے اور جو تم سوچ رہے ہو وہ بھی کسی حد تک درست ہے۔ اب تم پی کر فیصلہ کرو' ہم تینوں میں سے زیادہ صحیح کون ہے؟"

مادھو کی آنکھوں کے سامنے بجلی سی کوند گئی۔ اس نے آنکھیں بند کر کے ایک ہی سانس میں بھرا ہوا گلاس خالی کر دیا۔ خالی گلاس کو دوبارہ بھر کر اسے بھی حلق سے نیچے اتار دیا اور پھر سگریٹ کا کثیف دھواں بھی نگلنے لگا۔ کبھی کبھی اپنے ساتھیوں کے ساتھ حقہ پی لیتا تھا لیکن انگریزی شراب اور قیمتی سگریٹ کے سرور نے جیسے سارے جہان کی جنتیں مہیا کر دیں۔ وہ پہلی بار اپنی روٹھی ہوئی زندگی پر مسکرایا۔ پہلی بار اس نے اپنی زندگی کا ان صاحبوں کے ساتھ موازنہ کیا جو خاص قسم کی پریوں کی کہانیاں بیان کر رہے تھے۔ پریاں جو اپسراؤں کی طرح رقص کرتی ان کی زندگی میں آتی تھیں۔ کہانیاں مختصر تھیں بے لطف اور غلیظ تھیں لیکن کہانیاں تھیں۔ مادھو سنتا رہا۔ خاموش بیٹھا چھوٹے چھوٹے گھونٹ پیتا رہا۔

اسے فرش پر اکڑوں بیٹھے دیکھ کر مدن رائے نے کہا۔ "آج سے تم ہمارے دوست ہو کیوں کہ تم نے ہمارے ساتھ پی۔ آؤ..... صوفے پر ہمارے ساتھ بیٹھو۔ تم بہت ہی خوب صورت ہو اور خوب صورت معصوم لوگوں....."

وہ رک گیا۔ لہجہ بدل کر بلبیر سے مخاطب ہوا۔ ”پروفیسر! آج مادھو کو بھی صاحب بہادر بنا دیتے ہیں۔“

بلبیر آرام کرسی سے اٹھا اور اپنا ایک نیا سوٹ مادھو کو دے دیا۔ چند لمحوں میں سفید ریشمی قمیص ہلکے نیلے رنگ کی امریکن ٹائی اور گہرے نیلے رنگ کا سوٹ اسے پہنا دیا گیا اور صاحب بہادر بنا کر صوفے پر بٹھا دیا اور پھر نئے سرے سے شراب کا دور شروع ہوا۔ نریندر اس کھیل سے فارغ ہو کر چپکے سے کسی سے ملنے چلا گیا اور مدن رائے بلبیر کو اس پہاڑی لڑکی کی بات سنانے لگا جس نے اس کے منہ پر تھپڑ دے مارا تھا اور پھر ایک دم مسکرا کر اس کا ہاتھ چوم لیا تھا جس میں دس روپے کا ایک نیا نوٹ تھا۔ مدن رائے مزے لے لے کر بار بار ایک ہی کہانی دہرا رہا تھا۔ پہاڑ کی صحت مند جوانیوں کے گداز جسموں کی لرزشیں بیان کر رہا تھا۔ سگریٹ کے کش لگا رہا تھا اور بلبیر اس لمحے کے انتظار میں تھا جب مادھو کہانی سنتے سنتے زندہ ہو جائے اس کا خون کھولنے لگے۔ حقیقی پہاڑی جذبہ امڈ آئے اور ایک زور کا تھپڑ مدن رائے کے منہ پر مار کر اور نیا لباس نوچ نوچ کر اپنے جسم سے علیحدہ کر دے اور ننگ دھڑنگ دیوانہ وار قہقہے لگائے..... چیخے چلائے..... درحقیقت میں یہ ہوں۔ آج سے دس ہزار برس پہلے بھی یہی تھا۔ اس کے بیچ بھی یہی رہا اور اب دس ہزار برس بعد بھی یہی ہوں۔ یہی حقیقی ازلی خالص انسان..... لیکن وہ لمحہ پیدا نہ ہوا جس کا بلبیر کو انتظار تھا۔ وہاں صرف دس روپے کا ایک نیا کورا نوٹ کھڑکھڑا رہا تھا اور اس کی آواز پر مدن رائے ایک بہت پرانی داستان نئے سرے سے دہرا رہا تھا۔ لڑکی خوب صورت تھی۔ غریب تھی۔ لڑکا جوان تھا۔ امیر تھا اور مدن رائے اپنے اس ہاتھ کو بار بار اپنے ہونٹوں سے لگا رہا تھا جو اس پہاڑن نے چوم لیا تھا اور مادھو اپنی سدھ بدھ گنوا کر ایک فحش فلمی گانا گا رہا تھا جو اس نے نتھا سنگھ ڈرائیور سے اکثر سنا تھا جسے وہ شراب پینے سے پہلے لاری کی چھت پر بیٹھ کر بلند سر میں گایا کرتا تھا۔

جب رات آدھی سے زیادہ گزر گئی تو آیا نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ اسے دیکھ کر سب خاموش ہو گئے لیکن مادھو مدہم سر میں گاتا رہا۔ آیا اس کی آواز پہچان کر ٹھٹک گئی۔

مدن رائے نے لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”نیا مادھو ہے۔ پرانا مادھو مر گیا۔“

بلبیر نے بھی اپنی کہی۔ ”مدن سچ کہہ رہا ہے۔ یہ نیا مادھو ہے پرانا مادھو مر گیا۔“

مادھو نے ان دونوں کے فقرے دہرائے۔ ”ہاں پرانا مادھو مر گیا۔ رگھوگڑھی کی چاندنی میں جس کے لیے اس کا بوڑھا باپ کسی پہاڑن کو ڈھونڈنے گیا ہوا ہے جو پتا نہیں کب کی پہلے ہی بک چکی ہوگی۔“

آیا نے باہر جا کر کیرتی سے بات کی۔ اس نے مادھو کو بلوا بھیجا۔ بڑی مشکل سے مدن رائے نے اسے کمرے سے باہر دھکیلا۔ کیرتی باہر دروازے پر کھڑی تھی۔ اس حالت میں مادھو کو دیکھ کر بپھر گئی۔ بازوؤں سے پکڑ کر اسے اچھی طرح جھنجوڑا۔

”تم نے شراب پی.....؟“

مادھو نے ہچکی لی۔ ”شراب نہیں پی، وہسکی پی ہے۔ نریندر صاحب کہتا ہے وہسکی میں نیند گھلی ہوئی ہے۔ آج مجھے نیند آ جائے گی۔ آرام سے سو جاؤں گا۔“

کیرتی نے اسی لہجے میں پوچھا۔ ”یہ سوٹ کس نے دیا.....؟“

مادھو نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ ”صاحب نے۔ ایک صاحب نے سوٹ بخش دیا۔ دوسرے صاحب نے پہنایا اور میں صاحب بہادر بن گیا۔“

کیرتی نے اس کے منہ پر زور کا تھپڑ مارا۔ تھپڑ پڑتے ہی جیسے وہ ہوش میں آ گیا۔ اس نے اپنی مری ہوئی آنکھوں سے کیرتی کو پہچانا۔ اس کے بازوؤں میں ایک دم برقی رو پیدا ہوئی۔ اس نے کیرتی کی کلائی کو اپنی گرفت میں لے لیا اور اسے کھینچتا ہوا ڈاک بنگلے کے باغیچے میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لے آیا جہاں گھپ اندھیرا تھا۔

کیرتی نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”ہوش میں ہو۔“

مادھو نے اس کے چہرے کو اوپر اٹھایا جو غصے سے تمتما رہا اور اپنے ہونٹ اس کے لرزتے ہوئے نم ناک لبوں کے قریب لا کر سرگوشیانہ انداز میں کہا۔ ”میں نے کیا ہے۔ میں نے پی ہے وہسکی۔ تمہارے صاحب کی خوشی سے میں وہسکی پیوں۔ یہ کپڑے پہنوں اور صاحب بہادر جاؤں۔ تم اپنے صاحب کو کیوں نہیں منع کرتیں؟ مجھے یوں روکتی ہو۔ اس لیے کہ میں تمہارا نوکر ہوں، ایک گی ہوں۔ دل کرتا ہے تمہارا گلا اپنے ہاتھوں سے دبوچ اور تمہاری لاش جنگل میں پھینک کر خود پہاڑی نالے چھلانگ لگا دوں۔ اپنی ماں کی طرح..... تمہیں پتا ہے ری ماں نے چھلانگ لگا کر آتما ہتیا کیوں کی تھی؟ کیوں جان دے دی تھی؟“

اس نے اتنی سختی سے کیرتی کے منہ کو دبوچ رکھا تھا کہ کیرتی کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے لیکن زبان بند ۔ اس نے آواز تک نہ نکالی۔ دونوں ایک دوسرے قریب کھڑے تھے۔ ایک دوسرے کا لمس محسوس رہے تھے۔ ایک دوسرے کی سانسوں کو اپنے ہونٹوں جذب کر رہے تھے۔ یکبارگی ڈوبتے ہوئے مادھو کو کنارا مل گیا۔ ایک زور کا جھٹکا دے کر اس نے کیرتی پنے سے دور کر دیا۔

کیرتی دوبارہ اس کے قریب آ گئی۔ ”تمہیں نیند کیوں آتی؟“

دھو نے رندھی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ ”مجھے معلوم لیکن ایک بات ضرور ہے کہ اگر ایک دو راتیں ایسی تیں تو صاحب میرے ہاتھ سے مر جائے گا۔“

کیرتی کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ ”کون صاحب؟“

مدن صاحب!“

کیرتی پر لرزہ طاری ہو گیا۔ ”مادھو.....!“

میں جھوٹ نہیں بول رہا۔“

”لیکن کیوں.....؟ اس نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟“

”مجھے یہ بھی معلوم نہیں۔“

کیرتی چیخی۔ ”پھر اسے موت کے منہ سے بچایا کیوں تھا؟“

”اس لیے کہ تمہارا اس سے بیاہ ہو رہا ہے۔“

”مادھو.....!“ آواز کیرتی کے گلے میں پھنس کر رہ گئی۔

وہ اس کے اور قریب ہو گئی جیسے چاہتی ہو کہ وہ دوبارہ اسی سختی سے اس کا منہ اپنے ہاتھوں سے دبوچ لے لیکن مادھو وہاں سے چلا گیا اور برآمدے میں جا کر لیٹ گیا اور کیرتی بت بنی وہیں کھڑی رہی۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ مادھو جیسا انسان دوست کبھی مدن رائے کے متعلق ایسا خیال بھی کر سکتا ہے۔ یہ محبت تھی۔ ایک جانگلی کی اکھڑ محبت، لیکن اس کا انجام اور پھر جذبۂ انتقام جنگل کی طرح کتنا مہیب اور وحشت ناک ہوگا۔

کیرتی دبے پاؤں مادھو کی طرف بڑھی۔ وہ اوندھے منہ چارپائی پر پڑا ہوا تھا۔ اس کا سر سہلاتے ہوئے کیرتی نے پوچھا۔

”کھانا نہیں کھاؤ گے؟“

مادھو نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

کیرتی نے اپنی ساڑھی سے اس کے آنسو پونچھے اور اس پر کمبل ڈال کر اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔ بلبیر دروازے سے لگا کھڑا تھا۔ ہوش و حواس قائم تھے۔ وہ تقاضے پر پینے کا عادی تھا۔ وہ بھی گھونٹ کے حساب۔ کیرتی جانتی تھی پھر بھی وہاں اسے کھڑے دیکھ کر کانپ گئی۔

”تم یہاں کیا کر رہے ہو.....؟“

کمرے میں گھٹن تھی یہاں چلا آیا، لیکن تم گھبرائی ہوئی کیوں ہو؟“

بلبیر نے المیہ داستان کا آخری منظر دیکھا تھا لیکن خیالوں ہی خیالوں میں داستان کا درمیانی حصہ عبور کر کے اس کے ابتدائی اوراق بھی پڑھ لیے تھے۔ کیرتی نے اسے

سہمی ہوئی نظروں سے دیکھا اور کمرے میں داخل ہو کر دروازہ بند کر لیا۔ آج وہ جی بھر کر رونا چاہتی تھی۔

ساری وادی سو گئی۔ ڈوور صاحب کا بنگلہ بھی اونگھنے لگا لیکن مادھو آج بھی نہ سو سکا جو خواب اور غنودگی اسے ملی تھی وہ جیسے آنسوؤں سے دھل گئی۔

جب کرما لوٹا' رات دم توڑنے والی تھی اور مادھو اپنی چارپائی پر اکڑوں بیٹھا اپنی بے منزل کی سوچوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ نشے نے دوبارہ اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔

کرما کو دیکھ کر وہ لڑکھڑاتا ہوا اٹھا اور اس کی طرف لپکا۔

"پہچان جاؤ باپو تو چندی کا ایک روپیہ انعام۔ وہ فرق ورق سب دریا میں ڈوب گیا جس سے ہم ہمیشہ ڈرتے آئے ہیں۔ آج میں نے وہسکی پی اور موراں سے جی بھر کر باتیں کر لیں۔ تم بھی تھوڑی سی پی لو اور ڈوور صاحب کی روح سے باتیں کرنا۔ میں نے کملی چاچا کی بات نہیں کی۔ تم دکھی ہو جاتے ہو باپو! میں بھی بڑا دکھی ہوں' بڑا دکھی....." اس نے ہچکی لی اور وہیں بیٹھ گیا۔

کرما اسے ایسی حالت میں دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا۔ جو بیڑی تک کو ہاتھ نہ لگاتا تھا آج نشے میں دھت بک رہا تھا۔ وہ جہاں کھڑا تھا وہیں چپکے سے بیٹھ گیا۔ مادھو چارپائی پر بیٹھا ہانپ رہا تھا۔

مادھو دبی زبان میں کہہ رہا تھا۔ "باپو! ہمارے گھر میں جو بھی آتا ہے لوٹنے کھسوٹنے آتا ہے یا لٹانے۔ صرف بانٹنے اور ہم صرف منہ دیکھتے ہیں اور جانے والے پردیسی ہم پر ترس کھا کر چند پیسے پھینک جاتے ہیں اور کئی دن ان پیسوں کو اچھال اچھال کر ہم خوش ہوتے ہیں۔ آج میں نے بھی لوٹا' لوٹا اور لٹایا..... لوٹا اور لٹایا....."

کرما کے منہ سے بے ساختہ چیخ نکل گئی۔

"کیسے.....؟"

مادھو زیر لب مسکرایا۔ "اپنے ہی من کو باپو اپنے ہی من کو۔ وہ میم صاحب رو رہی تھی اور صاحب لوگ ہنس رہے تھے۔ میں بھی مل گیا ان سب میں۔ عجیب سی لوٹ تھی۔ بالکل کملی چاچی کی کہانیوں کی طرح۔ تم خفا ہو جاتے کملی چاچی کے نام پر' لیکن تھی ویسی ہی لوٹ اور میں اس لوٹ میں شریک ہو گیا۔ تم بھی پی لو۔ رات آرام سے کٹ جائے گی۔"

کرما کے بوڑھے ہاتھوں میں جیسے فولاد کی سی سختی ہو گئی۔ اس نے مادھو کو جی بھر کے پیٹا۔ جب تھک گیا تو اسے گھسیٹ کر چارپائی پر پھینک دیا لیکن اس نے تک نہ کی۔ وہ مار کھاتا رہا۔ جیسے اس میں بولنے یا احتجاج کرنے کی سکت ہی باقی نہ تھی۔

رات بھر کرما اس کے قریب ہی چارپائی پر بیٹھا رہا۔ اپنے ہاتھوں کو کاٹ کھاتا رہا۔ اس نے پہلی بار اتنی شدت سے پیا تھا۔

☆

دوسری صبح کیرتی معمول سے پہلے ہی جاگ گئی۔ رات کو وہ آرام کی نیند نہ سو سکی تھی۔ نریندر اور بلبیر سویرے ہی جنگلی مرغ کے شکار کے لیے چلے گئے تھے۔ مادھو ابھی تک سو رہا تھا۔ کیرتی نے کرما کو آواز دی۔ اسے دیکھتے ہی دونوں ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

کیرتی نے پوچھا۔ "کیا ہوا' تم اتنے پریشان دکھائی دیتے ہو؟"

وہ گڑگڑا کر معافی مانگنے لگا۔ "رات کو مادھو نے مجھ سے کچھ الٹی سیدھی باتیں کیں اس کے لیے معافی کا خواستگار ہوں' پھر کبھی ایسی ویسی بات نہیں کرے گا۔"

کیرتی نے گمبھیر سر میں کہا۔ "ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ اس نے پہلی اور آخری بار نشہ کیا۔ اب ہم جتنے دن یہاں رہیں گے تمہیں کسی سے شکایت کا موقع نہ ملے گا۔"

مدن رائے بھی کیرتی کے قریب آ گیا۔ اس نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

"کیا ہوا.....؟"

کیرتی نے جل کر جواب دیا۔ "تم نے شراب نہ پینے کا وعدہ کیا تھا لیکن اسے بھول گئے اور رات کو جوا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں تم سے بات کرنا بھی پسند نہیں کرتی اور اس جانگلی کو کھجورات کو صاحب بہادر بن بیٹھا تھا۔"

مدن رائے نے خفیف ہو کر جواب دیا۔ "یوں ہی موڈ بن گیا تھا۔ میں جانتا تھا تم برا مان جاؤ گی لیکن عادت سے مجبور ہوں۔ تم تو جانتی ہی ہو۔"

"لیکن تم نے مادھو کو کیوں گھسیٹا.....؟"

وہ خاموش رہا۔

کیرتی باغیچے میں جا کر ٹہلنے لگی جہاں چوکیدار پھولوں کی چھوٹی چھوٹی کیاریوں میں گوڈی کر رہا تھا۔

دوپہر کو وہ ڈاب پر نہانے گئے۔ بلبیر اور نریندر ابھی شکار سے نہ لوٹے تھے۔ مادھو جب اٹھا دھوپ اس کی چارپائی پر آ پہنچی تھی۔ اس کے سارے جسم سے ٹیسیں سی اٹھ رہی تھیں۔ رات کا نیا سوٹ اس نے اتار پھینکا۔ وہی دھوتی اور پتلون زیب تن کی جو کیرتی نے اسے بنوا دی تھی۔ نہانے کا سامان کندھے پر پھینک کر اسی پگڈنڈی پر چل دیا جس پر مدن رائے اور کیرتی جا رہے تھے۔ مادھو کو دیکھ کر مدن رائے کیرتی کو پیچھے چھوڑ کر خود اجلی اجلی دھوپ میں دوڑتا ہوا آگے نکل گیا۔ اب مادھو کیرتی کے قریب آ پہنچا تھا۔ اس کی آنکھوں میں اب تک رات کا خمار اور غنودگی تھی۔

کیرتی نے بڑے تیز لہجے میں کہا۔ "صاحب بہادر! وہ ریشمی سوٹ کیوں اتار دیا۔ تم تو کسی سے بخشش لینا ہی پسند نہیں کرتے تھے۔"

اس نے اپنی آنکھیں جھکا لیں جیسے رات کی اپنی حرکتوں پر بے حد پشیمان ہو۔

"آج میں تمہیں اپنے ہاتھوں سے پلاؤں گی۔ پیو گے رات کو تمہیں بہکے ہوئے دیکھ کر مجھے ایک کہانی یاد آئی۔ وہ کہانی سناؤں تمہیں تمہاری کملی چاچی کی کہانیوں کی ہی ایک کہانی ہے۔ سنو گے؟"

وہ جلدی جلدی آگے نکل گیا اور مدن رائے کو جا لیا۔ ڈاب پر پہنچ کر مدن رائے نے پوچھا۔ "مادھو یار! ڈاب کا پانی زیادہ گہرا تو نہیں؟"

اس نے نفی میں زور سے سر ہلایا۔

کیرتی اور مدن رائے نے نہانے کا لباس زیب تن کیا اور پھر ڈاب کے کنارے کنارے گیلی ریت پر دوڑتے رہے۔ ایک دوسرے کو گدگداتے رہے۔ کبھی کبھی وہ ایک دوسرے کو ریت پر گرا دیتے۔ ایک دوسرے پر گر جاتے۔ سفید چٹے' متناسب اعضا' بیلے کی چاندنی جیسی نرم نرم گوری گوری معطر دھوپ میں آبشار کی طرح تیز سیدھے ڈاب میں کود پڑے۔ مادھو ان کے کھیل کی لطافتوں میں شریک نہ تھا۔ اسے وہ کہانیاں بھی یاد نہ آ رہی تھیں جو اس بیلے سے متعلق تھیں۔ وہ اپنے سر کو ٹھنڈے پانی کے چھینٹے دے رہا تھا۔ رات کی گھٹن اور غنودگی کا احساس اس کے دماغ سے ابھی تک زائل نہ ہوا تھا۔ کبھی کبھی ان دونوں کو ڈاب میں تیرتے اور ایک دوسرے پر چھینٹے اڑاتے ہوئے دیکھتا اور پھر اپنے سر پر پانی ڈالنے لگتا۔ کھیل مادھو کے لیے نیا نہ تھا وہ چھینٹے بھی اس کے لیے نئے نہ تھے' سفید چٹے جسم بھی نئے نہ تھے۔ وہ ایسے لوگوں کے ساتھ سیکڑوں بار ڈاب پر آیا تھا اور انہیں ایسے کھیل کھیلتے دیکھا تھا البتہ اس کے لیے مدن رائے نیا تھا۔ کیرتی بھی نئی تھی۔ وہ خود بھی آج نیا تھا۔ وہ ڈاب میں اتر گیا اور اپنا سر پانی کے چھل کے نیچے رکھ دیا۔ دفعتہً اس کے کانوں میں ایک ہلکی سی چیخ کی بھنک پڑی۔ پیچھے مڑ کر دیکھا۔ کیرتی تیز دھارا کی زد میں آ چکی تھی اور مدن رائے اسے بچانے کے لیے اسی طرف بہتا چلا جا رہا تھا۔ پھر وہ بھی اسی تیز دھارا کی لپیٹ میں آ گیا۔ تھوڑی دور ہی تنہائی کا بہاؤ تھا۔ مادھو ڈاب کے کنارے کنارے دوڑنے لگا۔ دوڑتے دوڑتے جیسے اسے سوچنے کا وقت مل گیا اس کے دل میں رقابت کے جذبے کے زیر اثر ایک خیال پیدا ہوا کہ وہ ان دونوں کو بہہ جانے دے جنہوں نے اس کا سکون اور قرار چھین لیا ہے' لیکن مدن رائے کنارے پر لگ گیا تھا اور کیرتی نیچے ہی نیچے بہتی چلی جا رہی تھی۔ مادھو کو ایک جھٹکا سا لگا۔ وہ

ایک دم رک گیا اور کسی دوسری طاقت کے زیر اثر دریا میں چھلانگ لگا دی اور چند لمحوں کے بعد کیرتی کو اپنے کندھوں پر اٹھا کر کنارے کی خشک ریت پر پھینک دیا۔

مدن رائے ایک دریائی پتھر پر پیٹ کے بل لیٹ گیا تھا وہ کیرتی کی زندگی سے نا امید ہو چکا تھا لیکن وہ زندہ تھی۔ ہوش میں تھی۔ مادھو نے اسے ریت پر اوندھے منہ لٹایا اور اپنی گیلی قمیص سے اس کا جسم پونچھنے لگا۔ مدن رائے بھی اس کے قریب ہی گرم گرم ریت پر اوندھے منہ لیٹ گیا۔ کیرتی جیسے سو گئی تھی۔ اس کے نیم عریاں گیلے جسم کو خشک ریت کے چاندنی کی طرح چمکتے ذروں نے چھپا لیا تھا۔

مادھو دیر تک ان دونوں کے پاس بیٹھا رہا حتیٰ کہ دوپہر ہونے پر نریندر اور بلبیر بھی آ گئے۔ انہیں آتے دیکھ کر اس نے مدن رائے کا گاؤن کیرتی کے نیم عریاں جسم پر ڈال دیا۔

کیرتی خاموش اسی طرح لیٹی رہی۔

بلبیر نے پوچھا۔ ”کیا ہوا......؟“

مادھو نے جواب دیا۔ ”پانی کے بہاؤ میں آ گئے تھے۔“

”پھر کیا ہوا......؟“

”میں باہر نکال لایا۔“

”کیسے......؟“

مادھو خاموش رہا۔

بلبیر نے دوبارہ پوچھا۔ ”کیسے......؟“

”میم صاحب کو۔“

”اور مدن رائے......؟“

”صاحب خود کنارے پر لگ گیا تھا۔“

بلبیر نے کنارے پر کھڑے ہو کر ٹھہرے ہوئے دریا کی ڈاب کی نیلگوں گہرائیوں میں جھانکا جن کے متعلق مشہور تھا کہ وہ ہر خوب صورت چیز کو اپنی تہوں میں چھپا لیتی ہیں۔ کیرتی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے بلبیر سے پوچھا۔

”تم کیا دیکھ رہے ہو......؟“

بلبیر نے سنجیدہ لہجے میں جواب دیا۔ ”سنا ہے پہاڑوں کی بھری دوپہر میں ڈاب کی گہرائیاں خوب صور روحوں کی رقص گاہ بن جاتی ہیں۔ شاید مجھے بھی کوئی دکھ دے۔“

کیرتی جیسے اس بے معنی فلسفے سے جل گئی۔ ” گہرائیوں میں ڈوب کر دیکھ لو۔“

مادھو نے ایک وحشی قہقہہ لگایا۔ پہاڑوں میں ایک بار گونج پیدا ہوئی اور ڈاب کی گہرائیوں میں ڈوب گئی۔

کیرتی مادھو سے مخاطب ہوئی۔ ”تمہیں کیا ہوا؟“

جواب بلبیر نے دیا۔ ”جو کچھ میں نے کہا وہ سچ مادھو نے آج خوب صورت روحوں کا رقص دیکھا ڈاب کی گہرائیوں میں اتر کر کیوں مادھو......؟“

مادھو نے کیرتی کو دیکھا اور اپنی پنڈلیوں پر جمی ریت ہاتھ سے کریدنے لگا۔

کافی دیر کے بعد مدن رائے نے زبان کھولی۔ ”ما تمہیں اتنی آوازیں دیں لیکن تم نے ایک بھی نہیں سنی پھر بجائے ڈاب میں کودنے کے کنارے پر ہی بت کھڑے رہے۔“

مادھو نے کیرتی کو دیکھا لیکن اس نے اپنی نظریں لیں، جیسے وہ جانتی تھی کہ مادھو کے دل میں کون سا پرورش پا رہا تھا۔ قدرے توقف کے بعد جواب دیا۔

”دراصل میری سمجھ میں ہی کچھ نہیں آیا۔ میں نے آپ کھیل رہے ہیں جب مجھے معلوم ہوا کہ سچ سچ آ رہے ہیں، میں کود پڑا مگر اس وقت تک آپ کو کنارا تھا۔ صرف میم صاحب خطرے کے پاس تھیں۔ میں یاری والے کا نام لیا اور کود پڑا۔“

نریندر نے پوچھا۔ ”یہ یاری والا کون ہے؟“

”یاری والا پیر جو اوپر گھاٹی پر ہے۔“

”لیکن تم تو ہندو ہو، پیروں سے تمہارا کیا واسطہ؟“

مادھو ہنسا۔ ”پیر فقیر سب کے ہوتے ہیں۔ وہ س سنتے ہیں، سب کی مدد کرتے ہیں۔ یاری والے نے بھی مدد کی ورنہ میم صاحب تو تیز بہاؤ میں پھنسنے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھیں۔“

مادھو کی بات ایک مختصر سے مخلوط قہقہے پر ختم ہو گئی۔ کچھ دیر بعد وہ چاروں ڈاب کے کنارے اٹھکیلیاں کرتے رہے۔ نہاتے رہے اور مادھو ریت پر بیٹھا ہوا سوچتا رہا۔ ”زندگی کا ایک پل دوسرے سے کس قدر مختلف ہے۔“

کیرتی کو مادھو کی نیت پر شک ہو گیا۔ اسے اس بات کا پختہ یقین ہو گیا تھا کہ مادھو نے انہیں بچانے میں جو تاخیر اور تساہل سے کام لیا وہ صرف اس لیے کہ وہ دونوں میں سے صرف ایک کو زندہ دیکھنا چاہتا ہے اور یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ کسے بچائے اور کسے تنگنائی کی تیز دھارا میں مرنے دے۔ اس نے ڈاک بنگلے میں لوٹتے ہی آیا کو واپس شہر کی تیاری کرنے کے لیے کہہ دیا۔

جب مدن رائے کو فیصلے سے آگاہ کیا گیا وہ بہت سٹپٹایا۔ اس کے اپنے سارے پروگرام ابھی تک ادھورے پڑے تھے۔ شکار اور سیر و تفریح سے زیادہ اب وہ کیرتی میں دلچسپی لے رہا تھا اور وہ بھی ان فضاؤں میں کچھ بدلی بدلی سی دکھائی دیتی تھی لیکن اس کے بگڑتے ہوئے تیور دیکھ کر مدن رائے نے بھی خاموشی اختیار کر لی۔ وہ بھی کیرتی کے ساتھ ہی شہر لوٹنا چاہتا تھا۔

اس دن کے حادثے نے کیرتی کے دل میں مادھو کے لیے نفرت پیدا کر دی۔ اس کا جو چتر بنا رہی تھی اسے پھاڑ کر ریزہ ریزہ کر دیا۔ اب اس سے بات تک نہ کرتی تھی۔ اب اکیلی سیر کو جاتی یا آیا اور مدن رائے کو ساتھ لے جاتی۔ مادھو کے تمام احسانات جیسے اس کے ایک ہی رکیک ارادے سے ختم ہو گئے تھے۔ کیرتی کے تصور میں اس کی جو فرشتہ سیرت تصویر تھی اب داغ دار ہو چکی تھی۔

مادھو بھی نہ سمجھ سکا کہ اس میں ایسا خیال کیوں پیدا ہوا۔ اس کے دل و دماغ میں انتقام کی آگ سلگ رہی تھی لیکن اس کا نشانہ کون تھا؟ اس کے لیے وہ زندگی نئی نہ تھی۔ ایک ایک سانس ایک ویسے ہی ماحول میں کٹا تھا لیکن کیرتی سے مل کر اس نے ہنسنا کیوں چھوڑ دیا، کیوں اب وہ رونا چاہتا ہے؟ اس میں یہ قاتل کہاں چھپا بیٹھا تھا؟ کب سے اور کیوں......؟ ان باتوں کا اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ اس کے باپو کے پاس بھی نہیں۔ اس مہیب پراسرار جنگل کے پاس بھی نہیں جس کا وہ خود حصہ تھا۔ کیرتی بھی روٹھ گئی تھی۔ وہ کس سے دل کا حال بیان کرتا، کیسے بتاتا؟ جو کچھ اس نے کیا تھا وہ اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر کیا تھا اور اب وہ دل بھی اس کے ساتھ نہ تھا۔ مادھو بہت نادم تھا۔ وہ اڈے پر لوٹ جانا چاہتا تھا لیکن وہاں جانے کے لیے بھی دل نہ مانتا۔ اب اس نے کیرتی اور اس کے ماحول کی باتوں کو بھی یکسر بھلا دیا تھا۔ ضمیر نے اتنا کوسا تھا کہ اب اپنے آپ کو اس بات کے اہل ہی نہ سمجھتا تھا کہ انہیں اپنے خیالوں میں لائے البتہ غیر شعوری طور پر کبھی کبھار کیرتی اور مدن رائے کا پیچھا کرتا۔ مدن رائے کے ساتھ رہ کر اس کی ذہنیت کی پراگندگی سے بہ خوبی واقف ہو گیا تھا کہ وہ کس قماش اور فطرت کا انسان ہے۔ وہ کیرتی کو ناجائز طور پر اپنی گرفت میں لینے کے درپے تھے اور اس بات کا کیرتی کو بھی احساس تھا۔ اب وہ آیا اور کرما کو اپنے کمرے میں سلایا کرتی۔ اس نے اپنے دل کا راز کسی پر ظاہر نہیں کیا تھا کہ وہ شکاری کے تیوروں سے پریشان ہے۔ اس نے واپسی کی تیاری کر لی تھی اور سیٹھ جی کو بھی خط لکھ دیا تھا لیکن ابھی تک ان کی جانب سے کوئی جواب موصول نہ ہوا تھا۔ وہ خود پہاڑ پر آنے کا ارادہ رکھتے تھے اور اسے اپنے ساتھ واپس لے جانا چاہتے تھے۔

مدن رائے کے صبر کا پیمانہ جیسے لبریز ہو چکا تھا۔ وہ کیرتی کے ذہنی جھکاؤ سے مطمئن نہ تھا۔ حسب فطرت شادی سے پہلے ہی اس کے پر قینچ کر کے ہمیشہ کے لیے اسے اپنا بنا لینا چاہتا تھا اور اس سے اچھا موقع کہیں بھی نہیں مل سکتا تھا۔ وہ کمینگی کی حد تک اوچھے ہتھیاروں پر اتر آیا تھا لیکن کیرتی ہر بار بچ نکلتی۔ مدن رائے نے شہر پہنچتے ہی شادی کر لینے کا وعدہ کر لیا تھا اور جیسے کیرتی کو خرید لیا تھا۔ ضرورت سے زیادہ حق جتانے لگا تھا۔ ایک رات شراب کے نشے میں

چور کیرتی کے کمرے میں بھی آ پہنچا لیکن آیا کو دیکھ کر لوٹ گیا اور اب جوں جوں واپسی کے دن قریب آ رہے تھے مدن رائے کے رنگ و انداز بدلتے جا رہے تھے لیکن کیرتی بھی اب زیادہ محتاط تھی۔

☆

سیٹھ جی نے سیر و تفریح کا ارادہ ترک کر دیا تھا اور ان کا خط کیرتی کو مل گیا تھا اور مادھو اڈے پر جا کر پانچ سواریوں کا بندوبست کر آیا تھا۔ بلبیر اور نریندر سامان کے ساتھ اڈے پر چلے گئے۔ رات کو ان کا وہیں رہنے کا خیال تھا۔ کرما بھی ان کے ساتھ گیا۔

شام کو ہلکی ہلکی بارش شروع ہو پڑی۔ کیرتی برآمدے میں ٹہل رہی تھی۔ وہ خوش تھی کہ صحت یاب ہو کر اپنے گھر لوٹ رہی ہے اور اس کے والدین اسے صحت مند دیکھ کر پھولے نہ سمائیں گے۔ شام بن تو جیسے اسے دور سے دیکھ کر جگمگا اٹھے گا۔ اب تو ایک ہاری ہوئی بازی جیت کر گھر لوٹ رہی تھی۔

مدن رائے نے سرِ شام ہی اپنے آپ کو اپنے کمرے میں بند کر لیا تھا۔ مادھو بھی اس کے ساتھ بیٹھا رہا۔ دونوں کی حالت ایک جیسی تھی۔ دونوں غمگین تھے۔ دونوں نے جیسے کھو کر بہت کچھ پا لیا تھا' جیسے پا کر بہت کچھ کھو دیا تھا۔ مادھو کو آج بھی نیند کی دوا پیش کی گئی۔ اس نے انکار کر دیا۔ آج وہ سونا نہیں چاہتا تھا۔ صبح سویرے ہی اسے کیرتی کو اڈے پر چھوڑنے جانا تھا۔ وہ مدن رائے سے بھی زیادہ مایوس تھا۔ کیرتی کو کھو کر نہیں صرف اس کی ناراضگی اور سرد مہری کی وجہ سے۔ مادھو کو دیکھ کر جب وہ منہ پھیر لیتی اسے بڑا رنج ہوتا۔ ملتجیانہ نگاہوں سے جنگل کو دیکھنے لگتا جیسے کہہ رہا ہو تم ایک مدت سے میرے ساتھی ہو۔ تم تو میری باتیں سمجھتے ہو۔ میرے دل کا حال جانتے ہو۔ تم ہی اپنی بے زبانی سے میری داستان کیرتی کو سنا دو۔ تم پر تو کئی بجلیاں گری ہیں۔ کئی بار آگ میں جلے بھی ہو۔ تمہیں تو میری جلن کا احساس ہوگا ہی لیکن شاید جنگل بھی مدن رائے کی طرح اس کا رقیب تھا۔ وہ خود بھی جیسے کیرتی کی محبت میں الجھ گیا تھا۔ وہ بھی اس کی طرف متوجہ نہ ہوا۔ ہوتا بھی کیسے؟

رات کو حسبِ معمول سب نے اکٹھے ہی کھانا کھایا۔ سب ہی خاموش تھے۔ سب کے دل کسی نہ کسی خیال میں ڈوبے ہوئے تھے۔ کھانا کھا کر سب اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ صبح سویرے ہی سفر شروع ہونا تھا۔ ڈاک بنگلے سے اڈے تک کا فاصلہ بھی تو دو گھنٹے سے کم نہ تھا۔

جب بارش تیز ہو گئی تو ہوائیں جنگل کی تاریک ہولناکیوں میں گھر کر چیخنے لگیں جیسے کوئی ان کی عصمت اور پاکیزگی کو چھین لینے کی کوشش کر رہا ہو اور وہ بھاگ کر اپنی جان بچانا چاہتی ہوں لیکن اندھیرے میں کوئی راستہ نکل بھاگنے کے لیے نہ سوجھتا ہو۔ کبھی کبھار جنگل کا کوئی بے آواز قہقہہ گونج اٹھتا تو اس کے ساتھ ہی بجلی لپک کر بھٹکی ہوئی پریشان ہواؤں کو راستہ دکھانے کے لیے پگڈنڈی کو روشن کر دیتی' لیکن اندھیری سیاہ تاریکیاں جگمگاتی روشنی کو ایک ہی گھونٹ میں پی جاتیں اور جنگل گرجتا ہی رہ جاتا اور ٹین کی چھت پر بارش کا بے ہنگم سا شور شدت اختیار کر لیتا۔ مدن رائے اس بے ربط شور سے لطف اندوز ہو رہا تھا جس میں جل ترنگ کا سا ترنم تھا۔ پازیب کی سی چھنچھناہٹ تھی۔ یاقوتی ہونٹوں کی سی مسکراہٹیں تھیں۔ حسین آنکھوں کے اشارے تھے۔ مدن رائے نے بھی اشارہ پا لیا۔ شراب کا آخری گھونٹ پی کر دبے پاؤں اپنے کمرے سے نکلا اور برآمدے کی کھڑکی پھلانگ کر کیرتی کے کمرے میں جا پہنچا جہاں سبز رنگ کا لیمپ جل رہا تھا اور اس کی لو کیرتی کی طرح کسی سہانے سپنے سے کھیلتی ہوئی مسکرا رہی تھی وہ اس مسکراتی ہوئی لو کے قریب بیٹھ گیا۔ ماتھے پر بکھری ہوئی زلفوں سے کھیلنے لگا۔ کیرتی نے جیسے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا۔ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی اور نیم خوابی کی حالت میں مدن رائے سے لپٹ گئی' لیکن وہ خواب نہیں تھا۔ ایک حقیقت تھی۔ اس نے چیخنے کی کوشش کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لیکن آواز نہ نکلی۔ مدن رائے اس پر جھک گیا اس نے تمام حسیات کو یک جا جمع کر کے ایک روح فرسا چیخ بلند کی اور فرش پر جا گری۔ مدن بھی خوں خوار درندے کی طرح اس پر جھپٹا۔

چیخ سن کر مادھو مدن رائے کے کمرے میں گیا۔ وہاں صرف شراب کی خالی بوتل تھی خود وہاں سے غائب تھا۔ وہ کیرتی کے کمرے کی طرف لپکا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ اندر سے کوئی آواز نہ آ رہی تھی۔ وہ عجیب شش و پنج میں پڑ گیا۔ ہو سکتا ہے کیرتی نے خود اسے بلایا ہو۔ مدن رائے اس کا منگیتر ہے۔ شہری لوگ ہیں ہو سکتا ہے یہ سب شہری باتیں ہوں۔ ڈوور صاحب کے بنگلے میں کئی بار ایسا ہوا تھا۔ وہ ان کی باتوں میں کیسے مخل ہو سکتا ہے۔ ہو سکتا کہ.....؟ بہت سے سوال اس کے ذہن میں ابھرے۔ انہی میں الجھا ہوا غیر ارادی طور پر اسی کھڑکی کی طرف بڑھا جس نے مدن رائے کو کیرتی تک پہنچنے کا راستہ دیا تھا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے کمرے کے اندر نگاہیں دوڑائیں۔ لیمپ کی ہلکی مدہم روشنی تھی۔ ایک اندھیرے کونے میں کیرتی سہمی ہوئی دیوار سے لگی کھڑی تھی اور مدن رائے لڑکھڑاتی آواز میں کچھ کہہ رہا تھا اور کیرتی اپنے آپ کو اس کے مضبوط پنجوں سے چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔ چیخنے کی کوشش کر رہی تھی۔ مادھو کھڑکی پھلانگ کر لیمپ کے پاس کھڑا ہو گیا۔ اس کے سارے جسم پر رعشہ طاری ہو گیا تھا۔ وہ سنبھل کر آگے بڑھنا چاہتا تھا جہاں کیرتی مدن رائے کی بانہوں میں مچھلی کی طرح تڑپ رہی تھی۔ مادھو پر نظر پڑتے ہی وہ مدن کے پنجے سے نکل گئی اور اس سے لپٹ کر بے اختیار رونے لگی۔

"مجھے بچاؤ مادھو.....!" جیسے جنگل کی ہوائیں چیخ اٹھیں۔ "بچاؤ مادھو.....!" بجلی نے لپک کر جیسے دیوار کے درخت کی بھڑوں کو چھو لیا اور بادل ایک دم تھرتھرا اٹھے لیکن مادھو کچھ بھی نہ سن سکا۔ اس کا دماغ ماؤف ہو چکا تھا اور دل برف کی طرح یخ اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا تھا۔ کیرتی کو ایک طرف دھکیل کر وہ مدن رائے کی طرف بڑھنے لگا جو دیوار کا سہارا لیے غصے سے کانپ رہا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور کڑک کر کہا۔

"تم یہاں کیا کرنے آئے ہو؟"

مادھو نے عقاب کی طرح جھپٹ کر مدن کا گلا دبوچ لیا اور اچھی طرح جھٹک کر فرش پر ٹپک دیا اور دوسرے کمرے سے اسی کی بندوق اٹھا لایا۔ مادھو کے ہاتھ میں بندوق دیکھ کر جیسے کیرتی اپنی بے حرمتی کا سارا واقعہ بھول گئی۔ دونوں کے بیچ کھڑی ہو گئی۔

"یہ کیا کر رہے ہو؟"

مادھو نے مدن پر نشانہ باندھتے ہوئے کہا۔ "ہٹ جاؤ.....! پہاڑوں کی امانت لوٹ رہا تھا۔ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

کیرتی بندوق کے سامنے تن کر کھڑی ہو گئی۔ "تمہیں میری قسم ہے پھینک دو بندوق....."

مادھو کا سارا جسم پسینے سے شرابور تھا۔ ہاتھ کانپ رہے تھے۔ جسم کا سارا خون آنکھوں میں اتر آیا تھا اور کیرتی گڑگڑا کر مدن رائے کی زندگی کی بھیک مانگ رہی تھی۔

مادھو نے اپنی آستین سے منہ کا پسینہ پونچھا۔ "آپ چاہتی ہیں مدن صاحب اس حالت میں بھی زندہ رہے؟"

"ہاں۔"

"کیوں.....؟"

کیرتی نے اپنے آنسو پونچھ لیے۔ "اس لیے کہ میں نہیں چاہتی تم بے موت مرو۔"

مادھو کھڑکی کے قریب کھڑا ہو گیا۔ پسینے سے بھیگے ہوئے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیری اور اندھیرے میں ہی دو فائر کر دیے۔ خالی کارتوس اپنی مٹھی میں دبا کر بندوق مدن رائے پر پھینک دی۔ فائر کی آوازیں مدن رائے کا تعاقب کرتی ہوئی دیر تک جنگل کے شور میں گونجتی رہیں پھر اسی میں سما گئیں۔ وہ مدن رائے کو بازو سے پکڑ کر بنگلے سے باہر لے آیا۔ کیرتی خاموش دیکھتی رہی۔ اب آیا بھی

ہنگامے میں شریک ہوگئی تھی۔ مادھو اسے بازو سے پکڑ کر دور تک لے گیا اور ایک چھوٹی سی پگڈنڈی پر چھوڑ دیا جو کھیتوں میں سے ہوتی ہوئی نئے ڈاک بنگلے کو جاتی تھی۔ بارش نے شدت اختیار کرلی تھی لیکن ہواؤں نے چیخنا بند کردیا تھا جیسے اب وہ جنگل کی تاریک ہول ناکیوں سے جان بچا کر بھاگنے میں کامیاب ہوگئی تھیں۔

مدن رائے سر جھکائے پگڈنڈی پر سے نیچے اتر رہا تھا اور مادھو ایک اونچی گھاٹی پر بیٹھ کر اسے نئے ڈاک بنگلے کی طرف جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ بجلی دیر تک تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد چمکتی رہی۔ مدن رائے کو راستہ دکھاتی رہی۔

کافی دیر کے بعد مادھو واپس آیا۔ کیرتی اور آیا اس کے انتظار میں بیٹھی تھیں۔ اس حادثے سے یہ بھی بھول بیٹھی تھیں کہ وہاں وہ اکیلی ہیں اور بھیانک جنگل کی طوفانی رات ہے۔

کیرتی نے بلند آواز میں پوچھا۔ ”مدن کہاں ہے؟“

مادھو نے مدہم سر میں جواب دیا۔ ”صاحب نئے ڈاک بنگلے میں چلا گیا ہے۔“

کیرتی نے اسی لہجے میں کہا۔ ”راستے میں اگر کسی جنگلی جانور نے اسے مار ڈالا۔“

وہ اس کی معصوم محبت پر مسکرا دیا۔ ”بے فکر ہو کر سو جاؤ۔ گاؤں کے جنگلی جانور بھی جانتے ہیں۔ صاحب کی آپ کے ساتھ کڑمائی ہوئی ہے اس سے آپ کا بیاہ ہونا ہے وہ بھی میری طرح اسے زندہ ہی چھوڑ دیں گے۔“

مادھو نے چارپائی اٹھائی اور ان کے کمرے کے باہر لگا دی۔

لیکن وہ رات بھر نہ سو سکا۔ زندگی میں پہلا موقع تھا کہ اس کے اندر بھیانک قاتل جاگا تھا۔ کیرتی اب بھی مدن رائے سے محبت کرتی تھی۔ اس کی زندگی کے لیے وہ اس کے سامنے گڑگڑائی تھی۔ روئی تھی اسے یہ بھی خدشہ تھا کہ راستے میں جنگلی جانور اسے اپنا شکار نہ بنالیں۔ وہ اس جسم سے بھی لپٹ گئی تھی۔ محبت بھری نگاہوں سے اسے دیکھتی رہی تھی۔ وہ اسے زندہ دیکھنا چاہتی تھی۔ اس بھیانک حادثے میں بھی اسے مدن رائے کی موت ہی دکھائی دے رہی تھی۔ مادھو اس محبت کو نہ سمجھ سکا۔ وہ اس کے گیتوں میں بھی نہ تھی۔ ویسی محبت کی کہانی اس نے کملی چاچی سے بھی نہیں سنی تھی۔ کیسی محبت تھی وہ؟ کیسی معصومیت اور مخلصانہ جذبہ تھا اس کی محبت میں۔ یہ کیسا بندھن یہ کیسا رشتہ تھا؟ وہ دونوں کو زندہ دیکھنا چاہتی تھی۔ دونوں سے نفرت کرتی تھی۔

رات سوچوں میں کٹ گئی۔ صبح اڈے پر ہوئی۔ شہر کو جانے والی بس تیار کھڑی تھی۔ مدن رائے اور اس کے ساتھی بس میں بیٹھ گئے۔ آیا بھی اپنی نشست پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی تھی۔ مادھو نے سامان لدوایا بس کے ڈرائیور نتھا سنگھ نے پوچھا۔ ”تم بھی چل رہے ہو؟“

مادھو اسے ایک طرف لے گیا۔ دیر تک باتیں کرتا رہا۔ نتھا سنگھ اس کا دوست تھا۔ اس کی پہاڑوں کی امانت اپنے دوست کے حوالے کردی۔

کرما نے مادھو کے کان میں کہا۔ ”دو سو روپے دے گئی ہے۔“

مادھو نے تڑپ کر پوچھا۔ ”کہاں ہیں، مجھے دو۔“

کرما نے ڈرتے ڈرتے نوٹ اس کی طرف بڑھائے۔ ”کیا کرو گے؟“

”باپو! بخششیں لیتے ہی ساری عمر گزر گئی۔ زندگی میں ایک بار تو تم بھی کسی کو کچھ دے دو۔“

کرما اسے اس طرح دیکھنے لگا جیسے اس نے روپے چھین لیے ہوں۔ مادھو نے نوٹ اپنے دونوں ہاتھوں میں دبائے اور لاری کے پاس کھڑا ہوگیا۔ سردی تھی۔ کیرتی نے شال اوڑھ لی تھی۔ اس دھندلی دھندلی روشنی میں مادھو اس کے چہرے کو قریب سے دیکھنا چاہتا تھا لیکن کیرتی سر منہ شال میں لپیٹے خاموش بیٹھی رہی۔ آنکھیں پھیلائے ان راہوں کو دیکھتی رہی جو شام بن کی طرف

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بڑھتی سکڑتی جارہی تھیں۔ اس کی واپسی اتنی ہی دل شکن تھی جتنی کہ آمد۔ جب بس چلنے لگی تو مادھو نے دو سو کے نوٹ اس کی شال پر رکھ دیے اور ایک ہی گھونٹ میں اپنے سارے آنسو پی گیا۔ کیرتی خاموش رہی۔ آیا نے بھی ہونٹ نہ ہلائے۔ مدن رائے نے سگریٹ کے دھوئیں میں اپنا منہ چھپا رکھا تھا۔ بس چل پڑی۔ شال سے دو مخمور آنکھوں نے باہر جھانکا۔ دو ہاتھ غیر اختیاری طور پر ایک دوسرے سے مل گئے اور بس دور نکل گئی۔ مادھو دیر تک اپنے سر کو اپنی بوسیدہ ٹوپی سے کھجاتا رہا۔ پھر وہ پہاڑوں میں گونجتی ہوئی آواز کے پیچھے پیچھے دوڑنے لگا۔ دوڑتا بہت دور نکل گیا لیکن اب انجن کا شور بھی کہیں گم ہوگیا تھا۔ لاری پیچیدہ موڑ کاٹتی ہوئی کوسوں دور چلی گئی اور اس کے ساتھ کیرتی بھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔ وہ وہیں بڑے پل پر بیٹھ گیا۔ نیچے پہاڑی نالہ بھی دندناتا ہوا پہاڑوں کو چیرتا نہ جانے کس کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔

بہت دیر کے بعد اڈے پر لوٹا۔ کرما اس کا انتظار کررہا تھا۔ کرما کو روپے لوٹا دینے کا بہت دکھ تھا۔ تلخ لہجے میں پوچھا۔

”کہاں گیا تھا؟“

”لاری کو جاتے دیکھتا رہا۔“

کرما نے اسی لہجے میں پوچھا۔ ”نوٹ کیوں واپس کردیے؟“

مادھو نے آستین سے اپنے چہرے کا پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔

”اب گھر چل باپو! راستے میں باتیں ہوں گی۔“

دونوں اپنی پگڈنڈی پر ہولیے۔

کرما نے چلم کے لمبے لمبے کش لیتے ہوئے کہا۔

”روپے واپس کر کے تم نے اپنا گھر اجاڑ دیا۔ اب سیالے میں بھی تمہارا بیاہ نہیں ہوسکتا۔ روتے رہنا اپنی اور میری جان کو۔“

مادھو نے بچوں کی طرح معصوم ہنسی ہنس کر کہا۔ ”باپو! آؤ ایک بات کریں، جو روپیہ پیسہ تم نے آج تک جمع کیا ہے نا اس سے دونوں ہی بیاہ کرلیں۔“

کرما کو کھانسی کا شدید دورہ پڑا۔ ”تمہاری تو مت ماری گئی ہے۔ ذرا تمیز سے بات کیا کر۔“

مادھو نے گمبھیر سر میں کہا۔ ”ٹھیک کہہ رہا ہوں باپو! اس پیسے سے چند مرلے زمین خرید لیتے ہیں، عزت داری کے لیے زمین ضروری ہے اور تم نے اپنی ساری عمر بخششیں لیتے اور بیاہ رچاتے ہی ختم کردی۔“

کرما کڑک کر بولا۔ ”تو پھر زمین خریدنے کے لیے ہی روپے لے لینے تھے۔ ان کا کام کرتے رہے۔ سب کام کی مزدوری لیتے ہیں۔“

مادھو نے اس کا راستہ روک لیا۔ ”تم کہتے تھے میم صاحب نے تمہیں بیٹی کا پیار دیا جسے کوئی اپنی بیٹی بنا لیتا ہے اس سے بھلا کوئی روپے پیسے لیتا ہے سن باپو! خدمت کرنے کا مختانہ تو ساری عمر لیتے رہے۔ سمجھ لو ایک بار ہم نے مفت کام کیا۔ جن ہاتھوں نے کبھی کسی کو دینا سیکھا ہی نہ تھا ان ہاتھوں نے ہم سے پوچھے بغیر اپنا سب کچھ لٹا دیا۔ اپنا دل چھوٹا نہ کرو۔ خوش ہو پہلی بار زندگی میں ہم کسی کو دے سکے اور اس نے لے لیا۔“

بوڑھا کرما لاٹھی ٹیکتا ہوا آگے نکل گیا۔ مادھو کی باتوں نے اس کا دل بھاری کردیا تھا۔ مادھو گھاٹی پر کھڑا دیر تک اپنے سر کو کھجاتا رہا۔ وہی گھاٹی تھی جہاں ایک شام اس کے قریب کھڑے ہو کر کیرتی نے پہلی بار پہاڑی گیت کے بول سنے تھے، سمجھے تھے..... گوری دا چت لگا جیسے دیاں تہاراں..... لیکن آج وہ اکیلا تھا۔ آج وہ اپنی ساری کائنات لٹا کر اپنے گھر لوٹ رہا تھا۔

☆

کیرتی کیا چلی گئی وادیوں نے گنگنانا ہی چھوڑ دیا۔ مادھو کا دل بھی اسی کی طرح اکھڑا اور گنوار تھا۔ اس کی زندگی میں ایسا کوئی حادثہ نہ ہوا تھا جو اسے کسی کے متعلق سوچنے

پر مجبور کرتا۔ ہوش سنبھالا اپنے گرد پہاڑوں کا ایک لامتناہی سلسلہ دیکھا جس کے دامن میں بکھری ہوئی ان گنت وادیاں تھیں جو ماں کی مہربان آغوش کی طرح اسے سنبھالا دیتی رہیں۔ وہاں صرف ایک تھا جس کے ساتھ ہنس کھیل سکتا تھا۔ اپنے دل کا حال بیان کرسکتا تھا اور وہ تھا اس کا باپو! لیکن وہ بھی اس کے لیے جنگل کی طرح ایک پراسرار ہستی کا مالک تھا جسے نہ اس نے کبھی ہنستے دیکھا اور نہ روتے دیکھا۔ زمانے نے اسے پتھر بنا کر پتھروں میں پھینک دیا تھا۔ ایک خشک بنجر پہاڑ بنا دیا تھا۔

مادھو کا بچپن اور لڑکپن ڈاک بنگلے کے ماحول سے دور ہی رہا۔ کملی چاچی کی گود میں کہانیاں سنتے بیتا۔ خوب صورت جوانی کے خوب صورت جسم اور حسین خدوخال نے اسے سیر و تفریح کے لیے آنے والے لوگوں کا قرب بخشا، جو قلبی اور جسمانی سکون کی جستجو میں جاذب توجہ محرک اور غیر محرک چیزوں کا سہارا لیتے ہیں ایسے لوگوں کی بے شمار مسکراہٹیں اس نے دیکھی تھیں جن میں ایک بھوک بھی ہوتی تھی۔ ایک دبا دبا سا کرب ایک مریضانہ تشنگی، جوان کے اپنے ماحول کی غمازی کرتی تھی لیکن کیرتی کی مسکراہٹ پہلے نہیں دیکھی تھی۔ اسے ایک ہی بار دیکھا اور اپنا لیا۔ یکسر بھول کر وہ ایک مہیب جنگل ہے اور کیرتی کی مسکراہٹ چاند کی روپہلی چاندنی، جو وقتی طور پر ایک نظر مسکرا کر تو اسے دیکھ سکتی ہے لیکن اس سے الجھ نہیں سکتی۔

کیرتی کی مسکراہٹ کو اس نے اپنی خاموش زندگی میں سمو لیا تھا اور وہ خود بھی جیسے غیر اختیاری طور پر اس کی جانب سمٹتی چلی آرہی تھی۔ اچانک طوفان نے گھیر لیا۔ مدن رائے کی آمد ایک طوفان کی طرح تھی، جو کیرتی کو اس سے چھین کر بہت دور لے گیا۔ اتنی دور جہاں تک اس کی نگاہ پہنچ سکتی تھی اور نہ ہی خیالوں کی اڑان۔

مادھو نے اب اڈے پر کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ رات جنگل میں کاٹتا اور صبح ہونے پر اڈے سے دور بیٹھ کر مسافروں کی آمد و رفت کا جائزہ لیتا رہتا لیکن کوئی جانی پہچانی صورت دکھائی نہ دیتی۔ کرما اس کے پاگل پن سے گھبرا گیا تھا۔ اس کا علاج اب مادھو کی شادی ہی میں تھا۔ وہ گاؤں گاؤں گھوم کر ایک ایسی لڑکی کو ڈھونڈ نکالنا چاہتا تھا، جو مادھو کی طرح خوب صورت اور سمجھ دار ہو جو اس کی اکھڑی ہوئی زندگی کو سنبھال سکے لیکن آج تک نہ کرما کو ویسی لڑکی دکھائی دی تھی اور نہ ہی مادھو کو اپنا ساحل، جہاں اس کی چاندنی گم ہوگئی تھی۔

مادھو ایک روز اڈے سے لوٹا۔ بہت خوش تھا۔ نتھا سنگھ نئی بس خریدنے بڑے شہر جارہا تھا۔ آدھا سفر بس کا تھا اور آدھا ریل کا اور مادھو نے آج تک نہ ریل دیکھی تھی اور نہ ہی بڑا شہر جو کئی ریلوں کا گھر تھا جہاں کیرتی بھی رہتی تھی۔ وہ اس سے بھی ملنا چاہتا تھا آج تک جتنے پردیسی لوگ آئے مادھو سے خوشی خوشی بچھڑے لیکن کیرتی ناراض رہی۔ اسے اس بات کا دکھ تھا۔ اس سے اپنی غلطیوں کے لیے معافی مانگنا چاہتا تھا اور نتھا سنگھ اس کی مدد کرنے کے لیے تیار تھا لیکن وہ اپنے باپو کی اجازت کے بغیر جانا بھی نہیں چاہتا تھا اور باپو سے اجازت حاصل کرنی محال تھی۔ اس کے ساتھ کوئی ہیر پھیر ضروری تھا۔ کھانا کھانے سے فارغ ہو کر اس نے کرما سے بات چھیڑی۔

"نتھا سنگھ! اپنے مالک کی نئی بس لینے کل سویرے بڑے شہر جارہا ہے کہو تو اس کے ساتھ چلا جاؤں۔"

کرما تن کر بیٹھ گیا۔ "تم نے کیا کرنا ہے وہاں جا کر؟"

مادھو نے اپنی بات جاری رکھی۔ "اب تم دوڑ بھاگ کررہے ہو تو بیاہ کا معاملہ کہیں نہ کہیں طے ہو ہی جائے گا مگر تمہارے پاس نہ زیور ہیں اور نہ ہی کپڑا لتا اور پیسے بھی کم ہی ہیں۔ بڑے شہر میں چیزیں اصلی بھی ملتی ہیں اور سستی بھی اور بغیر کرائے بھاڑے کے سب کچھ مفت میں گھر پہنچ جائے گا پھر نتھا سنگھ بھی ساتھ ہے ایسا موقع پھر کب ملے گا؟ تمہاری مرضی ہو تو جاتا ہوں۔ کیرتی میم صاحب نے بھی تمہارے ساتھ وعدہ کیا تھا کہ میرے بیاہ پر ضرور آئے گی۔ اُسے بھی تمہاری طرف سے بلاوا دے آؤں گا۔"

مادھو نے پہلی بار اپنے بیاہ کی بات چھیڑی تھی۔ کرما نے جلدی جلدی چلم سلگائی اور زور زور سے ہنستے ہوئے کہا۔ "وہ تو صرف کہنے کی باتیں ہوتی ہیں۔ بڑے آدمی اسی طرح چھوٹے لوگوں کا دل رکھتے ہیں۔ پردیس سے کہاں آئے گی تمہارے بیاہ پر......؟"

مادھو نے بات ٹوٹنے نہ دی۔ "باپو! خاص اسی کام کے لیے جارہا ہوں کیا؟ اپنے دھندے سے جلدی فارغ ہوگیا تو کہتا آؤں گا اسے بھی۔ اپنا فرض پورا کرنا ہے۔ آئے نہ آئے اس کی مرضی۔ زور تھوڑا ہے کسی پر۔"

کرما نے زور زور سے گردن ہلائی، جیسے مادھو کی بات اس کے دل کو چھو گئی ہو۔ "بیاہ کی چیزیں تو سستی مل جائیں گی اور پھر نتھا سنگھ بھی ساتھ ہے۔ فکر والی تو کوئی بات نہیں، لیکن واپسی کب تک ہوگی؟"

اس نے فوراً جواب دیا۔ "دس نہیں تو پندرہ دن تک۔ وہاں بیٹھ کر کیا کرنا ہے؟ سو روپے مجھے دے دو اور بتا دو کیا کیا زیور اور کپڑا لانا ہے؟"

کرما نے چلم کا لمبا کش لیا اور نئے نئے گہنوں اور کپڑوں کی باتیں کرنے لگا جو اس نے گاؤں کی نئی نئی بیاہتا لڑکیوں کو پہنے ہوئے دیکھے تھے۔ چاندی اور ریشم کی باتیں دیر تک ہوتی رہیں۔ کرما اپنی ہونے والی بہو کو چاندی اور ریشم میں لپیٹتا رہا۔ اسے اپنے پہاڑی آنگن میں کھیلتے مچلتے دیکھتا رہا۔ خیالوں ہی خیالوں میں مسرور ہوتا رہا، لیکن مادھو اس کی باتوں سے بے خبر کسی کی مسکراہٹ کو اپنے سینے میں چھپائے ان قہقہوں کو ڈھونڈتا رہا جو کہتے ہیں سوراں کے ہوتے ہیں۔ ہوسکتا ہے ان میں کیرتی کی آواز بھی کہیں پوشیدہ ہو جو اسے کھینچ کر جنگل کی چاندنی میں لے جائے۔ اسی میں گم کردے اور کرما خیالوں ہی خیالوں میں پہاڑی زیوروں کی چمک دمک سے لطف اندوز ہوتا۔ اب اپنے بچھڑے ہوئے ساتھیوں کی یاد میں گم ہوگیا تھا۔ کودے ہتھ بھیجاں میں اج سکھ سانڈھڑے...... کوئی پکھرو بھی نیوں جندا او گدیا...... لگدا تیرا مندا او گدیا......

کرما مدہم سر میں گانے لگا، جیسے اپنے کسی دیرینہ ساتھی کی یاد آگئی تھی جس نے اتنی دور ڈیرے ڈال رکھے تھے جہاں تک کوئی پرندہ بھی نہیں پہنچ سکتا تھا اور وہ اپنے ساتھی سے ہی پوچھ رہا تھا کہ میں اپنی خوشی غمی کا حال تم تک کیسے پہنچاؤں کرما دیر تک گاتا رہا۔ اس کی آواز اونچی ہوتی گئی اور مادھو جیسے کیرتی کے پاس جانے کے لیے نتھا سنگھ کی بس میں بیٹھ گیا تھا۔ اس کی نگاہوں کے سامنے پہاڑی سفر کا منظر گھوم رہا تھا۔

مادھو نتھا سنگھ کے ساتھ بڑے شہر پہنچا۔ شہروں کے لوگ پہاڑ پر دیکھے تھے، ان کے ساتھ رہا تھا، ان کی باتیں سنی تھیں۔ اس نے سوچا تھا شہروں کے سارے لوگ ویسے ہی ہوں گے جیسے پہاڑوں پر آتے ہیں، ویسے ہی خوب صورت، دولت مند، خوش شکل اور خوش پوش، لیکن وہاں زیادہ تر اسے اپنے جیسے ہی لوگ دکھائی دیے۔ اپنے باپو کی طرح بوڑھے، مضمحل، فکر مند، ننگے اور بھوکے، بالکل پہاڑی لوگوں کی طرح ستے ہوئے چہرے اور مدقوق نڈھال جسم، جوان لڑکیوں کی ساخت اور ملبوسات دیکھ کر آنکھیں آپ ہی آپ شرما کر بند ہونے لگتیں جیسے پہاڑ کے ننگے پن سے وہ ملبوس عریانی زیادہ بے حیا تھی۔ چاروں طرف بھوک تھی۔ بھوک کا ایک لامتناہی سلسلہ تھا۔ لوگوں کی آنکھوں میں، بول چال میں، دیکھنے اور سننے میں حیوانی بھوک کا عنصر غالب تھا جو خوب صورت تھے، خوب صورت لباس میں لپٹے ہوئے تھے وہ زیادہ بھوکے اور ننگے دکھائی دیتے تھے، جو بدصورت تھے، میلے کچیلے چیتھڑوں میں ملبوس تھے، ان کے چہروں پر ان مٹ اضطراب تھا۔ کسی انجانی منزل تک پہنچنے کی جستجو تھی۔ شہر کی پختہ سڑک کی طرح ان کے چہروں پر بھی کول تار کی سی سختی اور ملائمت تھی جیسے وہ خود بھی ایک شاہراہ ہوں جس پر سے ہو کر کوئی دوسرے مافوق الفطرت لوگ ہزار ہا سال سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اپنی منزل تک پہنچنے کے لیے دندناتے ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی فکر میں تھے۔ بڑے شہر کے بازاروں اور گلی کوچوں میں اب ننھا سنگھ کے گیت گونج رہے تھے جو دل سے نہیں زبان سے گائے جاتے ہیں۔

☆

دن بھر وہ ننھا سنگھ کے ساتھ بڑے شہر میں گھومتا رہا۔ شام کو ننھا سنگھ نے اسے اپنے ایک دوست ڈرائیور کی بس میں بٹھایا جو اندر نگر کے روٹ پر چلتی تھی۔ ایک کاغذ پر اسے بستی اور کوٹھی کا نام لکھ دیا اور تہدیدی لہجے میں کہا۔

"یہ رقعہ سنبھال کر رکھنا اور سات بجے اسی بس پر لوٹ آنا۔ جہاں بس اتارے گی وہیں آ کر کھڑے ہو جانا۔ ڈرائیور اپنا یار ہے۔ تمہیں پہچان لے گا۔ تمہارا انتظار بھی کرے گا لیکن کوٹھی میں سوچ سمجھ کر جانا ان سیٹھوں کے گھروں میں آدمی کم ہوتے ہیں اور کتے زیادہ۔ بڑے خوب صورت ملائم خوشبودار بالوں والے مگر بڑے خوں خوار قسم کے۔ یہ نہ ہو کہ میم صاحب کی جگہ کتے تمہارا سواگت کریں اور تمہارا حلیہ ہی بگاڑ دیں۔"

مادھو سر ہلا ہلا کر باتیں سنتا رہا۔ جب بس چلنے کا وقت ہوا تو وہ مادھو سے اجازت لے کر اپنے جانے پہچانے محلے کی خاک چھاننے چلا گیا جہاں اس نے اپنی جوانی دیکھی تھی جہاں اب اس کی جوانی کا مزار تھا۔

اندر نگر پہنچ کر بس ڈرائیور نے ننھا سنگھ کی ہدایت کے مطابق اسے شام بن کے سامنے اتارا اور جب تک وہ کوٹھی کے گیٹ کے اندر داخل نہیں ہوا بس کو روکے رکھا۔

مادھو ڈرتے ڈرتے لان تک پہنچا۔ چاروں طرف نظر دوڑائیں وہاں نہ کوئی کتا تھا اور نہ ہی انسان۔ صرف ایک محل جیسی کوٹھی تھی۔ وہ دیر تک عمارت کی چوڑائی اونچائی ناپتا رہا۔ لان کے پھولوں کو پہچانتا رہا جن میں نہ پہاڑی پھولوں جیسا رنگ اور نکھار تھا اور نہ ہی خوشبو۔

گیٹ پر ایک کار رکی۔ ایک لڑکی اتری۔ کار چلی گئی۔ لڑکی لان سے ہوتی ہوئی کوٹھی کی طرف بڑھنے لگی۔ وہ ٹھٹک گیا لیکن وہ کیرتی نہ تھی ویسے ہی قد بت اور چال ڈھال کی کوئی دوسری لڑکی تھی۔ مادھو کو انسانی صورت سے سہارا ملا اور آگے بڑھ کر کہا۔

"کیرتی میم صاحب سے ملنا ہے۔"

لڑکی نے اسے غور سے دیکھا۔ حیران ہو کر پوچھا۔

"کیرتی میم صاحبہ کو کیسے جانتے ہو؟ کہاں سے آئے ہو؟"

مادھو نے سر جھکا کر جواب دیا۔ "پہاڑ سے آیا ہوں۔ کیرتی میم صاحب وہاں ٹھہری تھیں اور مدن صاحب اور بلبیر صاحب اور آپا صاحب اور......"

اس نے سارے نام گنوا دیے۔ رانی سمجھ گئی۔ کیرتی نے پہاڑ کی باتوں میں مادھو کا ذکر بھی کئی بار کیا تھا۔ وہ کیرتی کے دل کے کتنے قریب تھا رانی کو معلوم تھا۔ اس نے مادھو سے کوئی بات نہ کی۔ سیدھی کوٹھی میں چلی گئی۔ کیرتی اپنے کمرے میں بیٹھی کسی کا اسکیچ بنا رہی تھی۔ اس نے قریب جا کر اسکیچ کو غور سے دیکھا۔ "جب سے آئی ہو پہاڑن ہی بن گئی ہو۔ یہ پہاڑ کبھی ختم بھی ہوں گے۔"

کیرتی نے تھکی ہوئی آواز میں کہا۔ "آج اس جانگلی کا نقش ابھارنے کا ارادہ ہے جو پہاڑ پر ہمارے ساتھ رہا۔"

رانی نے کیرتی کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "نقش ابھارنے کا ارادہ ہے یا اس کا سارا وجود دیکھنے کا؟ جیتا جاگتا وجود‘ جو کب سے باہر لان میں کھڑا ہے۔ سچ کہہ رہی ہوں...... تمہارا جانگلی آ گیا ہے۔"

رانی پیانو پر جھک گئی۔ کیرتی غیر اختیاری طور پر اپنے کمرے سے باہر نکلی۔ بے چین سی نظروں سے اپنی تصویروں کو دیکھا۔ مادھو یہاں کہاں؟ وہ کیوں آیا؟ وہ تو...... لان میں نظریں دوڑائیں۔ مادھو ہی تھا۔ اس کے قدم وہیں رک گئے۔ وہیں بت بنی کھڑی رہی لیکن مادھو اس کی جانب بڑھتا گیا۔ اس کے شعور میں میم صاحب کا نقش تھا اور لاشعور میں کیرتی کا‘ جس سے وہ محبت کرتا تھا جو پہاڑی وادیوں اور گھاٹیوں کی سادہ معصوم رعنائیوں کا ایک حسین مرقع تھی جو اس کے دل کی دھڑکنوں میں اب بھی مسکرا رہی تھی۔

اسی مسکراہٹ کو سنبھالے وہ کیرتی کے بہت قریب آ گیا۔ دیر تک دونوں ایک دوسرے کو بہ غور دیکھتے رہے۔

کیرتی اسے اپنے کمرے میں لے آئی۔ رانی بہ دستور پیانو پر جھکی ہوئی تھی۔

آپا اسے دیکھ کر خوشی سے پھولی نہ سمائی۔ "تم کیسے آ گئے مادھو......؟"

مادھو فرش پر ہی بیٹھ گیا۔ "اپنا استاد آ رہا تھا میں بھی چلا آیا۔ سوچا آپ لوگوں سے بھی ملتا آؤں گا۔ ابھی لوٹ جاؤں گا۔ رات کو استاد کے ساتھ سینما دیکھنا ہے۔"

آپا نے اپنی کہی۔ "اب آئے ہو تو کچھ دن ٹھہر کر واپس جانا۔ تم نے پہاڑوں پر ہمیں گھمایا۔ اب تمہیں ہم بڑا شہر دکھائیں گے۔ بھول جائے گا اپنے پہاڑ......"

وہ مادھو کو اپنے ساتھ دوسرے کمرے میں لے گئی۔

رانی نے پیانو بجاتے ہوئے کیرتی سے پوچھا۔ "مادھو کو دیکھ کر تم چپ کیوں ہو گئیں؟"

کیرتی نے تھکی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ "اس کے اتنے احسان ہیں کہ اگر ساری عمر لگی رہوں‘ نہ چکا سکوں۔ اس نے مجھے کئی موتوں سے بچایا۔"

"پہاڑی گنوار تو دکھائی ہی نہیں دیتا۔ شکل و صورت سے بہت بڑے گھرانے کا لگتا ہے۔"

کیرتی جیسے مادھو کے خیالوں میں ہی ڈوب گئی۔

رانی نے بات بدلی۔ "کیا فیصلہ ہوا......؟"

کیرتی نے دبی زبان میں جواب دیا۔ "تمہیں معلوم ہی ہے پتاجی اور ممی میجر صاحب سے ملنے بمبئی گئے ہوئے ہیں۔"

رانی نے اسے خیالوں میں الجھے ہوئے دیکھ کر کہا۔ "تم سنبھالو اپنے مادھو کو‘ اب میں چلتی ہوں۔ بہت سی باتیں کرنی ہیں پھر کبھی کروں گی۔"

رانی چلی گئی۔

کیرتی سوچنے لگی رانی کے دل میں کوئی بات ہے جو اس کی زبان تک نہیں آ رہی اور اس بات کا تعلق ہے بھی مدن رائے کے ساتھ۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ مدن اور رانی ایک دوسرے سے قریب ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے کھنچے کھنچے سے رہتے تھے۔ وہ دوسرے کمرے میں آئی رانی اور مادھو بلند آواز میں باتیں کر رہے تھے۔ بیچ بیچ میں مادھو کا جنگلی قہقہہ سارے شام بن میں گونج اٹھتا جیسے کوئی پہاڑ جھنجنا اٹھا ہو اور کیرتی کو محسوس ہوتا جیسے اس کا ہر ایک پتھر مادھو کے قہقہے میں شریک ہے۔ وہ وہیں صوفے پر ہی دراز ہو گئی۔

کیرتی کو رانی اور مدن رائے کی کہانی معلوم تھی۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ مدن رائے اس سے انتقام لینا چاہتا ہے۔ اسے اپنا کر ہمیشہ کے لیے چھوڑ دینا چاہتا ہے۔ وہ جیت کا قائل تھا لیکن کیرتی سے وہ مات پر مات کھا رہا تھا۔

کیرتی نے سیٹھ جی سے کوئی بات نہ کی تھی۔ ماں کو جیسے سب کچھ معلوم تھا۔ وہ خاموش تھی۔ آپا کی حیثیت ایک تماشائی سے زیادہ نہ تھی۔ کیرتی خود بھی اپنے بارے میں کسی فیصلے پر نہ پہنچ سکی تھی۔ وہ سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ اگر یہ ہو جائے تو پھر آگے کیا ہوگا۔ آگے ایک کہر زدہ دھند تھی‘ اسے کچھ بھی دکھائی نہ دیتا تھا جو کچھ اس کے دل میں تھا وہ اس کے ذہن میں نہیں تھا۔ مادھو کی آمد بھی ایک حادثہ ہی تھا۔ کبھی دوبارہ اسے ملے گا‘ وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ اب وہ آ گیا تو اسے کیا کرنا چاہیے؟ ایک طرف مادھو تھا‘ دوسری طرف سروپ۔ وہ دونوں کو زندہ دیکھنا چاہتی تھی۔

مادھو جب دور پہاڑوں ہی میں رہ گیا تو شہر میں آ کر کیرتی پاگل سروپ کی طرف جھک گئی۔ روز اسپتال میں اس سے ملنے جاتی۔ اس کی ڈھارس بندھاتی‘ اسے دیکھ کر کیرتی کو محسوس ہوتا جیسے وہ پاگل نہیں ہے صرف اپنے گیتوں سے بچھڑ گیا ہے۔ اپنے ساتھیوں سے دور ہو گیا ہے۔ کیرتی کو دیکھ کر وہ احساس مٹ جاتا۔ کیرتی کی ایک ہی مسکراہٹ میں اس کے گیتوں کے کئی بول تھے‘ کئی محبتیں‘ کئی جنتیں

تھیں جنہیں وہ اس کی مدد سے ترتیب دے رہا تھا۔ وہ اسے زندگی دے رہی تھی کہ اچانک مادھواس کی زندگی میں آ گیا۔ زندگی جس کی دھڑکنیں مادھو کی یہ دولت قائم تھیں۔ مدن رائے نے تو اسے موت میں گھرے ہوئے دیکھ کر نگاہیں پھیر لی تھیں۔ قول واقرار بھول گیا تھا لیکن مادھو نے اسے موت کے منہ میں دیکھ کر اپنایا تھا۔ زندہ دیکھ کر مدن رائے نے اسے پانے کی نئی کوشش شروع کردی تھی لیکن زندگی دے کر مادھو نے اس سے کچھ نہ مانگا تھا' آزاد چھوڑ دیا۔ مدن رائے اور مادھو...... اور مادھو آپا سے باتیں کررہا تھا' قہقہے لگا رہا تھا اور کیرتی آج ہی کوئی فیصلہ کرنا چاہتی تھی۔ ایک بار پھر مادھو کو قریب سے دیکھنا چاہتی تھی۔ وہ بھی اسی کمرے میں چلی گئی۔ دروازے کے پاس کھڑے ہوکر پوچھا۔

"تمہارا باپو کیسا ہے؟"

آپا ہنس پڑی۔ "کہہ رہا ہے دن رات بیاہ کے لیے دوڑ دھوپ کررہا ہے۔ ایک لڑکی بھی پسند کرلی ہے۔ یہ شہر میں سامان لینے آیا ہے۔"

کیرتی نے پوچھا۔ "تم نے دیکھی ہے لڑکی......؟"

دوبارہ آپا نے جواب دیا۔ "کہتا ہے بیاہ ہی نہیں کرنا لڑکیوں کو کیوں دیکھتا پھروں۔"

"یہ سچ ہے مادھو!"

مادھو نے اپنی ہنسی روکتے ہوئے کہا۔ "یہ سچ ہے کہ باپو نے آپ سب کو میرے بیاہ پر بلایا ہے۔"

"کب......؟"

"جب بھی ہوگا۔"

وہ اپنی بات پر خود ہی ہنسنے لگا۔ آپا بھی ہنستی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔

کیرتی نے کہا۔ "پتاجی بمبئی گئے ہوئے ہیں' ان سے مل کر جانا۔ وہ پانچ سات دن تک آجائیں گے۔"

"مگر نتھا سنگھ میرا انتظار کرکے چلا جائے گا۔ میں کس کے ساتھ واپس جاؤں گا۔"

کیرتی نے اسی لہجے میں کہا۔ "اپنا ڈرائیور اسے بتا آئے گا تم اپنے باپو کے نام ایک چٹھی بھیج دو۔ لکھ دو کہ سیٹھ جی سے مل کر آجاؤں گا۔"

مادھو نظریں جھکائے بیٹھا رہا۔ اس نے اپنی بات جاری رکھی۔

"اب تم اڈے کے قلی نہیں ہو۔ ہمارے دوست ہو۔ شہری لباس پہن کر شہر کا رنگ دیکھنا۔ اپنے پہاڑ بھول جاؤ گے۔ اپنے گیت بھول جاؤ گے۔"

مادھو خاموش بیٹھا رہا۔ کیرتی بھی اس کے پاس بیٹھ گئی۔

☆

چند دن شہر میں رہ کر مادھو واقعی شہری بابو بن گیا۔ کیرتی نے اس کے لیے قیمتی کپڑے بنوائے۔ صاحب بہادر بناکر اپنے ساتھ گھماتی رہی جس سوسائٹی میں بیٹھنا معیوب سمجھتی تھی' جس ماحول میں اسے گھن آتی تھی' مادھو کو وہاں بھی لے جاتی' جیسے وہ اسے اپنے ماحول کا انسان بنانا چاہتی تھی اور اس کی جسارت حسب توقع رہی۔ وہ مادھو کو جس رنگ میں دیکھنا چاہتی تھی مادھو نے ویسا ہی بن کر دکھایا۔ اب وہ پہاڑ کا جانگلی نہ تھا۔ اس کی شکل وصورت اور لباس نے ایک مہذب انسان بنادیا تھا۔ ہر ایک محفل کا خوب صورت وجیہہ جوان تھا۔ کیرتی کے حلقۂ احباب میں یہ بات مشہور ہوچکی تھی کہ مادھو کیرتی کا دوست ہے۔ اسے پہاڑ پر ملا تھا۔ وہ ٹھہری بھی اسی کے گاؤں میں تھی اور مدن رائے کو موت کے منہ سے بچایا بھی اُسی نے تھا۔

مدن رائے کو کیرتی کے نئے ڈھونگ سے تعجب نہ ہوا۔ وہ جانتا تھا کہ کیرتی اس سے نفرت کرتی ہے۔ اس کی گرفت سے دور رہنا چاہتی ہے اس کے لیے کبھی وہ سروپ کا سہارا لینے کی کوشش کرتی رہی اور اب مادھو کو لاکھڑا کیا لیکن مدن رائے اپنے حالات سے مطمئن تھا۔ سیٹھ جی اس کے حق میں تھے۔ اسے ایک خاندانی اور شریف لڑکا سمجھتے تھے۔ کیرتی کی نفرت بے معنی تھی اگر اسے کوئی خدشہ تھا تو وہ رانی سے تھا جو سائے کی طرح اس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کا تعاقب کرتی رہتی۔ ایک رات دونوں میں ٹھن گئی اور مدن نے نشے میں دھت بلبیر کے گھر اسے پیٹ بھی دیا۔ اسی رات وہ کیرتی کے پاس آئی اور اسے وہ ساری کہانی بتا دی جو آج تک چھپائے رکھتی تھی۔ کیرتی بہت کچھ جانتی تھی۔ بہت سی باتیں اس کے لیے نئی تھیں۔ کیرتی نے پوچھا۔ "لوگ تو کہتے ہیں تم نے مدن رائے کو بہکایا کہ مجھے دق ہے میری ماں کو بھی یہی روگ تھا۔"

"بس یا کچھ اور بھی سنا ہے؟"

کیرتی نے اپنی بات جاری رکھی۔ "تم مدن کے ساتھ جاگیر میں پہنچ گئیں وہاں اپنے آپ کو شادی کے لیے پیش کیا۔ اس نے ہاں بھی کردی لیکن بات بگڑ گئی۔"

رانی تن کر بیٹھ گئی۔ "میں اتنی کمینی نہیں کہ اپنی سہیلی کے منگیتر کو ہی کھا جاؤں۔ میں جاگیر میں گئی تھی۔ مدن کے کہنے پر نہیں بلبیر کے کہنے پر۔ نریندر بھی ساتھ تھا اور بعد ازاں سروپ بھی آگیا۔ سب نے مدن رائے کو سمجھایا لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ ایک دن اس نے مجھ سے شادی کی التجا کی۔ کئی دن یہ مذاق رہا' آخر بلبیر نے مجھے مجبور کیا کیوں کہ اسے پختہ یقین تھا کہ وہ تم سے شادی نہیں کرے گا۔ تم بلبیر سے پوچھ سکتی ہو۔ اس نے مجھے سوچنے کا وقت ہی نہیں دیا۔"

"تم نے مجھے یہ بات بتائی کیوں نہیں؟"

رانی نے اسی رو میں جواب دیا۔ "جب میں وہاں سے آئی تم پہاڑ پر جاچکی تھیں۔ جب لوٹیں بات بگڑ چکی تھی۔ بلبیر اب کنی کتراتا ہے لیکن جو کچھ ہوا ذمے دار وہی ہے۔ لوگ تو سروپ کو پاگل کہتے ہیں لیکن اصلی پاگل بلبیر ہے۔ میں پوچھتی ہوں تو جواب دیتا ہے...... وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے۔ راسکل کہیں کا......"

کیرتی نے مدہم سر میں پوچھا۔ "اب تم نے کیا سوچا ہے؟"

رانی نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ "پہلی بات تو یہ سوچی ہے کہ تمہاری اس سے شادی نہ ہو۔ وہ تمہارے قابل نہیں۔ وہ کسی لڑکی کے قابل نہیں' اس کے بعد میں سنبھال لوں گی۔ میری نظر میں آوارہ ہونا گناہ نہیں کسی کو دھوکا دینا گناہ ہے۔"

"تم پتاجی کو ساری باتیں بتادو۔"

"انہیں تو شاید نہ بتا سکوں لیکن ممی سے ضرور بات کروں گی۔ کچھ بھی ہو میں اس سے نپٹ لوں گی۔ مجھ میں اتنی طاقت ہے۔"

مادھو تین گل دستے بنا لایا۔ ایک کیرتی کو دیا اور دوسرا رانی کو۔

کیرتی نے پوچھا۔ "یہ تیسرا گل دستہ کسی کے لیے ہے؟"

"سروپ صاحب کے لیے۔" اس نے دونوں کے قریب بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔ "سروپ صاحب کو پھول بہت پسند ہیں۔"

مادھو اسپتال میں سروپ سے مل چکا تھا۔ اس کی باتوں سے بے حد متاثر ہوا تھا جن میں پہاڑی گیتوں کے بول تھے۔ کملی چاچی کی کہانیاں تھیں۔ سرسبز وادیوں کی مترنم خاموشیاں تھیں اس میں کوئی بناوٹ نہ تھی۔ سیدھا سادہ پرخلوص انسان تھا بچوں کی سی بے فکر مسکراہٹ اس کے چہرے پر بنتی مٹتی رہتی لیکن وہ پاگل تھا۔ پاگل پن کا تعلق تو شعور سے ہے۔ وہ تو ایک معصوم بچہ تھا۔ وہ پاگل کیسے ہوگیا' شاید اپنے راستے سے بھٹک کر اپنا سہارا گنوا بیٹھا۔ وہ بھی تو پاگل ہی ہوتے ہیں جن کا سہارا ٹوٹ جاتا ہے۔ سروپ کو دیکھ کر نہ جانے کیوں اسے ایک پہاڑی گیت کے بول یاد آگئے تھے اور سروپ کے پاس بیٹھا دل ہی دل میں گنگنا تا رہا تھا۔

"دکھی لے رام دھناں پر بتا دی رتیا گی لنگنا کپیا تندا کنے۔
ہتھیں دیں دتیاں کٹھن ہوئی جدیاں کھوتسیاں پوندیاں وندا کنے۔"

وہ کیرتی سے مخاطب ہوا۔ "جب بھی سروپ صاحب کو

دیکھتا ہوں مجھے اپنا پہاڑی گیت یاد آجاتا ہے جس کا مطلب ہے پریت کی ریت بھی عجیب ہے۔ کچے دھاگے سے لٹکنا پڑتا ہے۔ اپنے ہاتھوں سے دی ہوئی گرہ کبھی اتنی سخت ہوجاتی ہے کہ اسے دانتوں سے کھولنا پڑتا ہے۔"

دونوں خاموش بیٹھی رہیں۔

قدرے توقف کے بعد مادھو نے پوچھا۔ "سروپ صاحب اچھے نہیں ہوسکتے؟"

رانی نے پوچھا۔ "کیا مطلب؟"

مادھو نے اسی لہجے میں کہا۔ "میرا مطلب ہے سروپ صاحب کو لوگ پاگل نہ سمجھیں۔ میں نے پاگل دیکھے ہیں۔ ان میں تو ویسی کوئی بات نہیں۔"

کیرتی بولی۔ "دن بھر روتا رہتا تھا۔ رات کو پل بھر کے لیے بھی سو نہیں سکتا تھا۔ ڈر تھا کہیں پاگل نہ ہوجائے۔ اب اسپتال میں ٹھیک ہورہا ہے۔"

مادھو نے جھٹ جواب دیا۔ "روتا تو دکھی من ہے۔ بے سہارا آدمی کا دل روتا ہے۔ اگر اسے سہارا مل جائے دکھ درد بانٹنے والا مل جائے تو....."

کیرتی نے ہنستے ہوئے کہا۔ "یہ بھی تمہارے پہاڑی گیتوں کے بول ہیں؟"

رانی بھی اس کی ہنسی میں شریک ہوگئی۔ "اب پہاڑی گیت ہی تو رہ گئے پہاڑوں پر۔ مادھو صاحب تو اب پہچانے بھی نہیں جاتے۔ ہر محفل میں انہی کی مسکراہٹ اور خوش اطواری کے چرچے ہیں۔"

کیرتی کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

رانی نے انگریزی میں کہا۔ "تمہارے ارادے کچھ اور ہی دکھائی دیتے ہیں۔"

کیرتی نے بھی انگریزی میں پوچھا۔ "کیا مطلب؟"

"یہی کہ یہ لڑکا تمہارے بہت قریب آگیا۔"

اس نے سنبھل کر جواب دیا۔ "ایسی کوئی بات نہیں۔ اسے خوش دیکھ کر اچھا کھلا پہنا کر مجھے محسوس ہوتا ہے میں نے اسے وہ چیز دے دی جس کی اسے خواہش تھی' لیکن حاصل نہ کرسکتا تھا ورنہ اور کوئی بات نہیں۔ صرف ایک قرض چکا رہی ہوں جو پہاڑوں سے میں نے اپنی زندگی کے لیے لیا تھا۔"

رانی نے زور زور سے گردن ہلائی۔ "یہ دل کی باتیں ہیں تمہاری زبان انہیں چھپا سکتی ہے لیکن آنکھوں کی پتلیاں نہیں۔ کچھ بھی ہو تمہارا انتخاب برا نہیں۔"

چائے آگئی۔ تینوں نے جلدی جلدی چائے پی اور سروپ سے ملنے اسپتال چلے گئے۔ آج سیٹھ جی نے بھی آنا تھا۔

☆

سیٹھ رادھے شام مدن رائے کے بھائی سے شادی کی بات پکی کرکے لوٹ آئے تھے۔ دھن دولت اور آیا شادی کے حق میں نہیں اور ان کی آواز کیرتی کی ترجمان ہے۔ سیٹھ جی جانتے تھے لیکن اب انہیں صرف اپنی آن کی فکر تھی جسے وہ کیرتی کی زندگی سے کھیل کر بھی بچانے کے لیے تیار تھے۔ سروپ اسپتال سے چلا آیا تھا۔ وہ بلبیر کے پاس ٹھہرا لیکن کیرتی اسے اپنی کوٹھی میں لے آئی۔ سیٹھ جی اس کی شاعری اور فلسفیانہ باتیں پسند کرتے تھے۔ ہر ایک بات توجہ سے سنتے اور سروپ بھی بلاتکلف ہر ایک مسئلے پر بحث کرتا لیکن کیرتی کی بات ان سے نہ کرسکا۔ کئی بار زبان پر بات آئی' وہیں مٹ گئی۔ مدن اس کا دوست تھا۔ وہ کیرتی سے محبت کرتا تھا اور کیرتی مادھو کو پسند کرتی تھی۔ مدن کی محبت اور کیرتی کی پسند میں کون سا جذبہ کارفرما تھا' سروپ کو معلوم نہ تھا۔ پانے اور کھونے کی ایک لمبی دوڑ تھی جس میں اس کی اپنی ذات شریک نہ تھی۔ اس کی اپنی محبت شاعر کی اپنے گیتوں سے محبت تھی اور وہ اپنے گیتوں کو زندہ کرنا چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کیرتی اور مادھو ایک ہو جائیں۔ راگ اور مغنی ایک دوسرے میں مدغم ہوجائیں اور شاعر امر ہوجائے اور خاندانی وجاہت اور امارت کی جو کھوکھلی دیوار درمیان میں حائل ہے وہ ڈھے جائے لیکن سیٹھ جی کے سامنے اس کی زبان نہ کھلتی۔ سیٹھ جی کی

خوشیوں میں اگر کوئی چیز حائل تھی تو وہ کیرتی کی خاموشی تھی جو کسی بھی مہیب طوفان کا پیش خیمہ ثابت ہوسکتی تھی۔ ایک مہینے کے بعد شادی تھی اور ایک مہینے کا وقفہ طویل بھی تھا اور مختصر بھی لیکن مادھو اس انتظار سے بے نیاز تھا۔ اس کی باتوں اور مسکراہٹوں میں کوئی فرق نہ پڑا۔ وہ وہی پہاڑی پتھر تھا جو پانی کی طرح پگھل کر میدانوں میں اتر آیا تھا لیکن وہاں پہنچ کر دوبارہ ایک چٹان کی شکل اختیار کرلی تھی لیکن اس کی ہیجانی کیفیت سروپ سے پوشیدہ نہ تھی۔

ایک دن موقع پاکر سروپ نے سیٹھ جی سے کیرتی کی بات چھیڑ ہی دی۔ سیٹھ جی خلاف فطرت خاموش بیٹھے سنتے رہے۔ بات کیرتی کی صحت' اس کے مستقبل سے شروع ہوئی اور مادھو پر آکر ٹوٹ گئی۔

سیٹھ جی نے ساری باتیں سن کر اپنی کہی۔ "تم یہ چاہتے ہو کہ کیرتی کی پسند یا کم عقلی اور ناپختگی کی وجہ سے اس کا ہاتھ ایک پہاڑی جاہل کے ہاتھ میں دے دیا جائے۔ وہ بھی صرف اس لیے کہ اس نے کیرتی کی خدمت کی۔ وہ خوب صورت اور نوجوان ہے۔ کیا خدمت کا صلہ خاندانی عزت اور وقار ہے؟ کسی کو قیمتی لباس میں دیکھ کر مہذب اور خاندانی نہیں بنایا جاسکتا۔ خاندان کی جڑیں ہوتی ہیں جو آندھی اور طوفان میں بھی نہیں اکھڑتیں۔ آزادی محبت جائز ہے لیکن ایک حد کے اندر ہی۔"

سروپ نے بھی اسی رو میں کہا۔ "پھر آپ میں اور دوسرے سرمایہ داروں میں کیا فرق ہے؟ آپ نے ہمیشہ انسان کو انسان کی نظر سے دیکھا۔ دولت اور ثروت کے پیمانے سے نہیں ناپا۔ مادھو کو اگر وہی سمجھ لیا جائے جو موجودہ صورت میں ہے تو میرے خیال میں اس میں اور مجھ میں تب بھی کوئی فرق نہیں جس طرح کہ مجھ میں اور مدن رائے میں فرق نہیں۔"

سیٹھ صاحب بلند آواز میں بولے۔ "سروپ صاحب! جہاں تک شاعری کا تعلق ہے یہ باتیں جائز ہیں لیکن دنیا میں رہتے ہوئے شاعری کے نہیں دنیا کے اصول اور قاعدے قانون اپنانے پڑتے ہیں۔"

سروپ نے ان کے دماغ کو جھنجوڑنے کی کوشش کی۔ "اگر کیرتی نے کوئی غلط اقدام اٹھالیا؟"

سیٹھ جی سٹپٹائے۔ "تمہارا مطلب خودکشی سے ہے؟"

"نہیں.....اس سے بھی خطرناک۔"

سیٹھ جی کا چہرہ غصے میں تمتما اٹھا۔ وہ کچھ کہنے ہی لگے تھے کہ مادھو آگیا۔ سیٹھ جی اپنی بات ادھوری چھوڑ کر اس سے مخاطب ہوئے۔

"تم واپس جانے کو کہہ رہے تھے؟"

مادھو کو دھچکا سا لگا۔ وہ سمجھ گیا اب حالات بگڑ گئے ہیں۔ اس کے چہرے پر بچوں کی سی معصوم مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"ایک دو دن میں چلا جاؤں گا' شاید کل ہی چلا جاؤں۔"

سیٹھ جی اس کی مسکراہٹ کی تاب نہ لاسکے۔ اٹھ کر چلے گئے۔

اس نے سروپ سے پوچھا۔ "سیٹھ جی مجھ سے ناراض ہیں؟"

سروپ نے گمبھیر سر میں جواب دیا۔ "کیرتی کی شادی قریب آرہی ہے اور جو کچھ کیرتی نے تمہارے بارے میں سوچ رکھا ہے' سیٹھ جی کے خیال میں تم اس کے اہل نہیں۔"

مادھو نے اسی رو میں کہا۔ "مجھے معلوم ہے۔"

"لیکن کیرتی تمہیں حاصل کرنے کی خواہاں ہو تو.....؟"

اس نے بلند آواز میں کہا۔ "آپ کوی ہیں اور میں ایک اَن پڑھ ڈنگر پہاڑی اور....."

"لیکن دونوں ہی تو پیار کے بھوکے ہوتے ہیں؟"

"لیکن وہ یہ بھی نہیں چاہتے کہ محبت کی رسوائی ہو۔ محبت تو انسان کو دیوتا بنا دیتی ہے۔ محبت تو گیتوں کو جنم دیتی ہے۔ یہ آپ کی بتائی ہوئی باتیں ہیں۔"

بلبیر اور کیرتی آگئے۔ کیرتی سیدھی اپنے کمرے میں چلی گئی اور سیٹھ جی کسی نوکر کو ڈانٹ رہے تھے۔ مادھو پھول

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چھنے لگا۔

بلبیر نے سروپ سے پوچھا۔ "تمہارا چہرہ کیوں اترا ہوا ہے؟"

اس نے تھکی ہوئی آواز میں کہا۔ "قصہ چھیڑا تھا میں نے۔ ختم کسی دوسرے نے کر دیا۔"

"میں نے منع جو کیا تھا۔"

"ایک بوجھ تھا۔ آج ہلکا ہو گیا۔ مادھو شاید آج رات ہی کو چلا جائے۔"

"آج رات تو مدن یہاں آ رہا ہے۔ وہ جاگیر سے لوٹ رہا ہے۔"

"تب تو مادھو کو جانا ہی چاہیے۔"

سیٹھ جی نے پکارا۔ بلبیر اندر چلا گیا۔ کیرتی سروپ کے پاس آ گئی۔ مادھو پھول توڑ رہا تھا اور شام دھیرے دھیرے اتر رہی تھی۔

کیرتی نے پوچھا۔ "کیا بات ہوئی؟ پتا جی بہت غصے میں ہیں۔"

سروپ نے ٹھنڈی آہ بھری۔ مدن اور مادھو کا موازنہ کیا گیا۔"

"پھر......؟"

"مادھو جیت گیا۔"

"کیسے......؟"

"وہ واپس جا رہا ہے۔ جو کچھ تم چاہتی ہو وہ نہیں چاہتا۔"

کیرتی بھاگ کر مادھو کے پاس گئی۔ "تم جا رہے ہو؟"

مادھو نے پھولوں پر جھکے ہوئے جواب دیا۔ "یہاں رہ کر اب کیا کروں گا۔"

"تمہارا دل نہیں لگا؟"

"مجھے شہر پسند ہے نہ شہری لوگ۔ اگر جلدی پہاڑوں پر نہ لوٹا تو مر جاؤں گا۔ میرا سب کچھ پہاڑوں کے پاس ہے۔ وہ روٹھ گئے تو میں کہیں کا نہیں رہوں گا۔"

کیرتی نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "تم چاہتے ہو میں وہی موت مرنے لگوں جس سے تم نے مجھے بچایا تھا۔"

"یہ چاہنا اور سوچنا آپ کے گھر والوں کا کام ہے لیکن میں نے جو کچھ پایا ہے کسی حالت میں بھی اسے گنوانا نہیں چاہتا۔ مجھے وہ اثاثہ زندگی سے بھی پیارا ہے۔ سیٹھ جی مجھے غلط سمجھتے ہیں۔ اب یہاں نہیں رہوں گا لیکن آپ کے بیاہ تک شہر ہی میں رہوں گا۔ کسی لاری کے اڈے کا آسرا لوں گا۔ دور سے دیکھوں گا آپ کو دلہن کے کپڑوں میں۔ میرے من کی یہ آخری حسرت ہے۔"

کیرتی کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن شدت جذبات سے گلا بند ہو گیا۔ آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔ سیٹھ جی کے کمرے میں ایک قہقہہ بلند ہوا۔ مادھو کے کان کھڑے ہو گئے۔ سروپ گیت سنا رہا تھا۔ مادھو دوڑتا ہوا سیٹھ جی کے کمرے میں جا پہنچا۔ سروپ جھوم جھوم کر اپنا گیت سنا رہا تھا۔ اس کے گیتوں میں مادھو کا اپنے پہاڑی گیتوں کا سا لوچ اور درد ملتا تھا اور میدانوں کے دھند غبار میں بھی اسے اپنی گھاٹیوں کی ہریالی دکھائی دیتی تھی۔ ایک "واہ" پر گیت ختم ہو گیا۔ بلبیر دیر تک گنگناتا رہا۔

وادیاں وہی اچھی ہیں
جو آباد ہوں
ویرانے کیا لٹیں گے......

پھر سروپ کی فرمائش پر مادھو نے پہاڑی گیت گایا۔ وہی گیت جسے سن کر کیرتی بے خود ہو جایا کرتی تھی۔

مجھ گوری دا چن بنیاں دا میرے نین چکور
اپنے ہتھیں آپوں بجھیا پائی پریماں دی ڈور

گوری کا چہرہ چاند اور میری آنکھیں چکور...... میں نے پریم کی ڈور میں اپنے آپ کو خود ہی باندھ لیا......

مادھو کا گیت بھی ختم ہو گیا لیکن مدن نہ آیا۔ سیٹھ جی اسی کے انتظار میں بیٹھے تھے۔ پورے سات بجے آنا تھا اور وہ وقت کا پابند تھا۔ آج دانستہ شام بن میں کوئی پروگرام نہ رکھا گیا۔ سیٹھ جی مدن رائے کو چیک دینا چاہتے تھے تاکہ وہ حسب ضرورت اور دل پسند چیزیں خرید لے۔ جب آٹھ بجنے کو آئے تو انہوں نے کیرتی کو کار لے کر بلبیر کے گھر جانے کو کہا جہاں وہ ٹھہرا ہوا تھا۔

کیرتی نے پوچھا۔ "اکیلی ہی جاؤں؟"

سیٹھ جی سروپ کو ساتھ بھیجنا چاہتے تھے لیکن اس نے کوئی دوسرا گیت چھیڑ دیا۔ شاید وہ کیرتی اور مادھو کو آخری موقع دینا چاہتا تھا اور بلبیر اس کے دل کی بات جان گیا تھا۔ اس نے مادھو کو ساتھ جانے کے لیے کہا۔ سیٹھ جی گیت کی مترنم گہرائیوں میں کھو گئے تھے۔

کیرتی مدن کے پاس نہ جانا چاہتی تھی لیکن مادھو سے کھل کر باتیں کرنے کی خواہاں تھی اور بلبیر اور سروپ نے اسے موقع دیا تھا اور وہ اس سے فائدہ اٹھانا چاہتی تھی۔ راستے میں اس نے مادھو کو جھنجوڑا لیکن وہ پتھر بنا بیٹھا رہا۔ کار خود چلا رہی تھی۔ رفتار کم کر دی۔

"تم تو پتھر بن گئے مادھو! لیکن میں جانتی ہوں تم کیا سوچ رہے ہو۔ جو کچھ بھی ہو جیسے بھی ہو ان سب سے اچھے ہو بڑے ہو۔ جنہیں تم یہاں دیکھ رہے ہو جو دھن دولت کے نشے میں سرشار تمہیں ٹھکرا رہے ہیں میں تم سے کچھ چھیننا نہیں چاہتی۔ تمہارا اثاثہ تمہیں مبارک ہو لیکن ایک وعدہ کرو۔ جب تک میں شام بن میں ہوں تم وہیں رہو گے بغیر پوچھے نہیں جاؤ گے۔"

"اگر سیٹھ جی نے مجھے نکال دیا۔"

"وہ تمہیں کچھ نہیں کہیں گے۔ وہ غصے میں کہہ بیٹھے۔ انہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ جو کچھ آج میں ہوں تمہاری بدولت ہوں۔"

مادھو نے سارے آنسو ایک ہی گھونٹ میں پی لیے۔ "میں تب تک نہیں جاؤں گا۔ میں پتھر ہوں بہت کچھ سہہ سکتا ہوں۔"

کیرتی نے کار کی رفتار تیز کر دی۔

مادھو زیر لب گنگنانے لگا۔

کمبل پھٹے تاں تاکی لاں...... امبر پھٹے تاں کہ کراں...... پھٹے ہوئے کمبل میں تو پیوند لگ سکتا ہے لیکن آسمان ہی پھٹ پڑے تو کوئی کیا کرے۔

بلبیر کی کوٹھی کے سامنے کار روک کر کیرتی نے اسے اندر بھیجا۔ بڑا دروازہ بند تھا۔ سامنے کے کمروں میں روشنی بھی نہ تھی۔ مادھو پہلے بھی بلبیر کے ساتھ کوٹھی میں آ چکا تھا۔ وہ پچھواڑے سے ہو کر اندر گیا۔ وہاں گڑھوالی نوکر بھی نہ تھا لیکن ایک کمرے میں روشنی تھی جہاں سے جانی پہچانی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ اس نے کھڑکی سے کان لگائے۔ ایک آواز مدن رائے کی تھی اور دوسری رانی کی۔ دونوں غصے میں بول رہے تھے۔ وہ دروازے سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔

"تم نے مجھے زیادہ پلا دی تاکہ آج کیرتی کے پاس نہ جا سکوں اور ایک جیتی ہوئی بازی ہار جاؤں لیکن میں وہاں جاؤں گا اور اسی حالت میں......"

"تم یہاں سے باہر قدم ہی نہیں رکھ سکتے۔ تم نے مجھے دھوکا دیا ورنہ ان باتوں کو زیادہ اہمیت نہیں دیتی۔ محبت کا کھیل رچایا، جسم سے کھیلے اور پھر ایک دم آنکھیں پھیر لیں۔"

"مجھے تم سے نفرت ہے۔"

"لیکن میں تم سے محبت کرتی ہوں جو تمہاری اس نفرت سے پیدا ہوئی۔ اب میں تمہیں کسی حالت میں بھی نہیں چھوڑ سکتی۔"

"میں نے تمہاری ہر حرکت کی قیمت چکائی ہے۔"

"مجھے بازاری چیز سمجھ رکھا ہے۔"

"اپنے آپ سے پوچھو۔"

"تمہیں یہ سودا مہنگا پڑے گا۔"

"اس کے لیے بھی تیار ہوں۔"

"سوچ لو۔"

"مجھے جانے دو۔ میرے پاس ان فضول باتوں کا وقت نہیں۔"

"ایک دن میں نے اپنے آپ کو تمہارے حوالے کیا

تھا۔ آج تمہیں اپنا آپ میرے حوالے کرنا ہوگا۔"

"میں کہتا ہوں راستے سے ہٹ جاؤ!"

"کوشش کر کے ہٹالو۔"

"مجھے وہ بھی آتا ہے۔"

میز کی دراز سے مدن نے پستول نکالا۔ شراب کے نشے اور غصے کی آگ نے اس پر لرزہ طاری کر دیا تھا۔ زبان اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ بڑی مشکل سے سوال جواب پورے کر رہا تھا۔ پستول اس کے ہاتھ میں دیکھ کر رانی چیل کی طرح جھپٹی اور پستول چھین لیا۔

"ایک قدم بھی آگے نہ بڑھانا۔" وہ بے ساختہ چلائی۔

مدن رائے میز کے سہارے کھڑا رہا۔ ہونٹوں پر اپنی زبان پھیرتا رہا۔

"دیکھو رانی!" اس نے سنبھلنے کی کوشش کی۔ "تم جذباتی ہوگئی ہو۔ میں کیرتی سے محبت نہیں کرتا۔ صرف اس سے انتقام لینا چاہتا ہوں۔ اس نے میری ہتک کی ہے، ٹھکرایا ہے۔ میرے لیے شادی وہ نہیں جو تم سمجھتی ہو۔ پھینک دو پستول۔ تم تو محبت کرتے مرنے مارنے پر اتر آئیں۔"

رانی ایک قدم آگے بڑھی۔ "کیرتی سے شادی کر کے اسے چھوڑ دو گے۔"

"ہاں۔"

وہ ایک قدم اور آگے بڑھی پستول کا منہ مدن رائے کی طرف تھا۔

"اس کے بعد کیا ہوگا؟"

"ہم دونوں ساتھ رہیں گے۔"

"شادی کے بغیر؟"

"ہاں۔ تم کہو تو شادی بھی کر سکتا ہوں۔"

"دوسری شادی۔"

"ہاں۔" مدن نے ہچکی لی۔ وہ اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"اور پھر تیسری، چوتھی، پانچویں..... ایک سالم حرم....." رانی نے پاگلوں کی طرح قہقہہ لگایا۔ مدن نے عقاب کی طرح جھپٹ کر اس کا پستول والا ہاتھ اوپر اٹھا لیا۔

"اب تمہیں اس کا استعمال سکھاؤں۔"

مادھو خاموش کھڑا دیکھ رہا تھا اور کیرتی لمبے لمبے ہار ن دے رہی تھی جیسے جہاز سمندر میں ڈوب رہا ہو جیسے کیبن میں آگ بھڑک اٹھی ہو اور مدن رائے رانی کے ہاتھ سے پستول چھین رہا تھا جو اس کے ہاتھ کا ایک حصہ بن کر رہ گیا تھا۔ مادھو بھی کھڑکی سے اندر داخل ہوا اور ان کی چھینا جھپٹی میں شریک ہوگیا۔ آخر اس نے پستول چھین ہی لیا لیکن تب تک گولی چل چکی تھی۔ مدن رائے صوفے پر گر پڑا تھا اور رانی ایک کونے میں دبکی ہانپ رہی تھی۔ ان دونوں میں سے ایک مر گیا تھا۔ مدن اس کے قریب تھا۔ مادھو نے اسے اوپر اٹھایا۔ وہ ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ گولی اس کے دل پر لگی تھی۔ مادھو نے غور سے پستول کو دیکھا اور پھر رانی کو جو اس طرح سے تاک رہی تھی جیسے اسے پستول کی ضرورت ہو۔

مادھو نے دروازے پر ٹنگے ہوئے ریشمی پردے سے اپنا پسینہ پونچھا جو اس کی آنکھوں کو اندھا کر رہا تھا۔ دیر تک اپنا سر کھجاتا رہا اور پھر رانی کو لے کر کمرے سے باہر نکل آیا۔ وہ بالکل خاموش تھی جیسے اس کی طاقت گویائی ہی ختم ہوگئی ہو۔

مادھو نے اسے جھنجوڑا۔ "باہر کیرتی جی انتظار کر رہی ہیں۔ اس سے کچھ نہ کہنا، کچھ نہ بتانا۔ یہ تو آپ جانتی ہی ہیں پستول میرے ہاتھ سے چلا۔ مدن صاحب کا قاتل میں ہوں۔"

رانی اسے پھٹی پھٹی سی آنکھوں سے دیکھتی رہی۔

اس نے بات دوہرائی۔ "پستول میرے ہاتھ سے چلا۔ مدن صاحب کا قاتل میں ہوں۔ یہ آپ جانتی ہی ہیں۔"

رانی کی جان میں جان آئی۔ اس نے بہ مشکل آواز نکالی۔ "پستول تم نے چلایا تھا؟"

"ہاں میں نے چلایا تھا۔ مدن صاحب کا قاتل میں ہوں۔" مادھو بار بار اپنے فقرے کو دوہراتا رہا تاکہ رانی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے ذہن سے ڈر اور خوف کا احساس مٹ جائے۔

"لیکن....." رانی نے ڈرتے ڈرتے زبان کھولی۔

اس نے بات کاٹ دی۔ "کار میں خاموش بیٹھے رہنا۔ کیرتی میم صاحب جو کچھ پوچھیں گی جواب میں دوں گا۔ اپنے گھر میں بھی کسی سے اس حادثے کا ذکر نہ کرنا۔"

وہ رانی کو لے کر کار کے پاس پہنچ گیا۔ اسے پچھلی نشست پر بٹھا کر زور سے دروازہ بند کر دیا اور خود اگلی نشست پر کیرتی کے ساتھ بیٹھ گیا۔

کیرتی نے سراسیمگی کی حالت میں پوچھا۔ "گولی چلنے کی آواز آئی تھی۔"

مادھو نے مکمل خود اعتمادی سے جواب دیا۔ "مدن صاحب نے زیادہ پی لی ہے۔"

"گولی کس نے چلائی؟"

"مدن صاحب نے۔"

"کس پر.....؟"

"مجھ پر....."

"کیوں.....؟"

"مدن صاحب نے زیادہ پی لی ہے۔"

کیرتی نے رانی سے پوچھا۔ "تم یہاں کیا کر رہی تھیں؟"

جواب مادھو نے دیا۔ "مدن صاحب کو لینے آئی تھیں۔"

کیرتی رانی سے مخاطب ہوئی۔ "خاموش کیوں ہو؟"

"آپ کار اسٹارٹ کریں۔" مادھو نے قدرے تیز لہجے میں کہا۔

"لیکن مدن.....؟"

"اس حالت میں انہیں ساتھ لے چلنا ٹھیک نہیں۔"

"لیکن کیوں.....؟"

"بتا جو دیا، مدن صاحب نے زیادہ پی لی ہے۔ انہیں ساتھ لے چلنا یا آپ کا ان سے ملنا مناسب نہ ہوگا۔"

کیرتی نے کار کی بتی روشن کر کے رانی کو دیکھا جو سہمی ہوئی بیٹھی تھی۔ اس کا چہرہ وحشت زدہ تھا اور بال بری طرح بکھرے ہوئے۔ اس کی حالت سے کیرتی نے کوئی دوسرا ہی اندازہ لگایا۔ دھیرے سے کہا۔

"میں سمجھی۔"

مادھو نے بلند آواز میں پوچھا۔ "کیا سمجھ گئیں؟"

کیرتی نے کار اسٹارٹ کر دی۔ راستے میں مادھو کے کہنے پر رانی کو اس کے گھر چھوڑ دیا گیا۔ کیرتی نے راستے میں کوئی بات نہ کی۔ جب کار اندر نگر کے پولیس اسٹیشن پر پہنچی تو مادھو نے کار روک لینے کو کہا۔

کیرتی نے کار روک لی۔ "کیا بات ہے؟"

"ایک رپٹ لکھوانی ہے۔"

"کیسی رپورٹ؟"

"آج جو جھگڑا ہوا اس کی۔"

"کیا ضرورت ہے؟"

"ضرورت ہے۔"

مادھو کار سے باہر نکلا۔ دیر تک سر کو کھجاتا رہا جیسے کچھ کہنے سے پہلے سوچنا چاہتا تھا جیسے اس کے دل میں بہت سی باتیں ایک ساتھ پیدا ہوگئی تھیں اور وہ فیصلہ نہ کرنا پاتا تھا پہل کسے دے؟

کیرتی نے گھبرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔ "صاف صاف بتاتے کیوں نہیں بات کیا ہے۔"

اس نے جیب سے پستول نکالا۔ "مدن صاحب کا میں نے خون کیا ہے۔ سیٹھ جی سے کہہ دیں، میں خونی ہوں۔"

مادھو نے جلدی جلدی تھانے کا گیٹ پار کر لیا۔

کار کی بجھی ہوئی بتیاں ایک دم جگمگا اٹھیں۔ رفتار ایک دم تیز ہوگئی۔ کیرتی کا ہاتھ ہارن پر تھا۔ ہارن بجتا چلا گیا۔ اسے جیسے نہ کار کی رفتار کی خبر تھی اور نہ ہی ہارن کی مسلسل چیخ کی۔ شام بن میں پہنچ کر کار خود بہ خود رک گئی لیکن ہارن مسلسل چیخ رہا تھا۔ سب لوگ کار کے گرد جمع ہوگئے۔ کیرتی بے ہوش پڑی تھی۔ بلبیر نے اس کا ہاتھ ہارن پر سے اٹھایا اور اسے اٹھایا اور اسے اٹھا کر اندر لے گئے۔ ساتھ نہ مادھو تھا اور نہ ہی مدن رائے۔ کافی دیر کے بعد

کیرتی نے آنکھیں کھولیں۔ سب نے ایک ساتھ ایک آواز میں پوچھا۔ ”کیا ہوا.....؟“ اس نے ایک چیخ ماری اور خاموش ہوگئی۔ دوسرے کمرے میں ٹیلی فون کی گھنٹی بج رہی تھی۔ بلبیر ادھر لپکا۔ ٹیلی فون پولیس اسٹیشن سے تھا۔ وہ لوگ شام بن میں آرہے تھے۔

اندر نگر کی ساری بستی جاگ پڑی۔ ساری بستی میں ساری رات کہرام مچا رہا۔ سیٹھوں کی موٹریں دوڑتی بھاگتی رہیں لیکن کیرتی نے ساری رات آنکھ تک نہ کھولی۔ آیا ساری رات اس کے سرہانے سر تھامے روتی رہی۔

☆

مادھو نے پولیس اسٹیشن پر جو رپورٹ درج کروائی اس میں اتنا ہی کہا کہ اس کا پہاڑ پر مدن رائے سے کسی بات پر جھگڑا ہوگیا تھا۔ وہاں وہ کیرتی کی وجہ سے بچ گیا ورنہ وہیں اس کے ہاتھوں مارا جاتا اور اسی ارادے کو پورا کرنے کے لیے اتنی دور سے بڑے شہر آیا تھا۔ جھگڑا کس نوعیت کا تھا' پس منظر کیا تھا بیان نہیں کیا۔ کیرتی رات بھر بے ہوشی میں بڑبڑاتی رہی اور رانی نے رات جاگتے ہی کاٹی۔ وہ جانتی تھی جب گولی چلی پستول اس کے اپنے ہاتھ میں تھا اور اس نے عمداً گولی چلائی تھی۔ صبح جب اسے معلوم ہوا کہ مادھو نے قتل کا الزام اپنے سر لے لیا ہے تو وہ چپکے سے اٹھی اور پولیس اسٹیشن چلی گئی۔

رانی نے اپنے بیان میں اختصار سے کام لیا۔ صرف اتنا کہا کہ مادھو بے گناہ ہے جب وہ جائے وقوع پر پہنچا مدن رائے اس کی گولی کا نشانہ بن چکا تھا اور حادثے کی ذمے دار مدن کی کوئی معمولی یا غیر معمولی حرکت نہ تھی' اس کی اپنی ذات تھی۔ وہ اس سے شادی کرنا چاہتی تھی لیکن مدن رائے نے وعدہ کرکے بعد ازاں شادی سے انکار کردیا اور وہ برداشت نہ کرسکی کہ اسے دھوکا دے کر کسی اور کے دائمی رشتے میں منسلک ہوجائے چاہے وہ اس کی بچپن کی سہیلی کیرتی ہی کیوں نہ ہو۔

پولیس تھانہ سے لے کر عدالت تک دونوں اپنے اپنے بیانات پر قائم رہے۔ ان میں سے ایک کی ذرا سی لغزش دوسرے کو موت کے منہ میں دھکیل سکتی تھی۔ دونوں جانتے تھے بسیار فیسائش پر بھی اپنے بیانات میں ردوبدل یا ترمیم نہ کی۔ من وعن وہی فقرے دوہرائے گئے جو پہلے بیان میں تھے۔

عدالت نے سروپ کے بیان صفائی کو قابل اعتماد نہ سمجھا کیوں کہ وہ ایک دماغی مریض تھا۔ اس نے اپنے بیان میں شاعرانہ مبالغے سے کام لے کر واقعات سے زیادہ احساسات کا تجزیہ کیا جو قانون کی رُو سے اہم نہ تھا۔ بلبیر اہم گواہ صفائی تھا۔ اس کی شہادت واقعات اور حقائق پر مبنی تھی لیکن اس نے کیس کے واقعاتی نکات کو ایسا الجھایا کہ وہ ایک نفسیاتی کہانی بن کر رہ گئی جس میں انسانی نفسیات اور زندگی کا فلسفہ تھا۔

کیرتی کے بیان کا تعلق رنگڑ گڑھی کے واقعات سے تھا۔ اس میں کوئی نئی بات نہ تھی۔ ایک صاف سیدھا بیان تھا جس میں مادھو کے ایثار اور خلوص کا تذکرہ تھا جس میں یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی تھی کہ مادھو جیسا انسان کسی کی زندگی تو دے سکتا ہے موت کے گھاٹ نہیں اتار سکتا اور اگر وہ مدن رائے کو قتل کرنے کا ارادہ رکھتا بھی تھا پہاڑ پر اس کے لیے اچھا موقع تھا' شہر آنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔

سیٹھ جی اور نریندر کے بیانات مادھو کے خلاف تھے۔ نریندر نے شکار کا وہ واقعہ بیان کیا تھا جب رنگڑ گڑھی کے جنگل میں مچان پر بیٹھے مادھو نے لائٹر کے شعلے پر نشانہ باندھا تھا اور پوچھنے پر اس نے بتایا تھا کہ دیکھنا چاہتا ہے میدان جنگ کی طرح وہ شعلے کو اپنی گولی کا نشانہ بنا سکتا ہے یا نہیں اور زخمی ریچھ جس گولی سے مرا تھا وہ بھی مادھو نے مدن رائے پر چلائی تھی جو چوک گئی تھی۔

عدالت نے جرح' جواب جرح اور دیگر بیانات اور شہادتوں میں قاتل مادھو ثابت ہورہا تھا۔ استغاثہ کے گواہوں میں کوئی قابل ذکر بات نہ تھی۔ پولیس کی طرف سے ایک مکمل کیس عدالت میں رکھا گیا تھا۔

کرما چوکیدار کو بھی عدالت کی طرف سے بلوایا گیا تھا۔ اس نے جو بیان دیا اس کا تعلق مادھو کی زندگی سے تھا قتل سے نہیں۔ نتھا سنگھ ڈرائیور جو مادھو کو گاؤں سے شہر لایا تھا اس کے واقعات کو دوہرایا گیا تھا۔ کرما نے مادھو سے ملنے کی اجازت حاصل کی تھی لیکن اس نے ملنے سے انکار کردیا۔ عدالت میں مادھو نے اپنے باپو کے آنسو دیکھے تھے جن میں ایک بوڑھے بے سہارا باپ کا پیار تھا۔ ایک التجا تھی' اپنے بیٹے کی زندگی کے لیے۔ جیل کی چاردیواری میں اس کی چیخیں سنی تھیں۔ دھاڑیں مار مار کر رونے کی سمع خراش صدائیں..... لیکن وہ رونا نہیں چاہتا تھا اور نہ ہی اپنے بوڑھے بے سہارا باپو کو اس حالت میں روتے دیکھ سکتا تھا۔ وہ اسے یہ بھی بتانا نہیں چاہتا تھا کہ وہ بے گناہ ہے۔ اس نے اپنے باپو سے ملاقات نہ کی۔ کرما ایک ہفتے شہر میں رہ کر نتھا سنگھ کے ساتھ اپنے گاؤں لوٹ گیا جہاں اس نے اپنے مادھو کے لیے ایک حسین' الہڑ دوشیزہ کو اس کے غریب ماں باپ سے خرید رکھا تھا۔ نہ جانے کتنی صدیوں کے بعد زندگی کی ایک تمنا پوری ہوئی تھی۔ نہ جانے کتنی صدیوں کے بعد ڈوور صاحب کے بنگلے کے سونے سونے اجڑے اجڑے آنگن میں بہاروں کی پائل کی جھنکار جاگنے والی تھی لیکن ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سوگئی اور کرما اسے جھنجوڑ کر زندہ نہ کرسکا۔ وہ مادھو کی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔ مادھو خود مرنا چاہتا تھا' اسے کوئی بھی نہ بچا سکتا تھا۔

رانی کے خلاف صرف اس کا اپنا بیان تھا۔ صفائی کی طرف سے اس کا باپ پیش ہوا تھا لیکن مادھو اور رانی ایک دوسرے کو بری الذمہ ٹھہرانے کی کوشش کررہے تھے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو زندہ دیکھنا چاہتے تھے جسے عام طور پر اس رنگ میں لیا جارہا تھا کہ وہ ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔ یہ بات عدالت سے باہر بھی پھیل چکی تھی اور اس کے جواز میں متضاد کہانیاں اور قصے بیان کیے جاتے تھے جن میں رانی کی اوباش طبیعت اور لاابالی پن اور مادھو کی حسین ساخت اور حلیم طبیعت قابل ذکر ہوتے۔ مادھو کی متناسب جسامت' معصوم چہرہ اور الہڑ سی پہاڑی مسکراہٹ شہر کے کونے کونے میں کہانی کا موضوع بن چکی تھی۔

عدالت میں آخری پیشی تھی۔ شہر کی معزز ہستیاں جن میں زیادہ تعداد نوجوان طبقے کی تھی' عدالت میں جمع ہوگئی تھیں۔ پورے دس بجے عدالت لگی۔ کٹہرے میں مادھو کھڑا تھا۔ جانی پہچانی نظروں کو مسکرا مسکرا کر دیکھ رہا تھا۔ وہی پہاڑی انداز جو اس کے رواں رواں میں رچ چکا تھا۔ کیرتی وہاں نہ تھی۔ بار بار وہ حسب عادت سوچنے کے انداز میں اپنے سر کو کھجانے لگتا اور اپنے بکھرے ہوئے خشک آوارہ بالوں کو اپنے چہرے پر سے ہٹانے کی کوشش کرتا اور ہتھکڑیوں کی کرخت بے ہنگم سی آواز چند لمحے کٹہرے سے ٹکراتی اور چھنچھنا کر وہیں بیٹھ جاتی جیسے وہ بھی مادھو کی طرح خاموشیوں کا ہی سہارا لینا چاہتی تھی۔ رانی کا وکیل باپ خوش تھا۔ اس نے رانی کو بچالیا تھا لیکن رانی کا زرد مغموم چہرہ موت اور زندگی کی اضطراری کش مکش سے بے نیاز تھا۔ اس کے لیے موت جیسے اتنی ہی اہم تھی جتنی اس کے باپ اور دوسرے لواحقین کے لیے اس کی زندگی۔ وہ جانتی تھی گناہ گار وہ خود ہے' مادھو نہیں جو ایک پہاڑی جانگلی ہے لیکن جس نے ہمیشہ دوسروں کو زندگی دی۔

سرکاری وکیل نے ایک فاتح کی طرح مکمل خود اعتمادی سے بحث شروع کی جس میں مادھو کی زندگی سے لے کر قتل تک تمام واقعات جوڑ توڑ کر بیان کیے گئے تھے۔ اس نے کہا۔

مادھو کا شہر میں اس حالت میں وارد ہونا اور تھوڑے ہی عرصے میں ایک اونچی سوسائٹی میں گھل جانا اس بات کا ثبوت مہیا کرتے ہیں کہ وہ کسی خاص مقصد کے لیے ہی یہاں آیا تھا اور وہ مقصد قتل ہی ہوسکتا ہے جس کا ثبوت

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نریندر اور کیرتی کے بیانات سے صاف ملتا ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ ملزم کیرتی سے محبت کرتا تھا اور اس نے کیرتی کو یہ بھی صاف طور پر بتا دیا تھا کہ وہ رات بھر سو نہیں سکا اور کئی راتوں سے متواتر جاگ رہا ہے اور اگر یہی حالت رہی تو مدن رائے اس کے ہاتھوں مارا جائے گا۔ قتل کے ارادے کا اشارہ نریندر کے بیان سے بھی ملتا ہے' جب ملزم نے مچان پر بیٹھے ہوئے مدن رائے پر نشانہ باندھا تھا ظاہر ہے ملزم میں تحت الشعور میں ہی سہی' قتل کا ارادہ پک چکا تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ مقتول کے رنگو گڑھی میں آنے پر کیرتی نے ملزم مادھو کی طرف توجہ نہ دی اور اپنی اوقات اور نسب کو بھول کر اس نے کیرتی کو اپنانے کی ٹھان رکھی تھی لیکن جب اس نے دیکھا کہ مدن رائے کی بے وقت اور اچانک آمد نے بنا بنایا کھیل بگاڑ دیا تو وہ انتقامی آگ میں جل اٹھا' اگر رنگو گڑھی میں اسے موقع ملتا تو وہ مدن رائے کو وہیں موت کے گھاٹ اتار دیتا لیکن اسے موقع نہ ملا۔ آخرکار اپنے ارادے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے پہاڑوں کو چھوڑ کر میدانوں میں اتر آیا اور اسے یہاں ایسا موقع دستیاب ہوا کہ وہ اپنی انتقامی آگ کو مٹا سکے۔ حالات اس کے خلاف تھے۔ اس نے اقبال جرم کرنا ہی مناسب سمجھا۔ یہ بات پہاڑی سرشت میں ہے کہ گناہ کر کے اسے تسلیم کیا جائے۔ عدالت کے لیے یہ کوئی انوکھی بات نہیں جو رپورٹ اس کے علاقہ سے موصول ہوئی اس سے بھی صاف ظاہر ہے کہ مادھو ایک آوارہ اور خودسر پہاڑی تھا۔ قرب وجوار کے ہر ایک ہنگامے اور جھگڑے فساد میں اس ہی کا ہاتھ ہوتا تھا۔ معمولی سی تعلیم کے بل بوتے پر کئی بار ریاست کے افسران کے خلاف بھولی بھالی دیہاتی جنتا کو ورغلایا اور انہیں تشدد پر اکسایا۔ حال ہی میں اپنے دوست رادھے کی شادی پر ریاستی محکمۂ مال کے ایک ملازم پر حملہ کر کے جان ہی سے مار دینے کی کوشش کی۔ واقعات سے صاف عیاں ہے کہ ملزم نے قتل کا ارتکاب کیا۔ ارادہ اس میں پہلے سے تھا۔

حالات نے پروفیسر بلبیر کے مکان میں یاوری کی اور اس نے حالات سے فائدہ اٹھایا۔ رہا پستول کہ مقتول کا پستول ملزم کے ہاتھ کیسے لگا یہ کوئی اہم مسئلہ نہیں۔ مقتول کا سامان سیٹھ رادھے شام کی کوٹھی میں پڑا رہتا تھا جہاں وہ ٹھہرا ہوا تھا۔ پستول وہیں سے ساتھ لایا اور پستول حاصل کرنے میں اسے دقت نہ ہوئی کیوں کہ اکثر حالات میں سامان کھلا ہی پڑا رہتا تھا جیسا کہ پولیس کی رپورٹ اور سیٹھ رادھے شام کے بیان سے ظاہر ہے۔ رانی کی انگلیوں کے نشان ظاہر کرتے ہیں کہ اس نے ملزم سے پستول چھیننے کی کوشش کی جس میں وہ کامیاب نہ ہوئی۔ سارے کیس میں صرف ایک ہی نقطہ اہم ہے کہ رانی نے اپنے سر الزام کیوں لیا؟ لیکن رانی اور کیرتی کی محبت اور دوستی کو اگر سامنے رکھا جائے جو بچپن سے ایک ساتھ رہنے اور تعلیم حاصل کرنے کی وجہ سے اس معراج تک پہنچ چکی تھی جہاں ایک دوسرے کے لیے جان تک کی بازی لگانے سے گریز نہیں کیا جاتا..... تو معاملہ خود بہ خود صاف ہو جاتا۔ رانی جانتی تھی کہ ملزم مادھو سے کیرتی محبت کرتی ہے پس منظر میں چاہے کچھ کیوں نہ ہو اس لیے ان دونوں کو ازدواجی رشتے میں منسلک دیکھنا چاہتی تھی جو ایک خام خیال ہو سکتا ہے لیکن حقیقت یہی تھی۔ صفائی کے گواہوں کے بیانات میں بھی یہ بات کسی نہ کسی رنگ اور انداز میں واضح ہو جاتی ہے کہ ملزم مادھو مقتول مدن رائے کو اپنے راستے کا کانٹا سمجھتا تھا اور اسے ختم کر دینے کا ارادہ رکھتا تھا۔ وہ اقبال جرم نہ بھی کرتا تب بھی عدالت کے ہاتھوں سے بچ نہ سکتا تھا۔

وکیل صفائی نے بحث کا جواب دیا۔ اس نے کہا۔

سارے کیس میں اہم شہادت بلبیر چوہدری کی ہے جو واقعات اور حقائق پر مبنی ہے۔ قتل کی واردات کا جہاں انجام ہوا وہاں بھی وہ موجود تھا۔ آغاز بھی اس کی موجودگی میں ہوا البتہ اس کہانی کا وہ حصہ اس کی غیر موجودگی میں اسی کے مکان پر پایۂ تکمیل تک پہنچایا گیا جسے ہم کلائمکس

کہہ سکتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے اور میں پروفیسر بلبیر سے متفق ہوں کہ اس المیہ کہانی کا انجام ایک جاگیردارانہ ماحول میں ہوا۔ جب ملزمہ رانی مدن رائے کے ہمراہ سیر و تفریح کے لیے وہاں گئی اور یہ شروع ہوئی رنگو گڑھی کے جنگل میں' جہاں مدن رائے کو کیرتی دوبارہ ملی۔ رانی مقتول کے ساتھ اس لیے گئی تھی کہ وہ بہ نظر خود اس ماحول کا جائزہ لینا چاہتی تھی جہاں اس نے مستقل طور پر قیام کرنا تھا۔ پروفیسر بلبیر کے بیان کا وہ حصہ قابلِ ذکر اور قابلِ غور ہے جس میں اس نے بتایا تھا کہ پندرہ بیس دن کے قیام میں دونوں ہر لحہ خوش خوش دکھائی دیتے تھے۔ دونوں ایک کمرے میں رہتے تھے لیکن بعد ازاں دونوں کے چہروں پر اکتاہٹ سی آ گئی اور پھر دونوں جدا ہو گئے اور مقتول مدن رائے نے حسب عادت اس کا کبھی تذکرہ نہ کیا لیکن رانی اسے خطوط بھیجتی رہی جنہیں پڑھ کر وہ اکثر جلا دیا کرتا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ رانی سے اس وقت تک شادی کرنے کا خواہاں رہا جب تک اس نے رنگو گڑھی میں کیرتی سے دوبارہ ملاقات نہ کی۔

عدالت یہ تو جانتی ہے کہ مقتول نے کیرتی سے شادی کرنے کا ارادہ ترک کر دیا تھا کیوں کہ اسے وہ دق کی مریضہ سمجھتا تھا لیکن دوبارہ اسے صحت یاب پا کر وہ اس کی طرف جھکا۔ یہ جھکاؤ کسی خاص ردِعمل کا مرہونِ منت تھا' جس کا تعلق ان دونوں میں سے کسی ایک کی ذات سے ہی ہو سکتا تھا لیکن یہ حقیقت ہے کہ بعد ازاں بھی میرا مطلب دوسرے دور محبت اور پسندیدگی سے ہے' تعلقات دونوں میں دوستانہ تھے۔ دوبارہ جب مقتول نے کیرتی سے شادی کرنے کا ارادہ ظاہر کیا کیرتی نے خاموشی سے اسے منظور کیا کیوں کہ وہ اس کا منگیتر تھا کیوں کہ کیرتی اپنی عزت اور زندگی اور اس کے مستقبل سے زیادہ اپنے والدین کا خیال رکھتی تھی لیکن رنگو گڑھی کے ڈاک بنگلے میں جسے ڈوور صاحب کا بنگلہ کہا جاتا ہے کوئی غیر معمولی حادثہ ہوا' جب رات کو بارش اور طوفان میں مقتول کو نئے ڈاک بنگلے میں بلبیر اور نریندر کے پاس آنا پڑا۔ اس حادثے کا علم مدن رائے' کیرتی' مادھو اور آیا کو ہو سکتا ہے۔ آیا کی شہادت ضروری نہیں سمجھی گئی جہاں تک مادھو اور کیرتی کا تعلق ہے وہ اس معاملے پر تب بھی خاموش ہی رہے اور اپنے بیانات میں بھی انہوں نے تذکرہ نہیں کیا لیکن یہ امر مسلمہ ہے کہ اس حادثے کے بعد جو ایک راز ہی رہا۔ کیرتی مدن رائے کو ناپسند کرنے لگی۔ مدن رائے کو اس بات کا علم ہو گیا تھا اور یہی بات تھی جو اسے کیرتی سے شادی کرنے پر اکسا رہی تھی۔ شادی کا یہ سارا جوڑ توڑ جو دوسرے دور محبت اور پسندیدگی کی پیداوار تھا ایک انتقامی جذبے کے تحت از سرِ نو ترتیب پا رہا تھا۔

جب مادھو شہر آیا اس وقت کیرتی کی شادی کی بات قریباً طے ہو چکی تھی اور مدن رائے اپنے مشن میں کامیاب ہو چکا تھا۔ مادھو کے کیرتی پر بہت سے احسان تھے۔ درحقیقت اسی کی بہ دولت کیرتی کو دوسری زندگی ملی۔ وہ احسان فراموش نہ تھی۔ جب وہ اس کے پاس آیا اسے اپنے ساتھ رکھا' اچھا لباس مہیا کیا اور وہ سب میں گھل مل گیا۔ کم تعلیم یافتہ تھا لیکن ایسے ماحول میں رہ چکا تھا جہاں ہر قسم کے لوگوں کی آمد و رفت رہتی ہے۔ قدرتی طور پر اس نے ہر قسم کی باتیں سیکھیں جنہوں نے اسے شعوری پختگی بخشی۔ خوش شکل اور خوش عادات ہونے کی وجہ سے ہر سوسائٹی میں قابل توجہ سمجھا گیا۔ مادھو جیسا انسان کسی کو زندگی تو دے سکتا ہے معمولی باتوں کے لیے کسی کو موت کے گھاٹ نہیں اتار سکتا اور عدالت نے دیکھا ہو گا کہ مادھو کی حرکات و سکنات اور بیانات میں کہیں بھی قاتل کا کردار نمایاں نہیں۔ اس کے چہرے پر قاتل کے احساسات کا کہیں ہلکا سا بھی پرتو نہیں جس میں شرمندگی اور پشیمانی کی جھلک ہوتی ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مادھو نے یہ قتل اپنے سر کیوں لیا؟ کیا رانی مدن رائے کی قاتل ہے۔

تمام بیانات اور واقعات کا بہ نظر غائر مطالعہ کرنے سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جو نتیجہ اخذ ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ مادھو کو یہ علم ہو چکا تھا کہ وہ اس سوسائٹی کا اہل نہیں جو کیرتی کی ہے۔ وہ اس ماحول میں پنپ ہی نہیں سکتا تھا جہاں کیرتی رہائش پذیر تھی۔ اس کی باتوں سے ظاہر تھا جو اس نے سروپ سے کیں اور جنہیں سروپ نے اپنے بیان میں دوہرایا اور جو عدالت کی نظر میں قابلِ اعتنا اور قابلِ قبول نہیں لیکن جن میں اس سارے کیس کے حقیقی جان دار نکات ہیں۔ سیٹھ رادھے شام بھی اسے اپنے راستے کا کانٹا سمجھتے تھے۔ راستہ جس پر چل کر وہ اپنے دلی ارادے کو پورا کرنا چاہتے تھے۔ مادھو نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ وہاں سے چلا جائے گا لیکن کیرتی نے اسے روکے رکھا۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ کیرتی اسے پسند کرنے لگی تھی اور پسند نے رفتہ رفتہ محبت کی ان حدوں کو چھو لیا تھا جہاں ایک ہو جانے کی فطری خواہش جاگتی ہو۔ ان حدود کو مستقل طور پر اپنانے کا فیصلہ اس نے کیا تھا یا نہیں کیرتی ہی بہتر جانتی ہے' لیکن یہ حقیقت ہے کہ کیرتی مدن رائے سے شادی نہ کرنا چاہتی تھی اور وہ کسی وقت بھی انکار کر سکتی تھی اگر اسے وقت ملتا جو مدن رائے کے قتل کے ساتھ ہی ختم ہو گیا۔

قتل کی رات جب پروفیسر بلبیر کیرتی سے ملنے گیا۔ رانی مدن رائے کے ساتھ تھی اور شراب کا دور چل رہا تھا۔ پروفیسر بلبیر جتنی دیر اپنی کوٹھی میں رہا وہ ان دونوں کے ساتھ ٹک کر نہ بیٹھ سکا کیوں کہ ان میں جو بات چیت ہو رہی تھی وہ نجی نوعیت کی تھی۔ رانی نے مدن رائے کو حسبِ وعدہ شادی کے لیے مجبور کیا۔ وہ نہ مانا۔ وہ اُسی رات سیٹھ رادھے شام کے ہاں مدعو تھا۔ وہاں جانا چاہتا تھا' لیکن رانی نے روکے رکھا۔ مدن رائے نے غصے میں آ کر اسے جان سے ہی ختم کرنے کی ٹھان لی اور پستول میز کی دراز سے نکالا۔ پستول کئی دنوں سے وہاں پڑا تھا جیسا کہ پروفیسر بلبیر اور اس کے نوکر راما گڑھوالی کے بیانات سے عیاں ہے۔ یہ کہنا کہ مادھو پستول سیٹھ رادھے کی کوٹھی سے اٹھا لایا تھا غلط ہے۔ پولیس کی رپورٹ سے بھی ظاہر ہے کہ جو سامان سیٹھ جی کے گھر پڑا تھا اس میں مدن رائے کے صرف پرانے کپڑے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ رانی کو ڈرانے دھمکانے کے لیے اس نے پستول نکالا ہو لیکن رانی نے پستول اس کے شرابی ہاتھوں سے چھین لیا لیکن چلایا نہیں کیوں کہ وہ اسے مارنا نہیں چاہتی تھی۔ رانی نے اپنے آپ کو خطرے میں دیکھ کر پستول چھینا۔ مدن رائے نے دوبارہ پستول حاصل کرنے کی کوشش کی۔ وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ مادھو نے یہ سارا واقعہ دیکھا۔ قتل رات کے نو سوا نو بجے وقوع پذیر ہوا لیکن مادھو اور کیرتی آٹھ بجے سیٹھ جی کی کوٹھی سے روانہ ہو چکے تھے۔ درمیانی راستہ بہ مشکل بیس پچیس فٹ کا تھا۔ اس طرح مادھو نے خونی ڈرامے کا آخری منظر دیکھا اور پستول کی چھینا جھپٹی میں وہ بھی شریک ہو گیا۔ صرف اس لیے کہ جھگڑا کوئی دوسرا رنگ اختیار نہ کر لے لیکن پستول چل چکا تھا۔ خود اس چھینا جھپٹی میں ہی اور جب پستول مادھو کے ہاتھ میں آیا' مدن رائے ڈھیر ہو چکا تھا۔ اس پر تینوں کی انگلیوں کے نشان ہیں۔ صاف ظاہر ہے کہ پستول چلایا نہیں گیا چل گیا تھا اور مادھو نے رانی کی جان بچانے کے لیے خون اپنے سر لے لیا۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ مادھو نے اپنے سر رانی کا خون کیوں لیا؟ کیا واقعی وہ رانی سے محبت کرتا تھا؟ جیسا کہ ظاہر کیا جا رہا ہے لیکن تمام واقعات اس رنگ سے کورے ہیں۔ رانی جیسی لڑکی مادھو جیسے غیر تعلیم یافتہ لڑکے سے کبھی محبت نہیں کر سکتی۔ ایسی محبت جو قربانی مانگتی ہو کیوں کہ رانی ماڈرن فیشن کی دل دادہ ہے البتہ پسند کر سکتی ہے لیکن اس کی پسند مادھو کے لیے کسی حالت میں بھی اتنی اہم نہیں ہو سکتی جس نے اپنے مخصوص پہاڑی ماحول کی بہ دولت اس جیسی درجنوں لڑکیاں دیکھی ہوں۔ لہٰذا قتل کا الزام اپنے سر لینے میں دو جذبے کارفرما تھے۔ ایک انسانی جذبہ۔ وہ خود پھانسی کے تختے پر لٹک کر ایک نوجوان لڑکی کو بچانا چاہتا تھا۔ اپنی اور رانی کی زندگی کو اس نے جانچا' پرکھا' تولا اور یہ نتیجہ اخذ کیا کہ دنیا کو رانی کی ضرورت ہے اور رانی کو دنیا کی۔ اس کی اپنی ذات کسی کے لیے بھی ضروری نہ تھی لیکن یہ اولین اور آخری جذبہ نہ تھا۔ درحقیقت قتل کا الزام اپنے سر لے کر وہ کیرتی کے راستے سے ہٹ جانا چاہتا تھا۔ وہ جان گیا تھا کہ کیرتی اب اس سے ایسی محبت کرنے لگی تھی جو ازدواجی رشتے پر جا ٹوٹتی ہے لیکن وہ اپنے آپ کو اس کا اہل نہ سمجھتا تھا اور اب اس سے دور ہونے کا صرف ایک ہی راستہ تھا کہ وہ اس کی آنکھوں سے ہی ہمیشہ کے لیے اوجھل ہو جائے اور وہ اس طور کہ نام رہے نہ نشان اور کیرتی اس بدنامی سے بچ جائے جو ایسے حالات میں اسے مل سکتی ہے۔ یہ کہنا کہ مادھو اس مقصد سے شہر آیا تھا کہ مدن رائے کو قتل کرے غلط ثابت ہوتا ہے۔ اگر وہ اسی لیے آنا چاہتا تو کیرتی کے ہمراہ ہی آ سکتا تھا۔ وہ بڑے شہر کیرتی سے ملنے آیا' نہ کہ مدن رائے کو موت کے گھاٹ اتارنے۔ سیکڑوں میل کا سفر اس خیال سے نہیں کیا۔ مفت سیر کرنے کا موقع ہاتھ لگا۔ وہ اپنے دوست استاد نتھا سنگھ ڈرائیور کے ساتھ چلا آیا۔ اسی کے ساتھ واپس جانا چاہتا تھا۔ یہاں پہنچ کر کیرتی سے ملنے کا خیال پیدا ہوا۔ کیرتی اس پر مہربان تھی کیوں کہ اس کی بہ دولت نئی زندگی پائی تھی۔ کیرتی کے بیان سے ظاہر ہے کہ وہ وہاں سے جانا چاہتا تھا اسے پہاڑوں کی یاد ستاتی تھی لیکن کیرتی نے اسے روکے رکھا۔ مادھو بے گناہ ہے۔ اس کا اس قتل سے کوئی واسطہ نہیں۔ گواہ استغاثہ اور پولیس کی رپورٹ جوڑ توڑ کے باوجود بھی مادھو کو خطاوار ثابت کرنے سے قاصر رہے۔

فریقین کی بحث ختم ہونے کے بعد عدالت فیصلے کی تاریخ مقرر کر کے برخاست کر دی گئی۔

☆

فیصلے کے دن عدالت میں حسبِ معمول گہما گہمی تھی۔ کیرتی بھی ایک کونے میں بلبیر اور سروپ کے ساتھ دُبکی بیٹھی تھی۔ جب مادھو کو عدالت میں لایا گیا سب کی نگاہیں ایک ساتھ اس پر اٹھ گئیں۔ وہاں صرف کیرتی ہی ایک تھی جس کی نگاہیں بسیار کوشش پر بھی اوپر نہ اٹھیں۔ زمین میں ہی دھنستی چلی گئیں۔ مادھو نے کٹہرے میں کھڑے ہو کر سب کو مسکراتے ہوئے دیکھا۔ کسی کو ڈھونڈا اور کیرتی کو ایک کونے میں جھکے ہوئے دیکھ کر ایک دم افسردہ ہو گیا اور ہتھکڑیوں سے جکڑے ہوئے اپنے ہاتھوں سے یوں ہی اپنے سر کو کھجلانے لگا۔ کیرتی کے پاس ہی سروپ بیٹھا تھا۔ مادھو کی نگاہیں کیرتی پر جم گئیں۔ کیرتی اور سروپ..... ہتھکڑیوں میں مدہم سی آواز پیدا ہوئی اور اس کے چہرے پر دوبارہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ پہاڑوں کی لازوال مسکراہٹ جو صرف دوسروں کو زندہ دیکھ کر ہی پیدا ہوتی ہے۔

فاضل جج نے سارے کیس پر مفصل تبصرہ کرتے ہوئے اس کا اختتام ان الفاظ میں کیا۔ ''جہاں تک مادھو کا تعلق ہے اس کا اس قتل میں قطعی کوئی ہاتھ نہیں۔ اس نے انسانی جذبے کے تحت ایک لڑکی کی جان بچانے کے لیے اپنے آپ کو اس حادثے میں شریک کیا۔ واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ قتل قصداً نہیں کیا گیا۔ کوئی کسی کی جان لینا نہ چاہتا تھا۔ گولی چلائی نہیں گئی چھینا جھپٹی میں چل گئی جس میں حفاظت خود اختیاری کا جذبہ کارفرما تھا۔ ہر دو میں سے کوئی بھی سزا کا مستوجب نہیں لہٰذا میں مادھو اور رانی دونوں کو بری کرتا ہوں۔''

عدالت کی نگاہیں ایک ہی ساتھ چمک اٹھیں اور مادھو کے چہرے پر جم گئیں جو اب بھی مسکرا رہا تھا جیسے اسے کیرتی اور رانی دونوں کے بچ جانے کی خوشی تھی۔ کیرتی اس وقت بھی مادھو کے مسکراتے چہرے کو نہ دیکھ سکی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے تھے۔

سروپ نے بلبیر کے کان میں کہا۔ ''کیا خیال ہے پروفیسر!''

بلبیر نے جواب دیا۔ ''مادھو کی مسکراہٹ سدا بہار ہے۔ اسے کوئی بھی نہیں چھین سکتا۔ وہ ہار جیت اور زندگی موت

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے بے نیاز ہے۔"

"اب کیا ہوگا......؟"

"مادھو اپنے گاؤں لوٹ جائے گا۔ اکیلا تنہا' جس طرح آیا تھا۔ اپنے صدیوں پرانے پہاڑی گیتوں میں اس نے ایک اور صدیوں پرانا گیت شامل کرلیا اور وہ گیت اس کے ہونٹوں کو چومتے ہی ایک امر کہانی بن گیا۔"

"تمہارا مطلب ہے پروفیسر......!" سروپ اپنا فقرہ پورا نہ کرسکا۔ کیرتی اٹھ کر باہر چلی گئی۔

"میرے شاعر دوست!" بلبیر نے ٹھہری ہوئی آواز میں کہا۔ "کہانی ختم ہوگئی۔ اسے اس پڑاؤ پر ختم ہونا چاہیے تھا۔ اب چلو۔ انجام خوب صورت ہے۔ مادھو کی سدا بہار مسکراہٹ کی طرح خوب صورت۔"

دونوں عدالت کے کمرے سے باہر چلے آئے۔ ہر طرف مادھو کی کہانی ہی زیر بحث تھی۔ کیرتی جا چکی تھی۔

ہتھکڑیوں سے چھٹکارا حاصل کر کے مادھو شام بن میں آیا۔ بلبیر اور سروپ بھی ساتھ تھے۔ دوپہر ڈھل چکی تھی اور آوارہ بدلیاں ایک دوسرے کے تعاقب میں پہاڑوں کی جانب بھاگتی جا رہی تھیں۔ ان پہاڑی وادیوں کو پیغام مسرت سنانے جو مادھو کی آمد سے ویران ہوگئی تھیں۔ وہ چپ چپ مسکراتی ہوئی آنکھوں سے انہیں دیکھتا رہا جیسے اگر اس کا بس چلے تو انہی میں تحلیل ہوکر اپنے پہاڑوں پر پہنچ جائے۔

شام بن میں داخل ہونے سے پہلے مادھو نے سروپ سے پوچھا۔

"سروپ صاحب! آپ نے کیا سوچا ہے؟ میرے ساتھ پہاڑ پر چل رہے ہیں یا شہر میں ہی بسیرا کرنے کا خیال ہے؟"

"تم جا رہے ہو؟"

"ہاں۔"

"کب......؟"

مادھو ہنسنے لگا۔ "سروپ صاحب! اس کیوں کا کیا جواب دوں؟ دے ہی نہیں سکتا۔ جی چاہتا ہے......" اس نے اپنے دونوں ہاتھ ہوا میں پھیلا دیے۔ "جی چاہتا ہے ان بدلیوں کے ساتھ اڑ کر اپنے جنگل میں جا پہنچوں۔ بوٹے بوٹے سے رو رو کر گلے ملوں۔ چھاتی پھٹ رہی ہے میری......! ایک پل بھی یہاں نہیں رہ سکتا۔"

بلبیر نے سوال کیا۔ "اگر کیرتی نے نہ جانے دیا؟"

بدلیوں پر سے اس کی نگاہیں اٹھیں اور بلبیر کے چہرے پر جم گئیں۔ دیر تک اپنا سر کھجلاتا رہا۔ ایک لمبی سانس چھوڑ کر جواب دیا۔

"ایک حسرت رہ گئی من میں......"

دونوں نے ایک ساتھ پوچھا۔ "کیا......؟"

"الغوزے سنانا چاہتا تھا۔"

بلبیر نے کہا۔ "پہاڑ پر تم سے سنتے ہی رہے۔"

مادھو نے زور سے گردن ہلائی۔ "آپ کو نہیں' سروپ صاحب کو۔"

بلبیر نے اپنی فلیٹ مادھو کے سر پر رکھی۔ "الغوزے پہاڑوں کا ساز ہے مادھو صاحب! وہی بجائے جائیں اچھے لگتے ہیں۔"

اس نے معنی خیز نگاہوں سے بلبیر کو دیکھا۔ "صاحب بھلا یہاں کیوں اچھے نہیں لگتے؟" اس نے ایک بلند قہقہہ لگایا اور خاموش ہوگیا۔ دیر تک بدلیوں کو اڑتے بھاگتے دیکھتا رہا۔ سیٹھ جی کے علاوہ باقی سب گیٹ پر جمع ہو گئے تھے۔ سب سے زیادہ کیرتی خوش تھی۔ اس کی آنکھوں میں خوشیاں چھلک رہی تھیں۔ آنسو چھلک رہے تھے۔ محبت چھلک رہی تھی۔ مادھو بچ گیا تھا۔ بے گناہ ثابت تھا۔ اس کے خیالوں اور سوچوں پر پورا اترا تھا۔

مادھو ایک انسان تھا۔ فرشتہ تھا۔ دیوتا تھا اور مادھو خاموش کھڑا سب کی باتیں سن رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں کوئی شکایت نہ تھی۔ شکوہ نہ تھا۔ وہی معصوم مسکراہٹ تھی جو وہ اپنے پہاڑوں سے لایا تھا۔ وہ ان سب کو پرائی' نئی پرانی داستانوں میں الجھا کر کمرے میں گیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پرانا لباس پہنا۔ پرانی فوجی ٹوپی سر پر رکھی۔ الغوزے کی جوڑی گلے میں ڈالی اور اپنا خالی تھیلا اٹھا کر باہر لان میں آ گیا۔ سب نے آنسوؤں بھری آنکھوں سے اس کو دیکھا لیکن کسی نے اپنی زبان نہ کھولی۔

فوجی ٹوپی سے سر کھجلاتے ہوئے وہ بلبیر سے مخاطب ہوا۔

"صاحب! میں سیٹھ جی سے ملوں گا۔"

دھن وتی سیٹھ جی کو بلانے چلی گئی۔

بلبیر اور سروپ نے کیرتی کو اس سے باتیں کرنے کا موقع دیا۔ وہ دونوں باتیں کرتے ایک طرف چلے گئے۔

کیرتی نے رقت بھری آواز میں کہا۔ "تم جا رہے ہو......؟"

مادھو نے بہ مشکل آواز نکالی۔ "ہاں۔"

"کیوں......؟"

"آپ کو خوش دیکھنے کے لیے اور اپنے آپ کو زندہ رکھنے کے لیے۔"

"یہی ایک طریقہ ہے؟ صرف یہی ایک!"

"تو پھر آج کے دن ٹھہر جاؤ۔"

"پھر کیا ہوگا......؟ کل تو جانا ہی ہوگا۔"

"تم چاہو تو......؟"

مادھو نے بات کاٹ دی۔ "میں جانتا ہوں' آپ کیا کہنا چاہتی ہیں' لیکن آپ اپنی زبان سے کچھ نہ کہیں۔ میری زندگی کے لیے' اپنی خوشی کے لیے نہ سہی۔"

کیرتی چپ ہوگئی۔ وہ جانتی تھی مادھو کیا چاہتا ہے اور اسے پورا کرنے کے لیے اس نے قتل کا الزام تک اپنے اوپر لے لیا تھا۔ وہ اس سے بہت سی باتیں کرنا چاہتی تھی۔ اسے بتانا چاہتی تھی لیکن بات زبان تک نہ آئی تھی موزوں الفاظ ہی نہ ملتے تھے۔ وہ آنسوؤں کو سنبھالے بت کی طرح خاموش رہی اور مادھو پھولوں کا گل دستہ تیار کرنے لگا۔ سیٹھ جی ابھی تک اپنے کمرے سے باہر نہ نکلے تھے۔

مادھو نے ہلکے نیلے رنگ کے پھولوں کا گل دستہ کیرتی کو دیتے ہوئے کہا۔ "ہر سال آپ پہاڑ پر آیا کریں گی سروپ صاحب کے ساتھ۔ میں جنگل میں بیٹھا آپ کا انتظار کرتا رہوں گا۔ ہاں کردیں! دل کو ڈھارس مل جائے گی۔" مادھو کی آواز ڈوبتی جا رہی تھی۔ "میم صاحب! آپ کی ہاں پر ہی برسوں تک انتظار کرسکتا ہوں کہ آپ نے وعدہ کیا تھا۔ آپ ضرور آئیں گی۔"

اس نے ایک ہی گھونٹ میں اپنے سارے آنسو پی لیے۔

لیکن کیرتی اپنے آنسو نہ روک سکی۔

سیٹھ جی بھی آ گئے۔ مادھو نے اپنے سر کو دونوں ہاتھوں سے کھجلایا۔ فوجی ٹوپی کو ٹیڑھا کر کے سر پر رکھا اور دونوں ہاتھ جوڑ کر سیٹھ جی کو پرنام کیا اور ان کے پاؤں چھو لیے۔ سیٹھ جی کچھ کہنا چاہتے تھے لیکن آواز نہ نکل سکی۔ وہ مسکرا بھی نہ سکے۔ وہ سیٹھ ہوتے ہوئے بھی انسان تھے۔ انسان ہوتے ہوئے بھی ایک سیٹھ تھے۔ اپنے نظام کے ایک اہم ستون! لیکن مادھو تھا کہ مسکرا رہا تھا۔ اس نے ان سے کچھ نہیں مانگا' کچھ نہیں چھینا' حالاں کہ وہ ایسا کرسکتا تھا کسی لمحے بھی' لیکن صرف مسکراتا رہا۔ کبھی الغوزے کی جوڑی ایک دوسرے سے ٹکرا کر اس کی مسکراہٹ کا ساتھ دیتی لیکن اس ٹکراؤ میں کوئی ترنم' کوئی مژدہ جانفزا نہ تھا۔ دھن وتی نے کیرتی کو روپے دیے۔ اس نے نوٹ مادھو کے خالی تھیلے میں ڈال دیے۔

مادھو شام بن کی چار دیواری سے باہر نکل گیا۔ اس کے پیچھے پیچھے بلبیر اور سروپ تھے اور کیرتی بڑے گیٹ پر کھڑی تھی۔ اس کا ہاتھ غیر اختیاری طور پر الوداعی انداز میں ہوا میں لہرا رہا تھا لیکن مادھو نے ایک بار بھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ وہ اپنے آنسو ان سب سے چھپانا چاہتا تھا جو اسے اس حسین تصادم میں ملے تھے۔ اُس کے آنسو پوجا کے پھولوں کی طرح پوتر تھے جنہیں اپنے خیالوں ہی خیالوں میں کیرتی کے پوتر چرنوں پر چڑھا رہا تھا جس نے اس کے لیے سب کچھ کیا۔ اس کی ہر بات مانی لیکن اپنے

من کی من میں ہی رہنے دی۔ صرف اس لیے کہ وہ اس سے محبت کرتی تھی' بالکل پہاڑی گیتوں کی سی مقدس محبت جو ہمیشہ زندہ رہتی ہے جو کبھی نہیں مرتی۔ کبھی نہیں مٹتی جس کے گیت ابتدائے آفرینش سے کائنات کے ذرّے ذرّے کی زبان پر اور پہاڑیوں کی انتہاہ پنہائیوں میں گونجتے رہتے ہیں اور جن کی گونج میں زندگی کی صدائے بازگشت ہے۔ بدلیاں جھک رہی تھیں اور کیرتی ہاتھ ہلا ہلا کر آنسوؤں کی روانی میں اپنے کسی موہوم سے خیال کو الوداع کہہ رہی تھی اور خیال نظروں سے دور ہوتا جا رہا تھا۔ نظروں سے دور ہو گیا تھا لیکن اس کی خلوص پر درد محبت کا مقدس پرتو کیرتی کے رُوئیں رُوئیں میں تھا۔ اس کی ضیاؤں سے کیرتی کے خیالوں کا ذرّہ ذرّہ زندگی کا ایک ایک لمحہ ثانیہ' ابدی نور سے منور ہو گیا تھا۔ جب مادھو دھند میں غائب ہو گیا تو کیرتی نے جھک کر گیٹ کی خنک مٹی پر بنے ہوئے مادھو کے پاؤں کے نشان اپنے ہاتھوں سے چھو لیے اور آنسوؤں کے موتی ان میں جذب ہو گئے۔ اپنی طرف سے اس نے بھی اپنے آنسوؤں کے پوتر پھول مادھو کے قدموں پر چڑھا دیے تھے۔ وہ دیر تک اپنی دھندلائی ہوئی آنکھوں سے اس راستے کو دیکھتی رہی جو ایک دن مادھو کو اس کے پاس لے آیا تھا اور آج وہی راستہ اپنے بازوؤں پر اٹھا کر اسے دور لے گیا۔ اتنی دور جہاں سے اب وہ کبھی نہیں لوٹ سکتا۔ جہاں تک اب کیرتی کبھی نہیں پہنچ سکتی۔ آنکھیں جھپکا جھپکا کر دیکھتی رہی۔ کون جانے لوٹ ہی آئے۔ اس کے الفوزے اپنی مدھر سریلی آواز میں کان میں آہستہ آہستہ کہہ دیں۔ مادھو آ گیا..... اور مادھو گنگنانے لگے "کھ گوری دا چن پنیاں دا میرے نین چکور....." اور ایک دم وہ خواب راحت سے چونک اٹھے..... لیکن وہاں کوئی نہ تھا۔ صرف قدموں کے نشان تھے جس پر رکھے پوجا کے پھول بھی تو اب مرجھا چکے تھے۔

بلبیر اور سروپ کی آواز نے کیرتی کو چونکا دیا۔ وہ پھٹی پھٹی سی آنکھوں سے انہیں دیکھنے لگی اور رُندھی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"چلا گیا مادھو.....؟"

سروپ نے رقت بھری آواز میں بہ مشکل جواب دیا۔

"ہاں....."

کیرتی کی روتی ہوئی آنکھیں یوں ہی مسکرا اٹھیں۔

"یہ لو سروپ....." اس نے سروپ کو پھولوں کا گل دستہ دیتے ہوئے کہا۔ "یہ گل دستہ مادھو نے اپنے ہاتھوں سے بنا سنوار کر مجھے دیا ہے' تمہارے لیے۔ وہ یہی چاہتا تھا۔ یہ پھول مادھو کو بھی پیارے تھے تمہیں بھی پیارے ہیں اور مجھے بھی بے حد پسند ہیں۔ لو انہیں سنبھالو! یہ کسی کی بڑی پیاری تمنا ہیں' بڑی مقدس امانت ہیں۔"

سروپ نے پھولوں کو سنبھالتے ہوئے بلبیر کو دیکھا جس نے سگریٹ کے دھوئیں میں اپنا چہرہ چھپا لیا تھا اور کیرتی بھاگ کر اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔

سروپ نے کانپتی ہوئی آواز میں پوچھا۔ "پروفیسر کیا.....؟"

بلبیر نے سگریٹ کا ایک لمبا کش لے کر اسے پاؤں تلے مسل دیا۔

"مادھو ایک پہاڑی جانگلی تھا۔ صرف ایک انسان میری طرح ایک پروفیسر اور تمہاری طرح ایک شاعر تھا..... وادیاں وہی لٹتی ہیں جو آباد ہوں..... ویرانے وہی لٹیں گے.....؟ مادھو ایک ہری بھری وادی تھا اور ہم سب اجڑے ہوئے بنجر ویرانے....."

پروفیسر بلبیر نے سروپ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔

"آؤ میرے ساتھ۔ سیٹھ جی تمہارا انتظار کر رہے ہوں گے۔"

دونوں سر جھکائے شام بن کی سُونی چار دیواری میں داخل ہو گئے۔

☆☆☆

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہم ہی شمع ہم ہی پروانے

پروفیسر اظہر راہی ایم۔اے

عورت ایک پہیلی ہے واقعی اسے کوئی مرد بوجھ نہ سکا۔ جو عورت چاہتی ہے وہ کوئی کر نہیں سکتا اور جو مرد چاہتا ہے وہ عورت کے بس کی بات نہیں۔ چاہت کا ایک طوفان عورت کے دل میں بند رہتا ہے۔ چاہتی ہے تو ٹوٹ کر بکھرتی ہے تو بکھر کر۔ پھر بالآخر خود ہی بکھری ہوئی کرچیاں سمیٹتی ہے۔

دل کی سلطنت کی حاکم ایک عورت کی کہانی' جس سے نفرت کرنا چاہتا تھا مگر نہ کر سکا

کتھی بارسنی ہوئی جوتشی کی داستان آج پھر شروع کر کے نسرین مجھے بور کرنے لگی۔ "اس جوتشی کی بات مجھے بھولتی نہیں جس نے کہا تھا۔ "بیٹی! تو بڑی بھاگوان ہے۔ جہاں جائے گی راج کرے گی!" جوتشی کے بیٹھتے ہی منے بھائی نے ڈھٹائی سے اپنا ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے تنک دھاری جوتشی سے پوچھا۔ "جوتشی جی مہاراج! ذرا میری قسمت کا حال تو بتائیے۔ میرے یہاں لڑکا پیدا ہوگا یا لڑکی؟" جوتشی نے کچھ دیر تک ہاتھ دیکھ کر منے بھائی کے چہرے کو غور سے دیکھا اور پھر جھلاہٹ سے ہاتھ چھوڑ دیا اور اٹھتے ہوئے کہنے لگا۔ "بچہ ہم سادھوں سنتوں سے مذاق کرنا اچھا نہیں۔ تیری تو ابھی شادی بھی نہیں ہوئی اولاد کہاں سے ہوگی۔"

منے بھائی کھسیا گئے اور اس سے معافی مانگ کر اپنے امتحان میں پاس ہونے کی بات پوچھنے لگے۔ جس میں وہ تیسری بار بیٹھ رہے تھے۔

جب سب کے ہاتھ دکھائے جا چکے اور جوتشی پانچ آنے کے حساب سے سب سے پیسے وصول کر چکا تو میری باری آئی۔ میں کھڑی یہ سب ماجرا دیکھ رہی تھی۔ چاہتی تو تھی کہ اپنا ہاتھ بھی دکھاؤں۔ لیکن سب کو اپنی اپنی پڑی تھی۔ میں نے جھٹ اپنا مٹی سے سنا ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے غور سے دونوں ہاتھ دیکھے۔ میرا نام پوچھا اور میری پیشانی کی سلوٹوں کو غور سے دیکھ کر انگلیوں پر نہ جانے کیا گنتا رہا۔ پھر بولا۔

"بیٹی! تو بڑی بھاگوان ہے۔ تیری قسمت کا ستارہ ہمیشہ بلندی پر رہے گا اور جہاں جائے گی وہاں راج کرے گی۔"

اپنے راج کرنے کی بات سے میں شرما سی گئی اور اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ منے بھائی نے ایک دھول میرے سر پر جماتے ہوئے کہا۔

"جوتشی جی! راج تو یہ کمبخت یہاں بھی کرتی ہے۔ جب جی چاہتا ہے ہر کسی کی شکایت کر کے پٹوا دیتی ہے۔ ہر امتحان میں پاس ہوتی ہے۔ چچا جب آتے ہیں اسی کے لیے ایک سے ایک اچھا کپڑا لاتے ہیں۔ امی اور پاپا کا لاڈ بھی اسی کے لیے پھٹا پڑتا ہے اور ہم لوگوں کو تو کوئی پوچھتا بھی نہیں۔"

"تم ہو اسی قابل!" میں نے پھٹ سے جواب دے

ڈالا۔

''ہاں تجھ میں تو لال ٹنکے ہیں!''

کہتے ہوئے منے بھائی چلے گئے۔

جوتشی کو ہاتھ دیکھنے کے پیسے نہ ملے تھے۔ اس لیے وہ خاموشی سے بیٹھا ہم دونوں کی نوک جھونک دیکھ رہا تھا۔ میں نے پھر اس کے آگے ہاتھ پھیلا دیا۔

''اچھا جوتشی جی! یہ بتاؤ کہ میں اس سال امتحان میں فرسٹ نمبر پر پاس ہوں گی یا سیکنڈ نمبر پر؟ وہ کمبخت رضیہ گھر پر دو دو ماسٹروں سے پڑھتی ہے اور مجھے کوئی نہیں پڑھاتا۔ کیا اب کے وہ فرسٹ نمبر پر آئے گی؟''

جوتشی نے میرا ہاتھ دیکھے بغیر شاید مجھے خوش کرنے کے لیے فوراً کہہ دیا ''نہیں بیٹی! تو ہمیشہ فرسٹ نمبر پاس ہوگی۔''

اور میں نے اسی خوشی میں اپنے بکس سے پانچ آنے نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیے۔

لیکن نہ جانے اس کے دل میں رحم کا جذبہ کہاں سے آ گیا تھا یا وہ ہم لوگوں سے پانچ آنے فی آدمی کے حساب سے اتنے پیسے وصول کر چکا تھا کہ مجھ سے لینا مناسب نہ سمجھا۔ اس نے پیسے یہ کہتے ہوئے واپس کردیے۔

''بیٹی! یہ پیسے تو میری طرف سے لے لے۔ ان کی مٹھائی کھالینا!''

وہ پیسے میں نے کچھ خوشی اور کچھ حیرت کے ساتھ واپس لے لیے۔ پروین آپا شاید اس بات پر جل گئیں اور جھٹ امی سے جا لگائی۔

''دیکھا امی! آپ اور چچا تو سب اس کا خیال رکھتے ہیں اس کمبخت جوتشی نے بھی اس سے پیسے نہیں لیے اور کہہ دیا کہ میری طرف سے مٹھائی کھالینا۔ ہم سے تو کم بخت نے فوراً لے لیے۔''

امی جان نے خوش ہو کر مجھے سینے سے لگا لیا۔

''بھائی میری لڑکی قسمت والی ہے۔ جبھی تو اس کا سب خیال رکھتے ہیں۔ دیکھ لو جوتشی نے بھی ہاتھ دیکھتے ہی کہ دیا کہ جہاں جائے گی راج کرے گی۔''

پروین آپا اس پر جل ہی تو گئیں اور برا سا منہ بنا کر بولیں۔

''یہ سڑی صورت راج کیا کرے گی جوتیاں اٹھائے گی جوتیاں!''

امی نے جل کر ڈانٹتے ہوئے کہا۔

''تیرے منہ میں خاک! جوتیاں اٹھائیں اس کے دشمن!''

جوتشی کی داستان سنا کر نسرین نے ایک سرد آہ بھری۔ جیسے اس کی زندگی بہت دکھ بھری گزر رہی ہو۔ پھر بولی۔

''آج باجی کا کہنا ہی سچ ہو رہا ہے۔ میں راج کیا خاک کروں گی تمہاری جوتیاں اٹھائے پھرتی ہوں۔ صاحب وکیل کیا ہو گئے ہیں، قانونی نکتوں سے الٹا مجھ پر راج کرتے ہیں۔ جب اس جھوٹ سچ سے نجات ملی کلب چلے گئے۔ رات کے دو دو بجے واپس آ رہے ہیں۔ دوستوں میں قہقہے لگا رہے ہیں۔ کبھی چائے کی فرمائش ہو رہی ہے، کبھی پان کی۔ کبھی دعوت دی جا رہی ہے، کبھی شکار کو چلے جا رہے ہیں اور یہ لونڈی ہے کہ ہر وقت صاحب کے لیے ہاتھ باندھے کھڑی رہتی ہے۔

''میں کہتی ہوں اب تو چائے پی لو۔ کب کی چائے لائی ہوں۔ اب تو ٹھنڈی بھی ہو گئی ہوگی۔ رات کا ایک بجنے والا ہے لیکن صاحب کو قانون کی دفعات ہی کی تلاش رہتی ہے۔ میں کب سے بک بک کر رہی ہوں۔ تم نے کبھی ہوں بھی کہا ہے؟''

میں نے کتاب پر سے نظریں ہٹائے بغیر اسی بے تعلقی سے جواب دیا۔

''جی ہاں سن رہا ہوں اور آپ کے جوتشی جی مہاراج کی داستان شاید شادی کے بعد ایک سو اکیاون بار سن چکا ہوں۔ اب اس داستان میں کوئی مزا نہیں رہا۔ کوئی اور بات کرو۔ صبح جب عدالت سے واپس آؤں گا ہلکے بادامی رنگ کا بلاؤز کا کپڑا جس کے لیے تم مجھ سے کئی بار کہہ چکی ہو اور آج بھی کہا تھا ضرور لیتا آؤں گا!''

''خیر مجھے پوری امید ہے کہ وہ کپڑا زندگی بھر نہ آئے گا۔ لیکن اب رات کا ایک بج رہا ہے۔ صبح اٹھ کر کام کرنا ہے۔ اب سو جایئے۔''

''ہاں ہاں ابھی سوتا ہوں۔'' میں نے کتاب کو مضبوطی سے پکڑتے ہوئے جواب دیا۔ لیکن وہ جاتے وقت بجلی بجھا کر تیزی سے نکل گئی اور مجھے مجبوراً اٹھنا پڑا۔

مجھے اس بات کا اعتراف رہا ہے کہ نسرین سے شادی کے بعد سے اب تک اس کے ساتھ انصاف نہ کر سکا۔ ایک وکیل کی حیثیت سے میری ذمہ داریاں اتنی زیادہ ہیں کہ مجھے وقت ہی نہیں ملتا۔ دوسرے یہ کہ اپنے پیشہ ور اور شخصیت کو مقبول بنانے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی کچھ سوشل بھی ہو۔ سیاسی پارٹیوں سے تعلقات رکھتا ہو۔ تاکہ عوام میں اس کی ساکھ قائم رہے۔ ادھر شہر کے معزز لوگوں سے واقفیت حاصل کرنے اور تعارف کرانے کے لیے کلب اور پارٹیوں کا سہارا بھی ضروری ہے۔ انہی سب مصروفیات نے اتنا جکڑ رکھا ہے کہ میں نہ تو وقت پر اس کی کوئی فرمائش ہی پوری کر سکتا ہوں اور نہ گھر ہی میں زیادہ دیر رہ پاتا ہوں۔ میری ان مصروفیات سے وہ بھی اچھی طرح واقف ہے۔ معاشی بے فکری بھی ہے۔ لیکن اس کے باوجود کچھ اور تقاضے بھی ہیں جن کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ اب یہی بات کہ بلاؤز کے کپڑے کے لیے ایک ہفتہ سے برابر کہا جا رہا ہے۔ لیکن میں ہمیشہ بھول جاتا ہوں۔ یاد رکھتا ہوں تو کچھ ایسی مصروفیات آ جاتی ہیں کہ بھول جانا ضروری ہو جاتا ہے۔

صبح اتوار تھا۔ اس لیے میں نے رات ہی پروگرام بنا لیا کہ شام کے وقت تفریح اور پھر کسی اچھے سینما میں فرسٹ شو! میں نے صبح اٹھ کر شام کے پروگرام سے نسرین کو مطلع کیا اور جلد تیار ہونے کی تاکید کر کے باہر آ گیا اس اچانک پروگرام نے نسرین کو متحیر کر دیا۔ اس کے چہرے کی سرخی اور آنکھوں کی شوخی میں نمایاں اضافہ ہو گیا۔

مجھے اس کے چہرے کے مغلیہ نقوش میں اس کی آنکھیں ہمیشہ حسین لگتیں اور ان کا حسن اس وقت اور دوبالا ہو جاتا جب کاجل کی سیاہی بھوری آنکھوں کے سیاہ گھنیری پلکوں کو اور سیاہ بنا دیتی۔ اس کی آنکھیں ہمیشہ میری کمزوری رہیں۔ خوشی، غم، غصہ، شوخی، فکر اور شرارت ان آنکھوں سے بآسانی معلوم کر لی جاتی۔ اس کی آنکھیں میرے لیے ہمیشہ ایک کھلی کتاب کی حیثیت رکھتیں۔ جن سے میں اس کے دل کا حال بہ خوبی معلوم کر لیتا۔ وہ بھی اپنی اس خصوصیت اور آنکھوں کی خوب صورتی سے بہ خوب واقف تھی اور شاید اسے میری کمزوری بھی معلوم ہو گئی تھی۔

آج جب میں ان آنکھوں کے مسکراتے، ہنستے ہوئے کنول دیکھ کر مسکرایا تو وہ فوراً سمجھ گئی کہ میری خوشی کا راز، راز نہ رہ سکا اور جھینپتی ہوئی گھر کے کام جلدی جلدی ختم کرنے لگی اور تفریح کی تیاریاں شروع ہو گئیں میں بھی تیار ہو کر ادھر ادھر کے مسودے دیکھنے لگا۔ جب اس سے کچھ طبیعت اکتائی تو باہر نکل کر مدھو کامنی اور سورج مکھی کے پودوں کو دیکھنے لگا جو کل ہی مالی نے لگائے تھے۔ دن کا ایک طویل حصہ ختم ہو چکا تھا۔ ہارن کی آواز نے مجھے چونکا دیا اور مسٹر دیو ایڈیٹر ''نوجیون'' کی کار گیٹ پر آ کر رکی۔ دیو کھادی میں ملبوس باہر نکلے۔ میں خدا سے دعا مانگ رہا تھا کہ یہ نئی مصیبت گلے نہ پڑ جائے۔ انہوں نے آتے ہی جملہ کسا۔

''وکیل صاحب! آج کیا بات ہے۔ ابھی تک کلب نہیں گئے؟ کیا اتوار کا دن بیگم صاحبہ کے ساتھ گزارنے کا پروگرام ہے؟''

میں خاموش رہا۔

دیو کو میری یہ خاموشی شاید اچھی نہ لگی۔ وہ میرے ان دوستوں میں سے ہیں جنہیں بے تکلف کہا جاتا ہے اور میں بھی بے تکلفی اسی وجہ سے قائم کیے ہوئے ہوں کہ وہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ایک روزنامہ کا ایڈیٹر ہے اور میرے مقدمات اور میری قابلیت کی شہرت کا ذریعہ ہے۔ دیو نے بے تکلفی سے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور اپنی کار کی طرف گھسیٹتے ہوئے کہا۔

"چلو ابھی پانچ منٹ میں آتے ہیں۔ ہوم منسٹر کا ایٹ ہوم ہے۔ وہاں تقریباً سب ہی آ رہے ہیں۔ تمہارا بھی سب سے تعارف ہو جائے گا۔ میں بھی پیپر کے لیے کچھ گرما گرم مواد لے آؤں گا۔"

میں نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی اور عذر کیا کہ آج مجھے بہت ضروری کام ہے۔ میں نہ جا سکوں گا اور دوسرے یہ بھی کہ دعوت نامہ میرے نام آیا نہیں اور بغیر بلائے جانا اچھی بات نہیں ہے۔ اس لیے مجھے تو معاف ہی رکھو!

لیکن اس کم بخت نے فوراً میرے نام کا کارڈ نکال کر دیتے ہوئے کہا۔

"یہ لیجیے آپ کے نام کا کارڈ! میں اس کارڈ کو خود اس لیے لے کر آیا ہوں کہ تمہیں بھی ساتھ لیتا چلوں۔"

میں نے اپنا یہ داؤ نہ چلتا دیکھ کر بہت باتیں بنائیں۔ لیکن دیو کے آگے ایک نہ چلی۔ البتہ وہ اس بات پر راضی ہو گیا کہ فرسٹ شو سے پہلے مجھے گھر چھوڑ دے گا۔ اس لیے چپ چاپ گھومنے کا پروگرام ختم کر کے میں خاموشی سے کار میں بیٹھ گیا۔ ایٹ ہوم پانچ بجے شروع ہونے والا تھا لیکن چھ بجے تک معزز مہمان کا کہیں پتا نہ تھا۔ ساڑھے چھ بجے وہ تشریف لائے اور معذرت کر کے ساڑھے سات تک بولتے رہے اور لوگ بور ہوتے رہے ہیں کبھی دیو کے چہرے کو دیکھتا اور کبھی گھڑی کو۔ خدا خدا کر کے ایٹ ہوم ختم ہوا تو آٹھ بجنے میں کچھ منٹ باقی تھے۔ مجھے نسرین کی آنکھیں جن میں غصہ تھا' شکایت تھی' بے چارگی تھی' اپنے چاروں طرف نظر آ رہی تھیں۔ وہی بولتی ہوئی آنکھیں جو میری کمزوری ہیں۔

فرسٹ شو کا وقت کبھی کا ختم ہو چکا تھا۔ اس لیے دل میں یہ سوچ کر کہ سیکنڈ شو دیکھا جائے گا' ایک قریبی ہوٹل میں کافی کے تلخ گھونٹ اتارے اور نو بجے کا انتظار کرنے لگا۔ تاکہ وقت پر پہنچ کر اور کوئی بہانہ بنا کر سیکنڈ شو چلا دیں۔ لیکن اب وقت کاٹنا دشوار ہو رہا تھا۔ دیو بھی میرے ساتھ بور ہو رہا تھا اور شرمندہ بھی تھا کہ اس نے میرا پروگرام بگاڑ دیا۔ دیو نے تجویز کی کہ یہاں سے کلب چلا جائے اور وہاں سے نو بجے وہ مجھے چھوڑ کر پریس چلا جائے گا۔ میں نے تجویز مان لی۔

کلب میں دوستوں کے بہت اصرار کے باوجود میں نے بجے گھر چل دیا۔ گھر کافی دور تھا۔ موٹر کا دھچکا لگا اور نے تیزی سے بریک لگا کر کار روک دی۔ پچھلا پہیہ ہو چکا تھا۔ میں سڑک پر کسی ٹیکسی کی امید میں کھڑا تھا۔ بج گئے تھے کوئی ٹیکسی نہ تو اب تک ادھر سے نکلی تھی اور دھیل ہی اب تک گاڑی میں لگا تھا۔ گیارہ بجے کے جب میں گھر پہنچا تو ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے گھر کی ایک ایک دیوار' ایک ایک دروازہ میرے لیے آنکھ بن گیا ہو کاجل کی سیاہی میں سے جھانکتی ہوئی بھوری بھو پتلیاں' جھکی ہوئی گھنیری پلکیں مجھ سے شکایت کر تھیں۔ جیسے کہہ رہی ہوں ہم نے ان چند خوش گوار لمحو کے انتظار میں دن کا طویل حصہ کس بے چینی سے گز تھا۔ ان آنکھوں نے تمہارا کتنا انتظار کیا۔ نہ جانے کب تک تمہارے انتظار میں کھلی شاہراہ پر منتظر رہیں۔ لیکن تم صرف جھوٹے وعدے ہی کرنا جانتے ہو۔ تمہیں صرف تسلیاں اور دلاسے ہی دینا آتا ہے۔ تم ایک عور کی خوشیوں اور اس کے جذبات کو کیا سمجھ سکتے ہو۔ تم ایسے ہی جھوٹے وعدے کرتے چلے آئے ہو۔ میں تھا کہ میں اتنا جھوٹا پڑ چکا ہوں کہ آج میرا کوئی بہانہ جھوٹ نہیں مانا جائے گا۔ لیکن پھر بھی میں چاہتا تھا مجھ سے شکایت کرے۔ مجھ سے جھگڑے۔ گھر خا تھا۔ شاید سب سو گئے تھے۔ لیکن میں اچھی طرح ہوں کہ وہ میری منتظر ہو گی۔ اس کی شکایت بھری ہوئی آنکھیں جن میں غصہ ہو گا اور بے چارگی بھی۔ میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

راہ تک رہی ہوں گی۔ میں دبے پاؤں کمرے میں آیا۔ وہ سادہ لباس میں ملبوس تھی اور پلنگ پر لیٹی ہوئی تھی۔ میں جانتا تھا کہ وہ جاگ رہی ہے۔ وہ ہمیشہ میرا انتظار کر کے سوتی ہے۔ لیکن میں خاموشی سے کپڑے بدل کر سو گیا۔ صبح بھی کوئی خاص بات نہ ہوئی اس کے سوا کہ میں اس سے آنکھ نہ ملا سکا۔ اس نے بھی بہت کوشش کی کہ میں ایک نظر اس کے چہرے کو دیکھ لوں۔ وہ میری کمزوری سے واقف تھی نسرین اس طرح کام میں لگی ہوئی تھی جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ حالاں کہ یہ میری بہت سی وعدہ خلافیوں میں سے ایک تھی۔ لیکن میں نے اسے حسب معمول خاموش پایا۔ میں سوچ رہا تھا کہ وہ اب شاید کچھ کہے گی۔ کچھ شکایت کرے گی۔ لیکن کچھ نہ ہوا۔ مجھ پر عجیب جھلاہٹ سوار ہو گئی۔ غصہ ملازموں پر اترنے لگا۔ لیکن پھر بھی وہاں کوئی اثر نہ ہوا۔ دن گزر گیا۔ شام ہو گئی۔ میں خاموشی سے مختلف فائلیں اور مسودے دیکھتا رہا۔ نسرین کی خاموشی سے میں سخت ذہنی الجھن میں تھا۔ طوفان کے بعد کی خاموشی یقیناً خوش گوار ہوتی ہے۔ لیکن بغیر طوفان آئے اگر فضا ساکت ہو جائے تو وہ کسی طوفان ہی کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ میں بھی اس طوفان ہی کا منتظر تھا۔

دوسرے دن صبح ہی سے بکسوں کے کھلنے اور بند ہونے کی آواز نے میری نیند کھول دی۔ اتنی صبح سے سامان کی الٹ پلٹ میری سمجھ میں نہ آئی میں نے بستر سے اٹھ کر دیکھا۔ نسرین اپنے کپڑے اٹیچی کیس میں رکھ رہی تھی۔ میں سمجھ گیا۔ یہ دو تین دن کی خاموشی کا ردعمل ہے۔ لیکن خاموش لیٹا رہا۔ وہ کچھ بڑبڑا رہی تھی۔ پھر بشیر کو تانگہ لانے کے لیے کہا گیا۔ بشیر اس اچانک تانگہ کی فرمائش پر گھبرا گیا۔

"بی بی جی! اس وقت سویرے سویرے آپ کہاں جائیں گی؟"

"اسٹیشن جاؤں گی۔ صبح کی گاڑی پکڑنا ہے۔ مجھے جب اس گھر میں کوئی پوچھتا ہی نہیں' جب میرا خیال ہی نہیں رکھا جاتا۔ میری کوئی ضرورت نہیں' کوئی اہمیت نہیں تو میرا یہاں رہنا کیا ضروری ہے۔ میرا بھی خاندان ہے۔ مگر تجھے اس سے کیا' تو تانگہ لے آ!"

میں کچھ کہنا چاہتا تھا۔ لیکن نہ جانے کیوں خاموش پڑا رہا۔ اصل میں مجھے بھی غصہ آ رہا تھا۔ بات اتنی بڑی نہ تھی جتنا اس کا طومار باندھا گیا تھا اور نہ مجھے امید تھی کہ بات یہاں تک پہنچے گی۔

تانگہ آیا۔ سامان اس پر رکھا جانے لگا۔ میری اس بے توجہی نے اسے اور غصہ دلایا۔ میں چاہتا تو روک بھی سکتا تھا۔ منع بھی کر سکتا تھا اور شاید وہ مان بھی جاتی۔ لیکن یہ کچھ نہ ہوا۔

تانگہ میں سوار ہوتے ہوئے نسرین نے بشیر سے کہا۔

"صاحب بہادر اٹھیں تو کہہ دینا میں گھر جا رہی ہوں۔ کھانے وغیرہ کی تکلیف ہو تو کسی ماما کو ملازم رکھ لیں۔ انہیں اس کا نہ کوئی وعدہ پورا کرنا پڑے گا اور نہ فکر رکھنی پڑے گی۔"

تانگہ روانہ ہو گیا۔

اور گھوڑے کی ٹاپوں کی صدا دور ہوتی گئی۔

میں بستر سے اٹھا۔ بشیر نے چائے لا کر دی اور نسرین کے چلے جانے کی اطلاع دی۔ جو میں پہلے ہی سن چکا تھا۔ وہ میرا موڈ دیکھ کر خاموشی سے چلا گیا۔ گھر میں ہر طرف خاموشی تھی۔ نہ تو برتن کھڑکنے کی آواز سنائی دے رہی تھی اور نہ نسرین کی ہلکی ہلکی گنگناہٹ جو اکثر اکیلے پن کو دور کرنے کے لیے دھیمے سروں میں کسی گیت کی لے سے ڈوبتی ابھرتی رہتی۔ صبح کی خاموشی میں زندگی کا یہ نغمہ فضا میں ملکوتی حسن پیدا کر دیتا۔ لیکن آج فضا بالکل سونی تھی۔ دروازوں کے بے جان پردے ہل رہے تھے۔ لیکن انہیں اٹھا کر آنے والا کوئی نہ تھا۔ میں نے چائے کا پہلا گھونٹ حلق سے اتارنے کی کوشش کی۔ لیکن چائے بہت بدمزہ تھی۔ پیالہ وہیں رکھ کر کپڑے تبدیل کیے جو شاید صبح ہی سے میرے سرہانے رکھ دیے گئے تھے۔ اپنے

دلدل

الف صدیقی

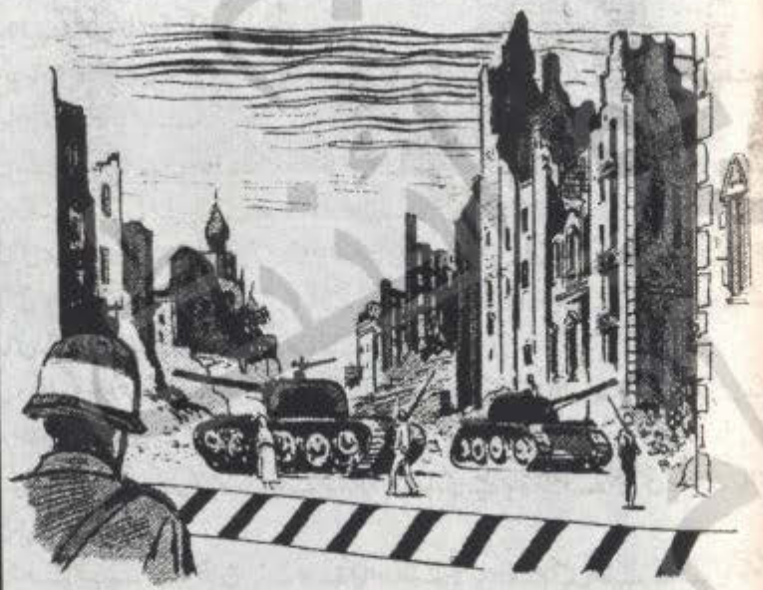

کمرے میں آ کر بیٹھ گیا۔ کئی فائلیں دیکھ ڈالیں۔ سارے حروف میرے سامنے سے گزر رہے تھے۔ لیکن مفہوم ذہن میں سما ہی نہیں رہا تھا۔ کچھ سمجھ ہی نہیں آ رہا تھا میں نے فائل پٹک دی اور باہر لان میں ٹہلنے لگا۔ مدھو کامنی کے پھولوں کا ڈھیر۔ سورج مکھی کا حسن' دیلیا کی لہراتی ہوئی بیلیں مجھے اپنی طرف متوجہ نہ کر سکیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے مجھے صرف ان آنکھوں کی تلاش ہو۔ ہنستی مسکراتی شریر آنکھوں کی! جن سے یہ سب کچھ حسین تھا۔ یہ ماحول' یہ سورج مکھی کے پھول' یہ مدھو کامنی کی بھینی بھینی خوشبو سب اس کے بغیر بے رنگ و بو تھے۔

عدالت میں بھی کوشش کے باوجود وقت نہ کٹ سکا۔ کلب کے' زندگی سے بھرپور قہقہوں میں بھی تصنع ہی تصنع تھا۔ مجھے اپنے آپ پر غصہ آ رہا تھا۔ میں کیا اتنا معذور ہوں کہ اس کے بغیر ایک قدم بھی نہیں چل سکتا میری بھی تو ذمہ داریاں ہیں۔ کیا میں اس کا خیال نہیں رکھتا؟ پھر اس کا اس طرح چلے جانا میری ہتک ہے۔ بے عزتی ہے۔ وہ مجھ پر جھنجلا سکتی تھی شکایت کر سکتی تھی اور کوئی ایسی خاص بات بھی نہ تھی جس پر اتنا غصہ کیا جاتا۔ میرے اندر کا مرد جاگ گیا تھا۔ میں غصہ میں شہر کی زندگی سے بھرپور شاہراہوں اور بارونق ہوٹلوں میں آزادی سے گھومتا رہا۔ میری خودداری جاگ گئی تھی۔ یہ سوچ کر کہ آج رات بھر خوب گھوموں گا تفریح کروں گا۔ میں کسی کا قیدی نہیں۔

میں آزاد ہوں!

بالکل آزاد!

کلب میں رات گئے تک فلیش ہوتا رہا۔ میری پہلی ہی ہار نے مجھے اس قدر بوکھلا دیا کہ میں پھر ہارتا ہی چلا گیا۔ رات کے دو بجے جب میرے پاس ایک پیسہ بھی نہ بچا تو مجبوراً گھر کی راہ پڑی۔ بارونق بازار ویران ہو چکے تھے اکا دکا لوگ تیز تیز قدموں سے اپنے گھروں کی راہ لے رہے تھے۔ ٹیکسی یا تانگہ کے انتظار نے جب مجھے مایوس کر دیا تو میں نے پیدل ہی گھر کی راہ لی۔ میں گھر جانا نہ چاہتا تھا۔

لیکن ان سونی سڑکوں کی اداسی بھی تکلیف دہ تھی۔ وہ جیسے کہہ رہی تھیں۔

"تمہارے لیے اب یہاں کوئی جگہ نہیں ہے!"

تھوڑا ہی فاصلہ طے ہوا ہوگا کہ ہلکی ہلکی بوندوں کی سرسراہٹ شروع ہوگئی۔ میں تیز تیز چلنے لگا۔ ایک چھوٹی سی بدلی پھیلتی گئی اور بارش کی تیزی میں اضافہ ہو گیا۔ میرے سر سے پاؤں تک شرابور ہو گیا تھا۔ لیکن قدم تیزی سے اٹھ رہے تھے۔ معدہ بالکل خالی تھا۔ میں نے صبح سے چند کپ چائے کے سوا کچھ کھایا پیا نہ تھا۔ نہ جانے کیوں بھوک نہ لگی تھی۔ گھر کے قریب پہنچتے پہنچتے مجھے کپکپی لگ گئی اور پھر میں کیسے اپنے کمرے میں پہنچا مجھے کچھ یاد نہیں۔

جب صبح آنکھ کھلی تو اپنے آپ کو بستر پر لیٹا ہوا پایا۔ بخار کی شدت سے میرا جوڑ جوڑ ٹوٹ رہا تھا۔ کسی کی گرم انگلیوں کے لمس نے مجھے بیدار کر دیا۔ مجھے اپنے آپ پر یقین نہ آ رہا تھا۔ میں نے آنکھیں کھول کر غور سے دیکھا۔ وہ نسرین تھی۔ لیکن میں نے غصے سے کروٹ بدل لی۔

نسرین نے تقریباً مجھ پر گرتے ہوئے کہا۔

"بس ایک دن میں یہ حالت بنا ڈالی؟ اور جاتے وقت یہ بھی نہ پوچھا کہاں جا رہی ہو اور کیوں جا رہی ہو؟"

میں خاموش رہا۔

"وہ تو خیر ہوئی کہ گاڑی چھوٹ گئی۔ ورنہ تم تو اپنا جانے کیا حال کر لیتے اور مجھے خبر بھی نہ ہوتی۔"

اس کی سسکیاں مجھے صاف سنائی دے رہی تھیں۔ میں نے آنکھیں کھول کر بغور دیکھا۔ ان آنکھوں میں غصہ تھا' بے بسی تھی۔ جیسے کہہ رہی ہوں.....

"میرے لیے اتنی ہی سزا کافی ہے۔"

حالاں کہ یہ سزا مجھے ہی دی گئی تھی اور میں سوچ رہا تھا۔ جوشی نے سچ ہی تو کہا تھا۔ وہ یہاں راج کرتی ہے۔ اس کے بغیر یہ مملکت کتنی ویران ہو جاتی ہے۔

☆☆☆

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دلدل

الف صدیقی

معاشرے کی بھرپور عکاسی کرتی ایک خوبصورت تحریر

کمروں کے ساتھ غسل خانے تو صرف بڑی بڑی کوٹھیوں اور بنگلوں میں ہوتے ہیں ارشاد نے اپنی بات کی وضاحت کی۔ پرانی وضع کے چھوٹے موٹے دیہاتی قسم کے مکانوں میں کہاں ہوتے ہیں۔ ایسے مکانوں میں تو غسل خانے کمروں سے دور بنائے جاتے ہیں۔

ہاں..... رحمت علی ایک دم چونک اٹھا۔ اس نے اس بات پر تو اب تک غور ہی نہیں کیا تھا تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔ جیسا یہ کمرا ہے اس جیسے گھروں میں کمروں کے ساتھ غسل خانے نہیں ہوتے۔ یہ کمرا خاص طور سے لوگوں کو قید کرنے کے لیے بنایا گیا ہے۔ اس میں بلب کا سوئچ بھی باہر ہے اور کمرے کے ساتھ ہی غسل خانہ بھی موجود ہے تاکہ قیدی کو باہر لے جانے کی ضرورت ہی نہ محسوس ہو۔

ایک اور بات پر بھی غور کرو ارشاد نے کہا غسل خانے میں جو اندر والا دروازہ ہے جو باہر کی طرف کھلتا ہے اس میں اندر کی طرف کوئی کنڈی نہیں ہے۔ یعنی اس دروازے کو صرف باہر سے ہی کھولا اور بند کیا جا سکتا ہے۔ اندر کی طرف سے نہیں۔ جو شخص اندر موجود ہوگا وہ اس دروازے کو اندر سے بند بھی نہیں کر سکے گا اور باہر سے آنے والا شخص اپنی مرضی سے کسی بھی وقت اس دروازے کو کھول کر اندر آ سکتا ہے۔

ہاں..... یہ سارا انتظام تو یقیناً خاص طور سے کیا گیا ہے..... رحمت علی نے کہا قیدیوں کو یہاں سے بھاگنے سے روکنے کے لیے یہ سارا بندوبست کیا گیا ہے۔

ان لوگوں کے یقیناً کوئی بہت ہی گھناؤنے قسم کے مقاصد ہوں گے ارشاد نے کہا ان سے جان چھڑانا ہمارے لیے اتنا آسان نہیں ہوگا۔ سوچنا شروع کرو..... ہمیں جلد از جلد خود کو ان کے چنگل سے چھڑانا ہے۔

بلب جلے بھی بہت دیر ہو گئی لیکن کوئی نہیں آیا۔ شاموا ور مستان خاں نے ایک بار آنے کے بعد پھر پلٹ کر خبر ہی نہیں لی۔ رات ڈھلتی جا رہی تھی اور ارشاد اور رحمت علی کا بھوک کے مارے برا حال تھا۔ انہوں نے گزشتہ روز دوپہر میں کھانا کھایا تھا اور اس کے بعد سے اب تک کچھ بھی نہیں کھایا تھا۔

مزید کافی دیر گزر گئی اور تب ایک بار پھر دروازے کے باہر آہٹ سنائی دی۔ دروازہ کھلا اور شاموا ور اس کے پیچھے بندوق بردار مستان خاں ایک بار پھر کمرے میں داخل ہوئے۔

ہم اس لیے آئے ہیں کہ تم لوگوں کو اگر غسل خانے جانا ہو تو باری باری چلے جاؤ شاموا نے بغیر کسی تمہید کے کہا اس کے بعد پھر ہم صبح ہی آئیں گے۔

صبح۔ ارشاد نے تعجب کے ساتھ احتجاج کرتے ہوئے کہا اور کھانے کا کیا ہوگا۔ تم ہمیں کھانے کے لیے کیا کچھ نہیں دو گے۔

ملے گا ملے گا شاموا نے خشک اور سرد انداز میں کہا کھانے کے لیے بھی ملے گا۔ لیکن آج نہیں۔ کل ول دیکھیں گے۔

کیا مطلب۔ رحمت علی نے آنکھیں پھاڑ کر کہا کل ول دیکھیں گے کا کیا مطلب۔ ارے ہم نے تو کل سے کچھ نہیں کھایا ہے اور اب اتنی رات ہو چکی ہے۔ ہمارا تو بھوک کے مارے دم نکلا جا رہا ہے اور تم کہہ رہے ہو کہ کل ول دیکھیں گے۔

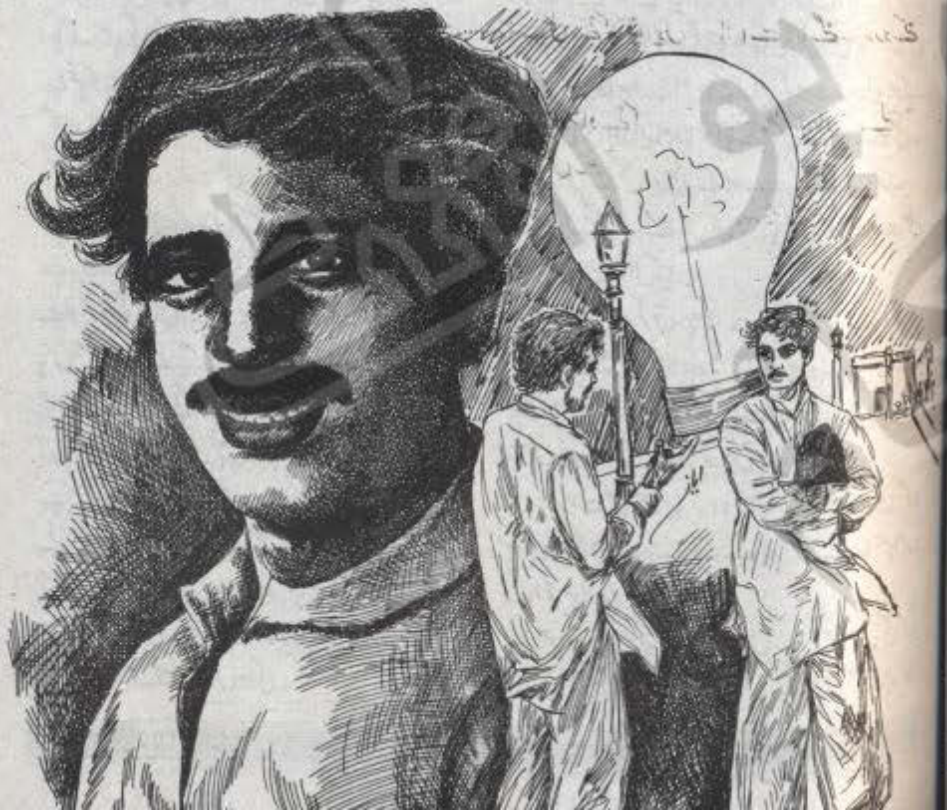

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تم لوگ کیسے فقیر ہو۔ شامو نے اسے کڑی نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔ فقیر ہو کر تم کو بھوکا رہنے کی عادت نہیں ہے۔ فقیروں کو تو بھوکا رہنے کی عادت ہوتی ہے۔

اور تم کس قسم کے فقیر ہو جو فقیروں کی دعوت کرتے ہو اور انہیں شان دار اور مرغن کھانے کھلاتے ہو۔ رحمت علی نے جوابی حملہ کیا تم کس قسم کے فقیر ہو جو اپنے ساتھ مسلح قاتل کو لیے پھرتے ہو۔ تم کیسے فقیر ہو جو دوسرے فقیروں کو دھوکے سے پکڑ کر انہیں قید کر دیتے ہو اور پھر انہیں بھوکا مارتے ہو۔ اپنوں کے ساتھ دھوکے بازی کرتے ہو۔

ہی ہی ہی شامو بڑی ڈھٹائی کے ساتھ ہنسا بہت اچھا بول لیتے ہو۔ تمہیں تو کوئی سیاسی لیڈر ہونا چاہیے تھا۔ الیکشن میں کھڑا ہونا چاہیے تھا۔ میں تو تم کو ضرور ووٹ دیتا۔

ہمیں ووٹ نہیں کھانا چاہیے شامو ارشاد نے اس کو گھورتے ہوئے کہا۔

دیکھو کھانا تمہیں اس وقت نہیں ملے گا شامو نے اچانک سنجیدگی کے ساتھ خشک اور درشت لہجے میں کہا میں نے تم کو بتا دیا ہے۔ آج کی رات تم کو بغیر کھانے کے ہی گزارنی ہوگی۔

لیکن کیوں۔ رحمت علی نے اپنا احتجاج جاری رکھا کیوں۔ کیا تمہارے پاس ہمیں کھلانے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ اور اگر تمہارے پاس ہمیں کھلانے کے لیے کچھ نہیں ہے تو تم ہم کو یہاں لے کر کیوں آئے ہو۔ کل تو تمہارے پاس ہمیں کھلانے کے لیے بہت کچھ تھا اور آج بھی ہے شامو نے چبھتی ہوئی نظروں سے اسے گھورتے ہوئے کہا آج بھی ہے لیکن ابھی نہیں۔ تم لوگوں کے لیے ضروری ہے کہ تم کو بھوکا رہنے کی کچھ عادت ہو جائے۔ یہ تمہارے لیے بہتر ہوگا۔ کون جانے۔ کل تم کو بھوکا رہنا پڑے۔ تمہارے پاس کھانے کو ہی نہ ہو..... تو پھر اس وقت تم کو بہت تکلیف ہوگی۔ لیکن اگر بھوکا رہنے کی عادت ہو تو پھر اتنی زیادہ تکلیف نہیں محسوس ہوگی۔

تم کیا کہنا چاہتے ہو شامو۔ ارشاد نے سخت لہجے میں کہا صاف صاف بات کیوں نہیں کرتے۔ پہیلیاں کیوں بجھوا رہے ہو۔

ابھی تو پہیلیوں سے ہی کام چلنے دو جوان شامو نے کہا ابھی صاف صاف بات کرنے کا وقت نہیں آیا۔ جب آئے گا تو صاف صاف بات بھی سن لینا اور اب ..... اگر غسل خانے جانا ہے تو چلو .... میں یہاں زیادہ دیر نہیں رکوں گا۔

ٹھیک ہے ارشاد نے کہا میری رسیاں کھول دو۔ میں جانا چاہتا ہوں۔ میرے بعد صمد جائے گا اس نے رحمت علی کی طرف دیکھا اور رحمت علی نے آہستہ سے گردن ہلا دی۔

شامو نے چارپائی کے قریب آ کر ارشاد کے ہاتھوں اور پیروں کی رسیاں کھول دیں۔ مستان خاں بندوق ہاتھ میں لیے ہوئے پوری طرح مستعد کھڑا رہا۔

جاؤ شامو نے غسل خانے کے دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اور ارشاد اس طرف روانہ ہو گیا۔

اسے اب کسی قسم کی دماغی یا جسمانی کمزوری کا احساس نہیں ہو رہا تھا سوائے اس کے کہ اس کو بہت زور کی بھوک لگ رہی تھی اور ایسا ہونا تو ایک بالکل قدرتی بات تھی۔ کیونکہ اس نے کل دوپہر کے بعد سے کچھ نہیں کھایا تھا۔

ہم لوگ گجرانوالے میں ہی ہیں یا کہیں اور۔ رحمت علی نے شامو سے سوال کیا۔

اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ شامو نے کہا تم گجرانوالے میں ہو یا لاہور میں یا شیخوپورہ میں۔ اس سے بھلا کیا فرق پڑتا ہے۔ اصل بات تو یہ ہے کہ تم ہمارے ساتھ ہو اور ہم تمہارے ساتھ ہیں۔

رحمت علی سمجھ گیا کہ وہ مکار اور عیار آدمی کسی بھی سوال کا صحیح جواب دینے کے لیے تیار نہیں ہے۔ تاہم اس نے اگلا سوال پوچھا۔

لاکھو اور دریام کہاں ہیں۔ اس نے پوچھا اس کی کیا وجہ ہے کہ صرف تم ہی ہم لوگوں کے پاس آ رہے ہو اور لاکھو اور دریام تو اپنی شکل ہی نہیں دکھا رہے ہیں۔ کیا وہ یہاں سے غائب ہو گئے ہیں۔

نہیں تو شامو نے سنجیدگی کے ساتھ کہا ان کو بھلا بھاگنے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ موجود ہیں۔

مگر کہاں۔ رحمت علی نے اصرار کیا۔

وہیں، جہاں ان کو ہونا چاہیے شامو نے ایک بار پھر گول مول سا جواب دیا اور اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔

اس نے لاکھو اور دریام کے بارے میں اس کے علاوہ اور کوئی بات نہیں بتائی۔

ارشاد ذرا دیر کے بعد غسل خانے سے باہر آ گیا اور اب رحمت علی کی باری تھی۔ رحمت علی کو کھولنے سے پہلے شامو ارشاد کو دوبارہ باندھنے لگا۔

سنو شامو ارشاد نے نرمی سے کہا ہم لوگ تمہاری قید میں ہیں اور جہاں سے ہم بھاگ کر کہیں بھی نہیں جا سکتے۔ تمہارا مستان خاں تو گن لیے ہمارے سروں پر سوار ہے۔ اب تم بند کمرے میں بھی ہم لوگوں کے ہاتھ پیر باندھ کر کیوں رکھنا چاہتے ہو۔ اس سے تمہیں کیا فائدہ ہے۔

اچھا تو تم یہ چاہتے ہو کہ ہم تم کو بالکل کھلا چھوڑ دیں۔ شامو نے آنکھیں نکال کر کہا۔

تو اس میں اس قدر ڈرنے اور گھبرانے کی کیا بات ہے۔ رحمت علی بولا۔ جیل میں قیدیوں کو کوٹھریوں اور بیرکوں میں تو ہتھکڑی اور بیڑی لگا کر نہیں رکھا جاتا۔ انہیں چلنے پھرنے اور گھومنے پھرنے کی آزادی ہوتی ہے۔ تم ہمارے ساتھ کم از کم قیدیوں جیسا برتاؤ تو کرو۔

میں تمہارے ساتھ زیادہ سے زیادہ یہ رعایت کر سکتا ہوں کہ تمہارے پیر کھلے چھوڑ دوں اور صرف تمہارے ہاتھ باندھ کر رکھوں۔

اگر ہاتھ بھی کھلے رکھو گے تو ہم کہیں بھاگ کر نہیں جائیں گے ارشاد نے کہا کمرا تو باہر سے بند ہے اور اس ایک دروازے کے علاوہ باہر جانے کا اور کوئی راستہ بھی نہیں ہے۔ ہم یہاں سے کس طرح باہر نکل سکتے ہیں۔ یہ سوچنا ہی سراسر بے وقوفی ہے۔

کچھ بھی سہی شامو نے اس کی بات کو رد کرتے ہوئے کہا میں اس سے زیادہ خطرہ مول نہیں لے سکتا۔ میں تم دونوں کے صرف پیر کھول سکتا ہوں۔ اس میں تمہیں آسانی ہوگی کہ تم اس کمرے میں چل پھر سکو لیکن ہاتھ نہیں کھولوں گا۔

اس نے ان لوگوں کی مزید کوئی اور بات نہیں سنی اور ارشاد کے دونوں ہاتھوں کی کلائیوں کو آپس میں ملا کر رسی سے باندھنے لگا۔ تاہم اس نے ارشاد کے پاؤں آزاد چھوڑ دیے۔

یہ بہت بڑا احسان ہے جو میں تم لوگوں کے اوپر کر رہا ہوں اس نے رحمت علی کی رسیاں کھولتے ہوئے کہا میں جانتا ہوں کہ اس میں خطرہ موجود ہے لیکن میں اتنا خطرہ تو مول لے سکتا ہوں۔

رحمت علی آزاد ہو گیا اور اس نے غسل خانے کا رخ کیا۔

تم ہمیں کب تک بھوکا مارو گے شامو۔ ارشاد نے اس کو نفرت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

اطمینان رکھو شامو نے اس کو گھورتے ہوئے معنی خیز انداز میں کہا ہم تم کو ماریں گے نہیں۔ اس بات کا یقین رکھو کہ تم زندہ رہو گے۔ مرو گے نہیں۔

لیکن زندہ رہنے کے لیے کھانا کھانا تو ضروری ہے۔ ایسا کون سا انسان ہے جو کھانے کے بغیر زندہ رہ سکے۔

ایسا تو کوئی بھی انسان نہیں ہے اور نہ ہو سکتا ہے شامو نے جواب دیا۔ اور تم بھی یقیناً ایسے انسان نہیں ہو

تھوڑی دیر کے بعد رحمت علی بھی باہر نکل کر آ گیا۔ شامو نے اس کے بھی صرف دونوں ہاتھ باندھے اور خوب کس کے مضبوطی کے ساتھ گرہ لگا دی۔ اس کے بعد وہ مستان خاں کے ساتھ وہاں سے جانے لگا۔

کچھ کھانے کا تو بندوبست کر دو شامو ارشاد کے لہجے میں درخواست کی جھلک تھی صبح تک تو ہمارا بھوک سے برا حال ہو جائے گا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لیکن تم مرو گے نہیں شامو نے سکون سے جواب دیا مجھے معلوم ہے کہ تم دونوں میں سے کوئی بھی نہیں مرے گا۔ تم دونوں زندہ رہو گے۔ اس لیے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے ..... نہ تم کو .... نہ مجھ کو

اس کے ساتھ ہی وہ مستان خاں کے ساتھ کمرے سے باہر نکل گیا۔ دروازہ باہر سے بند کر دیا گیا اور ارشاد اور رحمت علی اس کمرے میں ایک بار پھر اکیلے رہ گئے۔

وہ دونوں اب چل سکتے تھے۔ ان کے پاؤں کھلے ہوئے تھے۔ وہ اپنے پیروں سے کوئی بھی کام لے سکتے تھے لیکن ہاتھوں سے کچھ نہیں کر سکتے تھے۔

یہ منحوس ہمیں رات بھر بھوکا رکھے گا ارشاد نے سخت غصے اور نفرت کے عالم میں دانت پیستے ہوئے کہا خدا جانے یہ ہمارے ساتھ کیا کھیل کھیل رہا ہے۔

ایک طرف تو وہ یہ بھی کہتا جا رہا ہے کہ ہم مریں گے نہیں یعنی یہ کہ وہ ہمیں جان سے مارنے کا ارادہ نہیں رکھتا ہے رحمت علی نے کہا اور اس کے ساتھ ہی وہ ہمیں بھوکا بھی رکھ رہا ہے۔ اس کا یہ تماشا کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔

یہ لوگ شاید ہمیں کسی خاص مقصد کے لیے استعمال کرنا چاہتے ہیں ارشاد نے پرخیال انداز میں کہا اور اس غرض سے یہ ہمارے اوپر دباؤ ڈالنے کی کوشش کریں گے۔

ایسا ہی معلوم ہوتا ہے رحمت علی نے کہا ابھی تو یہ ہم کو بھوکا رکھ رہے ہیں۔ اس کے بعد شاید وہ ہم پر مزید دباؤ ڈالیں گے۔

وہ اب بھی کچھ بتانے پر آمادہ نہیں ہے ارشاد نے کہا اور کھانے کو بھی نہیں دے رہا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ وہ ہمارے سامنے اپنا مقصد اس وقت بیان کرے جب ہم بھوک سے بے حال ہو جائیں اور ہمارے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ رہے کہ اس کی بات مان لیں۔

ایسا ہی معلوم ہوتا ہے رحمت علی نے کہا وہ ہمیں اپنی بات ماننے کے لیے مجبور کر دینا چاہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہم کو جب کھانے کو نہیں ملے گا تو ہماری جسمانی طاقت بھی کم ہوتی چلی جائے گی اور ہم مزید کمزور ہوتے جائیں گے۔ بدمعاش اس سے فائدہ اٹھائے گا۔

اس سے پہلے کہ وہ وقت آئے جب ہماری جسمانی طاقت اتنی کم ہو جائے کہ ہم کسی کارروائی کے قابل ہی نہ رہیں ہمیں کچھ نہ کچھ کر لینا چاہیے۔

ہاں رحمت علی نے کہا بس کچھ نہ کچھ کر لینا ہے..... وہ دونوں صبح ہی آئیں گے۔

وہ دونوں کافی دیر تک آپس میں باتیں کرتے رہے۔ انہیں اپنی تمام تر حربی تربیت صلاحیت اور تجربے کو روئے کار لاتے ہوئے ایک فیصلہ کن قدم اٹھانا تھا۔

وہ دونوں شدید بھوک کے عالم میں سونے کی کوشش کر رہے تھے اور ان کی آنکھوں میں ذرا ذرا نیند آنی شروع ہوئی ہی تھی کہ اچانک دروازے کے باہر ایک بار پھر آہٹ سنائی دی اور وہ دونوں چوکنے ہو گئے۔ کوئی آ رہا تھا..... لیکن اب..... اس وقت..... اتنی رات گئے کسی کا یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی۔ شامو اور مستان خاں ایک چکر لگا کر جا چکے تھے۔ ان کو اب دوبارہ نہیں آنا تھا۔

دروازہ کھل گیا اور سب سے آگے آنے والا شامو تھا۔ شامو کے ساتھ ایک آدمی اور تھا۔ وہ گھنی سیاہ داڑھی اور بالکل گول چہرے والا ایک پستہ قد اور سیاہ فام آدمی تھا جس کی آنکھیں بہت چھوٹی چھوٹی لیکن کسی شکرے کی طرح تیز اور چمکیلی تھیں۔ اس کے چہرے سے ایک خاص قسم کی رعونت اور کرختگی کا احساس ہوتا تھا۔

ان دونوں کے پیچھے مستان خاں تھا اسی طرح بندوق ہاتھ میں اٹھائے ہوئے۔

اچھا تو یہ ہیں وہ دونوں نووارد نے ان دونوں کو غور سے دیکھتے ہوئے بھاری آواز میں کہا۔ وہ بڑی دلچسپی بھری نظروں سے ان دونوں کو دیکھ رہا تھا۔

ہاں شامو نے جواب دیا دیکھ لو دونوں کو اچھی طرح سے۔ وہ جو بڑا والا ہے اس کا نام اقبال ہے اور وہ جو چھوٹا ہے اس کا نام صمد ہے۔ دونوں خوب تندرست اور جوان ہیں۔

تم پھر غلطی کر رہے ہو شامو نووارد نے شامو کو گھورتے ہوئے کہا۔ ہمیں ہٹے کٹے اور مسٹنڈے جوانوں کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔ ہمیں تو ایسے کمزور اور ٹوٹے پھوٹے لوگ چاہئیں جنہیں دیکھتے ہی آدمی کا ہاتھ سیدھا اپنی جیب کی طرف چلا جائے۔

ارے..... وہ تو بالکل ٹھیک ہے۔ خادم علی لیکن یہ بھی تو دیکھ کہ جوان مگڑا ہوگا تو زیادہ دنوں تک جئے گا بھی۔ جلدی مرے گا نہیں۔ یہ دونوں تو خوب تگڑے ہیں۔ اب ان کو دبلا تم خود کر لینا اور ان کی جو توڑ پھوڑ کرنا ہو وہ بھی خود ہی کر لینا۔

وہ تو کرنا ہی پڑے گی خادم علی نے کہا اس کے بغیر ان مسٹنڈوں کو بھیک کون دے گا۔ وہ زور سے ہنسا اور توڑ پھوڑ کیے بغیر یہ بھلا ہمارے قابو میں کیسے آئیں گے۔ یہ تو ہمارے قابو میں صرف اسی وقت آئیں گے جب یہ ہمارے بغیر زندہ ہی نہ رہ سکیں ہی ہی ہی..... وہ بڑے ہی مکروہ انداز میں ہنسا۔

ارشاد اور رحمت علی ان دونوں کی گفتگو سن رہے تھے اور ان کے جسم میں خون کی گردش ایک دم تیز ہو گئی تھی اور دل کی دھڑکنوں میں اضافہ ہو گیا تھا تو یہ تھا سارا معاملہ..... وہ اب سب کچھ صاف طور پر سمجھ چکے تھے۔

تو پھر سودا پکا۔ شامو نے خادم علی کی طرف دیکھ کر کہا تم نے ان کو دیکھ لیا۔ پسند کر لیا۔ ٹھیک ہیں۔ تمہارے مطلب کے ہیں۔

ہاں بالکل ٹھیک ہیں اور ہمارے مطلب کے ہیں خادم علی نے گردن ہلاتے ہوئے کہا لیکن قیمت کچھ کم کرو..... تم بہت زیادہ مانگ رہے ہو۔

ارے کیا زیادہ مانگ رہے ہیں خادم علی۔ شامو نے کہا ذرا یہ بھی تو دیکھو کس قدر جوکھم کا کام ہے جو ہمیں کرنا پڑتا ہے۔ کتنا خطرہ مول لینا پڑتا ہے اور ساتھ ہی کتنا مال بھی خرچ کرنا پڑتا ہے۔ ان جیسے دو دو تگڑے مسٹنڈوں کو ایک ساتھ ایک ہی وقت میں قابو میں کرنا کوئی مذاق ہے۔ ذرا سی غلطی ہو جائے تو لینے کے دینے پڑ جائیں۔ یہ تو ہماری جان کے لیے کتنا بڑا خطرہ بن سکتے ہیں۔

وہ سب تو ٹھیک ہے شامو لیکن پھر بھی تمہیں کچھ خیال تو کرنا ہوگا۔ ہم تمہارے پرانے گاہک ہیں۔ رعایت تو کرنی ہوگی۔

تم ہمارے پرانے گاہک ہو اسی لیے تو ہم نے تمہارے علاوہ اور کسی کو نہ تو یہ مال دکھایا ہے اور نہ اس کے بارے میں کوئی بات کی ہے۔ تم ہی وہ اکیلے اور پہلے آدمی ہو جسے ہم یہ مال دکھا رہے ہیں۔ ایک بار یہ مال تمہارا ہو جائے تو اگلے تیس پینتیس سال تک تم اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہو۔

ارے میرے یار اگلے تیس پینتیس سال کس نے دیکھے ہیں۔

خادم علی نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہا چالیس سال سے اوپر کی عمر ہو رہی ہے میری اور آگے کب تک زندہ رہنا ہے کیا خبر۔ خیر تم کام کی بات کرو۔ مال ہمیں پسند ہے اور بڑی مشکل سے یہ مال ہاتھ آیا ہے خادم علی شامو نے کہا تم کو کیا معلوم کیسے کیسے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ کیسے کیسے جھانسے دینے پڑتے ہیں۔ کتنے بہت سارے لوگوں کو مل کر کام کرنا پڑتا ہے تب کہیں جا کر ایک دانہ ہاتھ آتا ہے۔ تمہیں تو ہر چیز پکی پکائی مل جاتی ہے۔

پکی پکائی تو نہیں مل جاتی میری جان خادم علی نے ہنستے ہوئے کہا ابھی تو یہ کچی ہی ہیں۔ ان کو پکانا پڑے گا۔

تو کیا ہوا۔ شامو نے جلدی سے کہا اگر تم چاہو تو ہم تمہیں پکا کر ہی دے سکتے ہیں۔ بالکل تیار مال مگر اس صورت میں پکوائی کا خرچا تمہیں دینا ہوگا۔

نہیں اس کی ضرورت نہیں ہے خادم علی نے کہا ہم خود ہی پکا لیں گے۔ بس تم کچھ رعایت کرو قیمت میں چلو یہاں سے تو اب باہر چلو۔ میں نے ان کو دیکھ لیا ہے اور مجھے یہ بات بھی بہت پسند آئی ہے کہ ان کا آگے پیچھے کوئی نہیں ہے۔ کوئی ان کو ڈھونڈتا ہوا نہیں آئے گا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ارے ہم تو ہمیشہ سب سے اچھے مال پر ہی ہاتھ مارتے ہیں استاد شاموں نے کہا تمہیں ایسے شاندار دانے ہر جگہ تو نہیں ملیں گے۔

وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے دروازے سے باہر نکل گئے۔ بندوق بردار مستان خاں بھی ان کے ساتھ تھا۔ دروازے کو باہر سے بند کر دیا گیا۔

ان تینوں کے چلے جانے کے بعد ارشاد اور رحمت علی نے ایک دوسرے کو پرتشویش نگاہوں سے دیکھا۔

یہ حرامزادے انسانوں کی خرید و فروخت کا کاروبار کرتے ہیں ارشاد نے دانت پیس کر کہا انہوں نے دھوکے سے ہم کو پکڑ لیا ہے اور اب یہ ہم کو کسی اور کے ہاتھوں فروخت کر رہے ہیں۔

اور جو شخص ہمیں خرید رہا ہے وہ ہمارے ہاتھ پیر توڑ کر ہمیں لنگڑا لولا اندھا یا کانا بنا کر ہم سے بھیک منگوائے گا رحمت علی نے کہا وہ ہم کو جسمانی طور پر اتنا زیادہ معذور بنا دے گا کہ ہم اس کی مدد کے بغیر اور اس سے الگ ہو کر زندہ ہی نہ رہ سکیں۔ وہ ہمیں توڑ پھوڑ کر ایسا بنا دے گا کہ ہم بھیک مانگنے کے علاوہ دنیا میں اور کسی کام کے قابل ہی نہ رہ پائیں۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں ہم اس کے محتاج بن کر صرف بھیک ہی مانگ سکیں گے اور وہ ہماری کمائی پر عیش کرے گا

ہم بری طرح پھنس گئے ہیں رحمت علی ارشاد نے کہا یہ پیشہ ور بدمعاش ہیں۔ ان کے پاس خطرناک ہتھیار بھی موجود ہیں۔ ہمیں ان سے بہت ہوشیاری کے ساتھ نمٹنے کی ضرورت ہے۔ یوں سمجھ لو کہ ہم دونوں اس وقت موت کی دہلیز پر کھڑے ہوئے ہیں۔ ذرا سا قدم بہکا اور گئے کام سے۔

بس پھر فوراً کارروائی شروع کر دو رحمت علی نے کہا اس سے پہلے کہ وہ کتے کا بچہ خادم علی ہمیں یہاں سے لے جائے ہمیں یہاں سے بھاگ نکلنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

چلو پھر کام شروع کرتے ہیں ارشاد نے کہا ہمیں سب سے پہلے تو کوشش کر کے اپنے ہاتھوں کو آزاد کرانا ہے۔

ان دونوں نے بغور اپنے بندھے ہوئے ہاتھوں کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ دونوں نے طاقت آزمائی کی۔ لیکن رسیوں کی گرہیں اتنی سخت اور مضبوط تھیں کہ وہ اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہیں ہوئیں۔ دونوں زور لگاتے لگاتے ہانپ گئے لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔

یہ کام اس طرح نہیں ہوگا رحمت علی نے کہا ہمیں اس کے لیے کوئی اور راستہ تلاش کرنا ہوگا۔

انہوں نے اس مختصر سے کمرے کی مختصر سی چیزوں کا جائزہ لینا شروع کیا۔ یہاں دو کھری چارپائیوں اور لوہے کی ایک پرانی شکستہ زنگ خوردہ چھوٹی سی میز کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس بات کا خاص طور سے خیال رکھا گیا ہے کہ اس کمرے میں کوئی بھی فالتو شے موجود نہ رہے کوئی بھی ایسی شے موجود نہ رہے جس کے ذریعے کوئی قیدی وہاں سے رہائی میں کسی طرح کی مدد حاصل کر سکے۔

یہاں تو کچھ بھی نہیں ہے ارشاد نے چاروں طرف کا اچھی طرح سے جائزہ لینے کے بعد مایوسی سے کہا یہاں تو کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس سے ہمیں اپنے کام میں ذرا سی بھی مدد مل سکے۔

ہاں یہاں تو ایسا کچھ بھی نہیں ہے رحمت علی نے مایوسی کے ساتھ کہا۔ چلو غسل خانے میں دیکھتے ہیں۔ شاید وہاں کوئی کام کی چیز مل جائے۔

وہاں بھی انہیں کوئی کام کی چیز نہیں مل سکی۔ دیوار کے ساتھ اینٹوں سے بنی ہوئی پانی کی ایک ٹنکی تھی جس پر ڈھکن کی جگہ لکڑی کا ایک بے حد بوسیدہ گلا سڑا تختہ رکھا ہوا تھا۔ جو اتنا کمزور تھا کہ اگر اونچائی سے زمین پر گر جاتا تو ٹوٹ جاتا۔ یہ سڑا ہوا تختہ ان کے کسی کام کا نہیں تھا۔ ایک المونیم کا بہت پرانا دھرانا سا لوٹا تھا جس میں جگہ جگہ بے شمار گڑھے پڑے ہوئے تھے اور ان گڑھوں میں ڈھیروں کالا کالا میل بھرا ہوا تھا۔

ان دو چیزوں کے علاوہ غسل خانے میں اور کچھ نہیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھا۔ حتیٰ کہ ہاتھ منہ پونچھنے کے لیے کوئی تولیہ یا کپڑے کا ٹکڑا تک نہیں تھا۔

وہ بغور ساری چیزوں کا جائزہ لیتے رہے۔

اگر ہمیں یہاں کوئی پرانا آئینہ یا ریزر یا کوئی پرانا دھرانا بلیڈ مل جاتا تو ہمارا کام بن جاتا ارشاد نے چاروں طرف کا جائزہ لینے کے بعد کہا۔ لیکن یہاں ایسا کچھ نظر نہیں آتا۔ شاید کسی نے شیو بنانے کے بعد یہاں کوئی آئندہ یا بلیڈ چھوڑا ہی نہیں۔

کیا معلوم یہاں کبھی کسی نے شیو بنایا بھی یا نہیں رحمت علی نے کہا۔ یہ تو قید خانہ ہے اور قیدیوں کو بھلا ایسی سہولتیں کہاں دی جاتی ہیں۔ جیل میں مرد قیدیوں کو بلیڈ بالکل نہیں دیا جاتا۔ سخت ممانعت ہے۔ ایک بار ایک قیدی کو کہیں سے ایک پرانا بلیڈ مل گیا تھا۔ اس نے اس پرانے بلیڈ سے ایک دوسرے قیدی کا پیٹ کاٹ کر رکھ دیا۔ وہ قیدی اسپتال جا کر مر گیا۔

اف..... توبہ..... ایک پرانے بلیڈ کے ذریعے یہ کام..... کاش ہمیں بھی ایک پرانا بلیڈ مل جائے۔

لیکن انہیں نہ تو کوئی پرانا بلیڈ مل سکا اور نہ ہی کوئی شیشے کا ٹکڑا۔ اس قسم کی کوئی چیز اس غسل خانے میں نہیں تھی۔

انہوں نے غسل خانے کے بیرونی دروازے پر طاقت آزمائی۔ دروازہ باہر سے بند تھا۔ اندر سے تو اس میں کوئی کنڈی یا چٹخنی تھی ہی نہیں۔ دروازہ بے حد مضبوط تھا اور پرانی شیشم کی موٹی لکڑی کا بنا ہوا تھا یہ صرف دھکے مارنے سے نہیں ٹوٹ سکتا تھا۔ اس کو توڑنے کے لیے تو ہتھوڑوں کی ضربات کی ضرورت تھی اور ان کے پاس تو ایک چھوٹی سی ہتھوڑی بھی نہیں تھی اور پھر ان کے تو دونوں ہاتھ بھی بندھے ہوئے تھے۔

غسل خانے میں بھی ایک روشن دان تھا۔ یہ بیرونی دیوار میں چھت سے ذرا نیچے تھا اور اس میں موٹی موٹی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔

یہاں بھی کچھ نہیں ہے ارشاد نے ایک لمبی اور ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا کوئی ایسی صورت ہوتی کہ ہمارے ہاتھ کھل جاتے۔ پھر تو ہم بہت کچھ کر سکتے تھے۔ بندھے ہوئے ہاتھوں کے ساتھ تو ہم بالکل مجبور ہو کر رہ گئے ہیں۔

وہ دونوں وہاں سے نکل کر دوبارہ کمرے میں آ گئے۔ جہاں وہ بغیر بستر والی چارپائیوں اور لوہے کی ایک پرانی اور زنگ خوردہ میز کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا جو جگہ جگہ سے ٹیڑھی میڑھی بھی ہو رہی تھی۔

میز رحمت علی کے راستے میں آ گئی تھی اور رحمت علی نے غصے کے عالم میں ایک لات رسید کی۔ میز لڑھک کر الٹی ہو گئی۔

اچانک رحمت علی کی نظریں اس الٹ جانے والی میز پر جم کر رہ گئیں۔

میز کے نچلے حصے میں اس کے چاروں پایوں کو آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ جوڑے رکھنے کے لیے لوہے کی چادر کی پٹیاں لگی ہوئی تھیں اور ان میں سے ایک پٹی کا کنارہ زنگ خوردہ ہونے کے باعث ذرا پتلا اور دھاردار ہو گیا تھا لیکن پٹی چونکہ کافی موٹی چادر کی تھی اس لیے یہ ٹوٹا نہیں تھا۔

اچانک رحمت علی میز کے پاس بیٹھ گیا اور اس پٹی کا جائزہ لینے لگا۔ ارشاد بھی فوراً ہی اس کے پاس بیٹھ گیا۔

اس میں کیا دیکھ رہے ہو ارشاد نے اس سے سوال کیا۔

کوئی جواب دینے کے بجائے رحمت علی نے اپنے دونوں ہاتھوں میں بندھی ہوئی رسی کے ایک حصے کو آہستہ سے آہنی میز کی زنگ خوردہ پٹی کے اوپر رگڑا۔ ارشاد اس کو غور سے دیکھ رہا تھا۔

اچانک ہی ان دونوں کے چہروں پر خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ ٹین کی دھاردار، زنگ آلود پٹی نے رسی میں نشان ڈال دیا تھا۔

رگڑو..... رگڑو..... ارشاد نے ہیجان کے عالم میں کہا۔ زور زور سے رگڑو..... کٹ جائے گی۔

تم بھی رگڑو۔ رحمت علی نے سرگوشی میں کہا۔ پٹی تو کافی

لمبی ہے۔ دونوں رگڑ سکتے ہیں۔

فوراً ہی ارشاد نے بھی اپنے دونوں ہاتھوں میں بندھی ہوئی رسی کو آہنی پٹی پر رگڑنا شروع کر دیا۔

دونوں میں اچانک ایک نئی طاقت پیدا ہو گئی تھی۔ وہ زور زور سے اپنی کلائیوں میں بندھی ہوئی رسی کو لوہے کی پٹی پر رگڑ رہے تھے اور رسیاں کٹنی شروع ہو گئی تھیں۔

اگرچہ یہ کام کافی مشکل تھا، کیونکہ اس میں ایک ساتھ بندھی ہوئی دونوں کلائیوں کو ایک ہی سیدھ میں تیزی سے آگے پیچھے حرکت دینی ہوتی تھی اور اس کے لیے دونوں ہاتھوں کو بہت سنبھال کر ان کی حرکت پر قابو رکھنا ضروری تھا، کیونکہ ذرا سی غلطی کی صورت میں ہاتھ زخمی ہو سکتا تھا، یا رسی غلط جگہ سے ٹکرا سکتی تھی۔ ضروری تو یہ تھا کہ لوہے کی پٹی اس کو صرف ایک ہی جگہ سے گھستی اور کاٹتی رہے، تاکہ وہاں سے رسی کٹ کر دو ٹکڑوں میں بٹ سکے اور بندھن سے آزادی ملے۔

دونوں کے بھوک سے نڈھال جسموں میں ایک نئی طاقت پیدا ہو گئی تھی۔ مایوسی کے عالم میں ان کو امید کی ایک روشن کرن نظر آئی تھی اور وہ جلد از جلد اس کام کو پورا کر لینا چاہتے تھے۔

لوہے کی پرانی میز زور زور سے ہلنے لگی تھی۔ جس کی وجہ سے ان کے کام میں دشواری پیدا ہونے لگی۔ ان دونوں نے اپنی ٹانگوں کے ذریعے میز کو قابو میں کیا اور اسے ہلنے سے روکا۔

پہلے ارشاد کے ہاتھ کی رسی کٹی..... اور دونوں کے چہرے خوشی سے کھل اٹھے۔ ارشاد کے دونوں ہاتھ رسی کی گرفت سے آزاد ہو چکے تھے، اس نے رحمت علی کے ہاتھ کی رسی کھولنی چاہی، لیکن اب اس کی ضرورت نہیں تھی۔ جتنی دیر ارشاد کو اس رسی کو ہاتھ سے کھولنے میں لگتی، اس سے کم دیر میں یہ رسی خود ہی کٹ جاتی اور ایسا ہی ہوا۔

رحمت علی کے ہاتھوں کی رسی بھی کٹ گئی۔ اگرچہ ان دونوں کو کافی محنت کرنی پڑی تھی، لیکن اس کا پھل ان کے سامنے موجود تھا۔ ان دونوں کے ہاتھ آزاد ہو چکے تھے اور اس کے ساتھ ہی ان میں نئی توانائی پیدا ہو گئی تھی۔ گو کہ ابھی وہ اس قید سے آزاد نہیں ہوئے تھے۔ تاہم، آزاد ہونے کی راہ ہموار ہو گئی تھی۔

واہ ری میز واہ۔ ارشاد نے لوہے کی اس پرانی، خراب و خستہ میز پر ہاتھ پھیرتے ہوئے، خوشی سے بھرپور لہجے میں کہا۔ یہ تو کمال دکھا گئی۔ اس میز نے تو ہمارا مسئلہ ہی حل کر دیا۔

بس اب آگے کی سوچو۔ رحمت علی نے کہا۔ رات میں ان لوگوں کے آنے کا اب کوئی امکان نہیں ہے۔ آئیں گے تو صبح کو ہی آئیں گے اور ہمیں ان کے خیر مقدم کے لیے تیار رہنا چاہیے۔

وہ دونوں آنے والوں کے خیر مقدم کے بارے میں سوچتے اور پروگرام بناتے رہے۔ انہیں یقین کے ساتھ یہ تو نہیں معلوم تھا کہ وہ لوگ ٹھیک کس وقت آئیں گے۔ تاہم، یہ اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ صبح کو جلدی ہی آ جائیں گے۔ آخر ان دونوں کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے اور وہ غسل خانے نہیں جا سکتے تھے۔ پانی تو انہیں شامو نے خوب بہت سا پلا دیا تھا اور انہوں نے خود بھی کافی پانی پیا تھا، کیونکہ کھانے کو تو انہیں کچھ بھی نہیں دیا گیا تھا۔

ان دونوں نے تھوڑی دیر تک سونے کا فیصلہ کیا، تاکہ علی الصباح وہ اپنی کارروائی کے لیے تیار رہیں۔ ان کو اب سونے اور جاگنے پر کافی حد تک قابو تھا۔ انہوں نے لاہور میں بھی تربیت کے حصول کے دوران ان ساری چیزوں کے بارے میں ہی سیکھا تھا۔

انہیں ٹھیک سے نیند نہیں آئی۔ ایک تو بھوک پریشان کر رہی تھی اور دوسرے اس بات کا ڈر تھا کہ کہیں وہ سوتے ہی نہ رہ جائیں۔

آخر اسی سونے جاگنے کی حالت میں رات گزر گئی اور ہو گئی۔ روشن دان سے صبح کا اجالا اندر آنے لگا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کمرے میں بلب ابھی تک روشن تھا۔ باہر سے کسی نے سوئچ بند نہیں کیا تھا۔

ان دونوں نے اپنی آنکھوں اور چہروں پر پانی کے چھینٹے مارے اور خود کو پوری طرح سے چاق و چوبند کر لیا۔ اب وہ اپنی پہلے سے سوچی سمجھی کارروائی کے لیے تیار تھے۔ انہوں نے سب کچھ آپس میں طے کر لیا تھا کہ انہیں کیا کرنا ہے۔

وہ دونوں بند دروازے کے دونوں کونوں کے پاس الگ الگ کھڑے ہو گئے۔ ارشاد دائیں کواڑ کے پاس کھڑا ہوا اور رحمت علی بائیں کواڑ کے پاس۔ ان دونوں کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ وہ خالی ہاتھ تھے۔ اس کمرے میں بھی کوئی ایسی چیز نہیں تھی جسے وہ ہتھیار کے طور پر استعمال کر سکتے۔ انہیں اپنے خالی ہاتھوں سے ہی کام لینا تھا اور ہتھیاروں کی کمی پوری کرنی تھی۔

کافی دیر گزر گئی۔ روشن دان سے آنے والی صبح کی روشنی میں برابر اضافہ ہو رہا تھا اور کمرے میں جلنے والے بلب کی روشنی مدھم پڑتی جا رہی تھی۔

اچانک بلب بجھ گیا۔

رحمت علی اور ارشاد نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو پیغام دیا۔ دونوں کے اعصاب تن گئے۔ فیصلہ کن وقت قریب آ رہا تھا۔ کارروائی کا وقت قریب آ رہا تھا۔

دونوں ہمہ تن گوش تھے۔ ان کی ساری قوتیں، قوت سماعت میں ڈھل گئی تھیں اور وہ ہر ہلکی سے ہلکی آہٹ کو بھی سننے کے لیے تیار اور عمل کے لیے مستعد تھے۔

پھر انہوں نے آہٹیں سنیں..... ایک سے زیادہ قدموں کی آہٹیں..... کوئی آ رہا تھا..... ایک سے زائد لوگ ادھر آ رہے تھے۔

ان دونوں کی سماعت انہیں بتا رہی تھی کہ آنے والے دو افراد تھے..... یہ دو افراد کے قدموں کی چاپ تھی۔

تو پھر ترتیب اس طرح ہونی چاہیے کہ آگے آگے شامو اور اس کے پیچھے بندوق بردار مستان خاں..... جس طرح کہ اب تک وہ آتے رہے تھے۔

دروازے کی کنڈی کی کھڑکھڑاہٹ سنائی دی۔ وہ دونوں اپنی اپنی پشت پر دیوار سے بالکل چپک کر کھڑے ہو گئے۔

کنڈی کھلی اور پھر دروازہ کھلا۔ دونوں پٹ ایک ساتھ کھل گئے اور ارشاد اور رحمت علی، ان کھلے ہوئے پٹوں کے پیچھے چھپ کر آنے والوں کی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ آنے والے اب اس وقت تک ان کو نہیں دیکھ سکتے تھے جب تک کہ اتنا آگے نہ آ جائیں کہ پٹوں سے آگے بڑھ آئیں اور پھر گھوم کر پیچھے دیکھیں۔

کہاں گئے دونوں۔ ارشاد اور رحمت علی نے شامو کی آواز سنی، جس میں حیرت کا عنصر شامل تھا۔ کمرے میں نہیں ہیں۔

غسل خانے میں ہوں گے۔ دوسری آواز مستان خاں کی تھی۔ اور کہاں جائیں گے۔ اس کے ساتھ شامو آگے آ گیا۔ ان دونوں نے شامو کو آگے بڑھتے دیکھا اور اس کے پیچھے پیچھے مستان خاں بھی آیا، جس کے ہاتھ میں گن تھی۔

مستان خاں کے سر پر پڑنے والا گھونسا اتنا زوردار تھا کہ اس کی آنکھوں کے آگے تارے ناچنے لگے۔ اس کو ایسا لگا جیسے کسی نے اس کے سر پر ایک پورا پہاڑ اٹھا کر دے مارا ہو۔

ارشاد نے اپنے دونوں ہاتھوں کو آپس میں ملا کر مستان خاں کے سر پر جو بھاری ضرب لگائی تھی۔ اس نے مستان خاں کو بے ہوش کر دیا۔ زمین پر گرتے گرتے وہ اس شخص کو ٹھیک سے دیکھ بھی نہیں سکا جس نے اس کے سر پر یہ عذاب نازل کیا تھا۔ اس کو تو بس ایسا لگا جیسے اس کے سر کے اوپر اور اندر گولے پھٹنے لگے ہوں۔

شامو آگے تھا اور مستان خاں اس کے پیچھے۔ ارشاد نے اچھل کر پھرتی سے مستان خاں کے سر پر دونوں

ہاتھوں سے ضرب لگا کر اس کو گرا دیا اور عین اسی لمحے رحمت علی نے مستان خاں کے ہاتھ سے گن چھین لی

گن اب رحمت علی کے ہاتھ میں تھی اور اس کا رخ شامو کے سینے کی طرف تھا۔

شامو کے لیے یہ سب کچھ سمجھنا بہت مشکل تھا۔ اس کے تو حواس ہی گم ہو کر رہ گئے تھے۔ وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ جب تک وہ کچھ سمجھنے کے قابل ہو سکے۔ اس وقت تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ مستان خاں ایک دھماکے کے ساتھ زمین پر گرا پڑا تھا اور صمد گن ہاتھ میں لیے ہوئے اس کے سامنے کھڑا ہوا شعلہ بار نگاہوں سے اسے گھور رہا تھا۔

ہاتھ اوپر..... کتے کی اولاد..... رحمت علی نے دانت پیس کر کہا۔ دونوں ہاتھ سر کے اوپر حرامزادے، ورنہ ابھی بھون کر رکھ دوں گا سور۔ اس کے ساتھ ہی اس نے گن کی نال کو ادھر ادھر ہلایا۔

تم..... تم گن چلانا جانتے ہو۔ شامو کی زبان سے حیرت کے عالم میں ایک نہایت احمقانہ جملہ ادا ہوا۔ وہ اس قدر پریشان ہو گیا تھا کہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے۔

بکواس بند کر..... دونوں ہاتھ سر پر رکھ..... ورنہ ابھی میں تجھ کو بتاؤں گا کہ بندوق کس طرح چلائی جاتی ہے۔

تعمیل حکم کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ شامو نے دونوں ہاتھ اپنے سر کے اوپر رکھ لیے۔

دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو جا۔ رحمت علی نے اس کو اگلا حکم دیا۔ منہ دیوار کی طرف۔ شاباش..... جلدی۔

اسی وقت ارشاد نے اس کو گردن سے پکڑ لیا اور دیوار کی طرف اس طرح دھکیلا کہ اس کا منہ دیوار کی طرف تھا۔ شامو نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔

ارشاد نے اس کو دیوار کے ساتھ لگا کر کھڑا کیا اور پھر اس کے دونوں ہاتھوں کو پکڑ کر کمر کے پیچھے لے آیا۔

رسی کمرے میں موجود تھی اور کافی تھی۔ ارشاد نے شامو کے دونوں ہاتھوں کو پیچھے کی طرف، آپس میں ملا کر انہیں اچھی طرح سے باندھ دیا۔ اس دوران رحمت علی، شامو کے علاوہ، مستان خاں پر بھی نظر رکھے رہا جو فرش پر سیدھا پڑا ہوا تھا۔

شامو کے دونوں ہاتھ پیچھے باندھنے کے فوراً بعد ارشاد نے اس کے دونوں ٹخنوں کو بھی ملا کر رسی باندھ دی اور اسے اسی طرح دیوار کے ساتھ کھڑا رکھا۔ شامو اب چل پھر نہیں سکتا تھا۔

شامو کو باندھنے کے بعد، ارشاد نے مستان خاں کے ہاتھ پیر بھی اسی طرح باندھ دیے۔ مستان خاں بالکل بے ہوش تھا۔ اس کے سر پر بہت زور کی چوٹ لگی تھی اور وہ بے حس و حرکت زمین پر پڑا ہوا تھا۔

کمرے کے دروازے کو رحمت علی نے آہستہ سے بند کر لیا تھا۔

ان دونوں نے مل کر مستان خاں کے بے ہوش جسم کو گھسیٹا اور اسے چارپائیوں کے نیچے ڈال دیا۔ مستان خاں ہوش میں آنے کے بعد بھی ان کے لیے فوری طور پر پریشانی کا باعث نہیں بن سکتا تھا، کیونکہ اس کی نقل و حرکت کرنے کی قوت بہت محدود ہو کر رہ گئی تھی۔

دیوار سے لگا ہوا، رسن بستہ شامو، اس وقت شدید پچھتاووں کا شکار تھا۔

اسے اس بات کا بالکل اندازہ نہیں تھا کہ جن نوجوانوں کو اس نے اور اس کے ساتھیوں نے معمولی درجے کے، بے سہارا، بے وقوف، مسکین اور لاوارث فقیروں کی حیثیت سے، دھوکے سے پکڑ کر اپنے قبضے میں کیا تھا، وہ اس قدر خوف ناک قسم کے لوگ ہوں گے۔ یہ ہرگز کوئی معمولی قسم کے فقیر نہیں تھے۔ بلکہ شاید فقیر ہی نہیں تھے۔ خدا جانے کیا تھے..... ان کے بارے میں جاننے میں سخت غلطی ہو گئی تھی۔ ان دونوں نے تو ایسی چالاکی اور ہوشیاری کا مظاہرہ کیا تھا کہ شامو اس طرح کی کارروائی کرنے کے بارے میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مشکل ہی سوچ سکتا تھا۔

لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ سارا معاملہ بہت بری طرح بگڑ چکا تھا۔ مشکل تو یہ تھی کہ وہ خادم علی کو بھی یہاں لے کر آ چکا تھا اور ان کے سامنے ہونے والی گفتگو کے ذریعے ان لوگوں کو معلوم ہو چکا تھا کہ ان کے عزائم کیا ہیں اور وہ اغوا کیے جانے والے دونوں افراد کے ساتھ کیا سلوک کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

بول حرام زادے، سور کی اولاد۔ ارشاد نے شامو کی گردن پکڑ کر اس کو ایک جھٹکا دیتے ہوئے کہا۔ کیا کرنا چاہتا تھا تو ہم لوگوں کے ساتھ۔ کون ہے یہ تیرا باپ خادم علی۔ کیا سودے بازی کی تھی تو نے اس کے ساتھ۔ بول..... نہیں تو ابھی تیرا گلا دبا کر تجھے یہیں اسی جگہ کتے کی موت ماروں گا۔

اس نے اپنی انگلیاں شامو کی گردن میں گاڑ دیں اور شامو کو ایسا لگا جیسے اس کی گردن میں لوہے کی سلاخیں گھسی جا رہی ہیں۔ اس کی گردن ٹوٹی جا رہی تھی۔ اس کو بڑے زور کی کھانسی اٹھی۔

بول..... بول..... ورنہ ابھی تیرا خاتمہ کر دوں گا۔ ارشاد نے اس کی گردن کو ایک اور زوردار جھٹکا دیا اور شامو کا پورا جسم کانپنے لگا۔ اس کا دم گھٹا جا رہا تھا اور اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اس کی جان نکل جائے گی۔

بتاتا ہوں۔ بتاتا ہوں۔ اس نے بری طرح سے کھانستے ہوئے کہا۔ میری گردن تو چھوڑو..... خدا کے واسطے۔

ارشاد نے اس کی گردن پر اپنی گرفت ذرا ڈھیلی کر دی۔ اب بول۔

خادم علی..... خادم علی..... فقیروں کا کاروبار کرتا ہے۔ شامو نے لرزتے ہوئے کہا۔

فقیروں کا کاروبار کیا۔ ارشاد نے پوچھا۔ صاف صاف بیان کر۔ کیا مطلب ہے اس بات کا۔

اس بات کا مطلب یہ ہے کہ اس کے پاس بہت سے فقیر ہیں جن سے وہ بھیک منگواتا ہے۔ شامو نے کہا۔ وہ سارے فقیر جو کچھ کماتے ہیں، وہ خادم علی اپنے قبضے میں رکھ لیتا ہے۔ یہ اس کا دھندہ ہے۔

اور فقیر۔ رحمت علی نے پوچھا۔ فقیر اس کو کچھ نہیں کہتے۔ وہ اس کو ایسا کرنے سے روکتے نہیں ہیں۔ اسے اس کی اجازت کیوں دیتے ہیں۔

اس میں اجازت دینے یا نہ دینے کا کوئی سوال نہیں ہے بھائی۔ شامو نے کہا۔ وہ فقیر خادم علی کی بات نہ مانیں تو کیا کریں۔ وہ خود سے تو کچھ کرنے کے لائق ہی نہیں ہیں اور خادم علی کے ہی محتاج ہیں۔

خادم علی کے محتاج کیوں ہیں۔ رحمت علی نے کہا۔ وہ اس سے علیحدہ رہ کر بھی تو بھیک مانگ سکتے ہیں۔ جب بھیک مانگنے پر ہی گزارا ٹھہرا، تو پھر اس کے لیے خادم علی کا سہارا لینے کی کیا ضرورت ہے۔

وہ ضرورت اس لیے ہے کہ یہ سب فقیر معذور ہیں۔ شامو نے بتایا۔ ان کو سہارے کی ضرورت ہے اور خادم علی ان کو سہارا فراہم کرتا ہے۔

تو اس نے سارے معذور فقیروں کو جمع کیا ہوا ہے۔ ارشاد نے کہا۔ کہاں سے لے آتا ہے وہ اتنے بہت سارے معذوروں کو۔

وہ معذوروں کو نہیں لاتا ہے۔ شامو نے جواب دیا۔ ایسے فقیر تو شاید دو ایک ہی ہوں گے جو اسے معذور حالت میں ملے۔ وہ تو صحت مند اور تندرست انسانوں کو معذور بناتا ہے۔

کیا۔ رحمت علی نے حیرت سے کہا۔ وہ تندرست انسانوں کو معذور بناتا ہے۔

ہاں۔ شامو نے جواب دیا۔ وہ تندرست انسانوں کو معذور بناتا ہے۔ وہ انسانوں کو خرید کر اپنے قبضے میں کر لیتا ہے اور پھر انہیں اپنی قید میں رکھ کر مختلف طریقوں سے ان کو معذور بناتا ہے۔ کسی آدمی کی آنکھ میں تیزاب ڈال کر اس کو اندھا کر دیا جاتا ہے، کسی کے ہاتھ پاؤں توڑ کر اس

کو ایسا اپاہج بنا دیا جاتا ہے کہ وہ کوئی کام کرنے کے لائق ہی نہیں رہتا۔ کسی کے چہرے کو تیزاب سے جھلسا کر اس کی شکل بگاڑ دی جاتی ہے۔ جو چھوٹے بچے ہوتے ہیں، ان میں سے اکثر کے ہاتھ پیروں کو موڑ کر، باندھ کر، ٹیڑھا میڑھا کر دیا جاتا ہے اور پھر وہ ساری زندگی ٹھیک نہیں ہو سکتے، نہ کوئی کام کر سکتے ہیں۔ وہ صرف بھیک مانگ کر ہی گزارا کر سکتے ہیں اور انہیں رہنے کے لیے کوئی جگہ چاہیے، کوئی ٹھکانا چاہیے..... کوئی سہارا چاہیے اور خادم علی انہیں یہ ساری چیزیں فراہم کرتا ہے۔ اس کے بدلے میں وہ ان سے ان کی کمائی ہوئی ساری رقم لے لیتا ہے۔

اف میرے خدا۔ رحمت علی نے سخت حیرت اور غصے کے عالم میں کہا۔ وہ صحت مند انسانوں کو معذور بناتا ہے..... اور بچوں کی زندگیاں تباہ کرتا ہے۔

ہاں صمد۔ شامو نے کہا۔ وہ ایسا ہی کرتا ہے۔ ہم لوگ تو ایسا کچھ نہیں کرتے، ہم تو صرف۔

تم صرف لوگوں کو اغوا کرتے ہو اور انہیں خادم علی اور اس جیسے دوسرے بدمعاشوں کے ہاتھ فروخت کرتے ہو۔ ارشاد نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ تم تو بڑے نیک اور اللہ والے لوگ ہو۔ تم بھلا کسی کو کیا تکلیف پہنچا سکتے ہو۔

ہم..... ہم لوگ کسی کو مارتے نہیں ہیں۔ شامو نے سہمی ہوئی آواز میں اپنی صفائی دینے کی کوشش جاری رکھی۔ ہم نہ کسی کو قتل کرتے ہیں، نہ کسی کے ہاتھ پیر توڑتے ہیں اور نہ ہی ہم کسی سے زبردستی بھیک منگواتے ہیں۔ یہ سارے کام تو خادم علی کرتا ہے۔

خادم علی ابھی کتنی دیر میں یہاں آئے گا۔ رحمت علی نے پوچھا۔ اور یہاں آنے کے بعد وہ کیا کرے گا۔

اور جو کچھ کہنا، سچ سچ کہنا۔ ارشاد نے اس کو دھمکی دی۔ اگر تم نے ایک لفظ بھی جھوٹ بولنے کی کوشش کی تو ہم یہیں تمہاری جان نکال لیں گے اور لاش کو چھوڑ کر چلے جائیں گے۔ تم خوب جانتے ہو کہ ہمیں ایسا کرنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔

نہیں، میں جھوٹ نہیں بولوں گا۔ خوف زدہ شامو نے کہا۔ میں تم کو سچ ہی بتاؤں گا۔ خادم علی اب دوپہر کو آئے گا..... وہ اپنے ساتھ گاڑی لے کر آئے گا۔

گاڑی۔ ارشاد نے تعجب سے پوچھا۔ کیا اس کے پاس گاڑی ہے۔ یا وہ کسی سے مانگ کر لائے گا۔

نہیں۔ شامو نے کہا۔ اس کے پاس ایک پرانی سوزوکی ہے، جو دیکھنے میں تو پرانی ضرور ہے لیکن بہت اچھی اور مضبوط گاڑی ہے۔ وہ اسے فقیروں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لانے لے جانے کے لیے استعمال کرتا ہے۔ وہ گاڑی لے کر آئے گا اور تم دونوں کو اپنے اڈے پر لے جائے گا۔

ایسے کیسے لے جائے گا۔ ارشاد نے پوچھا۔ ہم بھاگ بھی تو سکتے ہیں۔ کیا وہ یہ بات نہیں جانتا۔

خوب جانتا ہے۔ شامو نے کہا۔ اسی لیے وہ تم لوگوں کو بے ہوشی کی حالت میں یہاں سے لے جائے گا۔ یہاں سے لے جانے سے پہلے ہم دونوں کو بے ہوش کر دیا جائے گا اور پھر اٹھا کر گاڑی میں ڈال دیا جائے گا۔

ہم لوگ اس وقت کہاں ہیں۔ رحمت علی نے پوچھا۔ گجرانوالہ میں ہی ہیں، یا کسی دوسرے شہر میں۔ کسی اور جگہ۔

ہم گجرانوالے کے پاس ایک ڈیرے میں ہیں۔ شامو نے جواب دیا۔ یہ ڈیرہ ہمارا ہے۔

ہمارے سے تمہاری کیا مراد ہے۔ رحمت علی نے پوچھا۔ اس جگہ کا مالک کون ہے۔ اور اس وقت یہاں تمہارے علاوہ اور کون کون لوگ ہیں۔

یہ جگہ وریام اور لاکھو کی ملکیت ہے۔ شامو نے کہا۔ اور میں ان کا ساتھی ہوں۔ ہم لوگ اس جگہ کو صرف اس وقت استعمال کرتے ہیں جب ہمیں کسی کو یہاں قیدی بنا کر رکھنا ہوتا ہے۔ ورنہ عام دنوں میں یہاں صرف مستان خاں رہتا ہے اور وہی اس جگہ کی دیکھ بھال کرتا ہے۔

اور وہ باقی لوگ۔ وہ عورتیں اور لڑکیاں وغیرہ۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہم باقی لوگوں کو یہاں نہیں لاتے۔ شامو نے کہا۔ کیونکہ اس میں خطرہ ہے۔ ہم سب لوگ مستقل طور پر شیخوپورے میں رہتے ہیں۔ ہماری عورتیں بھی وہیں رہتی ہیں۔ ویسے، زیادہ تر تو ہم لوگ گھومتے پھرتے ہی رہتے ہیں۔

اس وقت اس مکان میں تمہارے علاوہ اور کون کون ہے۔ ارشاد نے پوچھا۔

مستان خاں تمہارے سامنے ہی پڑا ہوا ہے۔ شامو نے جواب دیا۔ وریام باہر گیا ہوا ہے اور دوپہر سے ذرا پہلے آجائے گا۔ لاکھو یہیں موجود ہے۔ وہ دوسرے کمرے میں سو رہا ہے۔

اور عورتیں۔ اور باقی لوگ۔ ارشاد نے پوچھا۔ وہ سب کہاں ہیں۔۔

وہ سب لوگ درگاہ شریف پر ہیں۔ شامو نے جواب دیا۔ وہ یہاں نہیں آئیں گے۔

ٹھیک ہے۔ ارشاد نے کہا۔ اب ہم وریام کو بھی یہیں لے آتے ہیں۔ تاکہ تم تینوں آدمی ایک ہی جگہ اکٹھے ہو جاؤ۔

انہوں نے مستان خاں اور شامو کو خوب اچھی طرح سے رسیوں میں جکڑ رکھا تھا اور اس بات کا کوئی امکان نہیں چھوڑا تھا کہ ان میں سے کوئی بھی رسی کھول کر اپنے آپ کو آزاد کرا سکے۔ مستان خاں کو، جو کہ ابھی تک بے ہوش پڑا ہوا تھا، ہلکا ہلکا ہوش آنا شروع ہو گیا تھا اور وہ خالی خالی، حیران حیران آنکھوں سے اپنے اردگرد کے ناقابل یقین منظر کو دیکھ رہا تھا۔

کمرے سے باہر نکلنے سے پہلے، انہوں نے شامو اور مستان خاں کی اچھی طرح سے تلاشی بھی لی۔ ان کے قبضے سے کوئی آتشیں ہتھیار برآمد نہیں ہوا۔ البتہ شامو کی جیب میں سے ایک چاقو برآمد ہوا، جسے باآسانی آلہ قتل کے طور پر استعمال کیا جا سکتا تھا۔ ان لوگوں نے اس چاقو کو فوراً ہی اپنے قبضے میں کر لیا۔ مستان خاں کی گن تو پہلے ہی ان کے قبضے آ چکی تھی۔

اچھا..... تو اب یہ بتاؤ شامو کہ لاکھو کون سے کمرے میں سو رہا ہے۔ ارشاد نے کہا۔ ہمیں اس مکان اور اس کے کمروں کے بارے میں کچھ نہیں معلوم ہے۔ ذرا ٹھیک ٹھیک بتانا۔

شامو نے ان کو اس کمرے کے بارے میں بتا دیا جس میں لاکھو سو رہا تھا۔

یہ بات اچھی طرح سے ذہن میں رکھنا کہ اگر کوئی حرامی پن کرنے کی کوشش کی تو یہاں تمہاری لاشیں پڑی نظر آئیں گی۔ ارشاد نے گن کی نال کو ان دونوں کی طرف لہراتے ہوئے کہا۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ ہم تمہارے ساتھ کوئی رعایت نہیں کریں گے۔

اس کے ساتھ ہی ارشاد اور رحمت علی اس کمرے سے باہر نکل آئے۔ احتیاطاً انہوں نے کمرے کے دروازے کو باہر سے بند کر دیا تھا۔

کمرے سے باہر نکل کر انہوں نے اپنے آپ کو ایک دالان میں پایا، جس میں کئی کمرے تھے اور سامنے کا حصہ کھلا ہوا تھا جس کے آگے کچا صحن تھا۔ وہ لوگ جس کمرے سے نکل کر آئے تھے اس کے دائیں جانب ایک کمرا تھا اور ایک کمرا اس کے بائیں جانب تھا۔ لاکھو کو بائیں جانب والے کمرے میں ہونا چاہیے تھا۔

انہوں نے پورے مکان کا تفصیلی جائزہ لینے سے پہلے، لاکھو کو اپنے قبضے میں کرنے کا فیصلہ کیا۔

دالان میں انہیں ایک موٹا سا ڈنڈا کونے میں رکھا ہوا مل گیا۔ خاصا بھاری بھرکم ڈنڈا تھا اور اس کی ایک ہلکی سی ضرب ہی آدمی کے سر کو پھوڑ سکتی تھی۔ رحمت علی نے لپک کر وہ ڈنڈا اٹھا لیا۔

اچھا ہے۔ اس نے مسکرا کر ارشاد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ کام آئے گا۔

ہاں۔ ارشاد نے ہنس کر کہا۔ مگر زیادہ زور سے مت مارنا کسی کے۔ ورنہ وہ وہیں ختم ہو جائے گا۔

ہو جانے دو۔ رحمت علی نے ہنس کر کہا۔ اچھا ہے۔ ایک اور مجرم جہنم رسید ہو جائے گا۔

رحمت علی کی بات ابھی ختم ہوئی ہی تھی اور ایک دم اس کمرے کا دروازہ کھلا جس میں لاکھو کو ہونا چاہیے تھا اور لاکھو اس دروازے کے پیچھے نظر آیا۔

لاکھو کی آنکھوں میں نیند بھری ہوئی تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ ان لوگوں کی آوازیں سن کر اچانک سوتے سے بیدار ہو گیا ہو۔ اس نے جیسے ہی ان دونوں کو دیکھا، اس کے چہرے پر شدید حیرت اور خوف کے آثار ظاہر ہو گئے۔ اس کی آنکھیں ایک دم پھیل گئیں۔

تم..... تم..... اس نے سخت گھبراہٹ کے عالم میں کہا۔ اس کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔ تم لوگ باہر کیسے آ گئے۔ شامو کہاں ہے۔

شامو وہیں ہے جہاں اسے ہونا چاہیے حرام زادے۔ ارشاد نے اس کی بات کا جواب دیتے ہوئے اچھل کر اس کی گردن پکڑ لی۔

لاکھو خود بھی ایک تندرست و توانا آدمی تھا اور جسمانی طور پر کافی مضبوط تھا۔ لیکن ارشاد کے آہنی ہاتھوں میں گردن کے جکڑ لیے جانے کے باعث وہ جیسے بالکل بے بس ہو گیا۔ وہ اپنے آپ کو آزاد کرانے کی جدوجہد کر رہا تھا، لیکن ارشاد کی گرفت سے نکلنا اس کے لیے ناممکن تھا اور رحمت علی نے تو ابھی اس کو ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا۔ وہ تو پاس ہی کھڑا ہوا خاموشی سے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔

میری گردن..... اقبال..... میری گردن..... لاکھو سخت بدحواسی اور سراسیمگی کے عالم میں پریشان ہو کر زور زور سے کھانسنے لگا۔ اس کا دم گھٹا جا رہا تھا۔ میری گردن چھوڑ دو اقبال..... لاکھو سے بڑی مشکل سے بولا جا رہا تھا۔

باندھو کتے کے بچے کو۔ ارشاد نے رحمت علی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور رحمت علی نے ادھر ادھر دیکھ کر ایک جانب پڑا ہوا کپڑے کا ایک ٹکڑا اٹھا لیا۔ یہ کپڑا ایسا تھا جیسے کسی عورت کا دوپٹہ۔ یہ نائلون کا تھا اور بہت مضبوط تھا۔

رحمت علی نے لاکھو کے دونوں ہاتھوں کو پیچھے کی طرف کر دیا اور انہیں اس کی پشت پر رکھ کر آپس میں ملا کر خوب کس کے باندھ دیا۔ کپڑا کافی تھا۔ لاکھو کے ہاتھ باندھنے کے بعد بھی کافی کپڑا بچ رہا تھا۔

تم لوگوں نے شامو کے ساتھ کیا کیا۔ لاکھو نے خوفزدہ آواز میں کہا۔ اور مستان خاں کہاں ہے۔ یہ گن تو..... یہ گن..... مستان خاں کی ہے۔ تمہارے پاس کس طرح آ گئی۔

گدھے کی دم، اپنا حشر دیکھنے کے باوجود تمہاری کھوپڑی میں یہ بات نہیں آ رہی ہے کہ یہ گن میرے پاس کس طرح سے آ گئی۔ ارشاد نے اس کے ایک ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ تم کیا سمجھتے ہو، ہم لوگ کوئی موم کے بنے ہوئے ہیں جو یوں آسانی کے ساتھ تمہارے ہاتھوں مارے جائیں گے۔ تم جیسے بدمعاشوں سے نمٹنا ہمیں اچھی طرح سے آتا ہے۔

اس کے ساتھ ہی اس نے لاکھو کو آگے کی طرف دھکیلا۔ چلو..... آگے چلو..... چلو اپنے باپوں کے پاس چلو۔

ارشاد کے ہاتھ میں گن تھی اور رحمت علی کے ہاتھ میں بھاری ڈنڈا اور لاکھو کے دونوں ہاتھ پیچھے بندھے ہوئے تھے۔ اسی حالت میں وہ اس کو دھکیلتے ہوئے اس کمرے کے دروازے تک آ گئے جس میں سے وہ ابھی نکل کر گئے تھے۔ دروازے کی کنڈی باہر سے بند تھی، جسے رحمت علی نے آگے بڑھ کر کھول دیا۔

مستان خاں اور شامو اسی حالت میں موجود تھے جس حالت میں وہ لوگ انہیں چھوڑ کر گئے تھے۔ دونوں رسیوں سے بندھے ہوئے تھے۔ البتہ مستان خاں کو اب پورے طور پر ہوش آ چکا تھا۔ ان دونوں کو کمرے کے اندر آتا دیکھ کر مستان خاں کی آنکھوں میں خوف کے سائے لہرانے لگے۔ ان دونوں کے ساتھ لاکھو بھی آ رہا تھا،

اس کے دونوں ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔

تینوں دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑے ہو گئے اور اس کے بعد ارشاد کی ہدایت پر رحمت علی نے انہی پگڑیوں کی ٹانگوں کو آپس میں ملا کر باندھ دیا۔ اس طرح اب ان میں سے کوئی بھی الگ الگ نہیں چل سکتا تھا۔ ویسے بھی، ان میں سے کسی کے لیے چلنا بے حد دشوار تھا کیونکہ ہر شخص کی دونوں ٹانگیں بھی آپس میں بندھی ہوئی تھیں۔ اس کے علاوہ، تینوں کی ٹانگیں بھی آپس میں بندھی ہوئی تھیں۔

اب ہم ذرا تمہارے اس مکان کا جائزہ لے لیں، اس کے بعد آ کر تم سے اچھی طرح نمٹیں گے۔ ارشاد نے کہا اور وہ اور رحمت علی، دونوں کمرے سے باہر نکل گئے۔

مزید احتیاط کی غرض سے انہوں نے ان تینوں کے پیروں میں مشترکہ طور پر بندھی ہوئی رسی کے ایک سرے کو چارپائی کے ساتھ مضبوط سے باندھ دیا تھا۔ رسی کی کمی نہیں تھی۔

وہ دونوں اس کمرے سے باہر نکل آئے اور انہوں نے دروازے کو باہر سے بند کر دیا۔ اس کے بعد انہوں نے مکان کی اچھی طرح سے چھان بین شروع کر دی۔

انہیں مکان میں اور کوئی شخص نہیں ملا۔ شامو نے ان سے جھوٹ نہیں بولا تھا۔ مکان کی تلاشی کے دوران انہیں کوئی خاص چیز نہیں ملی۔ البتہ ایک کمرے سے انہیں ایک ریوالور ضرور ملا اور اس کی ساتھ کچھ گولیاں بھی۔ انہوں نے فوراً ہی اس ہتھیار پر قبضہ کر لیا۔ ایک گن تو ان کے پاس پہلے سے ہی موجود تھی۔ اس کے بعد وہ دوبارہ اس کمرے میں واپس آ گئے۔

اچھا، تو اب ذرا شروع ہو جاؤ۔ کمرے میں آنے کے بعد ارشاد نے بہ یک وقت ان تینوں سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ اپنے بارے میں، اپنے گروہ کے بارے میں، اپنے کاروبار کے بارے میں اور خادم علی کے بارے میں ہمیں سب کچھ بتاؤ..... اور جو کچھ ہم پوچھتے جائیں۔ ہمیں ٹھیک ٹھیک بتاتے جاؤ اور اگر ایک لفظ بھی جھوٹ بولے تو گولی سینے کے پار ہو گی۔ ہمارے ہاتھوں میں ہتھیار ہیں۔ وہ ہمارے نہیں، تمہارے ہیں اور تمہارے ہی خلاف استعمال کیے جائیں گے۔

مگر پہلے تم ہمیں ایک بات بتاؤ اقبال۔ لاکھو نے ارشاد کو تیز سوالیہ نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔ تم کون ہو۔ ہم لوگوں نے تو تم کو اور صمد کو فقیر سمجھ کر پکڑا تھا۔ تم دونوں تو فقیر تھے۔ مگر تم ہمیں فقیر نہیں معلوم ہوتے۔

کیوں۔ ارشاد نے کہا۔ ہم تم کو کیوں فقیر معلوم نہیں ہوتے۔ ایسی کون سی بات دیکھ لی تم نے ہمارے اندر۔

فقیروں کے اندر ایسا حوصلہ اور اتنی بہادری نہیں ہوتی۔ لاکھو نے کہا۔ تم دونوں تو بندھے ہوئے تھے۔ مگر تم نے نہ جانے کس طرح سے اپنے آپ کو آزاد کرایا اور مستان خاں اور شامو جیسے آدمیوں کو اپنے قابو میں کر لیا۔ نہیں..... یہ کام فقیروں کا نہیں ہو سکتا۔ فقیر ایسا کام نہیں کر سکتے۔

ایک بات بتاؤ لاکھو۔ ارشاد نے کہا۔ تم فقیر ہو نا۔

ہاں۔ لاکھو نے جواب دیا۔ میں فقیر ہوں۔

اور تمہارے دوسرے ساتھی..... شامو اور وریام وغیرہ..... وہ بھی تو فقیر ہی ہیں نا۔

ہاں، وہ بھی فقیر ہیں۔ لاکھو نے کہا۔

لیکن تم لوگ کیسے فقیر ہو۔ ارشاد نے کہا۔ تم تو انسانوں کو اغوا کرتے ہو۔ انہیں دھوکا دے کر اپنے قبضے میں کرتے ہو۔ پھر انہیں بیچتے ہو۔ انہیں معذور بناتے ہو..... یہ سارے کام کرتے ہو تم لوگ..... تو کیا تم واقعی فقیر ہو۔ فقیر کا کام تو صرف بھیک مانگنا ہوتا ہے۔ وہ تو لوگوں سے راہ خدا میں بھیک، خیرات، زکوٰۃ، صدقہ مانگتا ہے۔ اس کا ایسے کاموں سے کیا تعلق جیسے کام کہ تم لوگ کرتے ہو۔

معلوم نہیں بھائی۔ لاکھو نے پہلو بچاتے ہوئے کہا۔ مگر ہم اصل میں تو فقیر ہی ہے۔

نہیں لاکھو..... یہ سب غلط اور جھوٹ ہے۔ ارشاد نے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کہا۔ تم فقیر نہیں ہو۔ تم لوگ مجرم اور بدمعاش ہو۔ تم نے فقیری کا لبادہ اوڑھ رکھا ہے اور اس لبادے میں تم بردہ فروشی کا کاروبار کرتے ہو۔

بہت سے فقیر ایسا کرتے ہیں۔ لاکھو نے کہا۔ ہم لوگ اکیلے تو نہیں ہیں اس میدان میں۔ نہ جانے اور کتنے لوگ یہی دھندہ کر رہے ہیں۔

ٹھیک ہے۔ ارشاد نے کہا۔ تو اب اپنے بارے میں تفصیلات بتاؤ۔

ارشاد اور رحمت علی کے سوالوں کے جواب میں لاکھو اور اس کے دونوں ساتھیوں نے اپنے بارے میں بہت سے اہم انکشافات کیے۔

لاکھو، دریام اور شاموکا گروہ بنیادی طور پر بچوں سمیت انسانوں کو اغوا کرنے اور انہیں اپنے قبضے میں لینے والوں کا گروہ تھا۔ بنیادی طور پر یہ لوگ فقیر بنے رہتے تھے اور پوری ٹولی ادھر سے ادھر گھومتی رہتی تھی۔ ان کا صدر مقام شیخوپورہ تھا جہاں یہ سارے لوگ ایک بڑے سے مکان میں رہتے تھے اور جس جگہ یہ لوگ رہتے تھے، وہاں کے دوسرے رہنے والے ان کو محض فقیروں کے طور پر جانتے تھے، جبکہ یہ بردہ فروش تھے۔

ان کے خریداروں میں خادم علی کے علاوہ کچھ اور خریدار بھی شامل تھے جو ان سے انسانوں کو اور بچوں کو خریدتے تھے اور پھر ان کو اپنی مرضی اور ضرورت کے سانچے میں ڈھال کر ان سے کام لیتے تھے۔ زیادہ تر انسانوں کو تو بھیک منگوانے کے لیے ہی استعمال کیا جاتا تھا اور اس غرض سے ان کے صحیح وسالم اور صحت مند جسموں کی توڑ پھوڑ کی جاتی تھی۔ انہیں معذور، لنگڑا لولا، اندھا کانا اور ٹیڑھا میڑھا بنا کر بالکل ناکارہ کر دیا جاتا تھا۔ پھر یہ لوگ کسی کام کے نہیں رہ جاتے تھے۔ حتیٰ کہ خود اپنے کام کے بھی نہیں۔ یہ صرف بھیک مانگ سکتے تھے اور معذوری کی زندگی گزار سکتے تھے اور اس کے لیے انہیں کسی نہ کسی سہارے کی ضرورت ہوتی تھی۔ انہیں یہ سہارا ان کے مالک فراہم کرتے تھے، جو ان سے دن بھر بھیک منگواتے تھے اور ان کی کمائی ہوئی رقم پر خود قبضہ کر کے بیٹھ جاتے تھے۔

ان لوگوں نے بتایا کہ یہ اب تک بہت سے بچوں، نوجوانوں کو اور بڑی عمر کے لوگوں کو بھی، اغوا کر کے مختلف گروہوں کے ہاتھوں فروخت کر چکے ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ تم لوگوں نے اب تک سیکڑوں گھروں کو اجاڑ دیا ہے۔ رحمت علی نے شعلہ بار نگاہوں سے ان تینوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

ان میں سے کسی نے رحمت علی کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ تینوں خاموش رہے۔

کتنے معصوم بچوں کو تم نے ان کے ماں باپ سے جدا کیا۔ رحمت علی نے بہ دستور شعلہ بار نگاہوں سے ان کو گھورتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔ ان بچوں کی زندگیاں بھی برباد کیں اور ان کے والدین کو بھی زندگی بھر کے عذابوں میں مبتلا کیا۔ تم لوگوں کو کبھی اس بات کا احساس نہیں ہوا کہ تم کیا کر رہے ہو اور جو کچھ تم کر رہے ہو، وہ کس قدر قابل نفرت ہے۔

اللہ تعالیٰ نے جن لوگوں کو سالم ہاتھ پیروں کے ساتھ ٹھیک ٹھاک حالت میں پیدا کیا، تم نے ان کو لنگڑا لولا اور اپاہج بنا دیا..... بھلا اس ظلم کی کوئی انتہا ہے۔

سب کچھ قسمت سے ہوتا ہے اقبال۔ لاکھو نے کہا۔ جس کی قسمت میں جو لکھا ہوتا ہے، وہی ہوتا ہے۔ کوئی کسی کو نہیں مارتا۔ سب کچھ اوپر والے کی مرضی سے ہوتا ہے۔

ذلیل بے غیرت۔ ارشاد نے دانت پیس کر کہا۔ شرم نہیں آتی، اپنے گناہوں اور بدمعاشیوں کے لیے تقدیر کو ذمے دار قرار دیتا ہے۔ خدا کے بندوں کو آزار پہنچاتا ہے اور اسے تقدیر کا نام دیتا ہے۔ اب ہم تجھے اچھی طرح سے بتائیں گے کہ تقدیر کیا ہوتی ہے۔

ان دونوں نے ان لوگوں سے خاصی معلومات حاصل کر لیں، ان کے اپنے کام کے بارے میں بھی اور خادم علی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے کام کے بارے میں بھی اور پھر وہ دونوں کمرے سے باہر نکل آئے۔ انہیں تازہ ترین صورت حال میں کچھ اہم فیصلے کرنے تھے۔ ابھی ذرا دیر کے بعد دریام بھی آنے والا تھا اور اس کے بعد خادم علی بھی..... مجرموں کی تعداد تو اچھی خاصی تھی۔ ابھی تین مجرم موجود تھے اور دو مزید آنے والے تھے۔ اس طرح وہ کل پانچ ہو جاتے، جبکہ یہ تو صرف دو تھے۔

انہوں نے باہر جا کر آپس میں کچھ دیر تک مشورہ کیا۔ جو کچھ کرنا تھا۔ وہ بہت سوچ سمجھ کر اور ہوشیاری کے ساتھ کرنا تھا۔

ان منحوسوں کا اصل علاج تو یہ ہے کہ ان کے بھی ہاتھ پیر توڑ کر انہیں معذور بنا دیا جائے، تاکہ یہ زندگی بھر دوسروں کے سہارے کے محتاج رہیں اور دوسروں سے رحم اور مدد کی بھیک مانگنے پر مجبور ہوں۔ ارشاد نے کہا۔ اور اس طرح ان کی زندگی موت سے بھی بدتر ہو جائے۔ مگر شاید یہ سب کچھ کرنا ٹھیک نہیں ہوگا۔ ان کے لیے بھی اور ہمارے لیے بھی۔ اس طرح وہ ایک مسلسل عذاب میں مبتلا رہیں گے..... اور پھر..... انہوں نے ہماری شکلیں بھی دیکھ لی ہیں۔ ہمیں پہچان بھی لیا ہے۔

پھر..... پھر ہمیں ان کے ساتھ کیا کرنا چاہیے۔ رحمت علی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

اگرچہ انہوں نے تو دوسرے بے شمار لوگوں کو مسلسل عذاب میں مبتلا رکھا ہے۔ مگر ہمیں ان کے ساتھ ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ ہمیں ان کو ایک ہی بار سارے عذابوں سے نجات دلا دینا چاہیے۔ اس نے معنی خیز نظروں سے رحمت علی کی طرف دیکھا۔

رحمت علی اس کا مطلب پوری طرح سمجھ چکا تھا اور اس کو اس سے پورا اتفاق بھی تھا۔

کچھ اور پوچھنا ہے ان لوگوں سے۔ رحمت علی نے پوچھا۔

میرے خیال میں اب اس کی ضرورت نہیں ہے۔ ارشاد نے کہا۔ دیکھو نا، ان جیسے اور خادم علی جیسے اور نہ جانے کتنے لوگ ہیں۔ ساری دنیا ایسے لوگوں سے بھری پڑی ہے۔ ہم کہاں کہاں، کس کس سے نمٹتے پھریں گے۔ ہم ساری دنیا کو تو سیدھا نہیں کر سکتے نا۔ بس، جس حد تک تھوڑا بہت، جو ہم سے ہو سکتا ہے۔

ہاں ٹھیک ہے۔ رحمت علی نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ اور اسی لیے اب زیادہ پوچھ گچھ کرنے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ کیا کریں گے اور زیادہ لوگوں کے بارے میں معلوم کر کے۔

ان دونوں نے آپس میں کچھ دیر تک مزید بات چیت کی، اس کے بعد وہ دروازہ کھول کر دوبارہ اسی کمرے میں آ گئے جہاں انہوں نے ان تینوں افراد کو بند کر رکھا تھا۔

اندر داخل ہونے کے بعد ان دونوں نے ان لوگوں سے کوئی بات نہیں کی۔ اب کسی بات چیت کی ضرورت نہیں تھی۔

رحمت علی نے ریوالور سے گولیاں چلا دیں اور ان تینوں کو باری باری نشانہ بنایا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ تینوں خاک وخون میں لتھڑ کر ڈھیر ہو گئے۔

ان تینوں کے لیے شاید اپنا یہ انجام غیر متوقع تھا۔ یا اگر انہیں اس انجام کی توقع بھی تھی، تو بھی اتنی جلدی کی توقع نہیں تھی۔ ان کا شاید یہ خیال تھا کہ یہ لوگ دریام اور خادم علی کے آنے کا انتظار کریں گے لیکن انہوں نے تو ایسا کچھ بھی نہیں کیا۔ بس، ایک دم گولی چلا دی۔

کمرے کا فرش خون سے لالہ زار ہو گیا۔ وہ تینوں بے سدھ ہو کر فرش پر اس طرح گرے ہوئے تھے کہ ان کے جسم آپس میں الجھ گئے تھے۔ چونکہ وہ تینوں آپس میں بندھے ہوئے تھے، اس لیے وہ بری طرح الجھ گئے تھے۔

ہم نے ان پر بہت رحم کیا ہے۔ ارشاد نے کہا۔ بڑی رعایت کی ہے ہم نے ان کے ساتھ، جو ان کو ایک ہی جھٹکے میں ختم کر دیا۔ اس طرح یہ لوگ ساری اذیتوں سے نجات پا گئے۔ اگر ہم ان کو زندہ رہنے کا موقع دیتے تو ان

کی زندگی بہت ہی خراب گزرتی۔ یہ ان سیکڑوں معذور لوگوں کی طرح بھیک مانگتے پھرتے جنہیں معذور بنانے میں ان کا حصہ ہے۔

ہاں۔ رحمت علی نے کہا۔ ہم نے ان کے ساتھ واقعی بہت رعایت کی ہے۔ یہ لوگ تو اس سے کئی گنا زیادہ کڑی اور دردناک سزا کے مستحق تھے۔ ہم نے ان کے ساتھ بہت زیادہ رعایت کی ہے۔

اچھا ہوا، ہم نے ان کو جہنم رسید کر دیا۔ ارشاد نے کہا۔ اب یہ اپنی ذلیل کارروائیوں کو مزید جاری نہیں رکھ سکیں گے۔ ہم نے بہت سارے انسانوں کو ان خبیثوں کے عذاب سے بچا دیا ہے۔

وہ دونوں کچھ دیر تک اس کمرے میں موجود رہے اور پھر کمرے سے باہر نکل آئے۔ انہوں نے کمرے کی تلاشی پہلے ہی لے لی تھی اور اسے اچھی طرح کھنگال ڈالا تھا۔ یہاں انہیں کوئی بھی کام کی چیز نہیں ملی تھی۔ ان تینوں کے لباسوں کی تلاشی بھی وہ لے چکے تھے۔

کمرے سے باہر آنے کے بعد انہوں نے دروازے کی کنڈی لگا دی اور احتیاطاً پورے مکان کا ایک بار پھر جائزہ لے لیا۔

وہ ابھی تک اس گھر سے باہر نہیں نکلے تھے اور انہیں نہیں معلوم تھا کہ وہ اس وقت کہاں ہیں اور اس مکان کے باہر کیا ہے۔ انہیں صرف اتنا معلوم تھا کہ وہ گجرانوالہ کے مضافات میں کہیں پر ہیں۔

باہر نکلنے کا فیصلہ کرنے سے پہلے انہوں نے باہر کے حالات کا ایک سرسری جائزہ لینے کا فیصلہ کیا۔

گھر میں ایک کچا زینہ تھا جو چھت پر جاتا تھا۔ چھت پر کچھ نہیں بنا ہوا تھا۔ اس کا اندازہ انہیں صحن میں کھڑے ہو کر اوپر دیکھنے سے ہی ہو گیا تھا۔ تاہم، ایک اونچی سی منڈیر ضرور تھی جو چھت کے چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔

وہ دونوں زینے پر چڑھ کر چھت کے اوپر پہنچ گئے اور انہوں نے یہ احتیاط برتی کہ وہ سیدھے کھڑے ہو کر چھت پر نہیں گئے۔ اس میں اس بات کا خطرہ تھا کہ انہیں کسی طرف سے دیکھ لیا جاتا۔ وہ دونوں جھکے جھکے، رکوع کی سی حالت میں، چھت کے اوپر گئے اور انہوں نے اپنے آپ کو منڈیر سے اوپر نہیں ہونے دیا۔ خود کو منڈیر کی اونچائی کی حد میں رکھا اور وہاں سے، بڑے محتاط انداز میں چاروں طرف نظر دوڑائی۔

قریب تو کوئی بھی مکان نظر نہیں آ رہا تھا۔ البتہ کچھ فاصلے پر ایک ٹوٹا پھوٹا اور پرانا سا احاطہ واقع تھا، جس کی صرف چار دیواری تھی اور جو پھاٹک کی جگہ تھی۔ وہاں کوئی پھاٹک نہیں لگا ہوا تھا، البتہ دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ کبھی یہاں کوئی پھاٹک رہا ہوگا۔

اس ٹوٹے پھوٹے اور خالی احاطے کے علاوہ جس کے اندر جنگلی گھاس اور جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔ آس پاس کوئی مکان نہیں تھا، البتہ کافی فاصلے پر کچھ مکانات نظر آ رہے تھے۔ لیکن وہ یہاں سے اتنی دور تھے کہ ان کے محض خدوخال ہی دکھائی دے رہے تھے۔

انہوں نے دور دور تک نظریں دوڑائیں۔ انہیں کوئی شخص نظر نہیں آیا۔

کاش اس وقت ہمارے پاس دوربین موجود ہوتی۔ رحمت علی نے آہستہ سے کہا۔ تو ہم بہت دور تک دیکھ سکتے تھے۔

ہاں۔ ارشاد نے کہا۔ لیکن فی الحال تو ہم کو دوربین کے بغیر ہی کام چلانا پڑے گا۔

دوربین ان کے پاس موجود تو تھی، لیکن اس وقت نہیں تھی۔ کیونکہ انہوں نے ہتھیاروں اور رقم سمیت اپنا سامان گجرانوالہ میں ہی ایک ویران لیکن محفوظ جگہ پر چھپا کر رکھ دیا تھا، کیونکہ وہ فوری طور پر کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہتے تھے۔ انہیں فیضو اور شرفو سے، شرفو کے گھر ملاقات کرنی تھی اور وہ شرفو سے پورے طور پر واقف نہیں تھے۔ اس لیے وہ اپنے ضروری ساز و سامان کے ساتھ وہاں نہیں جا سکتے تھے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بہرحال، اب تو انہیں شرفو کے بارے میں سب کچھ معلوم ہو چکا تھا اور وہ اس کی طرف سے مطمئن بھی تھے۔ تاہم، وہ ابھی اپنا سامان لینے کے لیے گئے بھی نہیں تھے کہ ان بردہ فروشوں کے جال میں پھنس گئے تھے اور وہ اس بات سے خوش بھی تھے کہ ان کے پاس ان کا خفیہ ساز و سامان موجود نہیں تھا۔

اگر ہمارے پاس ہتھیار، رقم اور دوسرا سامان موجود ہوتا تو یہ لوگ ہم کو شاید جان سے مار دینے کا فیصلہ کرتے۔ رحمت علی نے کہا۔ وہ خود اگرچہ سمجھ جاتے کہ ہم کوئی فقیر وقیر نہیں ہیں، بلکہ کچھ اور ہی ہیں۔

اور وہ ہماری زبان کھلوانے کے لیے ہم پر تشدد بھی کر سکتے تھے۔ ارشاد نے کہا۔ وہ اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھ سکتے تھے جب تک کہ ان کو یہ معلوم نہ ہو جاتا کہ ہم اصل میں ہیں کون اور ہم نے فقیروں کا سا بھیس کیوں بدل رکھا ہے۔ ہمیں تو انہوں نے دھوکے سے بے ہوش کر کے اپنے قابو میں کر لیا تھا اور باندھ دیا تھا۔ معلوم نہیں۔ اس صورت میں وہ ہم پر کتنا تشدد کرتے اور ہمارا کیا حشر کرتے۔

یہ تو بہت ہی اچھا ہوا کہ وہ ہم کو بس فقیر ہی سمجھتے رہے۔ رحمت علی نے ہنس کر کہا۔ اور انہیں ہمارے بارے میں شبہ ہوا بھی تو اس وقت جبکہ ہم ان پر قابو پا چکے تھے۔

دونوں باتیں کرنے کے ساتھ ساتھ آس پاس کے منظر کا نیز چھت کا بھی جائزہ لیتے جا رہے تھے۔

چھت پر منڈیر کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔ یہاں کوئی کرا وغیرہ بنا ہوا نہیں تھا۔ یہ مکان محض ایک منزل، یعنی زمینی منزل پر مشتمل تھا۔

جس رخ پر مکان کا دروازہ تھا، اس کے عین سامنے، کچھ فاصلے پر دو بڑے بڑے اور گھنے درخت موجود تھے۔

انہوں نے یہ پہلے ہی دیکھ لیا تھا کہ اس مکان کا ایک پچھلا دروازہ بھی موجود تھا لیکن اس دروازے میں اندر سے تالا لگا ہوا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ باہر سے کوئی بھی شخص اس وقت تک اندر نہیں آ سکتا تھا جب تک کہ اندر موجود کوئی شخص اس کے لیے دروازہ نہ کھول دے اور اندر کوئی موجود نہیں تھا جو دروازہ کھولتا۔

ان دونوں نے آس پاس کے مناظر کا کچھ دیر تک غور سے جائزہ لیا، آپس میں کچھ گفتگو کی اور پھر وہ دونوں چھت پر سے نیچے اتر آئے

مکان کا صدر دروازہ بھی اندر سے بند تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ باہر سے آنے والا کوئی بھی شخص پہلے دستک دے کر دروازہ کھلوائے گا پھر اندر آئے گا۔

انہوں نے صدر دروازہ کھولا اور دونوں باہر نکل آئے۔ پھر انہوں نے دروازے کو آہستہ سے اس طرح بند کر دیا کہ اس کے دونوں پٹ آپس میں مل گئے۔

اس کے بعد وہ دونوں مکان کے سامنے والے ایک درخت کے اوپر چڑھ گئے اور شاخوں میں چھپ کر وہاں بیٹھ گئے۔ وہ اپنی جگہ سے مکان کی طرف آنے والے کو اچھی طرح دیکھ سکتے تھے اور آنے والے کو ان کی موجودگی کی کوئی خبر نہیں ہو سکتی تھی۔ انہیں اب جو کچھ کرنا تھا، اس کے بارے میں وہ پہلے ہی اچھی طرح سوچ بچار کر کے طے کر چکے تھے۔

پہلے وریام کو آنا چاہیے۔ رحمت علی نے خیال ظاہر کیا۔

ہاں۔ شامو کے کہنے کے مطابق تو پہلے وریام کو ہی آنا چاہیے۔ ارشاد نے کہا۔ لیکن خادم علی بھی آ سکتا ہے۔ دونوں میں سے کوئی بھی پہلے آ سکتا ہے۔ ہم اس بارے میں یقین کے ساتھ تو کچھ بھی نہیں کہہ سکتے۔

کوئی بھی آ جائے، کیا فرق پڑتا ہے۔ رحمت علی نے کہا۔ حشر تو ان دونوں کا ہی ایک جیسا ہونا ہے۔

وہ دونوں بہت ہلکی آواز میں ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہے۔ گو کہ آس پاس کوئی وجود نہیں تھا، پھر بھی احتیاط کرنے کی سخت ضرورت تھی۔

رحمت علی پر ہلکی سی غنودگی طاری ہونے لگی۔ چوبیس گھنٹے سے زیادہ بھوکا رہنے کے بعد، جب وہ دونوں اس

کمرے سے باہر نکلے تھے، تو انہوں نے سب سے پہلے مکان میں کھانا تلاش کیا تھا اور انہیں باورچی خانے میں خاصی مقدار میں اچھا کھانا تیار مل گیا تھا، جو انہوں نے فوراً ہی کھانا شروع کر دیا تھا لیکن انہوں نے اس بات کا خیال رکھا تھا کہ وہ اتنا زیادہ نہ کھالیں جس کے باعث وہ گرانی کا شکار ہو جائیں۔ چنانچہ انہوں نے پیٹ بھر کر نہیں کھایا تھا لیکن پھر بھی رحمت علی پر کچھ سستی سی طاری ہونے لگی تھی، جس کا اسے فوراً ہی، خود ہی سے احساس ہو گیا اور ایک دم مستعد اور چوکس ہو کر بیٹھ گیا۔ اس وقت سستی کا غلبہ نہایت خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔

ان دونوں کی نظریں راستے کی جانب لگی ہوئی تھیں لیکن ابھی تک کوئی نظر نہیں آیا تھا۔ اگرچہ اس طرف آنے والا راستہ تو ایک ہی تھا اور باقی اطراف میں جھاڑیاں اور ٹیلے وغیرہ تھے۔ تاہم، وہ دونوں چاروں طرف نظریں دوڑا رہے تھے۔

کافی دیر کے بعد انہیں دور سے ایک متحرک نقطہ سا دکھائی دیا۔ دونوں نے ایک ساتھ ہی اس دھبے کو دیکھ لیا تھا اور اس کے بارے میں آپس میں بات بھی کی۔ انہوں نے یہ جان لیا تھا کہ کوئی شخص ادھر آ رہا تھا۔

نقطہ آہستہ آہستہ بڑا ہوتا گیا۔ وہ اس پر نظریں جمائے ہوئے تھے اور اسے آگے بڑھتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ وہ یکساں رفتار سے حرکت کرتا ہوا، ان کے قریب آ رہا تھا۔

پھر انہیں اس کے خدوخال بھی نظر آنے لگے۔ وہ ایک آدمی تھا جو پیدل چلتا ہوا اس طرف آ رہا تھا۔ وہ خاصے تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا آ رہا تھا۔ یہاں تک کہ اس کے چہرے کے خدوخال بھی واضح ہونے لگے اور اب وہ دریام کو صاف طور سے پہچان سکتے تھے۔

دریام آ رہا ہے۔ رحمت علی نے آہستہ سے کہا۔

ہاں۔ ارشاد نے گردن ہلائی۔ میں نے بھی اس کو پہچان لیا ہے۔ وہ دریام ہی ہے۔

دریام تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا آ رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اسے وہاں پہنچنے کی جلدی ہے۔ اس کا رخ اس مکان کی طرف ہی تھا۔

رحمت علی نے اپنا ریوالور سنبھال لیا۔ یہ وہی ریوالور تھا جو ان لوگوں کو اس مکان میں سے ملا تھا اور جس سے رحمت علی نے ان تینوں بردہ فروشوں کو ہلاک کیا تھا۔ اب چوتھے بردہ فروش کی باری تھی۔

دریام اپنی دھن میں مست، اپنے حشر سے بے خبر اور اس بات سے لاعلم کہ کوئی اس کی گھات میں بیٹھا ہوا ہے، تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا جا رہا تھا اور پھر جیسے ہی وہ اس درخت کے قریب سے گزرا رحمت علی نے اس کے شانے کا نشانہ لے کر گولی داغ دی۔

چلتے چلتے دریام کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے شانے پر کسی نے اچانک انگارہ رکھ دیا ہو اور وہ انگارہ تیزی سے اس کے جسم کے اندر گھستا چلا جا رہا ہو۔ درد کی شدت اس غضب کی تھی کہ اس کے لیے ایک قدم آگے چلنا بھی ناممکن ہو گیا اور وہ کوشش کے باوجود آگے نہیں بڑھ سکا۔ اس کے قدم لڑکھڑانے لگے اور وہ بہ مشکل اپنے آپ کو گرنے سے بچانے کی کوشش کر رہا تھا۔

اس ٹیس کے ساتھ ہی اس نے آواز بھی سن لی تھی اور اب اس کی سمجھ میں آ گیا تھا کہ اس پر کسی نے گولی چلائی ہے۔ مگر کس نے۔

اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے دھند چھا رہی تھی اور اس کا سر چکرا رہا تھا اور تب اس نے سامنے والے درخت کے پاس ایک شخص کو تیزی سے اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا۔ وہ شخص اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ ہی ایک اور آدمی تھا اور ان دونوں کے ہاتھوں میں گنیں تھیں۔

دریام کی دھندلاتی ہوئی آنکھوں نے جو منظر دیکھا وہ اس کے لیے ناقابل یقین تھا۔ اس کے لیے یہ دونوں شکلیں اجنبی نہیں تھیں۔ یہ تو اقبال اور صمد تھے۔

نہیں نہیں..... اس نے اپنے سر کو زور سے ایک جھٹکا دیا۔ اس کا واہمہ تھا..... شاید زخمی ہو جانے کا اس کے دماغ پر بھی بہت خراب اثر ہوا تھا۔ بھلا اقبال اور صمد یہاں کس طرح آ سکتے تھے۔ وہ دونوں تو قید میں تھے اور ان کی پوری طرح سے نگرانی کی جا رہی تھی۔ مستان خاں جیسا ہوشیار اور چالاک آدمی ان کی حفاظت پر مامور تھا اور شاموا اور لاکھو بھی وہاں موجود تھے۔ وہ سب مسلح تھے۔ تو پھر یہ دونوں فقیر ان کی قید سے آزاد کس طرح ہو گئے تھے۔

وہ سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ وہ دونوں آدمی عین اس کے سر پر نازل ہو گئے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ دونوں اقبال اور صمد ہی تھے۔

شانے میں شدید تکلیف کے باوجود وہ حیرت کا اظہار کیے بغیر نہیں رہ سکا۔

تم..... تم دونوں..... باہر کس طرح آئے۔ اس نے رک رک کر کہا۔ مجھ کو..... گولی..... کس نے ماری۔ کس نے چھڑایا تم کو۔

ہمیں کسی نے نہیں چھڑایا ہے دریام۔ ارشاد نے اس کو کڑی نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔ ہم نے خود ہی اپنے آپ کو بدمعاشوں کے چنگل سے آزاد کرا لیا ہے۔

اور..... شاموکہاں ہے۔ دریام نے درد سے کراہتے ہوئے کہا۔ اس کے شانے کی تکلیف میں برابر اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

شاموکہیں چلا گیا۔ رحمت علی نے ایک معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

کہاں گیا۔ دریام نے پوچھا۔

اوپر۔ رحمت علی نے انگلی کھلے آسمان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ہم نے اس کو اوپر بھیج دیا ہے۔ اب وہ وہیں رہے گا اور افسوس ہے کہ اب وہ لوگوں کو معذور بنانے کا کام بھی نہیں کر سکے گا، کیونکہ اب وہ جہاں ہے وہاں اس کام کی ضرورت نہیں ہے۔

تم نے اس کو مار دیا۔ دریام کی آنکھوں سے خوف ظاہر ہو رہا تھا۔ اسے اپنی موت سامنے کھڑی نظر آ رہی تھی۔

ہم نے اس پر بہت رحم کیا دریام کہ اس کو مار دیا۔ ارشاد نے کہا۔ ورنہ وہ تو اس سے کہیں زیادہ بڑے عذاب کا مستحق تھا۔

اور..... مستان خاں۔ دریام نے الجھے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ مستان خاں اور لاکھو۔

وہ سب ایک ساتھ ہیں۔ ارشاد نے کہا۔ ان تینوں میں بہت دوستی تھی نا اور وہ ایک دوسرے کے بغیر رہ بھی نہیں سکتے تھے۔ اس لیے ہم نے ان تینوں کو ایک ساتھ ہی اوپر بھیج دیا۔ اب وہ وہاں آرام کریں گے۔

دریام نے خوف زدہ نظروں سے ان دونوں کی طرف دیکھا۔ اس کے خوف کا اب یہ عالم تھا کہ اس کی زبان سے بات نہیں نکل رہی تھی۔ اسے اپنے تینوں ساتھیوں کے مارے جانے کی اطلاع مل گئی تھی اور اب اس کی باری تھی۔ اس کا آغاز بھی ہو چکا تھا۔

مجھے جانے دو..... اچانک دریام نے اپنی ساری ہمت کو مجتمع کرتے ہوئے کہا۔ مجھے یہاں سے جانے دو۔ میں کسی سے کچھ نہیں کہوں گا۔ تم لوگوں کے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گا۔

تمہارے پاس کسی کو ہمارے بارے میں بتانے کے لیے کیا ہے۔ ارشاد نے کہا۔ تم کیا جانتے ہو ہمارے بارے میں۔ کیا بتاؤ گے کسی کو۔

کچھ بھی نہیں۔ دریام نے گڑبڑا کر کہا۔ میں تمہارے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا۔ کچھ بھی نہیں بتا سکتا..... کچھ بھی نہیں۔

اب تم بھی ان تینوں کی پاس چلے جاؤ۔ ارشاد نے کہا۔ وہ تمہارا انتظار کر رہے ہوں گے۔ تمہیں اور کہیں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔

اس کے ساتھ ہی اس نے دریام کی گردن کا نشانہ لے کر ایک گولی داغ دی، فائر بالکل قریب سے کیا گیا تھا اور گولی دریام کے عین نرخرے میں لگی تھی۔ اس کے حلق

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے خرخراہٹ کی آوازیں نکلیں اور وہ زمین پر لڑھک گیا۔

بس، کافی ہے۔ رحمت علی نے کہا۔ اب اس پر مزید گولیاں ضائع کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

واقعی اس کی ضرورت نہیں تھی۔ نرخرے پر لگنے والی گولی جان لیوا ثابت ہوئی تھی اور دریام ختم ہو چکا تھا۔

ان دونوں نے مل کر دریام کے جسم کو گھسیٹا اور ایک طرف جھاڑیوں کے اندر ڈال دیا۔ اب وہ بالکل نظر نہیں آ رہا تھا۔

اس کے فوراً بعد وہ ایک بار پھر اس درخت پر چڑھ گئے اور وہاں شاخوں میں چھپ کر بیٹھ گئے۔ اب انہیں آخری آدمی کا انتظار تھا اور وہ تھا خادم علی..... وہ ظالم و سفاک شخص جو صحت مند انسانوں کو معذور بناتا تھا۔ جو ہنستے کھیلتے، تندرست و توانا جسموں کو لنگڑا، لولا، اپاہج اور محتاج بنا کر ان سے بھیک منگواتا تھا اور ان کی کمائی خود کھا جاتا تھا۔

کافی دیر کے انتظار کے بعد ان کو ایک گاڑی اس طرف آتی دکھائی دی۔ بہت دور سے وہ ایک بڑے سے متحرک دھبے کی طرح نظر آ رہی تھی، اور پھر وہ دھبا بڑی تیزی کے ساتھ بڑھتا گیا اور پھیلتا گیا اور اب وہ یہ دیکھ سکتے تھے کہ آنے والی ایک گاڑی تھی۔ کچھ دیر کے بعد وہ ایک سوزوکی کو اس طرف آتا ہوا دیکھ رہے تھے۔

سوزوکی ذرا سی دیر میں ان کے قریب آ گئی اور انہوں نے دیکھا کہ اس میں صرف ایک ہی آدمی تھا جو ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ اور یہ آدمی خادم علی تھا۔

سوزوکی مکان کے دروازے کے پاس جا کر رک گئی اور خادم علی نے ہارن بجایا۔ ہارن کی آواز سناٹے میں دور تک گونجی۔ خادم علی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ہوا انتظار کر رہا تھا۔

لیکن مردے تو ہارن کی آواز نہیں سنتے۔ خادم علی کے ہارن کے جواب میں کوئی بھی دروازہ کھولنے کے لیے نہیں آیا۔

کچھ دیر کے انتظار کے بعد خادم علی نے پھر ہارن بجایا اور اس بار وہ ذرا زیادہ دیر تک ہارن بجاتا رہا۔ لیکن پھر بھی کسی نے دروازہ نہیں کھولا۔

آخر خادم علی ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھول کر نیچے اترا۔

یہی وہ لمحہ تھا جس کا وہ دونوں اتنی دیر سے انتظار کر رہے تھے۔ خادم علی کو صرف اسی وقت نشانہ بنایا جا سکتا تھا جب وہ گاڑی سے باہر ہوتا۔ گاڑی کے اندر نشانہ نہیں بنایا جا سکتا تھا۔

رحمت علی ریوالور ہاتھ میں لیے ہوئے، بالکل تیار بیٹھا تھا۔ گن تو ارشاد کی ہاتھ میں بھی تھی، اور وہ بھی تیار تھا، لیکن اسے صرف اس صورت میں فائر کرنا تھا اگر رحمت علی کا نشانہ خطا ہو جاتا، جس کے امکانات بہت کم تھے۔

جیسے ہی خادم علی سوزوکی سے نیچے اترا۔ ویسے ہی درخت سے ایک گولی بھی نیچے اتری۔

بجلی کی رفتار سے بھاگتی ہوئی گولی رحمت علی کی گن سے نکلی تھی اور سیدھی خادم علی کے دائیں شانے میں پیوست ہو گئی۔

خادم علی کے حلق سے ایک چیخ نکلی اور وہ لڑکھڑا کر زمین پر گر پڑا۔

وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا اور اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ گولی کس طرف سے آئی اور اس پر فائر کرنے والا کون ہے۔

درد کی شدت اس کی جان نکالے لے رہی تھی۔ شانے میں سے خون کا فوارہ بہہ رہا تھا اور اس کا دایاں ہاتھ اب کام کے قابل نہیں رہا تھا۔ وہ تو زخمی ہو کر جھول گیا تھا۔

اس کے ساتھ خوف کی ایک سرد لہر اس کے سارے جسم میں دوڑ گئی تھی۔ کہیں کوئی موجود تھا۔ اس کا کوئی دشمن۔ کوئی مخالف۔ مگر کون۔

اس کے اپنے علاوہ..... اور بھی کئی لوگ تھے جو اسی طرح کے کام کر رہے تھے، انسانوں کو معذور بنانے کا کام..... اور اس سلسلے میں کچھ کاروباری رقابت کا بھی

سلسلہ رہتا تھا۔

شاید انہی میں سے کسی نے اس کو نشانہ بنایا ہو۔

لیکن کسی کے ساتھ بھی ایسا معاملہ تو نہیں تھا۔ کاروباری رقابت تو ضرور تھی۔ لیکن مار ماری تو کبھی آج تک کسی کے ساتھ نہیں ہوئی تھی۔

اور پھر اچانک، وہ دونوں اس کے سامنے آ گئے..... اس نے ان دونوں کو دیکھا۔ وہ گنیں ہاتھ میں لیے ہوئے، اس کے سامنے کھڑے تھے۔

خادم علی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس پر گولی چلانے والے اقبال اور صمد ہوں گے۔ وہ تو نہ جانے کن کن دوسرے لوگوں کے بارے میں سوچ رہا تھا اور ان دونوں کے بارے میں تو اس کے دماغ میں دور دور تک ایسا کوئی خیال نہیں آیا تھا۔ وہ دونوں تو قید میں تھے اور ان کا باہر نکل کر آنا ناممکن تھا۔

سوزوکی لے کر آئے ہو خادم علی۔ ارشاد نے اس سے مخاطب ہو کر کہا۔ کسے لے جاؤ گے یہاں سے، اس سوزوکی میں بٹھا کر۔ ہم دونوں کو کہاں لے چلو گے۔ چلو، ہم تیار ہیں چلنے کے لیے۔

تم لوگ..... تم آزاد ہو۔ خادم علی نے لڑکھڑاتی ہوئی زبان میں ان سے کہا۔ تم کو کس نے آزاد کرایا۔

کسی نے نہیں خادم علی۔ رحمت علی نے جواب دیا۔ ہم نے خود اپنے آپ کو آزاد کرایا ہے۔

ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔ خادم علی، اس لیے تمہارے سوالوں کے جلدی جلدی جوابات دے دو۔ ارشاد نے اس سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ہمیں تمہارے ٹھکانے کا پتا تو معلوم ہو ہی چکا ہے۔ شاموں نے بتا دیا تھا۔ اب ذرا یہ بتا دو کہ تم نے اپنی ساری رقم کہاں چھپا کر رکھی ہے۔ ہمیں بتا دو۔ تاکہ ہم اس کو وہاں سے نکال کر ان لوگوں میں بانٹ دیں۔ جنہیں تم نے ہاتھ پیر توڑ کر اور آنکھوں اور چہرے پر تیزاب ڈال کر لنگڑا لولا اور معذور بنایا اور جو اب دنیا میں بھیک مانگنے کے سوا اور کوئی کام نہیں کر سکتے۔ ہو سکتا ہے اس رقم سے ہم ان لوگوں کے لیے کچھ کر سکیں۔

اوہ میں۔ یکبارگی خادم علی کے منہ سے نکلا۔ میرا کیا ہوگا۔ میں کہاں جاؤں گا۔ تم لوگ میرے ساتھ کیا سلوک کرو گے۔

تم اب زندہ نہیں ہو خادم علی۔ ارشاد نے کہا۔ اپنے باقی تمام ساتھیوں کی طرح تم بھی موت کے منہ میں جا چکے ہو۔ دریام اور لاکھو..... شاموا اور مستان خاں۔ سب کے سب ختم ہو چکے ہیں۔ تمہارا کوئی بھی ساتھی اب زندہ نہیں ہے۔ جو فقیر تمہارے ساتھ رہ رہے ہیں، ان کو اب زندگی میں نئے سہارے کی ضرورت ہوگی۔ کیونکہ ان کے لیے تمہارا سہارا اب ختم ہو رہا ہے۔ تم نے ان سے بہت کمائی کر لی۔ اب زیادہ کی گنجائش نہیں ہے۔ سمجھ گئے نا۔ سب ختم ہو گئے۔

رحمت علی نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ہم نے تم کو بتایا نا، تمہارے تمام ساتھی ختم ہو گئے۔ لاکھو، دریام، شاموا اور مستان خاں سب ختم ہو گئے۔ سب کو ہم نے مار دیا اور ظاہر ہے کہ ہم تم کو بھی زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ ان سب لوگوں کے خاتمے کے بعد اب تمہاری باری ہے۔ تم نے ساری زندگی تو بہت ہی بھیانک قسم کے گناہوں میں گزاری ہے۔ اب زندگی کے ان آخری لمحوں میں کوئی نیک کام کر جاؤ۔ ان معذور لوگوں کو ایک نئی زندگی کی ضرورت ہے۔

میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں ان لوگوں کو ایک نئی زندگی دوں گا۔ خادم علی نے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا۔ میں ان سب کو آزاد کر دوں گا۔ ان کو رقم دے دوں گا۔ وہ جس طرح سے چاہیں زندگی گزاریں۔ بس تم لوگ میری جان بخش دو۔

ہم تمہاری جان بخشی ہی تو کر رہے ہیں خادم علی۔ رحمت علی نے کہا۔ صرف ایک گولی مار کر ہم تمہاری زندگی کا خاتمہ کر دیں گے۔ اور تم صرف چند لمحوں میں ساری دنیا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کی فکروں سے چھوٹ جاؤ گے۔ ورنہ اصل میں تو تم اس بات کے مستحق تھے کہ تمہارے جسم کی ایک ایک بوٹی کاٹ کر چیل کوؤں کو کھلا دی جاتی۔ اب تم جلدی سے بتا دو کہ تمہاری ساری رقم کہاں رہتی ہے۔ تم اسے چھپا کر کہاں رکھتے ہو۔ یہ اچھی طرح جان لو کہ اب وہ رقم تمہارے کسی کام کی نہیں ہے۔ تم اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکو گے کیونکہ اب تم زندہ نہیں رہو گے۔ تمہاری زندگی اب ختم ہو رہی ہے۔

خادم علی نے مرنے سے پہلے ان دونوں کی بہت خوشامد کی کہ وہ اس کی جان بخشی کر دیں اور اسے جانے دیں۔ اس کے بدلے میں وہ سب کچھ چھوڑ کر دریشی اختیار کرنے پر آمادہ تھا۔ لیکن ان دونوں نے اس کی ایک نہیں سنی۔ وہ ایسی حماقت کا ارتکاب نہیں کر سکتے تھے کہ اس کو زندہ چھوڑ دیتے۔

خادم علی نے اپنی زندگی کے ان آخری لمحات میں اس حقیقت کا ادراک کر لیا کہ اب وہ موت کی دہلیز پر آ کھڑا ہوا ہے اور اس کی زندگی کے سارے امکانات ختم ہو چکے ہیں۔ چنانچہ اس نے اپنی زندگی کا آخری نیک کام کرنے کا فیصلہ کر لیا اور اس نے ان دونوں کو اپنی اس دولت کے بارے میں بتا دیا جو اس نے چھپا کر رکھی تھی۔ اس کے ٹھکانے کا تو ان دونوں کو پہلے ہی سے علم تھا۔ شامو نے اس کے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا۔

ٹھیک ہے خادم علی۔ ارشاد نے اس کی باتیں سننے کے بعد کہا۔ تم نے اپنی زندگی کا آخری اچھا کام کر دیا ہے۔ ہو سکتا ہے اس نیکی کے بدلے میں خدا تمہارے کچھ گناہ معاف کر دے۔

اس کے ساتھ ہی ارشاد کی گن سے دو گولیاں نکلیں اور ان میں سے ایک گولی خادم علی کے سر میں اور دوسری گولی اس کی گردن میں پیوست ہو گئی۔ خادم علی زمین پر لڑھک گیا۔ اس کے جسم سے تین جگہوں سے خون کا فوارہ ابل رہا تھا۔

ان دونوں نے اس کے جسم کو بھی گھسیٹ کر جھاڑیوں کے اندر کی طرف ڈال دیا۔ دریام کا مردہ جسم خادم علی کے جسم سے زیادہ دور نہیں تھا۔ تاہم، دونوں مردہ جسم الگ الگ جھاڑیوں کے نیچے تھے۔

انہوں نے ان دونوں کی جیبوں کی تلاشی لی اور وہاں سے انہیں جو رقم ملی۔ وہ انہوں نے اپنے قبضے میں کر لی۔ خادم علی کی جیبوں سے تو ان کو اچھی خاصی رقم ملی۔ دریام کی جیب سے بھی انہیں خاصی رقم ملی۔

وہ دونوں سوزوکی میں بیٹھ گئے اور وہاں سے چل پڑے۔ ڈرائیونگ سیٹ ارشاد نے سنبھالی ہوئی تھی اور وہی گاڑی چلا رہا تھا۔

شکر ہے کہ ہم نے مجرموں کے ایک نہایت خطرناک گروہ کا خاتمہ کر دیا ہے۔ رحمت علی نے کہا۔ یہ تو وہ لوگ تھے جو دوسرے انسانوں کو زندہ درگور کر رہے تھے اور انہیں کسی طرح معاف کیا بھی نہیں جا سکتا تھا۔

ایسے لوگوں کو معاف کرنا دراصل انسانیت کے ساتھ غداری ہے۔ ارشاد نے کہا۔

ان کو تو معاف کرنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا جب بھی اور جیسے بھی موقع ملے، ان کو تو کتے کی طرح مار دینا چاہیے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو زندہ انسانوں کا گوشت کھا کر زندہ رہتے ہیں۔ ارشاد نے کہا۔

ان کے مارے جانے کا ایک اور فائدہ یہ بھی ہوگا کہ اس قسم کے چھ اور دوسرے گروہ موجود ہیں اور وہ یہی دھندا کر رہے ہیں، وہ خاصا گھبرا جائیں گے، ڈر جائیں گے اور ممکن ہے کہ کچھ عرصے کے لیے وہ اپنا کاروبار بھی روک دیں۔

کم از کم مزید نئے لوگوں کو معذور بنانے کا کاروبار تو ضرور کم ہوگا۔ ارشاد نے کہا۔ اس دھندے سے وابستہ کئی لوگوں کا ایک ساتھ، ایک ہی وقت میں مارا جانا ایک خاصا حیرت ناک واقعہ ہوگا ان سارے لوگوں کے لیے۔

ہاں ..... رحمت علی نے کہا۔ یہ لوگ ضرور ڈر جائیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ایک بات اور بھی ہوگی۔ یہ لوگ ان لوگوں کو تلاش کرنے کی بھی بھرپور کوشش کریں گے۔ جنہوں نے یہ سب کچھ کیا ہے۔ یہ صرف ڈر کر خاموش نہیں بیٹھیں گے۔ اس گروہ کی عورتوں سے انہیں ضرور اس بات کی اطلاع ملے گی کہ انہوں نے اقبال اور صمد نامی دو فقیروں کو پکڑا تھا۔ وہ عورتیں انہیں بار بار حلیہ بھی بتائیں گی۔

ہاں، یہ سب کچھ ہوگا۔ ارشاد نے کہا۔ اور ہمیں اس صورت حال کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ سب سے پہلے تو ہمیں اپنے حلیوں کی تبدیلی پر سب سے زیادہ توجہ دینی چاہیے۔ ابھی ہم جہاں جا رہے ہیں، وہاں ہمیں اپنے چہروں کو چھپا کر رکھنا ہے۔

ٹھیک ہے۔ رحمت علی نے کہا۔ ویسے یہاں اس مکان میں ابھی فوری طور پر تو شاید کوئی آئے گا ہی نہیں۔ ان کے باقی لوگ تو ادھر ادھر دوسری جگہوں پر بھیک مانگتے ہیں اور وہ مصروف ہیں۔ وہ ابھی ادھر نہیں آئیں گے۔

جب تک کوئی ادھر آ نہیں نکلتا، تب تک کسی کو اس واقعے کا علم نہیں ہوگا۔ ارشاد نے کہا۔ لیکن جیسے ہی کوئی ادھر آیا۔ ویسے ہی ہر طرف ایک شور مچ جائے گا۔ تین نقشیں گھر کے اندر۔ دو نقشیں گھر کے باہر، جھاڑیوں میں۔ یہ کوئی معمولی بات تو نہیں ہے۔ اس چھوٹے سے شہر کے لیے تو یہ بہت بڑی خبر ہوگی۔

یہ تو کسی بڑے شہر کے لیے بھی بڑی خبر ہوگی۔ رحمت علی نے کہا۔

ان جیسے اور بھی کتنے گروہ موجود ہیں۔ ارشاد نے کہا۔ صرف اس شہر میں نہیں، بلکہ اور بھی بہت سے شہروں میں۔ ملک بھر میں ..... ارشاد نے کہا۔ کاش ہم ان سب کو ختم کر سکتے! لیکن ہم جانتے ہیں کہ ہم ایسا نہیں کر سکیں گے۔ تو بس پھر جو کچھ کر سکتے ہیں۔ وہی کر ڈالیں۔

ان دونوں نے وہ جگہ تلاش کر لی جہاں خادم علی کا ٹھکانا تھا۔ ایک بڑے سے کچے احاطے کے اندر ایک پرانا، نیم پختہ مکان تھا۔ جو ایک صحن ایک دالان اور چند کمروں پر مشتمل تھا۔

اس مکان کے اندر داخل ہونے سے پہلے ان دونوں نے اپنے اپنے چہروں کو احتیاط کے ساتھ چادروں میں چھپا لیا تھا اور اب صرف ان کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ ان کے چہروں کو کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا۔

انہوں نے سوزوکی احاطے کے باہر ہی کھڑی کر دی اور احاطے کے اندر داخل ہو گئے۔

یہاں انہیں متعدد لوگ نظر آئے، جن میں بچے بھی شامل تھے، جو مختلف قسم کی معذوریوں میں مبتلا تھے۔ وہ ان دو ایسے اجنبیوں کو دیکھ کر قدرے متعجب ہوئے جنہوں نے اپنے چہروں کو چادروں سے چھپا رکھا تھا۔ انہوں نے فوراً ہی ان دونوں کے پاس آ کر ان کے بارے میں جاننے کی کوشش شروع کر دی۔

لیکن ان دونوں کے پاس وقت بہت کم تھا۔ وہ یہاں زیادہ دیر تک رک نہیں سکتے تھے۔ انہوں نے فوراً ہی اس جگہ کی تلاش شروع کر دی۔ جہاں خادم علی رقم چھپا کر رکھتا تھا۔

وہ جگہ احاطے کی ایک الگ تھلگ کوٹھری میں تھی۔ اس کوٹھری کے دروازے میں کوئی تالا لگا ہوا نہیں تھا۔ خادم علی نے بڑی چالاکی سے کام لیتے ہوئے، اس کوٹھری کو مشتبہ بنانے سے گریز کیا تھا۔

وہاں موجود معذوروں کو مطمئن کرنے کی غرض سے انہوں نے ان سے صرف یہ کہا کہ وہ ان کے دوست ہیں اور ان کی مدد کرنے کی غرض سے وہاں آئے ہیں۔

انہوں نے کوٹھری کے اندر جا کر دروازے کو اندر سے بند کر لیا اور پھر لکڑی کے ٹوٹے پھوٹے کباڑ کے نیچے، پرانی اینٹوں کے ایک شکستہ ڈھیر میں حفاظت کے ساتھ رکھی ہوئی بھاری رقم نکال لی، جو ایک کپڑے کے تھیلے میں بھری ہوئی تھی۔ رقم کو پہلے پلاسٹک کی ایک تھیلی میں بھرا گیا تھا اور پھر اس کو کپڑے کے تھیلے میں ڈال دیا گیا تھا۔

بھاری رقم تھی، لیکن ان کے پاس گننے کا وقت نہیں تھا۔ سارے بڑے بڑے نوٹ تھے۔ صاف ظاہر ہوتا تھا کہ چھوٹے چھوٹے نوٹوں کو بڑے نوٹوں کی شکل میں تبدیل کر کے پھر انہیں یہاں رکھا گیا تھا۔

رقم پر قبضہ کرنے کے بعد وہ دونوں اس کوٹھری میں سے باہر نکل آئے۔

معذور اور اپاہج فقیروں کی ٹولی ان کی منتظر تھی۔ یہ سارے لوگ ان کو حیرت، تجسس اور قدرے خوف کے ساتھ دیکھ رہے تھے۔ اگرچہ ان دونوں نے انہیں بتا دیا تھا کہ وہ ان کے دوست ہیں پھر بھی دوستی کا یقین کرنا اتنا آسان تو نہیں تھا۔ یہ زمانے کے ستائے ہوئے لوگ تھے۔ نہ جانے کیسے کیسے فریب اور دھوکے انہوں نے کھائے تھے جن کے نتیجے میں ان کے صحت مند اور توانا جسم لولے لنگڑے اور ناکارہ ہو کر رہ گئے تھے۔ ان لوگوں کے دلی جذبات کو سمجھنا بہت مشکل تھا۔

ارشاد نے ان سب پر باری باری نگاہ ڈالی اور پھر اس کی نظریں ایک سفید داڑھی والے بوڑھے کے چہرے پر جا کر جم گئیں۔ اس بوڑھے کی دائیں ٹانگ گھٹنے کے نیچے سے غائب تھی۔ وہ ڈیڑھ ٹانگ والا انسان تھا۔

بابا، تم کہاں کے رہنے والے ہو۔ ارشاد نے اس ڈیڑھ ٹانگ والے بوڑھے سے سوال کیا۔

گجرات کے قریب ایک گاؤں کا۔ بوڑھے نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

تو تم اپنے گھر میں کیوں نہیں رہتے۔ ارشاد نے اگلا سوال پوچھا۔

میرا کوئی گھر نہیں ہے۔ بوڑھے نے جواب دیا۔ میرے خاندان کے سب لوگ مر چکے ہیں۔ میری کوئی زمین جائداد بھی نہیں ہے۔ اب تو میں یہ بھی بھول چکا ہوں کہ میں کتنے برس سے بھیک مانگ کر گزارا کر رہا ہوں۔

یہاں، ان لوگوں کے پاس کیسے آ گئے۔ ارشاد نے پوچھا۔ اور یہ ٹانگ کیسے کٹ گئی۔

ٹانگ بس کے حادثے میں کٹ گئی تھی۔

بوڑھے نے جواب دیا۔ کئی مہینے خیراتی اسپتال میں پڑا رہا۔ پھر ان لوگوں نے وہاں سے نکال دیا۔ میرے پاس رہنے کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ تب خادم علی مجھے اپنے ساتھ لے آیا۔ تب سے میں اس کے ساتھ ہوں۔ یہیں رہتا ہوں اور بھیک مانگتا ہوں۔

اور جو کچھ نقد رقم تم کماتے ہو اس کا کیا کرتے ہو۔ ارشاد نے پوچھا۔

وہ سب خادم علی کو دے دیتا ہوں۔ بوڑھے نے جواب دیا۔ میرے لیے وہ ویسے بھی بے کار ہے۔ میں نقد رقم کا کیا کروں گا۔ کھانے پینے کو مل جاتا ہے۔ خادم علی کپڑے بھی دے دیتا ہے۔ سردی گرمی اور بارش سے بچنے کے لیے یہ جگہ موجود ہے۔ مجھے اور کیا چاہیے۔ میں نقد رقم اپنے پاس رکھ کر کیا کروں گا۔

اور یہ باقی لوگ۔ رحمت علی نے دوسرے لوگوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔ ان باقی لوگوں کی کمائی ہوئی رقم۔

وہ ساری رقم خادم علی ہم سے لے لیتا ہے۔ بوڑھے کے بجائے ایک نوجوان لڑکا بولا۔ جس کا ایک ہاتھ غائب تھا اور اس کی گردن بھی ایک جانب جھکی ہوئی تھی۔ وہ ہمیں ایک پیسہ بھی اپنے پاس رکھنے نہیں دیتا۔ سب کچھ چھین لیتا ہے اور اگر ہم اس سے چھپا کر کچھ پیسے رکھ لیں تو بہت بری طرح مارتا ہے اور رات بھر بھوکا رکھتا ہے۔

ہم سب کو بہت مارتا ہے جی۔ ایک اور آدمی بولا، جس کی ایک طرف کا چہرہ جلا ہوا تھا اور ایک آنکھ بھی غائب تھی۔ اور ہم تو کہیں اور جا بھی نہیں سکتے۔

ان سب لوگوں کی بات سننے کا اور باری باری سب سے الگ الگ بات چیت کرنے کا وقت نہیں تھا۔ ان دونوں کو جلد از جلد اپنا کام پورا کر کے وہاں سے بھاگ نکلنا تھا۔ صرف یہ جان لینے کی ضرورت تھی کہ ان میں سے کون سا

شخص ایسا ہے جو اس ساری رقم کو تمام فقیروں کے درمیان بالکل یکساں طور پر تقسیم کر سکے۔

اور ارشاد نے اس آدمی کو تلاش کر لیا تھا۔ وہ آدمی ڈیڑھ ٹانگ والا بوڑھا ہی تھا۔ اس کا اس دنیا میں آگے پیچھے کوئی نہیں تھا اور اس کو پیسے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ یہ بھیک مانگ کر ہی باآسانی گزارا کر سکتا تھا۔ اس کی عمر بھی اتنی زیادہ تھی کہ اب وہ زیادہ عرصے تک جینے کی امید بھی نہیں کر سکتا تھا۔

تمہارا نام کیا ہے بابا۔ رحمت علی نے بوڑھے سے پوچھا۔

نام تو میرا برہان الدین تھا۔ بوڑھے نے ایک پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ لیکن اب صرف میں ہی یہ بات جانتا ہوں کہ میرا نام برہان الدین تھا۔ اب تو سب لوگ مجھے بھورا کہتے ہیں۔ میں بھورے کے نام سے ہی جانا جاتا ہوں۔

اچھا تو بھورے بابا یہ بتاؤ کہ اگر وہ رقم جو خادم علی ان تمام لوگوں سے چھین کر اپنے آپ جمع کرتا رہا ہے، تم کو دے دی جائے تو تم اس کا کیا کرو گے۔

میں..... میں کیا کروں گا۔ بھورے نے حیرت سے آنکھیں پھاڑتے ہوئے کہا۔ میں بھلا رقم کا کیا کروں گا۔ کچھ بھی نہیں کروں گا۔ مجھے رقم کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ البتہ میں وہ ساری رقم ان لوگوں میں بانٹ دوں گا۔ اس نے اپنے اردگرد موجود لوگوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ لیکن خادم علی کی جمع کی ہوئی رقم کی طرف اگر کسی نے آنکھ اٹھا کر بھی دیکھا تو وہ اس کی آنکھیں نکال لے گا۔ تم لوگ اس کو نہیں جانتے۔ وہ بہت ہی ظالم اور بے رحم آدمی ہے۔ وہ کسی کو بھی بخشتا نہیں ہے۔

تم اس کی فکر مت کرو بھورے بابا۔ ارشاد نے کہا۔ یہ بتاؤ کہ کیا تم اس ساری رقم کو واقعی ایمان داری کے ساتھ ان تمام لوگوں میں تقسیم کر دو گے جن سے خادم علی بھیک منگواتا ہے۔

ہاں..... بھورے نے فوراً جواب دیا۔ اگر مجھے، وہ ساری رقم مل جائے تو میں اس کو ان تمام لوگوں میں برابر برابر بانٹ دوں گا اور اپنے لیے تو مجھے کچھ بھی نہیں چاہیے۔ میں تو بھیک مانگ کر آرام سے گزارا کر لوں گا۔

اور تم لوگ کیا کہتے ہو۔ ارشاد نے باقی معذور فقیروں سے پوچھا۔ اگر تم لوگوں کو کچھ رقم مل جائے تو تم اپنے اپنے گھروں کو جانے کا بندوبست کر سکتے ہو۔

بہت سی ملی جلی آوازیں بلند تھیں۔

خادم علی ہمیں زندہ کب چھوڑے گا۔

جسے اپنا گھر یاد ہے۔ میں وہاں آسانی سے پہنچا سکتا ہوں۔

میرے گھر والے تو خوشی سے بے قابو ہو جائیں گے۔ مگر..... میرا باتھ۔

ہائے، میں ایک ٹوٹی ہوئی ٹانگ کے ساتھ کس طرح گھر واپس جاؤں گا۔ میری تو دونوں ٹانگیں سلامت تھیں۔

سنو۔ سنو..... میری بات سنو۔ ارشاد نے ان لوگوں کو خاموش کراتے ہوئے کہا۔

تم سب لوگوں کو بھورے بابا پر بھروسا ہے نا۔

ہاں، ہے ہے ہے۔ ان سب نے ایک ساتھ کہنا شروع کر دیا۔

کل کتنے لوگ ہیں جو یہاں رہتے ہیں اور بھیک مانگتے ہیں۔ ارشاد نے پوچھا۔ میرا مطلب ہے، تم لوگوں کے علاوہ اور کون کون لوگ ہیں۔ کتنے ہیں۔ اور کہاں ہیں۔

باقی لوگ دھندے پر گئے ہوئے ہیں۔ ایک نے کہا۔ باری باری سب لوگوں کو دھندے پر بھیجا جاتا ہے۔

ٹھیک ہے۔ ارشاد نے کہا۔ تو سنو..... وہ ظالم اور بے رحم آدمی خادم علی اب زندہ نہیں ہے۔ وہ کتے کی موت مارا جا چکا ہے اور۔

خادم علی مارا گیا..... ارشاد کی بات کاٹتی ہوئی ایک تیز آواز بلند ہوئی۔ واقعی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

خادم علی مر گیا..... کیا سچ مچ مر گیا..... تم سچ کہہ رہے ہو۔ مگر تم دونوں۔

کیسے۔ کیسے مرا۔ خادم علی۔ کس نے مارا اس کو۔ کیا کسی ایکسی ڈنٹ میں مر گیا۔

وہ مر چکا ہے۔ ارشاد نے کہا۔ میری بات کا یقین کرو، وہ مر چکا ہے اور اب وہ کبھی لوٹ کر نہیں آئے گا۔ مردے لوٹ کر نہیں آیا کرتے۔ تم لوگ سب کے سب اب آزاد ہو۔ بھورے بابا سے اپنے اپنے حصے کی رقم لے لو اور یہاں سے چلے جاؤ۔ اطمینان رکھو۔ خادم علی اب کبھی لوٹ کر نہیں آئے گا۔

مگر رقم ہے کہاں۔ ایک آواز بلند ہوئی۔ خادم علی تو معلوم نہیں، رقم کہاں چھپا کر رکھتا تھا۔

رقم یہ رہی۔ ارشاد نے نوٹوں کے بنڈل اپنی جیبوں میں سے نکالے اور بھورے بابا کے سامنے رکھ دیے۔

لیکن ایک بات اچھی طرح سے جان لو۔ تمہارے جو لوگ اس وقت یہاں موجود نہیں ہیں، ان کا بھی اس میں برابر کا حصہ ہے۔ خبردار ان کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہونی چاہیے۔ سب کو برابر کی رقم ملنی چاہیے۔

سب کو برابر کا حصہ ملے گا۔ بھورے بابا نے پرعزم آواز میں کہا۔ نہ کسی کو کم نہ کسی کو زیادہ..... سب برابر کا حصہ پائیں گے۔

پہلے رقم تو گن لو۔ رحمت علی نے کہا۔ اس کے بعد اس کو تمام لوگوں کے درمیان برابر برابر تقسیم کر دو۔

ایسا ہی ہوگا۔ بھورے بابا نے کہا۔ بالکل ایسا ہی ہوگا۔

بس تو اب تم لوگ جانو اور تمہارا کام۔ ارشاد نے کہا۔ ہم لوگ اب چلتے ہیں۔ رقم پر کوئی جھگڑا نہیں ہونا چاہیے۔

رقم پر تو کوئی جھگڑا نہیں ہوگا۔ اس کا پورا یقین رکھو۔ بھورے بابا نے کہا۔ لیکن اس بات کا ایک بار پھر یقین دلا دو کہ خادم علی اب زندہ نہیں ہے۔

جس طرح تم کو اس بات کا یقین ہے کہ کل صبح کو سورج نکلے گا۔ اس طرح سے اس بات کا یقین رکھو کہ خادم علی مر چکا ہے۔ ابھی اس کے مرنے کی خبر عام نہیں ہوئی ہے۔ لیکن دو ایک دن میں کسی نہ کسی ذریعے سے تم کو خبر مل جائے گی۔

مگر..... تم لوگوں نے اپنے بارے میں تو کچھ بتایا نہیں..... ایک شخص نے کہا۔ تم لوگ کون ہو۔ کہاں سے آئے ہو۔ تم کو ان ساری باتوں کے بارے میں معلوم کس طرح ہوا۔ ہاں، ہمیں کچھ اپنے بارے میں بھی تو بتاؤ..... ایک اور آواز بلند ہوئی۔

اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ارشاد نے کہا۔ بس یہ لوگ آزاد ہو۔ اس بات کا یقین رکھو کہ تم لوگ آزاد ہو۔ خادم علی مر چکا ہے۔ جو اب کبھی تمہارے درمیان دوبارہ نہیں آ سکتا۔

اس کے ساتھ ہی ارشاد اور رحمت علی اس مکان سے باہر نکلنے کے لیے دروازے کی طرف بڑھنے لگے۔

لنگڑے، لولے، کانے، کٹے پھٹے، معذور اور نیم معذور فقیروں کی ایک ٹولی ان کے ساتھ ساتھ اور ان کے پیچھے دروازے کی طرف آ رہی تھی۔

وہ دونوں دروازے تک پہنچے تو رحمت علی نے فقیروں سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ بس، اب واپس چلے جاؤ۔ اپنے اپنے حصے کی رقم لو اور جس طرح سے جی چاہے اس طرح سے ایک نئی زندگی شروع کرو۔

وہ دونوں دروازے سے باہر نکل آئے۔ سوزوکی دروازے کے باہر کھڑی ہوئی تھی۔ وہ دونوں اس میں بیٹھ گئے۔ نے اسٹیئرنگ سنبھالا اور وہ وہاں سے روانہ ہو گئے۔

مجھے ایک بات کا ڈر ہے ارشاد۔ رحمت علی نے سے کہا۔ کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے۔

تم کس قسم کی گڑبڑ کی بات کر رہے ہو۔ ارشاد نے چلاتے ہوئے کہا۔

مجھے ڈر ہے کہ ان لوگوں کے درمیان رقم کے لیے جھپٹی نہ شروع ہو جائے۔ رحمت علی نے کہا۔ سب بے چارے فقیر ہیں یہ آپس میں لڑ بھی سکتے ہیں

اگر ایسا ہوا تو بہت برا ہوگا۔

یقیناً بہت برا ہوگا..... ارشاد نے کہا۔ لیکن ہم نے جو کچھ بھی کیا۔ اس سے زیادہ ہم نہیں کر سکتے تھے اور نہ ہم اس کے علاوہ کچھ کر سکتے تھے۔ ہم نے ان لوگوں کو ساری حقیقت بتا دی اور وہ رقم بھی ان لوگوں کے حوالے کر دی۔ اب وہ جو جی چاہے کریں۔ اس سے زیادہ ہم ان کے لیے اور بھلا کیا کر سکتے تھے۔

ہاں، واقعی ہم اس سے زیادہ اور کیا کر سکتے تھے۔ یہی کیا کم بات ہے کہ ہم نے ان کو آزادی دلا دی اور اس حرامزادے خادم علی کے چنگل سے آزاد کرا دیا۔ اب آگے وہ جانیں اور ان کی قسمت۔

دونوں وہاں سے کافی دور نکل گئے اور پھر ایک جگہ انہوں نے سوزوکی روک دی۔

یہ ایک بالکل ویران اور سنسان جگہ تھی۔ اور اس جگہ سے بہت دور تھی۔ جہاں وہ مکان واقع تھا۔ جس میں ان دونوں کو قیدی بنا کر رکھا گیا تھا اور جہاں سے وہ پانچ مجرموں کو جہنم رسید کرنے کے بعد صحیح سلامت نکل گئے تھے۔ وہ اس جگہ سے بہت دور ایک دوسرے مضافاتی علاقے میں تھے۔

ضروری کام تو ہم نے کر لیے ہیں۔ ارشاد نے رحمت علی سے کہا۔ اب اس سوزوکی کو چھوڑتے ہیں اور پیدل چلتے ہیں۔

انہوں نے خادم علی کی سوزوکی کو ایک ویران جگہ پر جھاڑیوں کے درمیان کھڑا کر دیا اور ارشاد نے اس کے انجن آئل کا نٹ کھول دیا۔ سوزوکی میں اوزاروں کا ایک تھیلا پڑا ہوا تھا۔ جس میں بہت سے چھوٹے موٹے اوزار موجود تھے جن سے ہنگامی صورت حال میں مدد لی جا سکتی تھی۔ انہی میں سے ایک پانا تلاش کر کے ارشاد نے انجن آئل کا نٹ کھول دیا۔ نٹ کے کھلتے ہی انجن آئل تیزی سے نیچے گرنے لگا۔

بس اب چند منٹ کے اندر اندر سارا تیل بہہ جائے گا اور انجن میں آئل نہیں رہے گا۔ اس کے بعد یہ گاڑی اسٹارٹ نہیں ہوگی، اس وقت تک، جب تک کہ اس میں تیل نہ ڈالا جائے۔ لیکن تیل کے بغیر اسٹارٹ کرنے کی کوششوں میں اس کا انجن جام بھی ہو سکتا ہے۔ پھر تو اس کو کسی دوسری گاڑی سے باندھ کر ہی یہاں سے لے جایا جا سکے گا۔

مگر کون اس کو باندھ کر لے جائے گا۔ رحمت علی نے کہا۔ خادم علی کا وارث کون ہے۔

خادم علی کا کوئی وارث ہو یا نہ ہو۔ ارشاد نے ہنستے ہوئے کہا۔ گاڑی کے تو بہت سارے وارث نکل آئیں گے۔ ایسے ایسے وارث نکل آئیں گے کہ وہ گاڑی کی ایک ایک چیز کو اس میں سے نکال کر لے جائیں گے۔

یہاں تک کہ ایک دن صرف ایک ڈھانچہ کھڑا رہ جائے گا۔

ان دونوں نے گاڑی کو وہیں چھوڑ دیا اور پھر وہ وہاں سے پیدل ہی چل پڑے۔

اب ذرا دیر میں شام ہونے والی تھی۔ انہیں رات گزارنے کے لیے کوئی ٹھکانا تلاش کرنا تھا۔ وہ فوری طور پر اس میلے میں نہیں جانا چاہتے تھے جہاں سے انہیں پکڑ کر قید کیا گیا تھا۔

میرا خیال ہے کہ یہ راستہ ریلوے اسٹیشن کی طرف جاتا ہے۔ ارشاد نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔ اور ہم وہاں پہنچ جائیں تو اچھا ہے۔ مسافر خانے میں بہت سارے لوگ ہوں گے۔ ان کے درمیان رہ کر ہم اطمینان سے رات گزار سکیں گے۔

ہاں۔ یہ ٹھیک ہے چلو..... رحمت علی نے کہا اور وہ دونوں ریلوے اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گئے۔

ریل کی سیٹی کی آواز نے ان کی رہنمائی کی اور کچھ ہی دیر کے بعد وہ ریلوے اسٹیشن کے علاقے میں پہنچ گئے۔

مسافر خانہ لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ مسافروں کے علاوہ فقیروں اور مانگنے والوں کی بھی ایک بڑی تعداد مسافر خانے پر قابض تھی۔ ان میں سے اکثر فرش پر پڑے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہوئے آرام کر رہے تھے یا سو رہے تھے۔ یہ دونوں بھی جا کے ان میں شامل ہو گئے۔

ایک ادھیڑ عمر کی فقیرنی ایک نوجوان لڑکے کے ساتھ فرش پر بیٹھی ہوئی کچوریاں کھا رہی تھی۔ جو اسے شاید کسی نے دی تھیں۔ تاہم، اس کے کھانے کا انداز ایسا تھا جیسے اسے وہ کچوریاں کوئی خاص پسند نہ آئی ہوں اور وہ انہیں محض زبردستی کھا رہی ہو۔

جلدی کھا کر ختم کرو اماں۔ اس کے ساتھ موجود نوجوان فقیر نے کہا۔ ہمیں کافی دور جانا پڑے گا۔ تب کہیں جا کر شام تک ہم درگاہ شریف تک پہنچ سکیں گے۔

ہاں ہاں، معلوم ہے۔ عورت نے جلدی جلدی منہ چلاتے ہوئے کہا۔ بس ابھی چلتی ہوں اور ابھی تو ہمارے پاس کافی وقت ہے۔ اندھیرا ہونے سے پہلے پہلے ہم درگاہ شریف تک پہنچ جائیں گے۔

لوگ تو وہاں دوپہر سے ہی جمع ہونا شروع ہو گئے ہوں گے۔ لڑکے نے جواب دیا۔

رات تک تو کافی مجمع ہو جائے گا اور پھر صبح سے تو اور بھی زیادہ لوگ آنا شروع ہو جائیں گے۔

ارشاد اور رحمت علی، دونوں غور سے ان دونوں ماں بیٹوں کی گفتگو سن رہے تھے۔ ارشاد نے معنی خیز نظروں سے رحمت علی کی طرف دیکھا۔ رحمت علی اس کی نظروں کا مقصد بہ خوبی سمجھ گیا اور اس نے بہت آہستہ سے گردن ہلا دی۔

عورت کچوریاں کھا رہی تھی، اور لڑکا اس انتظار میں تھا کہ کب وہ کھانا ختم کرے اور کب وہ دونوں وہاں سے درگاہ شریف کی طرف روانہ ہوں۔

ارشاد آہستہ سے اٹھا۔ رحمت علی بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ اور وہ دونوں مسافر خانے سے نکل کر دور اڈے کے باہر کھڑے ہو گئے۔

کہیں کسی درگاہ پر کوئی عرس ہے۔ رحمت علی نے ارشاد سے سرگوشی کی۔ بس سیدھے وہیں چلتے ہیں۔ رات آرام سے وہیں گزاریں گے۔

کچھ دیر کے بعد انہوں نے اس بوڑھی فقیرنی اور اس کے نوجوان بیٹے کو اندر سے باہر آتے دیکھا۔ دونوں بیٹے باہر نکل کر ایک طرف کو چل پڑے۔

ان دونوں نے کچھ دیر تک انتظار کیا۔ اس کے بعد خاموشی سے ان کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ لیکن انہوں نے اتنا فاصلہ دے رکھا تھا کہ ان دونوں کو اس بات کا کوئی شک نہ ہونے پائے کہ کوئی ان کا پیچھا کر رہا ہے۔

میلے ٹھیلے، عرس، مزاروں اور درگاہوں وغیرہ پر جمع ہونے والے مجمع..... یہ سب کچھ ہمارے لیے کتنے کام کی چیزیں ہیں۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کا اور چھپنے کا موقع ملتا رہتا ہے۔

اور کھانا بھی مفت کا مل جاتا ہے۔ ارشاد نے ہنستے ہوئے کہا۔ بس، درگاہوں درگاہوں گھومتے رہو، ایک کے بعد دوسرے عرس میں شریک ہوتے رہو، اور معلوم ہوگا کہ ساری زندگی یوں ہی گزر گئی۔ کچھ پتا ہی نہ چل سکا۔

عورت اور اس کا بیٹا خاصے تیز تیز قدموں سے جا رہے تھے اور ارشاد اور رحمت علی بھی ایک خاص فاصلے سے ان کا تعاقب کر رہے تھے۔

کافی دیر تک چلتے رہنے کے بعد کچھ اور لوگ بھی ادھر ادھر سے آتے ہوئے اور اس سمت میں جاتے ہوئے دکھائی دینے لگے۔ ایک بیجڑوں کی ٹولی گزری، جو ڈھول بجاتے ہوئے اور ناچتے گاتے ہوئے جا رہے تھے۔ ان دونوں نے سمجھ لیا کہ وہ اب درگاہ کے قریب پہنچ گئے ہیں۔ اب انہیں اس بات کی ضرورت بھی نہیں رہی تھی کہ وہ اس فقیرنی اور اس کے بیٹے کا پیچھا کریں۔ انہیں اب آسانی سے راستہ مل سکتا تھا۔

تقریباً ایک گھنٹے تک پیدل چلنے کے بعد وہ دونوں بالآخر ایک درگاہ کے پاس پہنچ گئے۔ درگاہ کی اصل عمارت تو چھوٹی سی تھی، لیکن اس کا احاطہ بہت وسیع تھا اور ایک طویل چہار دیواری اس کے چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔

شام کے دھندلکے پھیل چکا تھا اور سورج غروب ہو رہا تھا۔ ذرا دیر میں چراغ جلانے کا وقت ہونے والا تھا۔ ان

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دونوں نے مضافات میں واقع اس درگاہ کا جائزہ لیا۔

اس کی چہار دیواری اگرچہ بہت طویل تھی۔ تاہم، وہ کافی پرانی لگ رہی تھی۔ اور بعض جگہوں سے ٹوٹی ہوئی بھی تھی۔ کسی نے عرصے سے اس کی تعمیر و مرمت پر کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ وہ دونوں وہیں احاطے کے اندر داخل ہو گئے تھے، جہاں پہلے سے اچھے خاصے لوگ موجود تھے جن میں بڑی تعداد فقیروں کی بھی شامل تھی۔

درگاہ کی اصل عمارت میں داخل ہونے کے لیے تھوڑی سی سیڑھیاں چڑھنی پڑتی تھیں۔ اس کے بعد ایک وسیع چبوترہ تھا۔ چبوترے کے اوپر عمارت تھی اور اس کے اندرونی حصے میں مزار واقع تھا۔

درگاہ کے احاطے کے باہر بہت سی چھوٹی چھوٹی، عارضی نوعیت کی دکانیں لگی ہوئی تھیں اور بہت سے خوانچہ فروش بھی موجود تھے۔ ان میں سے کچھ تو خوانچے لگائے ہوئے بیٹھے تھے اور کچھ خوانچے اٹھاتے ہوئے ادھر ادھر گھوم پھر کر سودا بیچ رہے تھے۔

ہر طرف خاصی گہما گہمی تھی اور ڈھلتی ہوئی شام کی ملگجی روشنی میں ہر چیز بڑی پراسرار اور دل فریب معلوم ہوتی تھی۔

درگاہ کے دروازے پر ایک لمبی چوڑی عبارت لکھی ہوئی تھی، جس میں ان پیر صاحب کے لیے جن کی یہ درگاہ تھی۔ بہت سارے القاب و آداب استعمال کیے گئے تھے۔ ان دونوں نے اس لمبی چوڑی عبارت کو غور سے پڑھنے کی کوشش کی اور ایک ہلکا پھلکا مطلب ان کی سمجھ میں یہ آیا کہ یہ جن پیر صاحب کی درگاہ تھی۔ وہ پیر جنگل شاہ کہلاتے تھے۔ ویسے ان کا نام شیخ عبدالقدوس تھا۔

آج کی رات گزارنے کے لیے اچھی جگہ ہے۔ رحمت علی نے کہا۔

ہاں۔ ارشاد نے کہا۔ عرس کل سے شروع ہوگا۔ لیکن لوگ آج سے ہی جمع ہونا شروع ہو گئے ہیں۔ معلوم ہوا ہے کہ بہت دھوم کا عرس ہوتا ہے یہاں۔ پیر جنگل شاہ ضرور کوئی بہت مشہور اور مقبول بزرگ رہے ہوں گے۔

شام کا اندھیرا بڑھا تو درگاہ کی اصل عمارت کے اندر روشنیاں ہوئیں۔ لیکن وسیع احاطے میں روشنی کا کوئی انتظام نہیں تھا اور وہاں کی ملگجی فضا تاریکی میں تبدیل ہوتی جا رہی تھی۔ لیکن آنے والوں کے پاس اس کا بھی کچھ نہ کچھ بندوبست موجود تھا۔ کیونکہ وہ اس صورت حال سے واقف تھے۔

کئی لوگوں نے مٹی کے تیل کی اور بعض نے گیس کی لالٹین روشن کر لیں، جنہیں وہ اپنے ساتھ لے کر آئے تھے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے درگاہ کے وسیع احاطے میں پھیلی ہوئی تاریکی کے سمندر میں جگہ جگہ روشنی کے چھوٹے چھوٹے جزیرے نمودار ہونے لگے۔ اور یہ منظر بہت ہی خوبصورت اور دل فریب لگنے لگا۔ درگاہ کے احاطے کے باہر اب لوگوں کی تعداد کم ہوتی جا رہی تھی۔ کیونکہ زیادہ تر لوگ تو اب درگاہ کے احاطے کے اندر ہی آ گئے تھے۔ البتہ درگاہ کے اوپری حصے میں واقع مزار تک جانے کی کسی کو اجازت نہیں تھی۔ مزار تک جانے والا دروازہ بند کر دیا گیا تھا۔ اب یہ دروازہ اگلی صبح کو ہی کھلنے والا تھا۔

وسیع احاطے میں طرح طرح کے لوگ اور طرح طرح کی ٹولیاں موجود تھیں۔ ان میں عام فقیروں اور مانگنے والوں کے علاوہ گانے بجانے والوں، نشہ بازوں اور بے گھر و بے در لوگوں کی ٹولیاں شامل تھیں۔

وہ دونوں ایک الگ تھلگ کونے میں جا کر بیٹھ گئے۔ اب رات شروع ہو چکی تھی اور تاریکی نے فضا کو پوری طرح سے اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔

گھروں سے بھاگے ہوئے لڑکوں کی ایک خاص بڑی تعداد جن جگہوں پر آ کر پناہ لیتی ہے ان میں یہ مزارات اور درگاہیں وغیرہ بھی شامل ہیں۔ ارشاد کہنے لگا۔ اور اس لیے یہ جگہیں جرائم پیشہ افراد کی سرگرمیوں کا بھی ٹھکانا ہیں۔ بردہ فروش، بچوں کو اغوا کرنے والے، منشیات فروش، نشہ باز اور اسمگلر، یہاں تاک لگائے رہتے ہیں اور جیسے ہی انہیں کوئی ایسا بچہ نظر آتا ہے جو اکیلا ہو، گھر سے

بھاگا ہوا ہو یا اپنے گھر والوں سے بچھڑ گیا ہو، وہ اس کو اپنے قبضے میں لینے کی کوشش کرتے ہیں اور ایک بار جب وہ ان کے قبضے میں آ جائے، تو پھر سمجھ لو کہ اس کی زندگی بالکل برباد ہو گئی۔

بہت سارے ایسے بچے جو اپنے گھر والوں سے بچھڑ جاتے ہیں، ان مجرموں کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں۔

انہی میں سے بہت سے ایسے بچے بھی ہوتے ہیں جن کو پکڑ کر معذور بنا دیا جاتا ہے اور پھر وہ زندگی بھر بھیک مانگنے کے علاوہ اور کوئی کام نہیں کر سکتے۔

وہ دونوں آپس میں باتیں کر رہے تھے اور ان کے ارد گرد طرح طرح کا شور برپا تھا۔ تاریکی میں دور کسی کونے سے کسی کے گانے کی تیز اور پاٹ دار آواز آ رہی تھی۔ گانے والا شخص کسی پرانے شاعر کا پنجابی صوفیانہ کلام گا رہا تھا۔ اس کی آواز میں بڑا درس تھا۔ دوسرے گوشوں سے بھی طرح طرح کی آوازیں آ رہی تھیں۔

گرمیوں کے موسم کے آخری دن تھے اور رات کی فضا بڑی خوش گوار تھی۔ لوگ کھلے آسمان کے نیچے بڑی فرحت محسوس کر رہے تھے۔

رات کا کھانا انہوں نے ایک دکان سے خرید کر پہلے ہی کھا لیا تھا اور اب انہیں کچھ نہیں کرنا تھا۔

رات ڈھلتی گئی اور آہستہ آہستہ آوازوں کا شور کم ہوتا گیا۔ زمین کے اس دور افتادہ ٹکڑے میں، جو کہ آبادی سے کافی دور، ایک ویرانے کا حصہ تھا۔ اس وقت جو بہت سارے لوگ موجود تھے۔ وہ دھیرے دھیرے نیند کی آغوش میں جا رہے تھے اور رات کا سناٹا گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مٹی کے تیل اور گیس کی لالٹینیں بھی ایک ایک کر کے گل ہوتی جا رہی تھیں اور اس کے ساتھ ہی اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ بالکل خاموشی چھا گئی۔ روشنیاں بھی تقریباً گل ہو چکی تھیں اور اب یہ جگہ واقعی کسی ویرانے کا حصہ معلوم ہو رہی تھی، جس میں زندگی کے کوئی آثار موجود نہیں تھے اور کسی انسانی وجود کا احساس نہیں ہوتا تھا۔

ارشاد اور رحمت علی نے وہ رات اسی درگاہ کے صحن میں گزاری۔ آمد سحر کا اعلان کسی پرندے کی تیز اور سریلی آواز نے کیا اور اس کے ذرا ہی دیر بعد ساری فضا ہزاروں پرندوں کی چہچہاہٹ کی آوازوں سے گونجنے لگی۔ اس ویرانے میں درختوں کی کمی نہیں تھی۔ خود درگاہ کے صحن میں بھی بہت سے درخت موجود تھے، اور ان کی شاخوں پر ان گنت پرندوں کا بسیرا تھا۔ اور اب یہ پرندے ایک ساتھ مل کر ہی ایک نئے دن کے طلوع ہونے کی نوید دے رہے تھے۔

رحمت علی اور ارشاد بھی بیدار ہو گئے۔ ابھی صبح کا اجالا پوری طرح سے نہیں پھیلا تھا۔ لیکن لوگوں نے بیدار ہونا شروع کر دیا تھا۔

ذرا دیر میں علاقے میں زندگی کی سرگرمیاں پورے طور سے شروع ہو گئیں اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ سارا علاقہ جیسے متحرک ہو گیا۔

ان دونوں نے اپنے حلیے میں ایک بار پھر تبدیلیاں کر لی تھیں۔ جس حلیے میں وہ لاکھو، دریام اور ان کے خاندان کی لڑکیوں سے ملے تھے۔ وہ حلیہ انہوں نے کافی حد تک بدل دیا تھا اور ان کو اس حلیے میں دیکھنے والا اب انہیں پہچان نہیں سکتا تھا۔

یہ احتیاط اس لیے لازمی تھی کہ لاکھو اور دریام وغیرہ کے ٹولے کے بہت سے لوگ ابھی زندہ اور اسی شہر میں موجود تھے۔ جو ان دونوں کو اچھی طرح سے پہچانتے تھے۔ وہ تینوں لڑکیاں تھیں، جن کے ساتھ شادی کا ان کو جھانسا دیا جا رہا تھا۔ وہ سگریٹ پینے والی عورت تھی اور دو ایک اور بھی لوگ تھے اور پھر..... وہ پانچ لاشیں تھیں، تین مکان کے اندر اور دو مکان کے باہر، جنہیں یہ لوگ کل اپنے پیچھے چھوڑ کر آئے تھے۔ ان دونوں کی حیثیت تو مفرور قیدیوں کی سی تھی اور مفرور قیدی بھی کیسے۔ وہ جو پانچ افراد کو ہلاک کر کے بھاگے تھے۔

ہم آج کا دن اور آج کی رات یہاں اور گزاریں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گے۔ ارشاد نے رحمت علی سے کہا۔ کل صبح کو ہم شرفو کے گھر پہنچ جائیں گے اور اس سے کہیں گے کہ وہ فیضو کو بلا لے اور یہ کہ ہم فتو کی تلاش کے کام میں شرفو کو بھی شامل کر لیں گے اور پھر اس کے بعد ہم پوری تیاری کے ساتھ خرکاروں کے کیمپ کی تلاشی میں روانہ ہوں گے۔

ہاں..... رحمت علی نے کہا۔ یہ دونوں بہادر آدمی ہیں۔ ہمت والے ہیں۔ اگر ہم سوچ سمجھ کر کام کریں گے تو اس کیمپ کو تلاش بھی کر لیں گے اور اس کو ختم کر کے قید میں سارے لوگوں کو آزاد کرا لیں گے۔

جیسے جیسے دن چڑھتا جا رہا تھا، ویسے ویسے درگاہ کی رونق میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ بیل گاڑیوں میں، گھوڑا گاڑیوں میں، بسوں اور کاروں میں اور پیدل، لوگوں کی آمد کا سلسلہ جاری تھا۔ مزار کا دروازہ بھی کھول دیا گیا تھا اور مجاور نذر نیاز قبول کرنے کے لیے مستعدی کے ساتھ موجود تھے۔ رحمت علی اور ارشاد بھی مزار پر حاضری دے آئے تھے اور وہاں کے تمام مناظر کو اچھی طرح سے دیکھ آئے تھے۔ اس کے بعد سے وہ درگاہ کے صحن میں ہی ایک طرف بیٹھ گئے تھے اور لوگوں کے ہجوم کو اور درگاہ کی بڑھتی ہوئی رونق کو دیکھ دیکھ کر محظوظ ہو رہے تھے۔

لنگر کی تقسیم کا سلسلہ بھی صبح ہونے کے کچھ دیر بعد ہی شروع ہو گیا تھا۔ بہت سارے لوگ لنگر تقسیم کر رہے تھے۔ کہیں بیل گاڑیوں پر دیگیں لدی ہوئی تھیں اور ان کے ساتھ موجود لوگ طرح طرح کے کھانوں کا لنگر تقسیم کر رہے تھے۔ کہیں سوزوکیوں میں لاد کر دیگیں لائی گئی تھیں اور ان میں سے کھانا لوگوں میں تقسیم کیا جا رہا تھا۔

ارشاد اور رحمت علی نے ایک سوزوکی میں سے بریانی اور زردہ لیا اور سوزوکی کے پاس سے جانے لگے۔ وہ ابھی چند قدم ہی چلے ہوں گے کہ اچانک ایک پراسرار سرگوشی نے رحمت علی کی توجہ اپنی جانب مبذول کرا لی۔

لڑکی ہی چاہیے۔ کوئی کہہ رہا تھا۔ لڑکا نہیں..... خیال رہے۔

فکر مت کرو۔ دوسری سرگوشی ابھری۔

رحمت علی نے اپنے آگے بڑھتے ہوئے قدم ایک دم ہلکے کر دیے، لیکن اس طرح سے کہ کسی کو شبہ نہ ہونے پائے۔ وہ چلتے چلتے تقریباً رک گیا تھا اور ان دونوں آدمیوں کی سرگوشیوں کو سننے لگا تھا جو محتاط انداز میں بات کر رہے تھے اور انہیں اس بات کا یقین تھا کہ ان کے آس پاس ان کی گفتگو کو سننے والا کوئی اور شخص موجود نہیں ہے۔

گاڑی ادھر احاطے کے پیچھے کھڑی ملے گی۔ ایک شخص نے کہا۔ میں اس میں موجود ہوں گا۔

ٹھیک ہے۔ دوسرے شخص نے کہا۔

رحمت علی نے بڑی آہستگی کے ساتھ گردن گھما کر ان دونوں کو دیکھا۔

دونوں درمیانی عمر کے آدمی تھے اور ان میں سے ایک کے چہرے پر سیاہ داڑھی تھی جس میں ایک آدھ سفید بال بھی جھانک رہا تھا۔ اس کی آنکھیں چھوٹی چھوٹی اور اندر کو دھنسی ہوئی تھیں اور ان سے مکاری اور شاطری کا اظہار ہو رہا تھا۔ دوسرا آدمی بغیر داڑھی والا تھا اور اس کا رنگ بے حد سیاہ تھا۔ اس کے سر پر بہت چھوٹے چھوٹے بال تھے۔ دونوں آدمی پستہ قد تھے، لیکن ان کے جسم بڑے مضبوط اور توانا تھے۔

داڑھی والا شخص وہ تھا جو بغیر داڑھی والے شخص کو ہدایات دے رہا تھا۔

رحمت علی نے ان دونوں آدمیوں کو الگ الگ شناخت کر لیا۔ ارشاد ان کی طرف توجہ نہیں دے سکا تھا اور وہ دونوں آدمی وہاں سے آگے بڑھ گئے تھے لیکن رحمت علی نے ان کو نظر میں رکھ لیا تھا۔

وہ جلدی سے چند قدم آگے بڑھ کر ارشاد کے پاس پہنچا اور سرگوشی میں اس سے بولا۔ جلدی سے ان دونوں آدمیوں کو اچھی طرح سے دیکھ لو اور انہیں پہچان لو۔ اس نے ان دونوں آدمیوں کی طرف اشارہ کیا جو وہاں سے آگے بڑھ چکے تھے۔

ارشاد نے ان کی طرف نظریں اٹھائیں۔

وہ..... داڑھی والا اور اس کے ساتھ وہ کلوٹا۔ اس نے آہستہ سے رحمت علی سے پوچھا۔

ہاں، ہاں وہی۔ رحمت علی نے جلدی سے کہا۔

کیا ہے ان میں۔ ارشاد نے سرگوشی کی۔

بتاتا ہوں۔ رحمت علی نے سرگوشی میں کہا۔ بس اس کا خیال رکھو کہ یہ دونوں ہماری نظروں سے اوجھل نہ ہونے پائیں۔

ٹھیک ہے۔ ارشاد نے بھی سرگوشی میں جواب دیا۔ میں دیکھ رہا ہوں۔

وہ دونوں آدمی ایک طرف جا رہے تھے۔ اور پھر وہ کچھ دور جانے کے بعد، ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔ ان کے پاس بھی لنگر سے لیا ہوا پلاؤ اور زردہ تھا، جسے انہوں نے کھانا شروع کر دیا۔

رحمت علی اور ارشاد بھی ان سے کچھ فاصلے پر بیٹھ گئے اور انہوں نے بھی پلاؤ اور زردہ کھانا شروع کر دیا اور اس دوران رحمت علی نے سرگوشی میں ارشاد کو ان دونوں کے درمیان ہونے والی اس گفتگو کے بارے میں بتایا جو اس نے سنی تھی۔

ارے باپ رے باپ پوری بات سن کر ارشاد نے سخت حیرت کے عالم میں کہا۔ تو..... یہ لوگ کسی لڑکی کو اغوا کرنا چاہتے ہیں۔ اس کی آواز بہت ہلکی سرگوشی کی طرح تھی۔

ہاں۔ رحمت علی نے جواب دیا۔ یہ دونوں بھی کوئی بردہ فروش ہیں۔ بغیر داڑھی والا کسی لڑکی کو اغوا کرے گا اور داڑھی والا گاڑی میں باہر انتظار کرے گا۔ پھر یہ لوگ لڑکی کو لے کر یہاں سے بھاگ جائیں گے۔

کل رات کو ہی ہم لوگ اس بارے میں باتیں کر رہے تھے۔ ارشاد نے کہا۔ اور دیکھ لو..... آج ہی یہ ایک معاملہ ہماری نظروں کے سامنے آ گیا..... مگر کمال ہے..... تم نے ان دونوں کی بات سن کیسے لی۔ یہاں تو ہر طرف اس قدر شور مچا ہوا ہے۔

اتفاق سے داڑھی والے کے چند الفاظ میرے کان میں پڑے۔ رحمت علی نے کہا۔ اور بس، میں فوراً ہی متوجہ ہو گیا۔ میں نے دھیان سے سننا شروع کر دیا اور پھر ان کی پوری بات سن لی۔

یہ تو بہت ہی اچھا ہوا۔ ارشاد نے کہا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدرت ہم سے بہت سے اچھے کام لینا چاہتی ہے۔ اسی لیے ہم ان بدمعاشوں کے چنگل میں جا پھنسے، جہاں سے نکلنے کے لیے ہم کو انہیں ٹھکانے لگانا پڑا۔

اور اب شاید قدرت کسی بچی کی زندگی کو ہمارے ذریعے محفوظ بنانا چاہتی ہے۔ رحمت علی نے کہا۔

اچھا سنو۔ ارشاد نے سرگوشی میں کہا۔ اب سوچ لو کہ ہمیں کیا کرنا ہے، کیونکہ اصل میں تو ان کو ہی کچھ کرنا ہے اور ہمیں اس کے توڑ کے لیے کچھ کرنا ہے۔ مگر کیا کرنا ہے۔

وہ دونوں کچھ دیر تک آپس میں کچھ سرگوشیاں کرتے رہے، لیکن ارشاد اور رحمت ان کی باتیں سن نہیں سکتے تھے۔ تاہم، وہ ان کی ایک ایک حرکت کو اپنی نظروں میں رکھے ہوئے تھے اور ان دونوں کو اس کی کوئی خبر نہیں تھی۔

بالآخر وہ دونوں بردہ فروش اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے، ان کے درمیان کچھ جملوں کا تبادلہ ہوا اور اس کے بعد وہ دونوں الگ الگ سمتوں میں روانہ ہو گئے۔

داڑھی والے کا رخ درگاہ کے احاطے کے دروازے کی طرف تھا۔ رحمت علی اور ارشاد خاموشی سے اس کے پیچھے چل پڑے۔ وہ ایک خاص فاصلے سے اس کا تعاقب کر رہے تھے لیکن اس بات کا پوری طرح سے خیال رکھے ہوئے تھے کہ وہ ان کی نظروں سے اوجھل نہ ہونے پائے۔ آس پاس لوگوں کا بہت ہجوم تھا اور اس صورتحال میں کسی آدمی کا تعاقب کرنا بہت دشوار تھا، لیکن وہ دونوں بڑی مستعدی کے ساتھ اس شخص کا پیچھا کر رہے تھے۔

وہ شخص درگاہ کے احاطے سے باہر نکل آیا اور اب اس کا رخ احاطے کے پچھلے حصے کی جانب تھا۔

دونوں ایک خاص فاصلے سے اس کے پیچھے چلتے رہے اور انہوں نے اس کو نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ویسے بھی، اب ان کا کام اتنا زیادہ مشکل نہیں رہا تھا کیونکہ جس طرف وہ شخص جا رہا تھا ادھر ہجوم بہت کم تھا۔ اس طرف کھڑی ہوئی گاڑیوں کی تعداد بھی بہت کم تھی۔

وہ شخص چلتا ہوا ایک گاڑی کے پاس جا پہنچا، جو ایک قدرے تھلگ جگہ پر جھاڑیوں کے پاس کھڑی ہوئی تھی۔ یہ ایک سوزوکی تھی، جس کی اونچائی عام کاروں کے مقابلے میں زیادہ تھی۔

اس شخص نے ڈرائیونگ سیٹ کی طرف کا دروازہ کھولا اور وہاں جا کر بیٹھ گیا۔ اس نے ایک بار ادھر ادھر نہیں دیکھا تھا اور وہ ان دونوں آدمیوں کی موجودگی سے یکسر بے خبر تھا جو موت کے فرشتوں کی طرح اس کے پیچھے لگے ہوئے تھے۔

تم ادھر اس درخت کے تنے کے پاس جا کر بیٹھ جاؤ۔ ارشاد نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے، رحمت علی سے کہا۔ اور میں اب اپنے کام پر جاتا ہوں۔ تمہیں کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں خود ہی تمہارے پاس واپس آ جاؤں گا۔ خوش قسمتی سے اس کی گاڑی بھی ایسی اچھی جگہ کھڑی ہے کہ میں اپنا کام بڑی عمدگی کے ساتھ کر سکتا ہوں۔

ٹھیک ہے۔ رحمت علی نے کہا۔ تم جاؤ..... میں یہیں بیٹھا ہوں۔

رحمت علی کچھ دور جا کر درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور ارشاد اس طرف روانہ ہو گیا جدھر داڑھی والے کی سوزوکی کھڑی ہوئی تھی۔

سوزوکی جھاڑیوں کے پاس کھڑی ہوئی تھی۔ ارشاد نے قریب سے صورت حال کا جائزہ لیا۔ داڑھی والا ڈرائیونگ سیٹ پر آرام کے ساتھ اور تقریباً بے خبری کے عالم میں بیٹھا ہوا تھا۔

ارشاد آہستہ آہستہ جھاڑیوں کی طرف چلا گیا۔ اس کے دونوں ہاتھ سامنے کے رخ پر اس کے کرتے کے نیچے تھے۔ کوئی بھی دیکھنے والا یہی سمجھ سکتا تھا کہ وہ پیشاب کرنے کے لیے جھاڑیوں کی طرف جا رہا ہے۔

اور پھر وہ جھاڑیوں کے درمیان، گاڑی کے بالکل قریب، بیٹھ گیا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ہوا داڑھی والا آدمی اس کی موجودگی سے بالکل بے خبر، آرام سے بیٹھا ہوا تھا۔

ارشاد بڑی آہستگی کے ساتھ اپنی جگہ سے سرکا اور پلک جھپکتے میں وہ گاڑی کے نیچے تھا۔

ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے، داڑھی والے آدمی کو اس بات کی بالکل بھی خبر نہیں ہوئی کہ کوئی شخص گاڑی کے نیچے گھسا ہوا ہے۔ وہ اپنی جگہ پر اطمینان کے ساتھ بیٹھا رہا۔

ارشاد گاڑی کے نیچے جا کر غائب ہو گیا اور وہ وہاں کچھ دیر تک اپنی کارروائی میں مصروف رہا۔

دور، درخت کے تنے کے ساتھ بیٹھا ہوا رحمت علی اس منظر کو جزوی طور پر دیکھ سکتا تھا۔

رحمت علی نے دیکھ لیا تھا کہ ارشاد گاڑی کے پاس جھاڑیوں میں غائب ہو گیا تھا اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ہوا داڑھی والا آدمی اسی طرح بیٹھا رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ گاڑی کے نیچے کی جانے والی کارروائی سے بالکل بے خبر تھا۔

رحمت علی غور سے اس ساری صورت حال کو دیکھ رہا تھا اور اس کی نظریں ڈرائیونگ سیٹ پر سختی کے ساتھ جمی ہوئی تھیں۔ وہ کسی بھی غیر معمولی صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار اور چوکس تھا۔

پھر کچھ دیر کے بعد اس نے جھاڑیوں میں سے ارشاد کو برآمد ہوتے ہوئے دیکھا۔ ارشاد گاڑی کی پچھلی طرف سے گاڑی کے نیچے داخل ہوا تھا اور اسی طرف سے وہ دوبارہ نمودار ہوا۔

ارشاد بہت ہوشیاری اور آہستگی کے ساتھ چلتا ہوا اس درخت کی طرف آ رہا تھا جس کے نیچے رحمت علی بیٹھا ہوا تھا۔

رحمت علی بڑی بے چینی کے ساتھ اس کی آمد کا منتظر تھا۔ ارشاد بغیر کسی عجلت کے، آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔

(جاری ہے)

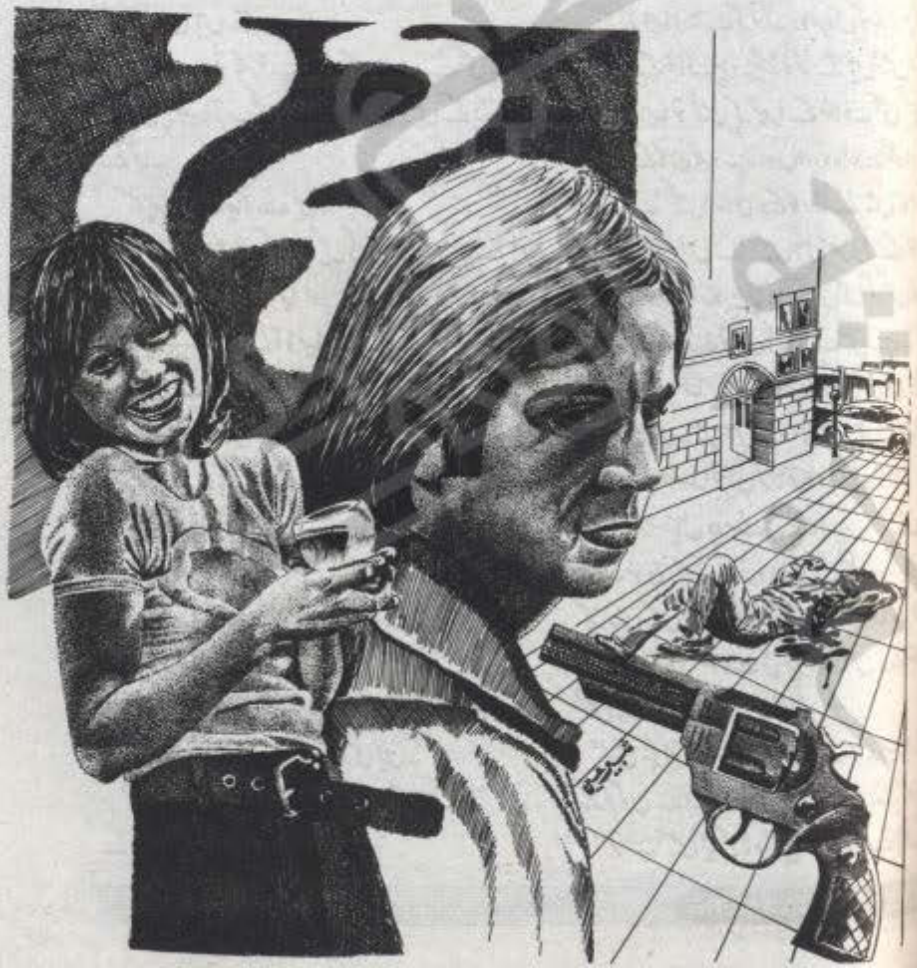

پسند

شہاب شیخ

"سچ کہتا ہوں۔" میں نے انہیں بھیجتے ہوئے کہا۔ وہ بھی مجھ سے والہانہ انداز میں لپٹ گئیں۔ ہمارے تعلقات گزشتہ دو سال سے چل رہے تھے۔ مسٹر احسان ہمیں اچھے اسمارٹ آدمی تھے لیکن میں مسز احسان کو پسند آگیا تھا۔

میں اس وقت آفس سے آکر بیٹھا ہی تھا کہ کال بیل بج اٹھی۔ میں نے فوراً اپنی بیوی نازیہ کی طرف دیکھا اور بولا۔ "جاؤ دیکھو بھئی کون آیا ہے۔"

وہ اٹھ کر ڈرائینگ روم سے باہر چلی گئی۔

کچھ دیر بعد وہ واپس آئی تو اس کے ساتھ مسز احسان تھیں، ہمارے محلے کی قابل احترام ہستی۔ لوگ ان کا احترام اس لیے کرتے تھے کہ وہ لوگوں کے کام کرتی رہتی تھیں۔ وہ سوشل ورکر تھیں اور سماجی کام کرنے کا شوق رکھتی تھیں۔

"عامر صاحب..... کیسے ہیں آپ؟" اس نے مسکرا کر مجھے سلام کرنے کے بعد کہا۔

میں نے سلام کا جواب دیا اور بولا۔ "میں بالکل ٹھیک ہوں..... آپ کیسی ہیں؟"

"میں بھی بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں۔" وہ بولی۔

"تشریف رکھیں۔" میں نے اپنے لگے عقابل صوفے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

وہ نازیہ کے ساتھ ہی وہاں بیٹھ گئیں۔

"کہیے..... کیسی ہیں آپ کی سماجی مصروفیات؟" میں نے ان سے کہا۔

"بہت خوب..... ایک مسئلہ آ گیا تھا، اسی سلسلے میں آپ لوگوں سے ملاقات کرنے آئی ہوں اور مجھے دیگر لوگوں سے بھی مل رہی ہوں۔" انہوں نے کہا تو میں نے بھنویں سکیڑ کر ان کی طرف دیکھا اور بولا۔

"کیا مسئلہ؟"

"وجواختر صاحب کے مکان میں نئے کرائے دار آ ہیں، ان کے بارے میں بات کرنی ہے۔" وہ بولیں۔

"کیا بات؟" میں نے بدتوقف کہا۔

"دیکھئے صاحب!..... یہ ہے شریفوں کا محلہ اور وہاں خاتون حمیرا صاحبہ آئی ہیں، ان کے بارے میں مجھے ہے کہ وہ ٹھیک نہیں ہیں اور میں چاہتی ہوں کہ سب والے مل کر انہیں یہاں سے نکال دیں۔" انہوں نے کہا

"او..... یہ تو افسوس ناک خبر ہے۔ کیا آپ ان بارے میں تصدیق کے ساتھ یہ بات کر رہی ہیں؟" نے ان کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا اور تائی کی ڈھیلی کرنی لگا۔

"جی ہاں جناب!..... میں نے معلومات حاصل ہیں ان کے بارے میں..... وہ جس محلے سے آ وہاں سے بھی اپنے کرتوتوں کی وجہ سے نکالی گئی بولیں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں نے گال کھجاتے اور سوچتے ہوئے کہا۔ ''پھر تو واقعی ان کے خلاف سخت ایکشن لینا چاہیے۔''

''جی ہاں بالکل۔'' وہ بولیں۔

''آپ نے باقی سارے محلے والوں سے بات کرلی ہے؟'' میں نے ان کی طرف جواب طلب نگاہوں سے دیکھا۔

انہوں نے ایک ادا سے اپنے ماتھے پر آ جانے والی لٹ بناتے ہوئے کہا۔ ''تقریباً آدھے محلے والوں سے تو بات کرلی ہیں میں نے۔''

''وہ کیا کہتے ہیں؟''

''کہنا کیا ہے؟'' انہوں نے ترچھی نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ ''سب اُسے یہاں سے نکالنے کے حق میں ہیں۔''

''ٹھیک ہے تو پھر آپ باقی محلے والوں سے بھی بات کرلیں، پر جیسا آپ کہیں گی، ہم ویسا ہی کریں گے۔'' میں نے کہا۔

''اچھا تو مجھے اجازت دیں۔''

''ارے...... ایسے کیسے جائیں گی آپ؟...... چائے پی کر جانا۔'' میں نے کہا اور نازیہ کی طرف دیکھا۔

''نازیہ...... چائے لے آؤ میڈ کے لیے۔''

''میں لے کر آتی ہوں۔'' نازیہ نے اٹھتے ہوئے کہا۔

اسی وقت مسز احسان نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

''میں چائے پھر کسی وقت پی لوں گی، فی الحال تو مجھے اپنا یہ کام مکمل کرلینے کی جلدی ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ جلد از جلد باقی محلے والوں سے بھی مل لوں۔'' پھر وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔

وہ نازیہ سے بات چیت کرتی ہوئی وہاں سے چلی گئیں۔

ذرا دیر بعد نازیہ واپس آ گئی۔ اُس نے میرے قریب ہی بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''مسز احسان نے محلے کی آدھے سے زیادہ ذمے داریاں اپنے سر لے رکھی ہیں۔''

''کچھ لوگوں کو سماجی کام کرنے کا شوق ہوتا ہے۔'' میں نے اظہارِ خیال کیا۔

''انہیں بھی جنون کی حد تک شوق ہے اس طرح کے ... کرنے کا۔'' وہ بولی۔

''کوئی نہ کوئی کام کرتی ہی رہتی ہیں۔ ویسے ان کی ... سے واقعی محلے والوں کو بہت فائدے ہو جاتے ہیں، اب ... دیکھو ناں کہ وہ آج کل کس مسئلے پر کام کررہی ہیں، ان ... نظر بھی بہت تیز ہے۔ انہوں نے حمیرا کو پہچان لیا ... ورنہ ہمیں اور دوسرے محلے والوں کو تو شاید کبھی کانوں کا ... خبر نہ ہوتی کہ وہ کیا کررہی ہے۔'' میں نے کہا۔

''کہیں ایسا تو نہیں کہ ان کا اندازہ غلط ہو۔'' نازیہ ... پر خیال انداز میں کہا تو میں نے اس کی طرف چونک ... دیکھا اور بولا۔

''کیا مطلب؟''

''اکثر ایسا ہوتا ہے کہ لوگ دوسروں کو بدنام کرنے کے ... لیے ان کے خلاف پروپیگنڈہ کرتے ہیں، میں سوچتی ہوں ... کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ حمیرا کے خلاف بھی کسی نے مسز ... احسان کے کان بھر دیے ہوں اور وہ اسے نکلوا دیں، وہ ... عورت ہے، کہیں سلائی کے کارخانے میں کام کرتی ... تین بچے ہیں اس کے، ہمیں اس طرح کے کاموں میں ... سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا چاہیے کیوں کہ اگر کسی کو اس طرح ... بلاوجہ تنگ کیا جائے تو اس کی آہ لگ سکتی ہے۔'' نازیہ ... کہا۔ وہ ایک حساس عورت تھی اور کسی کی بی دل آزاری ... سے ڈرتی تھی۔ میں اس کے اس طرح کے خیالات میں ... ہمیشہ اس کی حوصلہ افزائی کرتا تھا اس لیے بولا۔

''تمہارا خیال درست ہے نازیہ...... ہمیں حمیرا کے ... خلاف سوچ سمجھ کر فیصلہ دینا چاہیے لیکن...... مسز احسان ... کہہ رہی تھیں کہ انہوں نے اس کے ساتھ زندگی کے ... بارے میں بھی معلومات کی ہیں اور اس کے خلاف شاید ... انہیں کچھ ثبوت بھی چاہییں۔''

''یہی یہی تو کہنا چاہ رہی ہوں کہ شاید حمیرا کے خلاف ... کچھ لوگوں نے اپنے دل کی بھڑاس نکالی ہو۔'' وہ بولی۔

''تو اب ہمیں کیا کرنا چاہیے؟'' میں نے اس کی طرف ... سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

اس نے لمحاتی طور پر سوچ کر میری طرف دیکھا اور بولی۔ ''میرا خیال ہے کہ ہمیں اس معاملے سے دور ہی رہنا چاہیے، محلے کو کرنے دیں جو وہ کرتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے لیکن...... ہم مسز احسان سے کہہ چکے ہیں کہ ہم ان کا ساتھ دیں گے۔'' میں نے نرم لہجے میں کہا۔ ''اور پھر نازیہ یہ بھی تو سوچو کہ ہوسکتا ہے وہ درست ہی کہہ رہی ہوں اور اگر ان کی بات درست ہے تو حمیرا جیسی عورتوں کا شریفوں کے محلے میں رہنا مناسب نہیں ہے۔ تم کیا سمجھتی ہو کہ ایسی عورتوں کا محلوں میں رہنا مناسب ہے؟'' میں نے اس کی طرف جواب طلب نگاہوں سے دیکھا۔

وہ کچھ سوچنے لگی۔

''میرا تو خیال ہے کہ بالکل مناسب نہیں ہے۔ اس طرح کی عورتیں محلے بھر کو خراب اور بدنام کرنے کی باعث بنتی ہیں۔'' میں نے کہا۔

اس نے ایک گہرا سانس لیا اور شکستہ لہجے میں بولی۔ ''تم جانتے ہو عامر!...... زندگی بڑی تلخ ہوتی ہے۔ جن عورتوں کے آگے پیچھے کوئی نہ ہو، دنیا بھر کے مردوں کی نظریں ان پر ہوتی ہیں، وہ ان عورتوں کا جینا محال کر دیتے ہیں مجبوریوں میں جکڑی ایسی عورتوں کو میں موردِ الزام نہیں پکڑتی۔''

''دیکھو...... مجھے تمہاری بات سے کچھ اختلاف ہے۔'' میں نے ملائم انداز میں کہا۔ ''ایک تو تم نے دنیا کے سارے ہی مردوں کو ایک صف میں کھڑا کر دیا ہے، ہر مرد ایک جیسا نہیں ہوتا ہے، اچھے مرد بھی اس دنیا میں ہوتے ہیں اور دوسری بات یہ ہے کہ حمیرا جیسی عورتیں مظلومیت کی ڈھونگ رچا کر اپنا کام چلاتی رہتی ہیں۔''

''اس کا مطلب ہے کہ تم مردوں کی حمایت کرنے پر آ گئے ہو۔'' اُس نے ترچھی نظروں سے میری طرف دیکھا جن میں شکایت تھی لیکن اس کا لہجہ سخت نہیں تھا۔

میں نے دھیرے سے مسکرا کر نرمی سے کہا۔ ''تم غلط سمجھ رہی ہو، میں مردوں کی حمایت نہیں کررہا بلکہ یہی تو حقائق بتا رہا ہوں اور حمیرا جیسی عورتوں کا اصل چہرہ دکھانا چاہتا ہوں۔ یہ جان بوجھ کر مظلوم بنی رہتی ہیں جب کچھ مسز احسان جیسی تیز نظر خواتین کی نظروں میں آ جاتی ہیں۔''

''بہر حال۔'' اس نے ایک گہرا سانس لیا۔ ''مجھے حمیرا کے بچوں کا بھی خیال آتا ہے اور تمہیں بھی ہمدردانہ طور پر ان کے بارے میں سوچ کر بات کرنی چاہیے۔''

''اوہو۔'' میں نے کہا۔ ''ایک تو تم حساس بہت ہو۔ بھئی ہمیں اس کے بچوں کے بارے میں سوچنے کی کیا ضرورت ہے؟ ان کے بارے میں سوچنا تو حمیرا کا کام ہے یا پھر اس کے رشتہ داروں کا۔ یہاں تو بات صرف اتنی سی ہو رہی ہے کہ بس اگر وہ غلط عورت ہے تو اسے محلے سے نکال دیا جائے۔''

''ایک بات کہوں؟'' اس نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

''ہاں کہو؟''

''کہیں ایسا تو نہیں کہ تم صرف مجھ پر یہ ظاہر کرنے کے لیے اس کی مخالفت کررہے ہو کہ میں تم پر کوئی شک نہ کروں؟''

اس کی چبھتی ہوئی نگاہیں مجھ پر مرکوز تھیں۔

''میں کچھ سمجھا نہیں؟''

''سمجھے نہیں یا سمجھنا نہیں چاہتے؟''

''کھل کر بات کرو؟''

''دیکھو!'' وہ بولی۔ ''میں کئی بار یہ بات نوٹ کرچکی ہوں کہ تم حمیرا کو بڑی دلچسپی سے دیکھتے ہو اور اب اس کی بھرپور مخالفت کررہے ہو۔''

''اوہو۔'' میں نے ماتھے پر ہاتھ مارا۔ ''تو اس کا مطلب ہے کہ تان مجھ پر آ کر ٹوٹ گئی۔''

''تان رکنے کی بات نہیں ہے۔'' وہ بولی۔ ''تم اتنے بھرپور انداز میں عورتوں کی مخالفت تو نہیں کرتے ہو، آج مجھے حیرت ہو رہی ہے کہ تم اسے محلے سے نکلوانے پر تل گئے ہو۔''

''یہ صرف میں محلے کی بہتری کے لیے کہہ رہا ہوں، اگر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ایسی عورتیں محلے میں رہیں گی تو محلے بدنام ہو جائے گا۔" میں نے کہا۔

"سچ کہہ رہے ہو؟" اس کی طنزیہ نظر میں مجھ پر تھیں۔

"ہاں بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔"

"اگر واقعی وہ چلی گئی تو تمہیں کوئی دکھ تو نہیں ہوگا؟"

"میری کون سی رشتہ دار ہے وہ جو مجھے دکھ ہوگا؟"

"تمہارے اور مسز احسان کے خیال میں وہ جس طرح کی عورت ہے' اس سے رشتہ داری جوڑنے میں تمہیں زیادہ وقت تو نہیں لگے گا۔"

"تم خواہ مخواہ مجھے قصور وار ثابت کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔"

"اور یہ بھی تو ممکن ہے کہ تم اسے محلے سے اس لیے نکلوانا چاہتے ہو تاکہ جہاں وہ جا کر رہے' وہاں پہنچ جاؤ؟" اس نے ایک نیا نکتہ پیش کیا۔

"تو تم کیا چاہتی ہو..... کیا اسے محلے میں رہنے دیں؟ اچھا تو تم ہی اس کے بارے میں کوئی فیصلہ کرو' مجھے اس فیصلے سے اتفاق ہوگا۔" میں نے بازدری سے کہا۔

وہ خاموش ہو کر سوچنے لگی۔

"کھانا لگا دو۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

کچھ ہی دیر میں کھانے کی میز پر تھا اور وہ کھانا لگا رہی تھی۔ وہ خاموشی خاموشی سی تھی۔ وہ کھانا کھا چکی تو میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے برابر والی کرسی پر بٹھا لیا اور بولا۔ "کیا بات ہے..... کیا تم ناراض ہو؟"

"نہیں....." اس نے ایک گہرا سانس لے کر جواب دیا۔

"تو پھر؟"

"میں اُلجھی ہوئی ہوں۔"

"کیوں؟"

"حمیرا کے بچوں کی وجہ سے۔"

"ہم کیا کر سکتے ہیں ان کے لیے؟"

اُس نے ایک گہرا سانس لیا۔ "ہاں..... ہم ان جیسے لوگوں کے لیے کچھ نہیں کر سکتے' کوئی بھی کچھ نہیں کر سکتا۔ ہم سب ان کے دشمن ہیں' سارا معاشرہ..... کہاں جائیں گے وہ؟ آج یہاں سے نکال دیے جائیں گے' کہیں اور چلے جائیں گے کل وہاں سے بھی نکال دیے جائیں گے۔ چاہے حقیقت کچھ بھی میرے اس عورت کے "خواب" کا سیل لگ گیا ہے' اب اسے معاشرے میں کہیں جگہ نہیں ملے گی..... سوچو عامر!..... اس کے بچے کیا سوچتے ہوں گے؟..... اس طرح کے ماحول میں جب پرورش پائیں گے تو کل وہ کیا بنیں گے؟ مجرم؟..... قاتل؟..... ڈاکو؟..... یہ..... یہ سوچنے کی بات ہے ناں؟..... آخر ان جیسے لوگوں کا کیا مقام ہے ہمارے معاشرے میں؟"

"بھئی..... ہمیں اپنے بارے میں سوچنا چاہیے اور ویسے بھی ہم کوئی سماجی رہنما یا قوم کے خادم تو ہی نہیں کہ ایسے مسئلوں پر سوچیں' مسز احسان کر تو رہی ہیں کام' بس کافی ہے اور اگر انہوں نے حمیرا کے بارے میں پتہ لگا ہی لیا ہے کہ وہ اچھی عورت نہیں ہے تو پھر ہمیں اس کے بارے میں ہمدردانہ طور پر نہیں سوچنا چاہیے۔" میں نے کہا۔

"فرض کرو۔" وہ سوچتے ہوئے بولی۔ "وہ غلط عورت ہے۔ تو کیا کوئی ایسی صورت نہیں نکالی جا سکتی کہ اسے درست کر لیا جائے؟"

"وہ اچھی عورت نہیں ہے' تم سمجھتی کیوں نہیں ہو؟" میں نے زور دے کر کہا۔ "جو کوئی اس کی حمایت کرے گا وہ بھی بدنام ہو جائے گا۔"

"کیوں؟" اس نے جارحانہ انداز میں کہا۔ "کیوں بدنام ہو جائے گا؟..... کیا معاشرے کو سدھارنے کے لیے سوچنے والے کی یہی سزا ہے کہ اسے بھی بدنام کر دیا جائے؟"

"اوہو۔" میں نے دھیرے سے ہنس کر کہا۔ "یارا..... تم تو اتنی گہری باتیں کرتی ہو کہ سوچے نہیں سمجھ ہی نہ پالیتا۔"

"اچھا تم کھانا کھاؤ' ٹھنڈا ہو رہا ہے۔" اس نے کھانے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"تم نے کھا لیا ہے کیا؟"

"مجھے بھوک نہیں ہے۔"

میں سمجھ گیا کہ اس نے حمیرا والے معاملے کو زیادہ سنجیدگی سے لے لیا ہے اس لیے بولا۔ "دیکھو!..... تم کھانا کھاؤ' پھر ہم حمیرا کے بارے میں تسلی سے بات کرتے ہیں۔"

"نہیں..... بھوک نہیں ہے مجھے۔" وہ بولی۔

"اوہو..... لو کھاؤ۔" میں نے ایک پلیٹ اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ پھر اس میں سالن ڈال دیا اور روٹیاں اس کے سامنے رکھ دیا۔ اس نے آہستہ آہستہ کھانا شروع کر دیا۔ میں بھی کھانے لگا۔

کھانے سے فارغ ہو کر ہم ڈرائینگ روم میں آ کر بیٹھ گئے۔ اسی وقت فون کی بیل بجی۔

میں اٹھنے لگا تو نازیہ نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "تم بیٹھو میں دیکھتی ہوں۔"

اس نے کونے میں ٹیبل پر رکھے فون کا ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا اور "ہیلو" کہا۔ "پھر وہ ہم سی بات چیت کرنے لگی۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ مسز احسان کا فون ہے۔ اس نے ریسیور کریڈل پر رکھا اور واپس میرے قریب آ کر بیٹھتے ہوئے بولی۔ "مسز احسان کا فون تھا۔"

"کیا کہہ رہی تھیں؟" میں نے پوچھا۔

"بتا رہی تھیں کہ انہوں نے باقی لوگوں سے بھی بات کر لی ہے اور صبح محلے کے کچھ لوگ حمیرا کے گھر جائیں گے اور اسے محلہ چھوڑنے کے لیے کہیں گے۔" اس نے افسردہ لہجے میں کہا۔ "اور وہ یہی بھی کہہ رہی تھیں کہ اگر ناری ضرورت پڑی تو وہ ہمیں بھی ساتھ لے جائیں گے۔"

"تم انہیں منع کر دیتیں کہ ہم نہیں جائیں گے۔" میں نے کہا۔

"نہیں..... میں جاؤں گی۔" وہ بولی۔

"تم؟" میں نے حیرت سے کہا۔ "تم جا کر کیا کرو گی؟"

تم..... تم چھوڑ دو یہ معاملہ مسز احسان پر۔" مجھے خوشی تھی کہ کہیں نازیہ وہاں جا کر کوئی گڑبڑ نہ کر دے۔

"نہیں..... میں جاؤں گی۔" وہ بولی۔

"اوکے..... پھر میں بھی چلوں گا۔ تمہارے ساتھ۔"

"ٹھیک ہے..... چلنا۔"

اگلے روز چھٹی تھی اس لیے مجھے آفس جانے کی فکر نہ تھی اور میں یہ سوچ رہا تھا کہ حمیرا والا معاملہ کل ہی نپٹ جائے تو اچھا ہے' میں نہیں چاہتا تھا کہ میری غیر موجودگی میں نازیہ وہاں جائے اور کوئی ایسی ویسی بات کر بیٹھے جو دوسروں کے لیے ناگوار ہو۔

دوسری صبح دس بجے کے قریب مسز احسان آ گئیں۔ علیک سلیک کے ہوا نہوں نے ہم سے کہا۔ "میں چاہتی ہوں کہ اگر آپ لوگوں میں سے کوئی ایک یا دونوں میرے ساتھ حمیرا کے گھر چلیں تو مناسب رہے گا' میں نے محلے کے کچھ اور لوگوں کو بھی کہہ دیا ہے۔"

"ٹھیک ہے' ہم چلتے ہیں۔" نازیہ بولی۔

ہم لوگ گھر سے باہر آ گئے اور پھر ذرا دیر میں مسز احسان نے محلے کے کچھ لوگوں کو جمع کر لیا اور ہم حمیرا کے گھر پہنچ گئے۔ یہی دیکھ کر وہ کچھ نروس ہو گئی۔ پھر اس نے خود کو سنبھالتے ہوئے ہمیں بٹھایا۔ "جی..... کیسے آنا ہوا آپ لوگوں کو؟" اس نے سب پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

"ہم تم سے کچھ اہم بات کرنے آئے ہیں۔" مسز احسان نے ترش لہجے میں اس سے کہا۔

"اہم بات؟" وہ بولی۔

"ہاں....."

"جی فرمائیے؟"

"دیکھو بھئی!..... ہم محلے والے چاہتے ہیں کہ تم جلد از جلد یہ محلہ چھوڑ دو۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"کیوں جی؟" حمیرا نے حیرت سے کہا۔

"اس لیے کہ تم ایک لاوارث اور مجبور عورت ہو' تمہارے لیے اس محلے میں تو کیا' اس پورے معاشرے میں کوئی جگہ نہیں ہے۔" مسز احسان کے کچھ کہنے سے قبل ہی نازیہ نے اس سے کہا۔ مسز احسان نے نازیہ کی طرف شکایتی نظروں سے دیکھا۔

"نازیہ!..... پلیز مسز احسان کو بات کرنے دو۔" میں نے نرم لہجے میں نازیہ سے کہا۔

اُس نے ایک گہرا سانس لیا اور گویا خون کے گھونٹ پیتے ہوئے مسز احسان سے بولی۔ "ٹھیک ہے آپ کرلیں بات۔"

"دیکھو!" مسز احسان نے حمیرا کی طرف دیکھ کر کہا۔ "یہ شریفوں کا محلہ ہے اور تمہارے بارے میں ہم نے پتہ لگالیا ہے کہ تم کیا کرتی رہی ہو..... بہتر یہی ہے کہ تم آج ہی یہ محلہ چھوڑ دو۔"

"آپ لوگوں کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے جی۔" حمیرا نے کمزور لہجے میں کہا اور اس کا کمزور لہجہ اس بات کی غمازی کرتا تھا کہ اس کے بارے میں کو کچھ کہا گیا ہے وہ درست ہے۔

"ہمیں کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی ہم نہ تمام باتوں کی تصدیق کی ہے' اس کے بعد ہی ہم یہاں آئے ہیں۔" مسز احسان نے کہا۔

"لیکن جی..... میں....."

"دیکھو!" مسز احسان نے حمیرا کی بات کاٹ دی۔ "اگر تم شرافت سے نہیں جاؤ گی تو تمہیں دھکے دے کر نکالا جاسکتا ہے۔"

"کوئی اسے دھکے نہیں دے سکتا۔" اچانک نازیہ نے چیخ کر کہا۔

مسز احسان اور دیگر لوگوں نے اس کی طرف دیکھا۔

"میرا خیال ہے کہ اب ہم لوگ یہاں سے چلتے ہیں۔" میں نے کہا۔ میں چاہتا تھا کہ اس سے قبل کہ نازیہ زیادہ جذباتی ہوجائے' ہم لوگ یہاں سے چلے جائیں۔

"ٹھیک ہے' آپ لوگ جائیں۔ ہم اس سے بات کرلیتے ہیں۔" مسز احسان میری طرف دیکھ کر بولیں۔

"نہیں..... میں نہیں جاؤں گی' جو بات کرنی ہے میرے سامنے کی جائے۔" نازیہ یہ سخت لہجے میں بولی۔

"کیا تم چاہتی ہو کہ اسے اس محلے سے نکالا جائے؟" مسز احسان نے اس سے ترش انداز میں کہا۔

"تو پھر اسے دوسرے محلے والے بھی نکال دیں گے' یہ کہاں جائے گی؟" نازیہ بولی۔

"کہیں بھی جائے' یہ ہمارا مسئلہ نہیں ہے۔" مسز احسان نے تنک کر کہا۔

"یہی تو مسئلہ ہے۔" نازیہ دانت پیستے ہوئے بولی۔ "تم لوگوں کے پاس ان جیسوں کے لیے صرف یہی حل ہے کہ انہیں محلے سے نکال دیا جائے لیکن کیا محلے سے نکال دینے سے یہ مسئلہ حل ہوسکتا ہے؟ یہ رہیں گے تو اسی معاشرے میں ناں؟ کیا صرف یہ محلہ ہی ہمارا ہے' یہ معاشرہ ہمارا نہیں ہے؟"

"تو پھر کیا کریں تم ہی بتاؤ؟" مسز احسان فوراً بولیں۔

"دیکھو!..... اگر یہ عورت کچھ کرتی ہے تو یہ اس کی مجبوری بھی ہوسکتی ہے' اس کی مجبوریوں کو ختم کرنے کا کوئی راستہ نکالا جائے تو زیادہ بہتر نہیں ہے' اگر اس کی مجبوریاں ختم ہوجائیں گی تو کیا یہ اچھی زندگی نہیں گزار سکتی؟" نازیہ نے مسز احسان اور دیگر لوگوں کی طرف دیکھا۔ کئی لوگوں کے سر جھک گئے کیوں کہ ان کے پاس نازیہ کے سوال کے جواب نہیں تھا یا پھر وہ درحقیقت اس مسئلے پر مزید بات چیت نہیں کرنا چاہتے تھے۔ مسز احسان بھی کچھ جھینپ گئی تھیں' انہوں نے نازیہ سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

"دراصل..... یہ لوگ خود ہی اچھی زندگی نہیں گزارنا چاہتے ہیں۔"

"یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو؟" نازیہ بلاتوقف بولی۔

"ایسے کہ اگر یہ سدھرنا چاہیں تو سدھر سکتے ہیں۔ آخر یہ سب کام کیے بغیر بھی تو زندگی گزاری جاسکتی ہے۔" مسز احسان نے کہا۔

"لیکن میں پھر یہی کہوں گی کہ یہ بھی تم کیسے ہوسکتی ہو۔ کیا معلوم اس نے سدھرنے کی کوشش کی ہو لیکن..... اسے سدھرنے نہ دیا گیا ہو۔"

"وہ کس طرح؟" مسز احسان نے اس کی طرف دیکھا۔

"لوگ مجبوریوں سے بھی تو کھیلتے ہیں نا؟ خاص طور پر مرد؟" نازیہ نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"تم خواہ مخواہ بات کو بڑھا رہی ہو۔" مسز احسان نے بےزاری سے کہا۔

"ہاں بی بی!..... بات کو نہ بڑھاؤ' مسز احسان جو کہہ رہی ہیں' جو کر رہی ہیں وہ درست ہے' اس عورت کو محلے سے نکال دیا جانا ہی بہتر ہے۔" ایک بزرگ نے نازیہ کو سمجھانے والے انداز میں کہا۔

"آپ بھی یہ کہہ رہے ہیں؟" نازیہ نے شاکی نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔

انہوں نے ایک گہرا سانس لے کر کہا۔ "ہاں بھئی دراصل ہم لوگوں کے پاس اس کے علاوہ کوئی حل بھی نہیں ہے۔"

"تو حل ڈھونڈا جاسکتا ہے۔" نازیہ بولی۔

"اتنا وقت کس کے پاس ہے؟"

"تو وقت نکالا جاسکتا ہے۔"

"شاید تمہارے پاس وقت ہو لیکن باقی لوگوں کے پاس نہیں ہے۔ بہتر ہے کہ اس معاملے کو جلد از جلد ختم کیا جائے زندگی کے اور مسائل بھی ہیں۔" ایک محلے دار عورت ساجدہ نے نازیہ سے کہا۔

نازیہ نے گویا خون کا گھونٹ پیا اور میری طرف دیکھ کر بولی۔ "چلو گھر چلو..... ان لوگوں کے پاس کسی کے لیے ہمدردانہ طور پر سوچنے کے لیے وقت ہی نہیں ہے۔"

"ہاں ٹھیک ہے چلو۔" میں نے کہا۔ میں تو خود چاہتا تھا کہ کسی طرح نازیہ کو جلد از جلد یہاں سے لے جاؤں۔

ہم دونوں اٹھ کر حمیرا کے گھر سے باہر آگئے۔

"عجیب قسم کے لوگ ہیں یہ..... یہ بڑائی کو ختم کرنے کی بجائے بڑے بڑے لوگوں کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔" وہ غصے میں پھنک رہی تھی۔

"بس ان لوگوں کو سوچ کا یہی انداز ہے۔" میں نے اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔

"تم..... تم بھی تو ان ہی کے انداز میں سوچتے ہو۔" اچانک اس نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ یہ اُس کی عادت تھی کہ وہ اکثر اس طرح مجھے نشانہ بناتے رہتی تھی۔ میں بھی اسی کی عادت کا عادی ہوگیا تھا اس لیے نرم لہجے میں بولا۔

"میرا خیال ہے کہ ہم گھر چل کر اس معاملے پر بات کرلیتے ہیں۔"

میں اُسے گھر لے آیا' اُسے ٹھنڈا پانی پلایا اور بولا۔ "بس اب چھوڑو اس معاملے کو۔"

"تم..... تم نے بھی ایک لفظ میرے حمایت میں نہیں کیا؟" اس نے شکایت کی لیکن اب کے لہجے میں وہ پہلے والی حدت نہیں تھی۔

"بس..... میں سوچ رہا تھا کہ تم ہی اچھا بول رہی ہو۔" میں نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ اور لائٹر نکالتے ہوئے کہا۔

وہ ایک گہرا سانس لے کر سوچنے لگی۔ میں نے سگریٹ سلگالیا۔

"دیکھ لینا وہ اسے محلے سے دم نکال کر ہی دم لیں گے۔" اس نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

"دیکھو!..... یہ دنیا ایسے لوگوں سے بھری پڑی ہے۔ میں..... تمہاری اس بات سے اتفاق کرتے ہوں کہ یہ لوگ مظلوم ہوتے ہیں اور حالات انہیں اس مقام پر لائے ہوتے ہیں لیکن تم خود سوچ کر آخر ہم ایسے کتنے لوگوں کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مدد کر سکتے ہیں؟ یہ دنیا..... یہ دنیا تو ایسے لوگوں سے بھری پڑی ہے تم ایک کام کرو۔"

اُس نے میری طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

"تم اس مسئلے پر ایک افسانہ لکھو..... یہ ایک ایسا المیہ ہے جس پر ایک اچھا افسانہ لکھا جا سکتا ہے یا پھر تم اس نظر کو کسی طرح پینٹ کر لو۔" وہ کبھی بھکارا افسانے میں لکھتی تھی اور اُسے پینٹنگ کا شوق بھی تھا۔

"ہاں..... میں اس پر افسانہ لکھتی ہوں۔" اس نے ذرا سوچ کر مجھ سے اتفاق کیا۔

میں نے اطمینان کا ایک گہرا سانس لیا۔

اُس شام ہمیں اطلاع ملی کہ حمیرا اپنے بچوں کو لے کر کہیں اور چلی گئی ہے۔ اس بات کا نازیہ نے بہت اثر لیا۔

"میرا خیال ہے کہ ہم لوگ شاپنگ کرنے چلیں؟" میں نے اُس کا ذہن بٹانے کے لیے کہا۔ وہ شاپنگ پر کرنے کی بڑی شوقین تھی لیکن وہ بولی۔

"نہیں..... میرا موڈ نہیں ہے۔"

"اچھا چلو..... کہیں باہر ڈنر کریں؟"

"نہیں..... میں اس وقت تنہا رہنا چاہتی ہوں۔" پلیز مجھے تنہا چھوڑ دو۔" اُس کے لہجے میں ڈکوتھا۔

میں کچھ دیر کے اصرار کے بعد اُسے اپنی گاڑی میں لے کر روانہ ہو گیا۔ میں نے اُسے شاپنگ کروائی اور پھر ہم ایک ریسٹورنٹ میں آ کر بیٹھ گئے۔ یہاں ہم نے ڈنر منگوالیا۔ اب تک وہ اُلجھی ہوئی تھی۔

"پلیز نازیہ!..... اب حمیرا والے واقعے کو بھول جاؤ' بھولنے کی کوشش کرو۔" میں نے کہا۔

اُس نے ایک گہرا سانس لے کر اثبات میں سر ہلایا۔

"تو تم اس مسئلے پر افسانہ لکھو گی یا پینٹنگ بنانے کا ارادہ رکھتی ہو؟" میں نے اُسے باتوں میں لگانے کی غرض سے کہا۔

"افسانہ لکھوں گی۔" وہ بولی۔

"یہ اچھا بات ہے' پینٹنگ میں اس المیے کی وضاحت ذرا مشکل ہو سکے گی' میرا مطلب ہے کہ اس میں وقت لگ جائے گا اور افسانہ جلد لکھا جا سکتا ہے۔"

"ہاں....." اس نے تائیں انداز میں سر ہلایا۔

☆

اگلی صبح حسب روایت میں نے نازیہ کو الوداعی کلمات کہے اور بولا۔ "میرا خیال ہے کہ تم اب افسانہ لکھنا شروع کرو گی؟"

"ہاں....." اس نے اثبات میں سر ہلا کر کہا۔

"ٹھیک ہے..... آج شام شاپنگ پر چلیں گے' کل تم نے موڈ سے شاپنگ نہیں کی۔" میں نے کہا۔ اب اس کا موڈ کچھ بہتر تھا۔

"ٹھیک ہے۔"

میں اپنی گاڑی میں روانہ ہو گیا اور اپنے کام میں لگ گیا۔

☆

لنچ کے بعد میں اپنے مخصوص پرائیویٹ فلیٹ میں آ گیا۔ مسز احسان وہاں پہلے سے موجود تھیں' انہیں میں نے فلیٹ پر پہنچنے کے لیے فون کر دیا تھا۔ میں نے انہیں فوراً بانہوں میں بر لیا اور ان پر بوسوں کی بارش کر دی۔

"اُفوہ..... آج تم بڑے بے چین ہو رہے ہو۔" انہوں نے خود کو میری گرفت سے آزاد کروانے کی کوشش کی۔

"کل تو تم غضب ڈھا رہی تھیں جب گھر پر آئی تھیں' میرا تو دل چاہ رہا تھا کہ اس وقت تمہیں اپنی بانہوں میں لے لوں۔" میں نے کہا۔

"جھوٹ بولتے ہو تم۔" وہ ادا سے بولیں۔

"سچ کہتا ہوں۔" میں نے انہیں بھینچتے ہوئے کہا۔ وہ بھی مجھ سے والہانہ انداز میں لپٹ گئیں۔ ہمارے تعلقات گزشتہ دو سال سے چل رہے تھے۔ مسز احسان ہمیں اچھے اسمارٹ آدمی تھے لیکن میں سز احسان کو پسند آ گیا تھا۔

☆☆☆

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بہن

ڈاکٹر صفیہ سلطانہ صدیقی

ڈاکٹر کو اس نے بتایا تھا
میرے اندر آگ لگی رہتی
ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ ہر چیز
مجھے ملے دوسروں کو نہیں۔ سب حسن'
سب دولت' عزت' شہرت' تعلیم سب.....
سب پر میرا حق ہو۔ نعیمہ کا یا کسی اور کا نہیں۔ امی
کا بھی نہیں اور..... اور بھیا کی منگیتر کا بھی نہیں۔"
وہ نہایت سفاکی سے بولی۔

محبت' نفرت میں بگڑتے ہوئے زندگی کے کرداروں کی کہانی

سامعہ اور نعیمہ میں صرف دو برس کا فرق تھا۔ سامعہ نے میٹرک پاس کر کے پڑھائی چھوڑ دی تھی جب کہ نعیمہ نے گریجویشن کر لیا تھا۔ ابھی اس کا رزلٹ آیا ہی تھا کہ پڑوسن خالہ وحیدہ نے اپنے بیٹے اشرف کے لیے نعیمہ کا رشتہ مانگ لیا۔

نعیمہ اگرچہ شازیہ محمود کی چھوٹی بیٹی تھی مگر انہوں نے سامعہ کی شادی یا منگنی کا انتظار کیے بغیر نعیمہ کے لیے ہاں کر دی۔ دراصل انہیں سامعہ کی فکر تو بہت تھی مگر انہیں اتنی امید نہ تھی کہ اس کو آسانی سے کوئی اچھا رشتہ مل سکے گا۔ وجہ یہ تھی کہ سامعہ نہایت معمولی صورت کی لڑکی تھی۔ وہ اس معاملے میں اس قدر حساس ہو گئی تھی کہ اس نے اسکول کے چند لڑکوں اور دو لڑکیوں کی طرف سے ایک دو فقرے کسے جانے پر پڑھائی چھوڑنے کا فیصلہ کر ڈالا تھا اور واقعی اسکول جانا چھوڑ دیا تھا' لیکن اس کے والد محمود صاحب نے بڑی کوششوں کے بعد اسے گھر بیٹھے امتحان دینے کے لیے راضی کر لیا تھا۔ حالاں کہ اسے اب امتحان والے دن بھی اسکول کے طلبا و طالبات کی شکل دیکھنا گوارا نہ تھا مگر مجبوری یہ تھی کہ وہ اپنے پاپا سے وعدہ کر چکی تھی اور اسے امتحان دلوانے کے لیے محمود صاحب کو بڑے پاپڑ بیلنے پڑے تھے۔

اسکول کی پرنسپل نے حاضری کم رہ جانے کا اعتراض اٹھایا اور محمود صاحب نے پورے پندرہ دن لگا کر انہیں اس سنگین مسئلے کو حل کرنے پر قائل کیا تھا۔ شازیہ محمود کے لیے دوہری مصیبت ہر وقت تیار رہتی تھی۔ سامعہ اپنی کم صورتی کا بدلہ لینے کے لیے بات بے بات نعیمہ پر چڑھ دوڑتی تھی۔ نتیجہ کبھی یہ نکلتا کہ نعیمہ بھی زبان درازی کرتی یا پھر رو دھو کر چپ ہو جایا کرتی تھی۔ ماں اسے اکثر سمجھاتی کہ بڑی بہن سے نہ اُلجھا کرو۔

"امی! میں کب لڑتی ہوں؟ آپی مجھ سے لڑتی ہیں۔" وہ روتے ہوئے کہتی۔

”کوئی بات نہیں بیٹی! وہ بڑی بہن ہے تمہاری! اس کا حق ہے ڈانٹ دینا۔“ وہ جان بوجھ کر اصل وجہ ہضم کر جاتیں اور اسی کو سمجھاتی رہتیں۔ اس طرح سامعہ کا غصہ کم ہو جاتا تھا۔

ایک روز اتنی چھوٹی سی بات پر اس کا پارہ ہائی ہو گیا تھا۔ سامعہ پڑھائی میں مصروف تھی کہ نعیمہ نے اس کو مار کر اٹھا لیا۔

”آپی! میں ہیڈنگز لکھ کر ابھی واپس کر دیتی ہوں۔ میرا ختم ہو گیا ہے؟“ نعیمہ نے خوشامد سے کہا اور ڈرتے ڈرتے [illegible] دیکھ رہی تھی۔

”مجھے کیا دیکھ رہی ہے ایسے؟“ وہ بھڑک اٹھی اور نعیمہ کے ہاتھ سے مار کر چھین لیا۔ ”خبردار! جو میری چیزوں کو ہاتھ لگایا۔ آٹھویں جماعت میں ہے اور لگتا ہے کہ بی اے کر رہی ہے۔ میٹرک میں آؤ گی تو معلوم ہوگا کہ محنت کیسے ہوتی ہے اور کس طرح پرچہ کرنا ہوتا ہے بورڈ کا۔“ وہ غصے میں بے تکی بولنے لگتی تھی۔ ایسی باتیں تو اصل معاملے یا موضوع سے قطعاً غیر متعلق ہی ہوا کرتی تھیں۔ نعیمہ افسردہ ہو کر چپ چاپ واپس چلی گئی اور اپنے اکلوتے بھائی احمر بھیا کو ٹرائی کرنے لگی۔

نعیمہ بات بے بات سامعہ کی ڈانٹ پھٹکار کے ساتھ ساتھ ہلکے پھلکے تشدد کا نشانہ بھی بنتی چلی آئی تھی جس میں شدت نہ آنے کا اصل سبب یہ تھا کہ شازیہ محمود مسلسل اس کے اندر جلنے والے الاؤ کو ٹھنڈا کرتی رہتی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے کہیں آنا جانا ہی چھوڑ دیا تھا اور اگر مجبوراً کہیں جانا پڑ جائے تو دونوں میں سے کسی ایک کو ساتھ لے جانا ضروری ہوتا تھا۔ اس وقت پھر ایک نیا مسئلہ کھڑا ہو جایا کرتا تھا۔

”امی! میں نہیں جاؤں گی، میرا موڈ نہیں ہے۔“ سامعہ صاف کہتی۔ اس کو ٹیلی ویژن دیکھنے کے آگے کوئی کام سیر تفریح کچھ بھی اچھا نہ لگتا تھا۔ نیز وہ لوگوں میں بیٹھتے ہوئے گھبراتی تھی، اس لیے شازیہ محمود نعیمہ کو ساتھ لے کر جاتیں۔ اس پر سامعہ کو اعتراض ہوتا۔

”یہ لاڈلی ہے آپ کی؟ خوش شکل ہے نا اس لیے اسے لیے لیے گھومتی ہیں تاکہ لوگ آپ کے شاہکار کی تعریف کریں۔“ وہ جلی کٹی سناتی۔

”پھر تم چلو! کیا فضول بکواس کرتی رہتی ہو؟“ وہ آہستگی سے اسے ڈانٹتی۔

”میں......؟ مجھے...... مجھے لے جانا چاہتی ہیں آپ یا اوپری دل سے کہہ رہی ہیں؟“ وہ ماں سے جھگڑنے لگتی اور پھر رو پڑتی۔ شازیہ محمود بے بسی سے اسے دیکھنے لگتیں اور [illegible] کہ جانے کا ارادہ [illegible] سامعہ کو سمجھا سمجھا کر تھک چکی تھیں مگر وہ کچھ سننے کی روادار نہ تھی۔ وہ بار بار اللہ تعالیٰ سے شکوے کرتی۔

”وہ مجھے ذرا سا حسن دے دیتا تو اس کا کیا بگڑ جاتا؟“ سامعہ چیختی۔

”بیٹی! یہ تو اللہ کی آزمائش ہوتی ہے وہ کمی زیادتی کر کے ہر طرح سے اپنے بندوں کا امتحان لیتا ہے اور جب ہم جنت میں جائیں گے تو...... تو ہم سب خوب صورت ہو جائیں گے۔“ وہ اپنی بچی کو دھیمے دھیمے لہجے میں نہایت محبت کے ساتھ سمجھاتیں۔

”آپ تو پہلے بھی ٹھیک ہیں اور آپ نے اپنی شکل نعیمہ کو دے دی۔ مجھے کیا ملا؟“

”پھر وہی مرغے کی ایک ٹانگ؟“ وہ زچ ہو کر بولتیں۔

”اگر آپ بدشکل ہوتیں تو میں آپ سے پوچھتی؟“ وہ ماں سے گستاخی کر کے کہتی۔

”لوگ معذور بھی ہوتے ہیں، اندھے بھی تو ہوتے ہیں۔“ وہ دلیل دیتیں۔

”اندھی ہوتی میں...... لنگڑی ہوتی مگر بدشکل نہیں۔“ وہ چیختی۔

”تمہیں سمجھانا ہی فضول ہے۔“ شازیہ بیگم مایوسی سے کہتیں۔ ”اسے علاج کی ضرورت ہے شاید۔“ محمود

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

صاحب اکثر کہتے تھے اور پھر انہوں نے ماہرِ نفسیات سے رجوع بھی کیا۔

ڈاکٹر کو اس نے بتایا تھا میرے اندر آگ لگی رہتی ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ ہر چیز مجھے ملے دوسروں کو نہیں۔ سب حسن‘ دولت‘ عزت‘ شہرت‘ تعلیم سب...... سب پر میرا حق ہو۔ نعیمہ کا یا کسی اور کا نہیں۔ امی کا بھی نہیں اور...... اور بھیا کی منگیتر کا بھی نہیں۔“ وہ نہایت سفاکی سے بولی۔

ڈاکٹر نے اسے بہت کچھ سمجھایا۔ دوا بھی دی تھی مگر سامعہ نے اپنا طرزِ فکر ہرگز نہ بدلا۔ خالہ امی اس سے بہت پیار کرتی تھیں مگر وہ انہیں بھی چٹکیوں میں اڑا دیتی۔

”میرا کیا قصور ہے بھلا؟“

”کسی بہرے گونگے یا اندھے کا کیا قصور ہوتا ہے؟“ وہ سمجھاتیں۔

”میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ سب کچھ مجھے ملے۔“ وہ ہٹ دھرمی کے لہجے میں کہتی۔

”بیٹی! فرعون اور قارون تو غرق ہو جاتے ہیں...... دھنس جاتے ہیں، تم کس کے پیچھے چلنا چاہتی ہو؟“ وہ تاسف سے کہتیں۔

”خالہ امی! پاپا کی طرح نصیحت کا پٹارا نہ کھولا کریں۔ ذرا سا حسن مل جاتا تو اس کے خزانے میں کمی نہ آ جاتی۔“ وہ بڑی بے رخی سے کہہ دیتی۔

”ہائے اللہ...... ! اب تم اس تک بھی پہنچنے لگیں؟ قسم سے ہماری اماں نے تو کبھی ناشکری نہ کی۔ پچیس برس بڑے تھے ان سے ہمارے ابا اور دوسری شادی تھی ابا کی۔ سوتیلی اماں نے تنگ بھی بڑا کیا تھا ہماری اماں کو مگر مجال ہے جو کبھی ہم نے انہیں دکھ مناتے دیکھا ہو۔ ہر حال میں شکر کرتے دیکھا۔ کبھی دکھی ہوتیں تو جانماز بچھا لیا کرتیں اور چند آنسو دعا کے دوران نکلتے۔ بس...... شانت ہو جاتیں تھیں ایمان سے...... بالکل پرسکون۔“ وہ خوب صورت لہجے میں کہتیں۔

”بس بھی کریں...... ان کا تو نام بھی نہ لیں۔ نانی اماں نے مجھے شکل دے دی ہے اپنی۔“ وہ دکھی ہو جاتی۔

آخرکار سبھی نے اسے سمجھانا چھوڑ دیا، مگر اب بھی مسئلہ بہرحال اپنی جگہ باقی تھا کہ وہ نعیمہ کی دشمنی کر ہرگز ترک نہ کرتی تھی۔ اب اسے یہ اطلاع مل چکی تھی کہ نعیمہ گریجویٹ ہو گئی ہے لہٰذا اس نے غصے میں آ کر اس کے بال کھینچے تھے اور اس کے ہاتھوں پر اپنے لمبے لمبے ناخن گاڑ دیے تھے۔ نعیمہ بے انتہا سسک رہی تھی۔

”بیٹی اب چپ بھی ہو جا!“ شازیہ بیگم نے بے بسی سے نعیمہ کو مخاطب کیا۔

”امی! کیسے چپ ہو جاؤں؟ دیکھیں...... دیکھیں تو سہی آپی نے کتنا زور سے نوچا ہے۔ اب یہ داغ ہرگز نہ جائیں گے۔ کبھی بھی نہیں۔ پچھلی مرتبہ کے نشان بھی نہیں گئے۔ میری سب سہیلیاں پوچھتی رہتی ہیں کہ یہ تمہارے ہاتھوں پر کیسے نشان ہیں اور مجھ سے بات نہیں بنائی آتی۔“ وہ پھر نئے سرے سے رونے لگی اور ماں نے سرد آہ بھری۔

”ہائے میرے رب...... میں کیا کروں۔ اس کی منگنی کیسے ہو سکے گی؟“ وہ خود کلامی کرنے لگیں۔

”منگنی...... امی! میری شادی ہوئی تو بلکہ ہو ہی نہ سکے گی۔ آپی مجھے پہلے ہی خون میں نہلا دے گی۔ سرخ جوڑا پہنا دے گی خون کا۔“ وہ اتنا بولنے کے لیے چپ ہوئی اور پھر سے رونے لگی۔

”آخر میں کیا کروں؟“ وہ بے بسی سے سوچنے لگیں۔

آپی کو ہاسپٹل میں ڈال دیں۔ یہی حل ہے بس۔“ وہ اپنے ہاتھوں کے زخم دیکھتے ہوئے بولی۔

”نہیں بیٹی! خود غرض نہ بنو۔ بہن ہے وہ تمہاری!“

”بہن...... ایسی ہوتی ہے؟“ وہ پھر سسکنے لگی۔

☆

آمنہ‘ نعیمہ کی کلاس فیلو تھی۔ دونوں نے فرسٹ ڈویژن لی تھی، لیکن آمنہ مٹھائی لے کر پہلے اس کے گھر آ گئی تھی۔

عام حالات میں تو نعیمہ خوشی سے نہال ہو جاتی کیوں کہ آمنہ بہت ہی کم کہیں جاتی تھی' لیکن اس کی اور نعیمہ کی بڑی گہری دوستی تھی' لہٰذا اس نے بڑی مشکل سے نکلنے کا یہ ایک موقع نکال ہی لیا تھا۔ نعیمہ سے وہ اپنی ہر بات پر پریشانی شیئر کرتی تھی اور پرسکون ہو جاتی تھی۔ اب کالج کی مصروفیت ختم ہو گئی تھی تو آمنہ بڑی اداس تھی۔ نعیمہ نے جلدی جلدی منہ دھویا اور اپنی عزیز سہیلی سے ملنے چلی آئی۔ اسے نئی خبر سنانے کی بھی بے چینی تھی۔

رسمی گفتگو کے بعد آمنہ نے اس سے پوچھا۔ ''تمہاری آنکھیں سوج رہی ہیں؟''

''بس ویسے ہی۔ تم سناؤ کیا حال ہے امی ٹھیک ہیں تمہاری؟'' نعیمہ نے جلدی سے اس کو ٹال دیا۔

''ٹھیک نہیں ہیں' بیمار ہیں۔'' وہ بجھے بجھے دل سے بولی۔

''اور چھوٹی بہن؟''

''وہ ٹھیک ہے۔'' آمنہ نے مسکرا کر کہا۔

''یار! میں نے یہ نہیں پوچھا۔ مجھے دکھ ہوتا تھا کہ امتحان میں بھی گھر کے کام سے تم کو چھٹی نہیں ملی' حالاں کہ حلیمہ کی چھٹیاں تھیں۔'' وہ احتجاجی انداز سے بولی۔

''کم آن یار! چھوٹی ہے وہ تو۔'' آمنہ مسکرائی۔ ''بے پروا بھی بہت ہے۔''

''جی...... ؟ کتنی چھوٹی ہے؟ بھلا اب تھرڈ ایئر میں آئے گی اور تم کہہ رہی ہو......'' وہ برہمی سے بولی۔

''میں بڑی ہوں۔ میرا فرض ہے کہ...... کہ میں اس کا ہر طرح خیال رکھوں۔'' وہ مسکرا دی۔

''ہائے...... حلیمہ کتنی خوش قسمت ہے۔'' اس نے اپنی ہتھیلیوں کی پشت پر نگاہ جمائی جہاں ادھڑی ہوئی کھال میں پھر سے ذرا سا خون رس رس کر اکٹھا ہو گیا تھا۔

(''ہونہہ...... بڑی آئی باتیں بنانے والی' جیسی خود ہے ویسی اس کی سہیلیاں ہیں۔'' سامعہ جو کھڑکی کی جھری میں کان اور آنکھیں لگائے کھڑی تھی بڑبڑانے لگی۔ اس کی عادت تھی کہ اکثر وہ چھپ کر باتیں سنا کرتی تا کہ اسے اختلافی نکات مل سکیں۔ گھر میں اس پر کوئی چیک نہ تھا۔ سب اس سے نرمی برتتے اور اسے برداشت کرتے تھے۔ اس لیے اس کی غلط عادات روک ٹوک نہ ہونے کی وجہ سے حد سے گزرتی چلی جا رہی تھیں اور وہ خود کو ملنے والی رعایتوں کا بڑا ناجائز فائدہ اٹھانے لگی تھی۔)

دونوں سہیلیاں باتیں کرنے میں مگن تھیں۔ آمنہ ہنس پڑی۔ ''نہ جانے نعیمہ تم مجھ کو اتنا اچھا کیوں سمجھتی ہو؟''

''اس لیے...... کہ......'' نعیمہ نے ایک سرد آہ بھری اور خاموش ہو گئی۔

''ہاں بتاؤ نا؟'' وہ الجھے الجھے لہجے میں اصرار کرکے پوچھنے لگی۔

''اس لیے کہ میری آپی تو تم جیسی نہیں ہیں۔ تمہاری بھی تو کتنی دوست ہیں اسی طرح آپی کی بھی ہوتیں اگر وہ خوش مزاج اور ہنس مکھ ہوتیں...... حاسد نہ ہوتیں۔''

''ایسے نہیں کہا کرو۔ بڑی بہن ہیں وہ!'' آمنہ نے پیار سے کہا۔

''ہونہہ...... ایسی ہوتی ہے بڑی بہن! مجھ سے کام بھی اتنا کراتی ہیں اور...... اور......'' وہ چپ ہو گئی۔

(''ہاں۔ بول تو سہی۔ آگے بھی بتا۔ واپس آئے گی تو اس کا منہ بھی نوچ لوں گی میں۔'' سامعہ نے پھر زیر لب کہا اور دانت کچکچانے لگی۔)

''چلو چھوڑو یار! یہ بتاؤ تم ایڈمیشن لو گی یونی ورسٹی میں؟'' آمنہ نے موضوع بدل دیا۔

''نہیں۔ نہیں لے سکوں گی؟'' وہ قدرے شرما کر بولی۔

''وہ کیوں؟'' آمنہ نے بے چینی سے پوچھا۔

''بعد میں بتاؤں گی۔ پہلے تم بتاؤ؟ تم تو ضرور لو گی ایڈمیشن...... ہے نا؟'' نعیمہ بولی۔

''ہاں پکا ارادہ تھا میرا' مگر......'' وہ ٹھنڈی سانس بھر کے رہ گئی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

''مگر...... ؟'' نعیمہ نے پوچھا۔

''مگر یہ کہ...... امی بیمار رہنے لگی ہیں' حلیمہ چھوٹی ہے۔'' اس نے پھر پیار چھلکاتے لہجے میں حلیمہ کو چھوٹی کہا تو نعیمہ کی آنکھوں میں حسرت سی در آئی۔

''کتنی خوش نصیب ہے حلیمہ!'' وہ پھر بے ساختہ بولی۔ اس لیے کہ آج اس کا دل بہت ہی زیادہ دکھی تھا۔ اسے بات بات پر رونا آ رہا تھا کیوں کہ اس کے ہاتھ خراب ہو گئے تھے۔

''ایک بات پوچھوں آمنہ!'' نعیمہ نے پرخیال انداز میں کہا۔

''ہاں۔ آج تو تم عجیب عجیب سی لگ رہی ہو؟'' وہ مسکرائی۔

''تمہاری بہن حلیمہ...... کتنی حسین لڑکی ہے۔ کبھی...... کبھی تمہیں حسد نہیں ہوتا اس سے؟'' نعیمہ نے حسرت سے کہا۔

''کیا پاگل پن ہے۔ وہ...... وہ بہن ہے میری...... میری چھوٹی بہن! مجھے بڑی عزیز ہے وہ تو مجھے' اسے بہت لاڈ پیار سے پالتی ہوں۔ امی تو بیمار رہتی ہیں اس لیے میں ہر طرح سے اس کا خیال رکھتی ہوں۔ ابھی چھوٹی بھی تو ہے وہ۔ میں نہ دیکھوں گی تو اور کون دیکھے گا۔ لاپروا بھی کتنی ہے۔'' وہ ہنسی۔

''ہائے صرف دو تین برس چھوٹی تو ہے۔ تم تو یوں کہتی ہو جیسے حلیمہ دودھ پیتی بچی کا نام ہے۔'' حیرت کے مارے نعیمہ نے بے ساختہ کہا۔

''ڈھائی سال چھوٹی ہے مگر...... ہے تو چھوٹی' بڑی تو نہیں ہے۔'' اسے نعیمہ کا لہجہ اپنی چھوٹی بہن کے لیے بڑا ناگوار گزرا تھا۔

''تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ یہ کہ...... کہ تمہیں اس سے حسد کیوں نہیں ہوتا؟''

''حسد کی کیا بات ہے؟ بھائی بہن تو جسم کے اعضا ہوتے ہیں۔ کیا تمہارے ہاتھ تمہارے پاؤں سے حسد کر سکتے ہیں؟'' وہ تعجب سے بولی۔

''یا اللہ! تو نے یہ کون سی مخلوق پیدا کی ہے؟'' وہ بے پناہ رشک سے بولی۔

''مگر تم آج مجھے بالکل ٹھیک نہیں لگ رہی ہو۔'' آمنہ نے کہہ ہی دیا۔

''کبھی حلیمہ اتراتی تو ہو گی...... ہے نا؟'' نعیمہ اندازے لگانے لگی۔

''ہاں۔ کیوں نہیں' بہت اتراتی ہے۔'' وہ سرسری لہجے میں ہنس کر بولی۔

''اللہ کی قسم! میں تو کبھی نہیں اترائی مگر آپی پھر بھی میرا خون پینے کو تیار رہتی ہے جیسے میں نے اس کی شکل نوچ کر اپنے اوپر لگا لی ہو۔ کبھی کبھی تو میرا دل چاہتا ہے کہ...... کہ میں اپنا یہ منہ جلا ڈالوں۔'' نعیمہ رونے لگی۔ اس کے ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا تھا۔

(ہونہہ...... ڈرامے باز! کیسی اداکاری کر رہی ہے اچھا ہے جلا ہی ڈالے۔'' سامعہ نے بڑبڑاتے ہوئے دانت پیس کر خود کلامی کی)

''ہائے! ایسا نہیں کہتے صبر سے کام لیتے ہیں۔'' وہ بڑے پن سے بولی۔

''کتنا صبر؟ کہاں تک کروں آخر؟ کیا کیا ہے میں نے؟ یہ دیکھو میرے ہاتھ۔'' نعیمہ بری طرح رونے لگی۔ سامعہ کا جی چاہا کہ وہ اندر آ جائے اور آخر نعیمہ کے بال جھنجھوڑ کر اس کا منہ بھی نوچ ڈالے۔ اس بے عزتی کے بدلے میں جو وہ اپنی دوست کے ساتھ ''مل کر'' سامعہ کی کر رہی ہے۔

''آپی کیوں حسد کرتی ہے تم کیوں نہیں کرتیں حلیمہ سے وہ تو بڑی حسین لڑکی ہے؟''

''تمہاری تو سوئی ایک ہی جگہ اٹک جاتی ہے مائی ڈیئر! ایکچو لی...... میں حقیقت پسند ہوں اور میں سمجھتی ہوں کہ اگر انسان کے پاس کوئی چیز کم ہوتی ہے تو کچھ زیادہ بھی ہوتا ہے۔ پھر ہم رونے کے بجائے اپنی صلاحیتوں کو کیوں

نہ ڈھونڈ نکالیں۔ جو ہمیں آگے سے آگے لے جاسکتی ہیں۔ تم جانتی ہو میری ایک سہیلی ٹانگوں سے معذور ہے اور سوشل ورکر ہے وہ۔ اس نے اپنی دونوں ٹانگوں کو مسئلہ نہیں بنایا۔ حیرت کی بات دیکھو کہ اس کا رشتہ بھی طے ہوگیا ہے۔" وہ خوشی چھلکاتے لہجے میں بولی۔

"سچ..... کیسے؟"

"اس نے یہ بھی مسئلہ نہ کھڑا کیا۔ عمر میں کافی زیادہ ہے وہ شخص مگر بس وہ ہر معاملے کو عقل مندی سے چلاتی ہے اور سمجھوتہ کرلیتی ہے۔ عجیب لڑکی ہے وہ۔" آمنہ نے مرعوب ہوکر کہا۔

"تم بھی تو ہو۔" نعیمہ نے دھیرے سے کہا اور آمنہ کو یوں دیکھنے لگی جیسے وہ آمنہ نہ ہو بلکہ کوہ ہمالیہ ہو۔

"میں کہاں..... میں تو معمولی سی لڑکی ہوں۔ جہاں تک شکل کی بات ہے وہ میرے ابو سے ملی ہے مجھے۔ وہ میرے ابو ہیں بس اچھے لگتے ہیں مجھے اور حلیمہ امی کی ہم شکل ہے۔ بے حد حسین..... بالکل میری امی کی طرح اسی لیے میں اسے اتنا پیار کرتی ہوں جیسے کیمرے سے امی کی تصویر کھنچی ہوئی ہو۔" وہ میٹھے لہجے میں بولی۔

"امیزنگ....." نعیمہ بہ مشکل کہہ پائی جب کہ دوسرے کمرے میں کھڑی سامعہ پہلی مرتبہ ذرا سی شرمندہ ہوئی تھی۔

"تم خواہ مخواہ مجھے بلندی پر پہنچا رہی ہو۔" وہ پھیکی مسکراہٹ سے بولی۔

"تم کچھ اداس ہو؟ کیا کالج چھوڑنے کی وجہ سے؟" نعیمہ نے پوچھا۔

"نہیں۔ وہ تو ایک دن چھوڑنا ہی تھا۔ میں اس لیے اداس ہوں کہ..... کہ دیکھو نا..... اب ماشا اللہ حلیمہ بھی بڑی ہونے لگی ہے۔ امی ابو نے اس کے کئی رشتے واپس کردیے۔ میں نے کہا کہ اگر میری نہ ہوگی تو..... حلیمہ کا کیا قصور ہے؟ میں دیکھتی ہوں اسے بننے سنورنے کا کتنا شوق ہے اسی لیے میں تقریبات کے لیے اس کا میک اپ خود کرتی ہوں۔ سیکھا ہوا ہے نا میں نے۔ وہ تو شکل ہی لیتی ہے۔ ذرا ڈھنگ سے تیار کردوں تو بالکل پری لگتی ہے۔ لوگ کہتے ہیں آپ اس کی بہن ہیں؟ حیرت سے کہیں سے لگتی تو نہیں؟" وہ ہنس پڑی۔

"یار! تم کس مٹی کی بنی ہو؟ تمہیں لوگوں کے ریمارکس..... برے نہیں لگتے۔"

"نہیں۔ نعیمہ کچھ برا نہیں لگتا' بس یہ برا لگتا ہے کہ کوئی یہ کہے میری وجہ سے بہن یا بھائیوں کی شادی رک رہی ہے اور یہ حقیقت بھی ہے اسی لیے میں نے امی سے کہا ہے کہ ابو بھائیوں کی شادی بھی کرائیں اور حلیمہ کی بھی اسے دولہن بننے کا بہت شوق ہے۔ میرا کیا ہے اگر اللہ نے مقدر میں لکھا ہوگا تو شادی ہوجائے گی نہ لکھا تو نہیں ہوگی جنت میں جاکر کرلیں گے۔" وہ مسکرادی۔

"ہائے حلیمہ.....! تم کتنی لکی ہو؟" نعیمہ نے دل پکڑ کر ایکٹنگ کے انداز میں کہا تو آمنہ ہنس پڑی۔

"تمہیں یوں نہیں لگتا کہ جیسے تمہاری انا پہ چوٹ پڑی ہو؟ لوگ تبصرہ کرتے ہیں تو..... برا تو لگتا ہوگا؟" آج نعیمہ نے اسے پورا ہی کھنگال کے رکھ دیا تھا۔

"نہیں تو۔ لوگ جو محسوس کرتے ہیں وہ کہہ دیتے ہیں۔ ہر ایک اپنی ذہنی سطح کے مطابق محسوس کرتا ہے۔ ہم کسی کی ذہنی سطح کو اونچا یا نیچا نہیں کرسکتے۔ اپنی ذہنی سطح کو اونچا نیچا کرسکتے ہیں بس۔" وہ مسکرائی تو نعیمہ غور کرنے لگی۔

"تم سچ کہتی ہو آمنہ! میں..... میں آپی کی ذہنی سطح بلند کرنے کی ناکام کوشش کرتی ہوں۔" وہ پرخیال لہجے میں بولی۔

("منحوس..... ہر بات میں میری برائی نکالتی ہے۔" سامعہ بڑبڑائی۔)

"سب سے بڑی بات یہ ہے نعیمہ.....! کہ میں میں قسمت پہ بہت یقین رکھتی ہوں۔ میں نے حسن کو رلتے بھی دیکھا ہے۔ سچ پوچھو تو میں اپنی حلیمہ کے لیے بہت پریشان رہتی ہوں۔ اللہ اس کی قسمت اچھی کرے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس میں بچپن بہت ہے۔"

"اتنی جلدی کیا ہے تم لوگوں کو؟" نعیمہ نے کہا۔

"امی پریشان رہتی ہیں اپنی بیماری سے۔ میں نے سوچا کہ اگر میرا بوجھ نہیں اترتا تو کم از کم میری بہن اپنے گھر کی ہوجائے۔ پچاس فی صد ہی سکون مل جائے امی کو۔"

"تم اپنے بارے میں کس وقت سوچتی ہو؟" نعیمہ نے بھونچکا ہوکر کہا۔

"میں.....؟ میں خلیل جبران کا سوچا ہوا اکثر سوچتی ہوں کہ "ہم سفید کونجوں کا ایک غول ہیں جو نیلے آسمان میں اپنی اپنی منزل کی تلاش میں نکلتی ہیں خوش خوش..... پھر کسی کو اپنی منزل خوب صورت باغ میں ملتی ہے اور کوئی رات کی سیاہی میں سخت چٹانوں سے ٹکرا ٹکرا کر خار زاروں میں گر پڑتی ہیں۔" اتنا کہہ کر آمنہ چپ ہوگئی۔

(یہ بات سن کر سامعہ کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے)

نعیمہ نے اداسی سے کہا۔ "یہ سوچ تو تمہیں افسردہ کرتی ہوگی؟"

"نہیں نعیمہ! میں سوچتی ہوں کہ یہ تو قسمت کی تقسیم ہے اور کیا یہ کافی نہیں ہے کہ جو کچھ ہمیں یہاں نہیں ملتا وہ آگے جاکر دوسرے جہاں میں ضرور ملے گا اور اس وقت ہم زیادہ..... بہت زیادہ ضرورت مند ہوں گے اس لیے ہی میں اپنی نیت کو اُجلے بہتے پانی کی طرح شفاف رکھتی ہوں۔" وہ سنجیدگی سے بولی۔

"اللہ تمہیں بہت عطا کرے۔ میری دعا ہر وقت تمہارے ساتھ ہے۔" نعیمہ نے بے ساختہ کہا۔

("ہونہہ..... میرے لیے دعا کرتے تو اس کی زبان کٹتی ہے؟" سامعہ نے فوراً سوچا اور اس کی پیشانی پہ نفرت کی لکیریں ابھر آئیں۔ "کم بخت کو غیروں سے پیار ہے۔")

"تمہارا بہت شکریہ اور..... حلیمہ کے لیے بھی دعا کرنا۔ اصل میں کل اس کا ایک پروپوزل بھی بتایا ہے کسی نے۔ جو رشتے خود آئے تھے تو وہ تو امی نے قبول کیے نہیں' میری وجہ سے اس کا نقصان ہوا۔ اب وہ لوگ آئیں گے اگلے ہفتے' دعا کرو وہ لوگ ہماری حلیمہ کو پسند کرلیں۔"

"آمین!" نعیمہ نے کہہ دیا۔

"لڑکا پڑھا لکھا ہے۔ تمیز دار فیملی ہے۔" وہ بتانے لگی۔

"اچھا۔ دیکھا ہے تم نے؟"

"نہیں۔ تصویر دیکھی ہے' اب وہ لوگ آئیں گے تو دیکھوں گی۔ کام تو مجھے ہی سنبھالنا ہوتا ہے۔ امی کو تو بستر سے اٹھنے میں بھی تکلیف ہوتی ہے۔ وہ بہت سخت بیمار ہوگئی ہیں۔" آمنہ نے افسردگی سے کہا۔

"کیسا ہے..... تصویر سے کچھ اندازہ تو ہوا ہوگا؟" نعیمہ نے دراصل اپنی گڈ نیوز دینے کے لیے یہ تمہید باندھنی شروع کی تھی۔

"شکل کا کیا ہے؟ شکل تو معمولی ہے مگر اچھا کماتا ہے۔ شائستگی والے لوگ ہیں۔ ہماری ایک آنٹی ہے' وہ بتا رہی تھیں کہ بہت ہی اچھے لوگ ہیں۔ شریف بہت ہیں اور کیا دیکھنا ہے؟ مگر حلیمہ کو وہ بالکل پسند نہیں آیا ہے۔" آمنہ ہنس پڑی۔

"پھر کیسے کروگی شادی؟" وہ بے ساختہ بول پڑی۔

"میں نے سمجھایا ہے حلیمہ کو۔ وہ تو بچی ہے ابھی' اتنی سمجھ دار نہیں ہے مگر میری بات پر غور کرتی ہے مان لیتی ہے میری بات۔" وہ فخریہ انداز سے مسکرائی۔

"ایسی بہن کی بات کون ٹال سکتا ہے بھلا؟" نعیمہ تو جیسے مبہوت ہوگئی تھی۔

"امی کہہ رہی تھیں عمر ذرا بڑی ہے لڑکے کی مگر میں نے کہا کہ اگر دونوں نا سمجھ ہوئے تو لڑائی بہت ہوگی۔ اس لیے اچھا ہے ذرا چھ آٹھ سال کا فرق رہے۔" وہ بڑے پن سے بولی۔

"میں دعا کروں گی۔ اللہ اچھا کرے۔" نعیمہ نے کہا اور بولی۔ "میرے پاس بھی ایک گڈ نیوز ہے۔" یہ سن کر آمنہ سے کہیں زیادہ سامعہ کے کان کھڑے ہوئے۔

اسے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے اس کے وجود میں ایک سنسنی سی دوڑ گئی ہو۔

"وہ..... وہ ہیں نا خالہ وحیدہ..... ان کے بیٹے اشرف سے میری بات پکی ہوگئی ہے۔ شادی بھی جلدی کرنے کو کہہ رہے ہیں وہ کیوں کہ اشرف جلدی باہر چلے جائیں گے پھر کچھ عرصے میں مجھے بھی بلوالیں گے۔ مٹھائی تو کسی نہ کسی طرح بانٹ دی آپی سے چھپا کر مگر اب شادی کیسے چھپا کر ہوگی۔ امی بڑی پریشان ہیں۔ پاپا کہہ رہے تھے کہ آپی کو کچھ دن کے لیے اسلام آباد بھیجنا پڑے گا تایا جان کے سسر کا گھر ہے ناوہاں۔" اس نے بتایا۔

"ہائے سچ.....؟ اتنی دیر میں بتائی ہے اتنی اچھی خبر؟" خوشی کے مارے آمنہ اچھل پڑی۔

"بس شرم آرہی تھی..... نا؟" وہ دھیرے سے مسکرائی۔

("ہائے..... نہیں چھوڑوں گی۔ میں تیرا منہ نوچ لوں گی۔" خبر کی تاب نہ لاکر سامعہ تیز آواز میں بول پڑی اور دھڑ سے کھڑکی کھل گئی۔ سامعہ کی آنکھیں لہو رنگ ہو رہی تھیں اور چہرہ تانبے کی طرح تپ رہا تھا۔)

نعیمہ کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگی تھیں اور اس کا چہرہ بالکل سفید لٹھے کی طرح ہوگیا۔ آمنہ اس اچانک افتاد پر بوکھلا اٹھی تھی۔

"یہ..... یہ تمہاری آپی ہیں؟" وہ بہ مشکل بول سکی۔

"ہاں..... شاید مجھے..... مار ہی ڈالے گی اب!" وہ غیر ارادی طور پر آمنہ سے چپک گئی اور خوف زدہ نگاہوں سے سامعہ کو دیکھنے لگی۔

"کب جاؤ گی تم؟" وہ دھاڑتے ہوئے آمنہ سے پوچھنے لگی۔

"بس..... ابھی جانے والی ہوں۔" آمنہ نے بہ مشکل کہا۔

"پھر جاؤ۔ منہ کیا دیکھ رہی ہو؟" وہ آنکھیں نکالتے ہوئے چیخ کر بولی۔

"نہیں نہیں۔ تم نہ جانا امی..... امی پلیز اندر آئیں امی....." نعیمہ نے چیخ کر ماں کو آواز دی۔

"دیکھیں آپی! صبر کریں۔ اس طرح سے تو آپ بیمار ہو جائیں گی؟" آمنہ نے افسوس سے کہا۔

"اپنی چونچ بند رکھو اور دفع ہو جاؤ یہاں سے۔" سامعہ نے اسے کھا جانے والی نظروں سے گھور کر کہا۔ آمنہ جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اسی وقت شازیہ بیگم اندر داخل ہوگئیں۔ نعیمہ اور آمنہ نے سکھ کا سانس لیا اور آمنہ فوراً ہی چلی گئی۔

"امی! آپ اور پاپا میرے دشمن ہیں۔" سامعہ کی آنکھوں میں وحشت اتر آئی تھی۔ وہ گھوم کر دروازے سے آنے کی بجائے کھڑکی سے کود کر اندر آگئی تھی۔ نعیمہ نے فوراً دو قدم کے فاصلے پر واقع واش روم میں پناہ لی۔

"اب وہیں بند رہنا۔ نکلو گی تو تمہارا منہ نوچ دوں گی۔ بڑی اچھی شکل ہے نا تمہاری۔" وہ رونے لگی اور نعیمہ سوچنے لگی کہ صرف خوش شکل ہونے پر یہ حال ہے اگر میں حلیہ جیسی ہوتی تو نہ جانے کیا ہو جاتا؟

"بیٹی! صبر کرو۔ اتنی بے صبری اچھی نہیں ہوتی۔" ماں نے اسے گلے لگایا۔

"پہلے میری شادی ہوگی۔ میں بڑی ہوں۔" اس نے دوٹوک انداز میں کہا۔

"اچھا' اچھا۔ ٹھیک ہے بیٹی! پہلے تمہاری ہی ہوگی۔" شازیہ محمود اس کے بالوں میں اپنی انگلیوں سے کنگھی کرنے لگیں مگر اسے قرار نہ آیا۔ وہ ماں کو بھی مسلسل برا کہتی رہی۔

خوش قسمتی سے محمود صاحب کے دوست کے بیٹے کا رشتہ سامعہ کے لیے آگیا تھا۔ انور سامعہ سے چودہ برس بڑا تھا اور اس کی بیوی دوسرے بچے کی پیدائش میں انتقال کر گئی تھی۔ محمود صاحب کے دوست احمد صاحب نے اپنے سوتیلے بیٹے انور کو سگوں سے بڑھ کر پالا تھا۔ اب اس کے لیے بڑے پریشان تھے لیکن محمود صاحب ان سے بھی کہیں زیادہ پریشان اور غمگین تھے۔ انہوں نے خود ہی احمد

صاحب سے اپنی بیٹی کے لیے بات کی تھی اور انہیں مطمئن کرنے کے لیے اپنی بیٹی کو "سمجھ دار" بھی قرار دے دیا تھا جو کہ وہ ہرگز نہیں تھی۔

دو دن رونے دھونے کے بعد اچانک سامعہ کو یہ خبر ملی کہ اس کا بھی رشتہ آیا ہے تو اس کے دل میں قدرے ٹھنڈک پڑ گئی' مگر جب اسے رشتے کی تفصیلات معلوم ہوئیں تو وہ براہ راست "پاپا" کے آگے آ کھڑی ہوئی۔

"پاپا! کیا سامعہ حرام کا مال ہے جسے آپ انور کی جھولی میں ڈال دیں؟" وہ بھڑک کر بولی تو محمود صاحب بھونچکا سے رہ گئے۔

"تم ہوش میں تو ہو؟ تمیز نہیں ہے تمہیں؟ کس طرح باپ سے بات کی جاتی ہے۔" وہ بہ مشکل بولے۔

"آپ کو تمیز ہے پاپا!" وہ جھلا کر بولی اور ایک زوردار ہاتھ اس کے سر پر پڑا۔ اس نے گھوم کر دیکھا تو ماں کو اپنے پیچھے کھڑا پایا۔

"امی..... آپ نے مجھے مارا ہے.....؟ آپ نے.....؟" وہ بے ہوش سی ہونے لگی۔

"ہاں۔ تم حد سے بڑھ رہی ہو۔ جو فیصلہ پاپا نے کیا ہے اس سے بہتر فیصلہ کوئی نہیں ہو سکتا۔ جاؤ اپنے کمرے میں اور زبان چلی تو کاٹ ڈالوں گی۔" شازیہ محمود کے لہجے میں بے حد کاٹ تھی۔ وہ غصے سے لال بھبھوکا ہو رہی تھیں۔ سامعہ گنگ رہ گئی۔

"دفع ہو جاؤ۔ سنا نہیں تم نے؟" شازیہ محمود نے دہاڑتے ہوئے اسے دھکا دیا اور وہ روتی چیختی اپنے کمرے میں جا گھسی۔ نعیمہ گھر میں ہی موجود تھی۔ اس نے احتیاطاً اپنے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

"بہت خوب..... میرے لیے دو بچوں کا بوڑھا باپ اور اس کے لیے شہزادہ..... ہاں۔ اس کے لیے اشرف ہے۔ یہ سب ظالم ہیں' مجھ پر ظلم کرتے ہیں' یہ دشمن ہیں۔" وہ نہ جانے کب تک روتی اور چیخ چیخ کر الزام تراشیاں کرتی رہی۔

☆

ہفتے بھر کی کوشش ناکام ہو چکی تھی۔ سامعہ انور کے ساتھ شادی پر کسی طرح بھی رضامند نہ ہوئی لہٰذا مجبوراً انہیں بہانہ بنا کر ٹال دیا گیا تاہم نعیمہ کے لیے اب میدان اس حد تک تو صاف ہوگیا تھا کہ سامعہ کو اس کی شادی کی اطلاع ہوگئی تھی اور اشرف کی ماں نے معقول طریقے سے مہمان بلا کر باقاعدہ منگنی کا اصرار شروع کر دیا تھا۔

"بہن منگنی کا کیا تکلف کرنا؟ ایک مہینے بعد شادی' یہ سب ارمان نکال لینا۔" شازیہ محمود نے گھبرا کر کہا۔ بات معقول بھی تھی اس لیے کافی تردد کے بعد اشرف کی ماں نے مان ہی لی۔ شازیہ محمود پریشان تھیں کہ دو مرتبہ وہ سامعہ کو اسلام آباد کیسے بھیج سکیں گی؟ ایک دفعہ بھی بہت پریشانی کی بات تھی۔

نعیمہ کو آمنہ سے ملے ہوئے ایک ہفتہ ہی ہوا تھا کہ اس کے گھر سے مٹھائی آگئی۔ آمنہ کے بھائی جان مٹھائی دے گئے تھے۔ نعیمہ ان سے کچھ بھی نہ پوچھ سکی اس لیے کہ سامعہ کو یہ موضوع ملتے ہی نعیمہ اور اشرف کی متوقع شادی کا دکھ آن گھیرتا تھا اور وہ شور اٹھا دیتی تھی۔ مٹھائی چکھنے کے بعد نعیمہ نے فوراً ہی آمنہ کو فون کیا۔

"دیکھا یار تو نے..... میری دعا قبول ہوگئی نا؟ حلیمہ خوش تو ہے نا؟" نعیمہ نے کہا۔

"اس کی خوشی کا تو کوئی ٹھکانہ ہی نہیں ہے۔ بس کیا بتاؤں؟" آمنہ بولی۔

"ارے تمہارے سمجھانے سے اس قدر سمجھ دار ہوگئی وہ؟" نعیمہ کو حیرت ہو رہی تھی۔

"کیا مطلب..... میں سمجھی نہیں؟" آمنہ نے الجھے الجھے انداز میں کہا۔

"یہ حلیمہ کی منگنی کی مٹھائی ہے نا؟" نعیمہ نے گڑبڑا کر کہا تو آمنہ نے قہقہہ لگایا۔

"نہیں بھائی جان نے بتایا نہیں تمہیں؟" وہ شرمیلے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لہجے میں بولی۔

"کیا.....؟" نعیمہ پر جیسے شادیٔ مرگ کی کیفیت طاری ہوگئی۔

"یہ کہ..... یہ میری بات طے ہوئی ہے اسی لڑکے سے جس کا میں ذکر کررہی تھی۔"

"نہیں بھئی..... کیسے ہوا یہ سب؟" نعیمہ نے حیرت کے مارے ہلکی سی ایک چیخ ماری۔

"ایسے ہوا کہ میرے فرشتوں کو بھی خبر نہ ہوئی ہوگی۔ میں نے کچن میں سب تیار کیا' حلیمہ کا بڑا اچھا لائٹ میک اپ کیا۔ خوب صورت والا پیازی سوٹ استری کرکے پہنایا۔ ایمان سے میں تو بالکل بھنگن بنی ہوئی تھی۔ پکوڑے سموسے تلنے میں' گھر کی صفائی بھی تھی' کاٹن کے نیلے معمولی کپڑے پہن رکھے تھے بس۔" وہ ہنستے ہوئے بولی۔

"ہائے..... پھر کیسے ہوا یہ سب؟" نعیمہ کی آنکھیں جیسے اُبل رہی تھیں۔

"پھر وہ آئیں دو عورتیں تھیں ایک لڑکی۔ تین دن بعد فون آیا تو میں نے ہی اٹھایا تھا۔ وہ کہنے لگیں ہمیں رشتہ کرنا ہے۔ میں نے خوش ہوکر کہا۔ "حلیمہ کو مبارک باد دیتی ہوں اور امی سے آپ کی بات کراتی ہوں آنٹی!" مگر وہ تو مجھ سے ہی باتیں کرنا چاہ رہی تھیں' بولیں۔ "بیٹی ہم نے تمہیں پسند کیا ہے۔ وہ تو چھوٹی ہے' ہمیں تو سمجھ دار اور گھڑ لڑکی چاہیے۔ ایسی اعلیٰ ظرف' وسیع دل کی لڑکی جو نند کو بوجھ نہ سمجھے' ایسے ہی پیار و محبت سے ہمارے گھر کو جنت بنا سکے۔ میرا بیٹا بڑا حساس طبیعت کا ہے۔ اسے خیال کرنے والی پیار کرنے والی بیوی چاہیے۔"

"پھر کیا ہوا.....؟" نعیمہ تعجب سے بہ مشکل تین لفظ بولی سکی۔

"پھر کیا ہوا؟ ریسیور میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا' حیرت کے مارے..... اور جب مجھے دوبارہ ہوش آیا تو دو منٹ گزر چکے تھے۔ میں نے چیک کیا فون بند ہو چکا تھا۔

تھوڑی دیر بعد پھر فون آیا تو امی نے اٹھایا۔ وہ ہنسنے لگی۔

"یار کمال ہوگیا۔ اللہ چھپر پھاڑ کر دیتا ہے۔ کب ہے تیری شادی؟" نعیمہ نے پوچھا۔

"چھ ماہ بعد۔" آمنہ نے بتایا۔

"مگر میری پندرہ دن بعد ہے' ذرا ایک دن پہلے آجانا۔" نعیمہ نے اسے دن تاریخ یاد کرائے۔

☆

نعیمہ کی شادی ہوگئی تھی۔ شادی کے اگلے دن نعیمہ نے سامعہ سے ملنے کی خواہش کی تو محمود صاحب نے اسے قطعاً منع کردیا۔

"نہیں ہم دونوں ملنے جائیں گے۔" وہ اداسی سے بولے۔ شازیہ محمود کا چہرہ بھی اترا ہوا تھا۔

"کک..... کیا..... آپی کو..... گھر نہیں لائیں گے؟" نعیمہ نے غمگین ہوکر کہا۔

"نہیں بیٹی! ابھی ممکن نہیں۔ ولیمے کے بعد بھی نہیں۔" محمود صاحب نے بتایا۔

"اوہ..... سوسیڈ!" نعیمہ کی آنکھیں چھلک اٹھیں۔

کچھ ہی دیر بعد محمود صاحب اور شازیہ سامعہ کے سامنے کھڑے تھے۔

"آگئے تم لوگ.....! میرے دشمن..... ظالم لوگو! میں سامعہ محمود نہیں ہوں۔ لوگوں سنو!..... سنو میرا نام سامعہ اشرف ہے۔ میری بہن ڈائنا ہے۔ وہ میرا منگیتر ہے۔ میرا منگیتر ہے وہ جس سے وہ شادی کرے گی۔ اس نے میرے حق پہ ڈاکہ ڈالا ہے۔ اس نے مجھ سے میرا منگیتر چھین لیا۔ اسے بہکا لیا' اسے اپنا بنا لیا مجھ سے چھین کر..... میں اسے ہرگز معاف نہ کروں گی۔ قتل کردوں گی اسے۔ وہ میرے سامنے تو آجائے۔" سامعہ چیخ چیخ کر ہلکان ہوچکی تھی۔ پاگل خانے کے ڈاکٹر نے دو نرسوں کو اشارہ کیا۔ سامعہ کو دبوچ کر ایک انجکشن گھونپ دیا گیا اور وہ اشرف یا نعیمہ سے تو کیا دنیا جہاں سے بے خبر ہوگئی۔

☆☆☆

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جیسی

نوشاد عادل

اللہ کی لاٹھی بے آواز ہوتی ہے' وہ ظالم کی رسی دراز ضرور کرتا ہے لیکن نظر انداز نہیں کرتا۔ ایک نہ ایک روز ظالم اپنے ہی بچھائے ہوئے جال میں پھنس کر اس کی سامنے ضرور پہنچتا ہے۔

اس چیخ کا احوال جو روح کی گہرائیوں سے برآمد ضرور ہوتی ہے مگر سنائی نہیں دیتی

"یہ زرینہ ہے' جس کا میں نے آپ سے ذکر کیا تھا۔" آصفہ نے اس لڑکی کا تعارف کرایا۔ میں نے بریف کیس صوفے پر رکھتے ہوئے اس لڑکی کی جانب دیکھا۔ زیادہ سے زیادہ اس کی عمر انیس یا بیس سال ہوگی۔ بہت معصومانہ اور قدرے سہمے ہوئے انداز میں مجھے دیکھ رہی تھی۔ نہایت معمولی سے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ بڑے سے دوپٹے سے اس نے اچھی طرح خود کو ڈھانپا ہوا تھا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں بلا کی شرم و حیا تھی حالاں کہ اس کی رنگت گوری نہ تھی' لیکن بادامی رنگت اس پر غضب ڈھا رہی تھی۔ میرا پہلا خیال اس کے بارے میں یہی ابھرا تھا کہ اگر وہ گوری ہوتی تو اتنی دل کش نہ ہوتی۔

اس نے بہت دھیمی آواز میں مجھے سلام کیا۔ میں نے بہ آواز بلند جواب دیا۔

"آج اس کا پہلا دن ہے ہمارے گھر۔" آصفہ مجھے مزید بتانے لگی۔ "وہ سامنے والے بلاک میں زبیدہ خالہ ہیں نا..... ان کے گھر آتی تھی یہ۔ جب سے فرزانہ گئی ہے مجھے بڑی مصیبت ہوگئی تھی۔ میں نے زبیدہ خالہ سے بھی کہہ دیا تھا کہ اگر ان کی نظر میں کام کرنے والی کوئی ہو تو میرے پاس بھجوا دینا۔ انہوں نے زرینہ کو بھیج دیا۔"

"کہاں رہتی ہو بھئی تم.....؟" میں نے ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتے ہوئے اس لڑکی سے دریافت کیا۔

"وہ جی..... آگے..... چل گوٹھ میں..... اپنے ماے کے پاس۔" اس نے جھجکتے ہوئے جواب دیا۔

"یہیں کراچی کی رہنے والی ہو؟" میں نے دوسرا سوال کیا۔

"ناجی صاحب جی..... میں ادھر رحیم یار خاں سے آئی ہوں۔" اس بار اس نے قدرے حوصلے سے جواب دیا تھا۔

"رحیم یار خان سے.....؟" میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ "اتنی دور سے کیوں؟ وہیں نوکری کیوں نہیں کرلی؟ وہاں تمہارا کوئی نہیں ہے؟"

"جی..... سب ہیں..... پر وہاں ملازمت نہیں ہے۔" اس نے دھیمے لہجے میں بتایا۔ "اور اگر ملازمت ملتی بھی ہے تو بہت سخت محنت والی ملتی ہے۔ محنت سے تو جی میں نہیں گھبراتی پر محنت کے پیسے بہت کم ملتے ہیں۔ میرا ماما بہت عرصے سے ادھر کراچی میں رہتا ہے۔ اس نے مجھے ادھر بلوالیا۔"

"یہاں تو گزارا ہو رہا ہے نا؟"

"شکر ہے جی رب کا..... چار پیسے بچ بھی جاتے ہیں۔ وہ ادھر رحیم یار خاں گھر بھجوا دیتی ہوں۔"

بس زرینہ سے اتنا ہی انٹرویو لیا تھا۔ اس کی کہانی میری سمجھ میں آگئی تھی۔ وہ بھی ان ہزاروں لوگوں میں سے ایک تھی جو روزگار کی تلاش میں اس غریب پرور شہر کے دامن میں پناہ کی تلاش میں آتے ہیں۔ اس کی کہانی میں کوئی نیا پن نہیں تھا' میرے لیے صرف یہی کافی تھا کہ میری بیوی آصفہ کی پریشانی ختم ہوگئی۔ کئی روز سے وہ مجھ سے بھی کسی ملازمہ کا رونا رو رہی تھی۔

میں اپنی مختصر سی فیملی کے ساتھ گلستان جوہر کے ایک متمول علاقے میں رہائش پذیر تھا۔ نہایت پرسکون اور چین و آرام سے زندگی گزر رہی تھی۔ میری شادی کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔ ابھی ہماری کوئی اولاد بھی نہیں ہوئی تھی۔ میں نے آصفہ سے محبت کی شادی کی تھی۔ میں ایک انگلش لینگویج انسٹی ٹیوٹ میں پڑھاتا تھا اور ساتھ ساتھ اپنی تعلیم بھی جاری رکھے ہوئے تھا۔ آصفہ وہاں پڑھنے آتی تھی۔ اس کا تعلق ایک مڈل کلاس گھرانے سے تھا۔ آصفہ سے میری محبت کی ابتدا کیسے ہوئی یہ ایک لمبی اور علیحدہ کہانی ہے لیکن اتنا ضرور بتاؤں گا کہ محبت سے شادی تک کا سفر بغیر کسی رکاوٹ اور پریشانی کے طے ہوا تھا۔ مجھ میں کسی بات کی کمی نہ تھی۔ پڑھا لکھا ہوں، پوش گھرانے سے تعلق ہے، خوب صورت ہوں اور آگے مستقبل روشن ہے۔ آصفہ کے گھر والوں نے کسی قسم کی کوئی ردوقد نہ کی اور فوراً ہی رشتہ قبول کرلیا تھا۔

آصفہ سب سے بڑی ہے۔ اس سے چھوٹا ایک بھائی زبیر اور پھر دو بہنیں ہیں۔ وہ تینوں ابھی تعلیم حاصل کررہے تھے مگر زبیر کا پڑھنا نہ پڑھنا ایک برابر ہی تھا۔ وہ بہت کم عمری سے ہی غلط دوستوں کی صحبت کا شکار ہوگیا تھا۔ بہنوئی ہونے کے ناتے میں نے بھی اسے بہت سمجھایا تھا، مگر وہ اپنے والدین کی ایک نہیں سنتا تھا بھلا میری کیوں سننے لگا۔ پھر میں نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا تھا۔

زرینہ جب سے گھر کا کام کاج کرنے لگی تھی آصفہ کو بہت آرام ہوگیا تھا۔ وہ اکثر زرینہ کے بارے میں مجھے بتانے لگی تھی۔

"بہت محنتی لڑکی ہے۔ بے چاری کو جو بولو وہ کام سر جھکا کر کردیتی ہے اور وہ جو پہلے تھی نا..... فرزانہ..... اف توبہ..... اس کے تو نخرے ہی اتنے تھے۔ ایک تو اس کے مزاج ہی نہیں ملتے تھے اور پھر ہر دوسرے دن اس کا کوئی نہ کوئی کام نکل آتا تھا۔ کبھی بچہ بیمار ہے تو کبھی اماں کے گھر جانا ہوتا ہے۔ الٹا سیدھا کام نمٹا کر بھاگ لیتی تھی۔"

"چلو اب تو تمہیں آرام ہوگیا نا۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہاں..... بے چاری یہ تو بڑی شریف ہے۔" آصفہ نے ریموٹ سے ٹی وی کے چینلز تبدیل کرتے ہوئے کہا۔ "اتنے خراب کپڑے تھے اس کے پاس۔ میں نے اپنے چند پرانے جوڑے دے دیے۔ وہ تو بھئی اتنا خوش ہوگئی کہ پوچھیں نہیں۔"

"بہت اچھا کیا تم نے۔ غریبوں کی مدد کرتے رہنا چاہیے۔ اللہ بہت خوش ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔

ایک روز چھٹی والے دن میں گھر میں موجود تھا۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ چھٹی کے روز گھر کا سودا سلف میں خود بازار جاکر لے آتا ہوں۔ آصفہ نے لمبی سی لسٹ میرے ہاتھوں میں تھمادی۔ میرے پاس نئی سینٹرو کار ہے۔ بازار جاکر میں نے سودا لیا اور پھر جب گھر میں آیا تو زبیر کی آواز سن کر میرے ماتھے پر شکنیں پڑ گئیں۔

"یہ کہاں سے آ گیا۔" میں نے منہ ہی منہ میں بدبداتے ہوئے خود کلامی کی۔

"السلام علیکم بھائی صاحب....." زبیر مجھے دیکھ کر صوفے سے کھڑا ہوگیا۔

"اوہو..... کب آئے تم.....؟" میں نے سامان کی تھیلیاں میز پر رکھتے ہوئے رسماً پوچھا۔

"بس ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی آیا ہوں۔" زبیر نے ترچھی نظروں سے ایک طرف دیکھا۔

اتفاق سے میری نگاہ بھی وہاں پڑ گئی۔ میں نے وہاں زرینہ کو دیکھا جو شیلف پر رکھی ہوئی چیزیں صاف کررہی تھی۔ مجھے زبیر کا اسے یوں دیکھنا اچھا نہیں لگا۔ یوں بھی اسے میں پسند نہیں کرتا تھا۔ بیوی کا بھائی تھا اور وہ بھی اکلوتا۔ اس لیے اسے جبراً برداشت کرنا پڑتا تھا۔

زبیر کی بازاری نظروں کو میں نے پہچان لیا تھا۔ اس کے بارے میں مجھے علم تھا کہ وہ چھٹے چھانٹ لچے لفنگوں میں اٹھتا بیٹھتا تھا۔ ہفتے مہینے میں ایک آدھ بار ہی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کالج جاتا تھا۔ وہاں بھی اس نے خراب لڑکوں کے ساتھ دوستیاں پالی ہوئی تھیں۔ ان دوستوں میں بعض بڑے گھرانوں کے بگڑے ہوئے لڑکے تھے جنہیں دن بھر اور رات گئے تک اپنی گاڑیوں پر آوارہ گردی اور خرمستیاں کرنے کے علاوہ اور کوئی کام نہیں تھا۔ میں نے میز پر سامان رکھنے کے بعد آصفہ کو آواز لگائی۔

"یہ سامان میز پر رکھا ہوا ہے۔ لسٹ بھی رکھی ہے۔ چیک کرلو کوئی چیز کم تو نہیں ہے۔ میں ذرا نہالوں۔" یہ کہہ کر میں غسل خانے کی طرف چل دیا۔ جب میں نہا کر تولیے سے بال خشک کررہا تھا تو مجھے زبیر کی آواز سنائی دی۔ وہ ڈرائنگ روم میں ابھی تک بیٹھا تھا اور آصفہ سے باتیں کررہا تھا۔

"نئی ملازمہ رکھی ہے باجی.....؟"

"ہاں..... ابھی کچھ ہی روز ہوئے ہیں۔" آصفہ نے جواب دیا۔ وہ سامان چیک کررہی تھی۔

"سیدھی سادی لگ رہی ہے۔ جب سے آیا ہوں یہ کام میں ہی لگی ہوئی ہے۔" زبیر نے عام سے لہجے میں کہا۔

"ہاں..... ادھر کی نہیں ہے نا..... رحیم یار خان سے نوکری کرنے یہاں آئی ہے۔ اس بے چاری کو شہر کی چالاکیوں کا کیا پتا۔ دیہاتی لڑکی ہے۔"

"ہاں وہ تو میں بھی دیکھ رہا ہوں۔" زبیر نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

میں اس وقت تک کمرے میں ہی رہا جب تک زبیر وہاں سے چلا نہ گیا۔ اگلے روز آفس میں کام بہت زیادہ تھا۔ میں نے موبائل سے آصفہ کو بتا دیا کہ مجھے دیر ہو جائے تو تم کھانا کھالینا۔ جب میں آفس سے روانہ ہوا تو ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ تھکن کے مارے میرا برا حال تھا۔ کسی نہ کسی طرح گاڑی ڈرائیو کرتا ہوا اپنے اپارٹمنٹس جا پہنچا۔ جس اپارٹمنٹس میں میرا فلیٹ تھا وہ گلستان جوہر کے عقبی حصے میں واقع تھا۔ یہاں کے بعد پرانا ایئرپورٹ کا علاقہ شروع ہوجاتا تھا لہٰذا ساڑھے بارہ ایک بجے تک یہاں اتنی زیادہ رونق نہیں ہوتی تھی جتنی جوہر موڑ جوہر چورنگی کے ایریا میں ہوتی تھی، جیسے ہی میں نے اپارٹمنٹس جانے والے راستے کا آخری موڑ کاٹا ایک موٹر سائیکل اچانک ہی میرے سامنے آ گئی۔ اس کی تیز روشنی میری آنکھوں میں گھس گئی تھی۔ میں نے بوکھلا کر بریک مارے۔ غلطی میری نہیں تھی، موٹر سائیکل والے کی تھی۔ وہ جس انداز میں میری کار کے سامنے آیا تھا اگر دونوں گاڑیوں کی رفتار زیادہ ہوتی تو بڑے حادثے کا باعث بھی بن سکتی تھی۔ میں نے کھڑکی سے منہ نکال کر موٹر سائیکل والے کو کھری کھری سنانا چاہی تو یک لخت میری کھوپڑی سے کوئی سخت شے آ لگی۔

"فوراً نیچے آجاؤ..... فوراً....." ایک انتہائی کرخت اور کھردری آواز ابھری۔

ایک ثانیے سے بھی کم وقت میں..... میں سمجھ گیا کہ یہ لوگ ایسٹریٹ کرمنلز ہیں۔ ہر روز کراچی شہر میں اس قسم کے لٹیرے وارداتیں کرتے ہیں اور تقریباً روزانہ ہی اخبارات ایسی وارداتوں کی خبروں سے بھرے ہوتے تھے۔ میں جانتا تھا کہ اگر میں نے ہوشیاری دکھانے یا کسی قسم کی مزاحمت کرنے کی کوشش کی تو وہ مجھے گولی مارنے سے بھی قطعاً دریغ نہیں کریں گے لہٰذا میں چپ چاپ گاڑی سے اتر آیا۔ وہ تین افراد تھے۔ موٹر سائیکل کی روشنی انہوں نے بند کردی تھی۔ آس پاس بھی اندھیرا تھا اس لیے میں ان کے چہروں کے خدوخال دیکھنے سے قاصر رہا مگر اتنا اندازہ ضرور ہوا کہ وہ نئے نئے جوان ہونے والے چھوکرے تھے۔ انہوں نے جدید فیشن کی جینز پہنی ہوئی تھیں اور اوپر ٹی شرٹس تھیں۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ اچھے گھرانوں کے چشم و چراغ تھے جو اپنے آبا واجداد کے نام روشن کررہے تھے۔

"جو کچھ بھی ہے فوراً نکالو..... جلدی کرو۔" ایک لمبے قد کے لڑکے نے آگے بڑھ کر مجھے دھکا دے کر گاڑی سے لگا دیا۔ میں نے جیب سے اپنا بٹوہ نکالا ہی تھا کہ اس نے

جھپٹ لیا اور کپڑوں کی تلاشی لی۔

"موبائل کدھر ہے؟" دوسرے لڑکے نے پوچھا۔

"اندر..... گاڑی میں....." میں نے بے بس آمیز لہجے میں کہا۔ تیسرا لڑکا تیزی سے میری گاڑی کا دروازہ کھول کر اندر کا جائزہ لینے لگا۔ موبائل کے علاوہ اس نے کیمسٹس بھی اٹھالیں۔

"چلو ادھر منہ کر کے دس قدم دور کھڑے ہو جاؤ۔" لمبے لڑکے نے پستول کی نال میری پسلیوں میں دھنساتے ہوئے کہا۔ "اور پلٹ کر دیکھا تو یاد رکھنا..... گولی سیدھی کھوپڑی میں گھسے گی۔"

میں نے اس کے حکم کی تعمیل کی۔ پانچویں قدم پر ہی میں نے موٹر سائیکل اسٹارٹ ہونے کی آواز سنی جو لحظہ بہ لحظہ دور ہوتی گئی۔ نویں قدم پر ہی میں نے پلٹ کر دیکھا اور ایک گہرا سانس لیا۔ اللہ کا شکر تھا کہ جان بچ گئی۔ جب میں اپنے فلیٹ میں داخل ہوا تو میری شکل دیکھتے ہی آصفہ چونک گئی۔

"یہ آپ کا چہرہ پیلا کیوں ہو رہا ہے..... کیا ہوا؟" وہ بے چاری پریشان ہو گئی تھی۔

"ارے کچھ نہیں ہوا۔" میں نے زبردستی مسکرانے کی کوشش کی۔ "آفس میں کام بہت تھا تھکن ہو گئی ہے۔ تم نے کھانا تو کھالیا نا؟"

"نہیں کوئی تو بات ہے..... مجھ سے مت چھپائیں۔" اس نے میرا سوال سنی ان سنی کر دیا۔

میں اسے فوری طور پر حادثے کے بارے میں نہیں بتانا چاہتا تھا مگر وہ میرے سر ہوئے جا رہی تھی لہذا بتانا ہی پڑا۔

"انہوں نے آپ کو تو کوئی نقصان نہیں پہنچایا نا..... کوئی چوٹ تو نہیں آئی آپ کو..... خدا جانے کب یہ لوگ غارت ہوں گے۔ کسی کا انہیں احساس ہی نہیں ہے۔ انہیں کیا پتا کہ پیسہ کتنی محنت سے کمایا جاتا ہے اور وہ ایک منٹ میں ہی سب کچھ لے جاتے ہیں۔" آصفہ اس وقت پڑھی لکھی عورت کے بجائے روایتی بیوی کا رول ادا کر رہی تھی۔

"مجھے کچھ نہیں ہوا..... تم فکر مت کرو..... جو کچھ گیا اس پر لعنت بھیجو۔ سمجھو جان کا صدقہ نکل گیا۔"

لیکن آصفہ دیر تک بڑبڑاتی رہی۔ اس کا کہنا تھا کہ میں پولیس میں رپورٹ کرا دوں لیکن میں مزید الجھنوں میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔ ان لٹیروں نے تو چند منٹ کے لیے ہی پریشان کیا تھا اور جو لینا تھا لے کر چلے گئے مگر پولیس میں رپورٹ کرانے کا مقصد ہوتا کہ بار بار پولیس کا میرے گھر آنا اور خواہ مخواہ پریشان کرنا۔ سو دو سو واراداتیں ہوتی ہیں تو پھر کبھی ایک آدھ مجرم پکڑے جاتے ہیں۔ پولیس والوں نے کون سا میرا سامان برآمد کر کے میرے حوالے کر دینا تھا۔ لہذا بات آئی گئی ہو گئی۔ میں نے آصفہ کو سختی سے منع کر دیا تھا کہ کسی سے بھی اس حادثے کے بارے میں ذکر نہ کرے۔

میں نے کچھ ہی روز میں محسوس کیا کہ زبیر کی آمد و رفت میرے گھر کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی تھی۔ میں کوئی احمق تو تھا نہیں کہ اس کے آنے جانے کا مقصد نہ جان پاتا۔ وہ زرینہ کی وجہ سے زیادہ آ جا رہا تھا۔ پہلے تو میں نے سوچا کہ کسی دن اسے سختی کے ساتھ روزانہ وہاں آنے سے منع کر دوں لیکن پھر یہ سوچ کر خود کو اس ارادے سے باز رکھا کہ بہانہ کیا کروں گا' اگر آصفہ پر اپنے خدشے کا اظہار کیا تو وہ برا مانے گی کہ میں اس کے بھائی پر شبہ کر رہا ہوں۔ میں نہیں جانتا تھا کہ وہ میرے پیچھے گھر آ کر کیا کیا حرکات کرتا ہو گا۔ ایک دن موقع پا کر میں نے زرینہ کو ایک کام کے بہانے بلایا۔ اس وقت آصفہ کچن میں چوہے سے لڑ جھگڑ رہی تھی۔

زرینہ میرے پاس آئی۔ وہ چائے رکھ کر جانے لگی تو میں نے اسے آہستگی سے آواز دی۔ "سنو..... زرینہ....."

وہ پلٹ کر مجھے دیکھنے لگی۔ منہ سے تو کچھ نہ بولی مگر آنکھوں میں بڑا سا سوالیہ نشان مجھے واضح دکھائی دیا۔

"تمہیں یہاں کوئی پریشانی تو نہیں ہے؟" میں نے ایسے ہی اخبار اپنے سامنے پھیلا لیا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"نہیں صاب جی..... پریشانی تو کوئی نہیں ہوتی۔ بیگم صاب بھی بہت اچھی ہیں۔ بڑا خیال رکھتی ہیں میرا۔" اس نے بھولپن سے بتایا مگر مجھے ایسا لگا کہ وہ کچھ چھپا رہی ہے۔

"دیکھو..... ادھر آرام سے بیٹھو۔" میں نے سامنے والے صوفے کی طرف اشارہ کیا مگر وہ نہیں بیٹھی۔

"میں ایسے ہی ٹھیک ہوں جی....." اس نے ایسے انداز میں کہا جیسے وہاں سے جانا چاہتی ہو۔

میں نے اس کے بیٹھنے پر کوئی اصرار نہیں کیا اور سنجیدگی سے کہا۔ "کچھ دنوں سے میں محسوس کر رہا ہوں کہ تم پریشان سی نظر آ رہی ہو؟ دیکھو..... مجھ سے گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے اپنا ہمدرد ہی سمجھا کرو۔"

"اگر کوئی بات ہوتی تو میں آپ کو ضرور بولتی صاب جی۔ میں ٹھیک ہوں۔" وہ بہت پکی تھی۔ وہ اپنے آپ کو مضبوط خول میں بند کرنا جانتی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ اس کی گرہیں کھولنا بہت مشکل ہے۔

"اگر پیسوں کا کوئی مسئلہ ہو تو بتا دینا۔" میں نے یہ کہہ کر اخبار پر نظریں جما دیں۔ وہ چلی گئی۔

بہرحال اس روز کے بعد میں نے زرینہ سے اس کی پریشانی کے بارے میں کوئی سوال نہ کیا لیکن مجھے پورا یقین تھا کہ زبیر ضرور میرے پیچھے آ کر اسے مختلف طریقوں سے تنگ کرتا ہو گا۔ ایک روز میں آفس گیا لیکن وہاں میری طبیعت خراب ہونے لگی۔ بخار سا چڑھ گیا۔ وہاں سے میں نے چھٹی لی اور گھر کی راہ لی۔ معمول کے خلاف آج میں جلد گھر آ گیا تھا۔ اتفاق سے دروازہ کھلا تھا۔ مجھے بڑی حیرانی ہوئی مگر جب برابر والے فلیٹ سے آصفہ کے باتیں کرنے کی تیز تیز آوازیں سنائی دیں تو سمجھ گیا کہ وہ کسی کام سے وہاں گئی ہے اس لیے دروازہ کھلا ہوا ہے۔ میں خاموشی سے گھر میں داخل ہو گیا۔ بیڈ روم کے پاس آیا تو اندر مجھے کسی کی دبی دبی سی آواز سنائی دی۔ پھر کوئی مردانہ آواز آئی۔ وہ ہنس رہا تھا۔ میں دروازے کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا اور اندر کی آوازیں سننے کی کوشش کرنے لگا۔ اندر زبیر اور زرینہ موجود تھے۔ زبیر دبی ہوئی آواز میں بول رہا تھا۔ "ایمان سے زرینہ..... تم بہت بھولی ہو۔ اسی لیے میں تمہیں پسند کرنے لگا ہوں' لیکن تم شاید میری محبت کو ابھی تک نہیں پہچانی ہو۔"

"آپ..... آپ ایسا مت بولا کرو صاب..... میری بات تو طے ہو چکی ہے ادھر رحیم یار خان میں۔ یہاں تو میں نوکری کرنے آئی ہوں۔ مجھے چھوڑ دو جی....." زرینہ کی بے بس آمیز آواز آئی۔ "بیگم صاب نے دیکھ لیا تو میری نوکری ختم ہو جائے گی۔"

"کیسے ختم ہو گی..... میں جو ہوں۔ دیکھو..... میں تمہیں بہت گھمایا کروں گا۔ تم چلو گی نا میرے ساتھ؟" زبیر اسے مختلف انداز میں اپنے جال میں پھنسانے کی کوشش کر رہا تھا۔

اب مجھ سے برداشت نہ ہو سکا۔ میں ایک دم اندر داخل ہو گیا۔ زبیر نے زرینہ کی کلائی پکڑی ہوئی تھی اور اسے اپنے نزدیک کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ زرینہ مزاحمت کر رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر زبیر ایک لمحے کے لیے بھونچکا رہ گیا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ میں خلاف معمول آفس سے اس وقت آ جاؤں گا۔ اس نے زرینہ کی کلائی چھوڑ دی تھی اور سٹپٹائے ہوئے انداز میں مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اسے عین موقع پر پکڑا تھا۔ عذر تراشنے کے لیے اس کے پاس کچھ باقی نہ رہا تھا۔

"مجھے یہ سب دیکھ کر کوئی حیرانی نہیں ہوئی۔" میں نے پرسکون مگر زہریلے لہجے میں کہا۔ "مجھے تم جیسے لفنگے سے یہی توقع تھی اور اس کے سوا تم کر بھی کیا سکتے ہو۔ تمہیں اس بات کا بھی کوئی احساس نہیں رہا کہ یہ تمہاری بہن کا گھر ہے' اگر آس پڑوس کے لوگوں کو یہ معلوم ہوا کہ اس گھر میں ایسی واہیات حرکتیں ہو رہی ہیں تو عزت کس کی خراب ہو گی؟ تم تو بے غیرتوں کی طرح یہاں سے چلے جاؤ گے۔ پیچھے تو ساری باتیں ہمیں سننے کو ملیں گی۔"

زبیر کے دل میں چور تھا۔ وہ کون سا اس غریب لڑکی

سے کوئی سچی محبت کرنے جا رہا تھا۔ اس کے باوجود اس نے جھٹلاتے ہوئے کہا۔ ”بھائی صاحب آپ..... بات سمجھنے کی کوشش کریں۔ خواہ مخواہ ایک دم جذباتی ہونے سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔ آپ نے جو کچھ دیکھا اس کے متعلق آپ غلط سوچ رہے ہیں۔“

”میں کیا سوچ رہا ہوں اور کیا نہیں، یہ تمہارے سوچنے کی بات نہیں ہے۔“ میں نے اس بار غصے کا اظہار کیا۔ ”آئندہ یہاں آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اب تم جا سکتے ہو۔“ زبیر کندھے اچکا کر باہر نکل گیا۔ میں زرینہ کی طرف مڑا۔ وہ سہمی ہوئی ہرنی کی طرح مجھے دیکھ رہی تھی۔ مجھے اپنی طرف متوجہ پا کر اس کا حوصلہ جواب دے گیا اور وہ رو پڑی۔

”میرا کوئی قصور نہیں ہے صاب جی..... میں نے تو کچھ نہیں کیا وہ تو.....“

میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”میں جانتا ہوں اور مجھے پہلے ہی اس ذلیل پر شبہ تھا۔ اس لیے میں نے تم سے پوچھا تھا کہ تمہیں یہاں کوئی پریشانی تو نہیں ہوتی مگر تم نے مجھے ٹال دیا تھا۔“ وہ خاموشی سے اپنے دوپٹے کا کنارہ موڑتی رہی۔

میں نے اس واقعے کا ذکر اسی دن شام کے وقت آصفہ سے کیا تھا۔ اس وقت تک زرینہ جا چکی تھی۔ آصفہ نے میرے منہ سے یہ بات سنی تو اس کے ماتھے پر ناگواری کی شکنیں ابھر آئیں۔ ”بات کوئی اور ہی ہوگی۔ میرا بھائی خراب صحبت میں رہتا ضرور ہے مگر ہمارا خون گندہ نہیں ہے۔ آپ بلاوجہ اس پر شک کر رہے ہیں۔“

”شک نہیں یہ آنکھوں دیکھی بات بتائی ہے میں نے۔“ مجھے یقین تھا وہ اپنے بھائی کی طرف داری کرے گی۔ ”میں نے زبیر کو آئندہ یہاں آنے سے منع کر دیا ہے۔ میری عزت کی بات ہے۔“

آصفہ نے دبے دبے انداز میں احتجاج کیا مگر زیادہ اور کچھ نہ بولی۔ میں پوری طرح مطمئن نہیں ہوا تھا بلکہ مجھے سو فی صد یقین تھا کہ زبیر پھر بھی آئے گا اور آصفہ مجھ سے بھی اس کی آمد کے بارے میں چھپائے گی۔ بعد میں میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ زبیر اب بھی میرے گھر آتا تھا۔ ایک دن چھٹی والے روز وہ میرے پاس آیا۔ اس کے چہرے پر ندامت اور شرمساری کے آثار تھے بولا۔ ”بھائی صاحب! میں اب بھی یہی کہتا ہوں کہ آپ نے مجھے غلط سمجھا، لیکن بہرحال میں اس بات کی وضاحت نہیں کروں گا۔ بس میں تو آج آپ سے معذرت کرنے آیا ہوں۔ سوری۔“

”ٹھیک ہے مگر تمہیں خود کو سدھارنا چاہیے۔“ میں نے قدرے نرم لہجے میں کہا۔ ”تم اکلوتے ہو۔ دونوں چھوٹی بہنوں کی ذمہ داری بھی تم پر ہے۔ بوڑھا باپ کب تک تمہیں پالے گا۔ آگے کے بارے میں سوچو۔“

”جی بھائی صاحب!“ اس نے سر جھکا کر کہا۔

پھر کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہ آیا۔ زبیر کبھی کبھار میرے گھر آ جاتا تھا۔ زرینہ اپنے کام سے کام رکھتی تھی لیکن اسے میں نے کہہ دیا تھا کہ اگر زبیر دوبارہ کوئی حرکت کرے تو مجھے ضرور بتائے۔ کچھ عرصے تک تو کوئی بات نہ ہوئی مگر پھر ہو گئی۔

میری ممانی کا طویل علالت کے بعد انتقال ہو گیا تھا۔ وہ ڈیفنس میں رہتی تھیں۔ جب ہمیں اطلاع ملی تو اس وقت میں آفس جانے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ اطلاع ملتے ہی میں نے آفس فون کر دیا اور پھر میں اور آصفہ ممانی کی طرف روانہ ہو گئے۔ جاتے جاتے آصفہ نے برابر والے فلیٹ میں چابی دے دی کہ زرینہ آئے تو اسے دے دے، وہ صفائی وغیرہ کر لے گی۔

دوپہر کو جب میں تدفین پر سے ممانی کے گھر لوٹا تو موبائل پر ہمارے پڑوسیوں کی کال موصول ہوئی۔ پڑوسیوں کا لڑکا تھا جو بہت گھبرائے ہوئے لہجے میں بول رہا تھا۔ ”وسیم بھائی آپ کدھر ہیں، جلدی سے گھر آ جائیں۔“

”خیریت تو ہے کیا ہوا؟“ میں پریشان ہو گیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

”بس آپ آ جائیں۔ پولیس آپ کی ملازمہ کو پکڑ کر لے گئی ہے۔“ اس نے بتایا۔

”ملازمہ کو پولیس لے گئی۔ اس لڑکی زرینہ کو.....؟“ میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔

”ہاں..... بس آپ فوراً آ جائیں۔“

”میں..... میں آتا ہوں۔“ میں نے رابطہ منقطع کیا۔ اپنے ایک رشتے دار سے کہہ دیا کہ آصفہ سے کہنا میں ابھی ایک کام سے جا رہا ہوں۔ ہو سکتا ہے دیر لگ جائے۔ زیادہ دیر ہو تو ادھر ممانی کے گھر ہی ٹھہر جانا۔ اپنے فلیٹ پہنچا تو وہاں پڑوس والوں کو اور زبیر کو پایا۔ زبیر مجھے دیکھتے ہی بولنے لگا۔ ”بھائی صاحب..... دیکھا آپ نے اور کریں اس ملازمہ پر اعتماد۔ اگر میں عین موقع پر نہ آتا تو آج گھر کا صفایا ہو گیا تھا۔“ میں نے دیکھا کہ زبیر کے ماتھے پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔

میرا تو دماغ ہی کام نہیں کر رہا تھا۔ ”پوری بات صحیح سے بتاؤ؟ کیا ہوا؟“

پھر پڑوسی اور زبیر نے جو کہانی سنائی اس کے مطابق ہمارے جانے کے ایک گھنٹے بعد زرینہ کام کے لیے آ گئی تھی۔ پڑوسی سے اس نے فلیٹ کی چابی لے لی اور اندر چلی گئی۔ پڑوسیوں نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ دی البتہ انہوں نے یہ ضرور بتایا کہ انہیں کچھ اجنبی آوازیں ضرور سنائی دی تھیں مگر انہوں نے ان آوازوں کو نظر انداز کر دیا۔ اتفاق سے زبیر وہاں آ گیا۔ اس کے ساتھ اس کے دو دوست بھی تھے جنہیں باہر کھڑا کر کے زبیر اندر گیا تو اس نے دیکھا کہ اندر زرینہ کے علاوہ دو آدمی اور تھے اور دونوں مل کر گھر کی قیمتی چیزیں قالین پر بچھی ہوئی چادر پر رکھ رہے تھے۔ زبیر کو آتے دیکھ کر انہوں نے اسے دھکا دیا۔ اس کا سر میز کے کونے سے جا لگا۔ بدحواسی میں انہوں نے فلیٹ کا دروازہ بھی بند نہیں کیا تھا اس لیے زبیر اندر آ گیا تھا۔ اسے دھکا دینے کے بعد وہ دونوں آدمی باہر بھاگ گئے لیکن زبیر نے زرینہ کو پکڑ لیا تھا۔ پھر اس نے اپنے دوستوں اور پڑوسیوں کے ساتھ مل کر اسے پولیس کے حوالے کر دیا۔

زبیر کے بتانے کا انداز ایسا تھا کہ میں بھی سوچنے پر مجبور ہو گیا۔ جو قصہ اس نے سنایا تھا ایسے قصے پہلے بھی ہوتے رہے ہیں۔ ملازماؤں یا ملازموں نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر گھروں اور فلیٹوں کو لوٹا تھا۔ بہ ظاہر تو زرینہ میں ہم نے کبھی ایسی کوئی بات نہیں دیکھی تھی مگر نیت خراب ہونے میں بھلا کتنی دیر لگتی ہے۔

زبیر کو فلیٹ میں چھوڑ کر میں تھانے پہنچا۔ زرینہ حوالات میں بند تھی۔ دو سپاہی حوالات کے سامنے کھڑے اسے کچھ کہہ رہے تھے۔ میں نے زرینہ کو دیکھا تو اس کی بھولی بھالی صورت دیکھ کر ایک لمحے کو میں ٹھٹک گیا۔ میں کیسے یقین کر لوں کہ وہ بچوں جیسے چہرے والی معصوم لڑکی کوئی مجرمانہ قدم اٹھا سکتی ہے۔ اس کی آنکھوں کی ویرانی دیکھ کر میرا دل کانپ اٹھا۔ اس کے لیے میرے دل میں جو غصہ تھا وہ ایک دم کافور ہو گیا۔ مجھے دیکھ کر بھی اس کے جسم میں کوئی حرکت نہ ہوئی البتہ آنکھوں سے بہنے والے آنسو مزید تیزی سے بہنے لگے تھے۔ میں اس کے نزدیک جا کھڑا ہوا۔ وہ سلاخوں کے اس پار بیٹھی تھی۔

”زرینہ.....“ میں بولا تو خود مجھے اپنی آواز اجنبی معلوم ہوئی۔

”صاب جی.....“ وہ ایک دم سسک پڑی۔ ”مم..... میں..... میں.....“

”تم بے قصور ہو نا.....؟“ میں نے یقین کے ساتھ استفسار کیا۔ ”میں جانتا ہوں تم چوری نہیں کر سکتی ہو۔“

”میں نے کچھ بھی نہیں کیا تھا..... میں تو جی گھر کا کام کر رہی تھی کہ وہ آ گیا۔“ زرینہ آہستہ آہستہ بتانے لگی۔

”وہ..... زبیر.....؟“ میں نے بھویں اچکا کر اسے دیکھا۔

”ہاں۔“ اس نے گردن ہلائی۔ ”اور جب اس نے دیکھا کہ میں وہاں اکیلی ہوں تو وہ..... اپنی من مانی کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ میں تو وہاں سے بھاگنا چاہ

رہی تھی جی۔"

"پھر.....؟" میرا دماغ گرم ہو رہا تھا۔

"پھر اس کے دو دوست بھی آ گئے۔ میں جب چلائی تو پڑوسیوں نے میری آواز سن لی۔ زبیر نے جب دیکھا کہ اس کا مقصد اب پورا نہیں ہو سکتا تو اس نے مجھ پر چوری کا جھوٹا الزام لگا دیا اور پولیس میں پکڑوا دیا۔" وہ رونے لگی۔

"تم فکر مت کرو۔ تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔ میں ابھی تھانیدار سے بات کرتا ہوں۔"

میں انسپکٹر کے پاس جا پہنچا۔ پھر رات کے نو بج گئے لیکن میری ہر کوشش رائیگاں گئی۔ تھانے والے زرینہ کو چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھے۔ وہ حیل وحجت سے کام لے رہے تھے۔ انہوں نے زرینہ کو پکڑنے کے لیے اپنے جسموں کو حرکت دینے کی زحمت کی تھی۔ اپنی محنت کا معاوضہ تو انہیں ہر صورت چاہیے تھا مگر میں ایک پیسہ بھی رشوت دینا حرام سمجھتا تھا۔ وہ لوگ زرینہ کے گھر والوں کے منتظر تھے جو اس کی ضمانت کے عوض انہیں ان کا محنتانہ دے کر جاتے۔ بالآخر تھک ہار کے میں وہاں سے آ گیا۔ آصفہ کو فون کر دیا کہ میں گھر آ گیا ہوں کل تمہیں لینے آؤں گا۔

رات بہت دیر تک میں کروٹیں بدلتا رہا۔ میرے گھر آتے ہی زبیر وہاں سے چلا گیا تھا۔ بار بار میری آنکھوں کے سامنے معصوم اور بے قصور زرینہ کا چہرہ آ رہا تھا۔ اسے اپنی معصومیت اور بھولپن کی بھاری قیمت ادا کرنی پڑی تھی۔ وہ اپنے معاشی مسائل سے لڑنے جھگڑنے کراچی آئی تھی' اپنا گھر بار اور سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر لیکن یہاں آ کر وہ دوسرے مسائل کا شکار ہو گئی تھی۔ میں جانتا تھا کہ اس کے ماما وغیرہ میں اتنا دم نہیں تھا کہ وہ اسے پولیس کے شکنجے سے چھڑا سکتے۔ مجھے ہی کوئی راستہ نکالنا تھا۔ میں نے اپنی سی کوشش کر کے دیکھ لی تھی کہ اسے رات حوالات میں گزارنے نہ دوں' مگر پولیس والوں کو اپنی من مانی کرنے کے سو بہانے آتے تھے۔ میں ان سے جیت نہیں سکا تھا۔

ایک نوجوان لڑکی کا حوالات میں رات گزارنا بہت سی تشویش ناک بات تھی۔ میں ایک مرد ہو کر خوف ناک وسوسوں سے ڈر رہا تھا اور وہاں وہ جو لڑکی حوالات میں رات بسر کر رہی تھی اس کا نہ جانے کیا حال ہوگا۔

غرض میری پوری رات ایسے ہی گزری۔ کبھی آنکھ لگ جاتی اور کبھی میں چونک کر اٹھ بیٹھتا۔ وہ قیامت کی رات تھی جو گزر گئی لیکن یہ قیامت مجھ پر نہیں بلکہ زرینہ پر گزری تھی۔

جب میں تھانے پہنچا تھا تو پہلے مجھے باہر ہی راہداری میں روک کر بٹھا دیا گیا۔ میں بولتا رہا کہ مجھے زرینہ سے ملنا ہے مگر کسی نے میری کوئی بات نہ سنی۔ وہ لوگ مختلف بہانوں سے کام لیتے رہے۔ وہاں زرینہ کا ماما اور اس کی مامی بھی آ گئی تھی۔ غربت کے دبے کچلے لوگ تھے۔ منہ کھول کر ایک ایک کو دیکھ رہے تھے۔ انہیں تو یہ بھی نہیں پتا تھا کہ انہیں کس سے کیا بات کرنی ہے' بیٹھنا کہاں ہے۔

جب بہت دیر ہو گئی تو میں نے ہیڈ کانسٹیبل سے پھر کہا۔ اس نے مجھے اشارے سے بلایا اور ایس ایچ او صاحب کے روم میں لے گیا۔ سامنے ایس ایچ او صاحب بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے چہرے پر عجیب سی گمبھیرتا چھائی ہوئی تھی۔

"بیٹھیں۔" انہوں نے سامنے رکھی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

"سر مجھے اس لڑکی سے ملنا ہے۔ مجھے اتنی دیر سے اس سے ملاقات کرنے نہیں دی جا رہی ہے۔"

"اس کے بارے میں آپ کو بتانا ہے۔" ایس ایچ او صاحب نے سنجیدگی سے کہا۔

"کیا بات.....؟" میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

"کل رات اس نے حوالات میں خودکشی کر لی۔" انہوں نے دھماکا خیز انکشاف کیا۔

میرا وجود کسی طاقت ور بم کی طرح پھٹ گیا۔ ایسا لگا جیسے تھانے کی چھت مجھ پر آ گری ہو۔ میں نے ہکلاتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "یہ..... یہ..... آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"ٹھیک کہہ رہا ہوں۔" انہوں نے بتایا۔ "جلد ہی اس کی لاش ورثا کے حوالے کر دی جائے گی۔ وہ چوری کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑی گئی تھی شاید سزا کے خوف سے خودکشی کر لی یا پھر اپنے ساتھیوں کے ڈر سے۔ انہی میں سے کوئی وجہ ہو سکتی ہے۔"

میں گومگو کی سی کیفیت میں بیٹھا رہ گیا۔

اب وہاں رہا کیا تھا۔ میں وہاں سے چلا آیا۔ زرینہ کی معصوم صورت میری آنکھوں کے سامنے چکراتی رہی۔ میرا دل نہیں مان رہا تھا کہ اس نے خودکشی کی تھی۔ کوئی حادثہ ہوگا جو اس پر حوالات میں گزرا تھا۔ اخبارات میں اس واقعے کی چھوٹی سی خبر آئی تھی اور بس۔ لوگوں نے یہ خبر پڑھی ہوگی کسی کے دماغ نے اس خبر کے پیچھے چھپی تلخ حقیقت کو نہیں سمجھا ہوگا۔ آہستہ آہستہ میرے دماغ سے یہ واقعہ محو ہوتا چلا گیا۔ یہاں کب کسی غریب کی شنوائی ہوئی تھی۔ کب مجرم بے نقاب ہوتے تھے۔ کب تلخ حقائق پر سے پردے ہٹتے تھے۔ سسٹم اسی طرح چل رہا تھا۔ پولیس نے زرینہ کی لاش خاموشی سے اس کے ماما کے حوالے کر دی تھی۔ اس سادہ لوح انسان نے روتے دھوتے اسے کفنا دفنا دیا۔ میرا خیال تھا کہ اگر پوسٹ مارٹم کرایا جاتا تو کئی باتیں سامنے آ سکتی تھیں۔ زرینہ کی پراسرار موت پر سے گرد ہٹ سکتی تھی۔

آخر ایک سال کے بعد حقیقت اتفاقی طور پر سامنے آ گئی۔

اسی تھانے کا ایس ایچ او شدید زخمی حالت میں اسپتال لایا گیا۔ اس کے بچنے کی کوئی امید نہ رہی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ اسے بہت سی چیخیں سنائی دیتی ہیں۔ ان لوگوں کی چیخیں جو اس کے ظلم کا شکار ہوئے تھے۔ ان میں وہ لڑکی زرینہ بھی تھی۔

ایس ایچ او کو اکیلے میں باقاعدہ پلانگ سے چند مجرموں نے گھیر کر زخمی کیا تھا۔ اسپتال میں وہ زندگی اور موت کی کش مکش میں مبتلا تھا۔ اسپتال میں ہی وہ چیخیں سنائی دیتی تھیں جو کسی اور کو سنائی نہیں دیتی تھیں۔ ایس ایچ او نے اقرار کر لیا تھا کہ اس رات اس نے نشے کی حالت میں اس غریب لڑکی زرینہ پر مجرمانہ حملہ کیا تھا۔ رات گئے تک وہ اور اس کے ساتھی زرینہ کی عزت سے کھیلتے رہے تھے۔ وہ تڑپتی رہی' سسکتی رہی تھی۔ انہیں اللہ رسول کے واسطے دیتی رہی مگر ان لوگوں پر شیطان سوار تھا۔ اپنی ہوس پوری کر کے وہ لوگ چلے گئے تھے۔ زرینہ کا بکھرا ہوا' ٹوٹا پھوٹا وجود حوالات میں پڑا تھا۔ نہ جانے کس وقت اس نے اپنے دوپٹے کو پنکھے سے باندھا اور گلے میں پھندا ڈال کر جھول گئی تھی۔ یہ تمام تفصیل ایس ایچ او کی زبانی اخبارات میں چھپی تھی۔

جب میں نے یہ تمام تفصیل پڑھی تو عجیب سی کیفیات کا شکار ہو گیا تھا۔ قدرت نے خود بہ خود ظالم کو سزا دے دی تھی اور حقیقت کا پردہ بھی اسی کی زبانی چاک کروایا تھا۔ زبیر تو پہلے ہی مکافات عمل کا شکار ہو گیا تھا۔ اس نے زرینہ پر جھوٹا الزام لگایا تھا۔ اس کے ساتھ برائی کی تھی۔ تقدیر کے ترکش سے نکلے ہوئے تیر نے اسے بھی نہیں چھوڑا تھا۔ وہ اپنے بدمعاش قسم کے دوستوں کے ساتھ رات کی تاریکیوں میں لوٹ مار کرتا تھا۔ راہ گیروں سے پیسے اور موبائل وغیرہ چھین لیتا تھا۔ اسی طرح اس کے اخراجات پورے ہوتے تھے۔ ایک رات انہوں نے ایک ٹیڑھے آدمی کو لوٹنا چاہا تو وہ ان کی جان پر مصیبت بن گیا۔ اتفاق سے ایک پولیس موبائل بھی نزدیک ہی تھی۔ وہ سب لڑکے پکڑے گئے باقی لڑکے تو سفارشوں اور رشوت وغیرہ دے دلا کر چھوٹ گئے مگر پولیس نے زبیر پر گزشتہ کئی سالوں کی کردہ اور ناکردہ وارداتیں بھی ڈال دی تھیں اور اسے لمبے عرصے کے لیے جیل بھیج دیا تھا۔

ظالم کی پکڑ کہیں نہ کہیں ضرور ہوتی ہے' لیکن لوگ پھر بھی ان واقعات سے سبق حاصل نہیں کرتے ہیں۔ وہ خبریں پڑھتے ضرور ہیں۔ اس پر افسوس ناک تبصرہ کرتے ہیں توبہ تلا کرتے ہیں اور بس۔ عمل کچھ بھی نہیں۔ نہ جانے ہمارا معاشرہ کب سدھرے گا۔

☆☆☆

گلابوں کی جنگ

اشتیاق فاطمہ اعظمی

پورے ملک میں اس خبر سے خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی..... لوگ سارے گلے شکوے بھول کر اس خوشی کو انجوائے کر رہے تھے۔

اِدھر قاصد یہ خوشخبری لے کر اسپین پہنچا تھا۔

اور اس خبر نے اسپین کے نا صرف دربار میں بلکہ پورے اسپین میں مسرت خیز حدت پیدا کر دی تھی۔ فلپ کے عزیز اقرباء تو اس خبر سے خوش تھے۔ مگر عام شہری بھی اس بات پر بے حد خنداں تھے کہ اب انگلستان بھی اسپین کی عمل داری میں شامل ہونے والا تھا۔

میری کے آنے والے بچے کی خوشی میں پورے اسپین میں غربا کو کپڑے اور کھانا تقسیم کیا گیا۔ بچے کا نام تجویز کر کے اس کے نام پہ ایک بڑا اچرچ تعمیر کروانے کا فیصلہ کیا گیا۔ فلپ کے باپ نے اپنی جائیداد کے ایک بڑے حصے کو ہونے والے پوتے کے نام کرنے کا اعلان کر دیا تھا۔

ان تمام خبروں نے ملکہ میری کی خوشی دوبالا کر دی تھی۔ انگلستان کے لوگ بھی ملکہ میری اور اس کے چیلے چانٹوں کی زیادتی بھول کر خوشی منانے میں لگ گئے تھے۔ اُن کے لیے بھی یہ ایک نہایت خوشی کی خبر تھی اور وہ تمام پچھلی باتیں بھلا کر اس خوشی میں گم ہو گئے تھے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دونوں ملکوں میں ہونے والے بچے یعنی انگلستان کے ولی عہد کی آمد پہ جشن اور دیگر تقریبات کی تیاریاں ابھی سے شروع ہو گئی تھیں۔

میری کے ہاں بچے کی ولادت مئی میں متوقع تھی۔

گزرتے وقت کے ساتھ میری کی ہیئت میں بھی تبدیلی آ رہی تھی۔ حمل کے شروع کے ایام میں ملکہ بے حد صحت مند اور توانا دکھائی دینے لگی تھی۔ مگر جوں جوں دن آگے بڑھ رہے تھے ملکہ کمزور اور لاغر ہوتی جا رہی تھی۔ اس کے چہرے کی رونق اور آنکھوں کی چمک ماند پڑتی جا رہی تھی۔ البتہ اس کا پیٹ بڑھتا جا رہا تھا۔ اسی لیے سب مطمئن تھے کیونکہ بچوں کی ولادت کے مراحل اسی طرح طے ہوتے ہیں۔ ملکہ کی معالجہ دائی اریتا کا خیال تھا کہ مئی میں بچے کی ولادت کے بعد سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ بچے کے بعد وہ ملکہ کو طاقت اور توانائی کی دوائیں دے گی جس سے ملکہ چند دنوں میں ہی سرخ و سفید ہو جائے گی۔

اسپین کے حالات نرم گرم چل رہے تھے، چارلس پنجم چاہتا تھا کہ اب فلپ اسپین میں آ کر حالات کی باگ دوڑ اپنے ہاتھوں میں لے لے مگر، میری کے گھر بچے کی آمد کی وجہ سے نہ وہ بیٹے کو بلا رہا تھا اور نہ ہی فلپ واپس جا سکتا تھا...... وہ ان دنوں سائے کی طرح ملکہ کے آگے پیچھے گھوم رہا تھا...... اور اس کی توجہ اور محبت پا کر ملکہ بے حد خوش تھی اور اپنی ان تمام خوشیوں اور راحتوں کی وجہ وہ دائی اریتا کو سمجھتی تھی...... اور آئے دن وہ اُس پہ انعام و اکرام کی بارشیں کرتی رہتی تھی۔ جوں جوں ولادت کی متوقع تاریخ قریب آ رہی تھی۔ ملکہ نے اریتا کو اپنے محل میں ہی بلا کر رکھ لیا تھا۔ اب آٹھوں پہر دائی اریتا ملکہ کے ساتھ ہی ہوتی تھی۔

مئی کا مہینہ تیزی سے گزرتا جا رہا تھا لیکن عوام اور خود میری جس خوشخبری کی منتظر تھی۔ وہ خوشخبری دینے والا دن نہیں آیا اور دیکھتے ہی دیکھتے پورا مئی گزر گیا۔

جون کے گزرتے ہوئے دن نا صرف ملکہ بلکہ عوام میں بہت بے چینی اور پریشانی جگا رہے تھے۔

اریتا! ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ سینکڑوں بار کیا گیا سوال ایک بار پھر ملکہ اریتا سے کر رہی تھی۔

''میں تو خود سخت پریشان ہوں۔'' اریتا نے پپڑی زدہ لبوں پہ زبان پھیرتے ہوئے کہا۔ ''اگر آپ برا نہ مانیں تو کسی اور معالج کو بھی دکھا لیں۔''

اریتا کی اس بات سے ملکہ کے دل کو دھچکا سا لگا تھا۔ وہ تو سمجھتی تھی کہ اس کے ہر درد کا درماں اریتا ہی ہے مگر آج اریتا خود اس کو کسی اور معالج کا مشورہ دے رہی تھی۔ مسز کیٹی اور فلپ کا بھی یہی خیال تھا۔ ایک بار پھر ڈاکٹر ماریہ کو طلب کیا گیا۔

لندن کے نیلے آسمان پہ سورج کا سنہری گولہ جگمگا رہا تھا۔ گلی کوچوں میں راحت بخش سنہری دھوپ بکھری ہوئی تھی۔

ایسا خوشگوار موسم لندن کو کبھی کبھار ہی نصیب ہوتا تھا۔ لوگ باگ مسکراتے چہروں کے ساتھ اپنے روزمرہ کے معمول میں مصروف تھے۔ جبکہ ڈاکٹر ماریہ ایسے میں ملکہ کا معائنہ کر رہی تھی۔

اُس نے ملکہ کے سیاہ چہرے، حلقوں میں اُتری ہوئی آنکھوں اور پھولے ہوئے پیٹ کی طرف حیرت سے دیکھا اور دھیرے دھیرے اس کی جانب بڑھی پھر اُس نے ہاتھ سے ملکہ کا پھولا ہوا سخت پیٹ ٹٹولا۔ ملکہ کو اچانک ہی اپنے پیٹ میں درد کی لہر اُٹھتی محسوس ہوئی۔ مگر ماریہ درد پہ توجہ دیئے بغیر اپنے معائنے میں مصروف رہی۔

کچھ دیر بعد اُس نے سرد اور خشک لہجے میں کہا۔

''ملکہ عالیہ! مجھے افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے کہ آپ کے پیٹ میں......!''

کیا ہے ملکہ کے پیٹ میں؟ مسز کیٹی نے آگے بڑھ کر قدرے غصیلے لہجے میں پوچھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ملکہ اپنے آرام دہ بستر پر دراز تھی اور ڈاکٹر ماریہ اس کے پیٹ کو ٹٹول کر دبا کر اور سائیڈوں سے ہلا کر چیک کر رہی تھی۔ چیک اپ کے ختم ہوتے ہی اس نے سرد اور خشک آواز میں اعلان کیا تھا۔

ملکہ عالیہ! مجھے بہت افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے کہ آپ کے پیٹ میں...... ؟ کیا ہے ملکہ کے پیٹ میں...... ؟ مسز کیٹی نے آگے بڑھ کر قدرے غصیلے لہجے میں پوچھا تھا۔ اس کی آواز سے بے چینی اور تشویش بھی ہویدا تھی۔

''ملکہ عالیہ کے پیٹ میں بچہ نہیں ہے۔''

''کیا'' ڈاکٹر کے جواب نے نا صرف مسز کیٹی کو بلکہ ملکہ کو بھی ساکت کر دیا تھا۔

کیا کہہ رہی ہیں آپ ڈاکٹر؟ کئی لمحوں تک ساکت رہنے کے بعد مسز کیٹی نے حیران اور پریشان لہجے میں سوال کیا تھا۔ ملکہ کے پیٹ میں اگر بچہ نہیں ہے تو پھر کیا ہے؟

ملکہ کے پیٹ میں ایک انتہائی خطرناک قسم کی بیماری ہے...... ایک رسولی ہے...... جس کی وجہ سے یہ پیٹ اتنا بڑا دکھائی دے رہا ہے اور اگر جلد از جلد اس کا علاج نہ ہوا تو یہ بیماری جان لیوا بھی ثابت ہو سکتی ہے۔''

ڈاکٹر نے غیر جذباتی اور سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

مگر اس کا جواب سن کر مسز کیٹی بدحواس سی ہو گئی تھی، جبکہ ملکہ حیران نظروں سے ڈاکٹر کو تکے جا رہی تھی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ ڈاکٹر کی بات کو سمجھ ہی نہیں سکی ہے۔

''ڈاکٹر'' چند ثانیوں کے جان لیوا سکوت کے بعد مسز کیٹی کی گھٹی گھٹی اور بے حد دھیمی آواز ابھری...... ''کیا...... واقعی ایسا ہے۔''

میرا علم اور تجربہ تو یہی کہتا ہے۔ البتہ میں چاہوں گی کہ شاہی ہسپتال کے کچھ اور سینئر اور زیرک ڈاکٹرز کو دکھا لیا جائے۔

مگر...... یہ کیسی عجیب بات ہے کہ...... نو مہینوں کے جان گسل انتظار کے بعد یہ بات سامنے آئے کہ پیٹ میں سرے سے بچہ ہی نہیں...... بلکہ یہ تو......''

مسز کیٹی نے سرگوشی میں بات شروع کی تھی مگر ملکہ کو اپنی طرف متوجہ پا کر وہ بات پوری کیے بنا ہی یک لخت چپ ہو گئی تھی۔

''مسز کیٹی'' کئی لمحوں کی خاموشی اور حیرانی کے بعد ملکہ کی سپاٹ سی آواز ابھری تھی۔ ''تمہاری یہ ڈاکٹر کیا کہہ رہی ہے؟''

''ملکہ عالیہ'' مسز کیٹی لپک کر ملکہ کے قریب چلی گئی تھی اور قدرے احترام بھرے انداز میں جھک کر اس نے سمجھانے والے لہجے میں کہا تھا۔

''ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ کسی حتمی رائے سے پہلے شاہی شفاخانے کے دیگر سینئر ڈاکٹرز کو بھی دکھا لیا جائے تو مناسب ہے۔''

''مجھے شروع سے اس ڈاکٹر پر اعتبار نہیں ہے۔'' ملکہ نے ذرا سا رخ موڑ کر دھیمی آواز میں اپنی رائے کا اظہار کیا۔

''ہٹاؤ...... بدبخت کہہ رہی ہے پیٹ میں بچہ ہی نہیں ہے...... جبکہ ادھر اسپین میں اس بچے کی آمد کے سلسلے میں شب و روز جشن کا سماں ہے۔ وہاں کس قدر خوشیاں منائی جا رہی ہیں۔ غرباء و مساکین میں کھانا، مفلوک الحال لوگوں میں کپڑے اور پیسے تقسیم کیے جا رہے ہیں۔ دن کو کوچہ کوچہ گلی گلی، پھولوں سے سجایا جاتا ہے تو راتوں کو قریہ قریہ میں چراغاں ہوتا ہے۔ یہ خوشبو اور روشنی کا سفر کیا بے وقعت اور بے معنی ثابت ہوگا...... ؟ نہیں مسز کیٹی...... ایسی بدشگونی کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی۔ بلکہ سوچنا بھی نہیں چاہتی میں تو جلد از جلد اس ننھے فرشتے کو اپنی گود میں دیکھنا چاہتی ہوں جو میری کوکھ میں پل رہا ہے۔'' ملکہ نے دونوں ہاتھوں کو پیار بھرے انداز میں اپنے پھولے ہوئے پیٹ پر پھیرتے ہوئے سرگوشی میں کہا تھا۔ ''اس ڈاکٹر کو فوراً چلتا کرو۔ وہ دائی کہاں ہے...... اسے بلاؤ اور اس سے تاخیر کی وجہ دریافت کرو۔''

ملکہ کی ناخوشگواری محسوس کرنے کے باوجود ڈاکٹر آگے بڑھی تھی اور اس نے سر جھکا کر اور قدرے دوہرا ہوتے ہوئے انتہائی لجاجت بھرے مگر بے حد مودب لہجے میں گزارش کی تھی۔

''ملکہ عالیہ'' آپ میری بات کا اعتبار کریں۔ آپ ایک انتہائی بدترین مرض میں مبتلا ہیں...... اگر جلد از جلد مناسب

علاج معالجے کا انتظام نہ کیا گیا تو..... تو....."

ڈاکٹر انتہائی دکھ کرب اور بے بسی کے سے انداز میں بول رہی تھی اور ملکہ سے زیادہ مسز کیٹی اس کی باتوں کو غور سے سن رہی تھیں۔

تو کیا ہوگا؟ ڈاکٹر کے رکتے ہی ملکہ نے انتہائی درشت لہجے میں دریافت کیا۔ "کیا میں مر جاؤں گی۔"

ملکہ کا غصہ محسوس کرنے کے باوجود ڈاکٹر نہایت دلیری اور بے حد سنجیدگی سے جواب دہ ہوئی تھی۔

"خدانخواستہ' میرے منہ میں خاک..... مگر..... ایسا بھی ہوسکتا ہے۔"

"نہیں ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔" ملکہ اپنی کمزوری اور نقاہت کے باوجود تن کر بیٹھ گئی تھی۔ اس کے چہرے پر خشونت کے آثار تھے اور آنکھوں سے غصہ جھلک رہا تھا۔ "نہیں ڈاکٹر ماریہ..... ایسا بالکل بھی نہیں ہوگا..... میں چاہوں گی کہ تم یہ دیکھنے کے لیے زندہ رہو کہ..... میں نے ملکہ انگلستان نے اپنے محبوب شوہر کے بچے کو جنم دیا۔ اور اس کی ولادت کے جشن میں شامل ہوئی۔"

"کاش ایسا ہوسکتا۔" ڈاکٹر ہتھیلی پر سر رکھ کر بولی۔ "ملکہ عالیہ میں آپ کی ڈاکٹر ہوں' اس ناطے آپ کی بہی خواہ ہوں..... آپ کوئی عام عورت نہیں ہیں۔ آپ انگلستان کی ملکہ ہیں..... خدارا خود پر رحم کیجیے اور ہمارے وطن کو اتنے اچھے' حکمران سے محروم نہ ہونے دیجیے۔"

"کیا تمہیں اپنی زندگی سے پیار نہیں۔" ملکہ نے سرد نظروں سے ماریہ کو دیکھتے ہوئے یخ بستہ لہجے میں سوال کیا۔

"مجھے اپنی زندگی سے زیادہ آپ کی زندگی عزیز ہے۔ خدا کے لیے..... آپ اپنا معائنہ کروائیے اور علاج پر توجہ دیجیے۔"

ڈاکٹر ماریہ نے بے ساختہ ملکہ کے پاؤں پکڑ لیے تھے۔

"ملکہ عالیہ پلیز..... اب بالکل بھی تاخیر کی گنجائش نہیں ہے..... آپ کو علاج کی سخت ضرورت ہے۔ بچے کے مغالطے میں پہلے ہی مرض کو پھیلنے کا خوب موقع ملا ہے۔ اس لیے اب رسولی کا سائز بے حد بڑا ہو چکا ہے۔ یہ..... یہ سب حد خطرناک بھی ثابت ہوسکتا ہے۔"

ڈاکٹر کی آواز اور انداز میں ایسا ضرور کچھ تھا کہ ملکہ کئی لمحوں تک بے حس و حرکت بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی تھی۔ ملکہ کی خاموشی کے وقفے سے مسز کیٹی نے بھی فائدہ اٹھاتے ہوئے کسی قدر دھیمی آواز میں اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"میرا بھی یہی خیال ہے کہ آخر کسی دوسرے ڈاکٹر کو رائے لینے میں حرج ہی کیا ہے۔ کیوں ملکہ عالیہ؟" اپنی بات کے اختتام پر اس نے ملکہ سے تصدیقی انداز میں سوال کیا تھا۔

"آں..... ہاں" ملکہ یوں چونکی تھی جیسے ابھی ابھی نیند سے جاگی ہو۔ اس کا زرد چہرہ کچھ اور مرجھایا ہوا لگ رہا تھا۔ چند لمحوں پہلے تک ماں بننے کا شوق ایک دہکتی مشعل کی طرح اس کے چہرے سے ہویدا تھا۔ اب وہ روشنی دہشت اور وحشت کی تاریکی میں کہیں تحلیل ہوگئی تھی۔ اس کی آنکھوں سے خوف جھانکنے لگا تھا اور وہ یکا یک دھم سے بیڈ پر گر گئی تھی کسی کٹے ہوئے شہتیر کی مانند۔

"ملکہ عالیہ۔" مسز کیٹی پریشان سے انداز میں اس کی جانب لپکی تھی۔ "آپ ٹھیک تو ہیں نا۔"

"ہاں" ڈاکٹر سے کہو معائنے کا انتظام کروائے ملکہ کی حمکن سے چور مایوس آواز ابھری۔

ڈاکٹر کی تشخیص شہزادے فلپ تک بھی پہنچ چکی تھی۔

کیا کہہ رہے ہو رینارڈ؟ اس نے حیرت و بے یقینی سے خبر لانے والے رینارڈ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ "بھلا یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے۔ پہلے کبھی ایسا سنا' کہ کسی عورت کے پیٹ میں نو مہینے تک بچہ پلتا رہا اور آخر میں پتہ چلا پیٹ میں ایک بدگوشت کا ڈھیر لگا ہے۔ چھی چھی..... یہ ڈاکٹر کتنی بے ہودہ بات کہہ رہی ہے۔ مجھے فوری طور پر میری کے پاس لے کر اس کی تشفی کا سامان کرنا ہوگا۔"

"مگر اس وقت؟"

رینارڈ نے قدرے کسمساتے ہوئے کہا۔ "اس وقت وہ لیبر روم میں ہوں گی۔ تخلیق کے کربناک عمل سے گزر رہی ہوں گی..... بھلا اس وقت ہمارا وہاں کیا کام۔"

"ہاں یہ تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" فلپ نے اپنے سامنے دھرے ساغر و مینا کی جانب توجہ مبذول کرتے ہوئے تائید بھرے انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

حسب معمول وہ فرصت کے لمحات میں مے نوشی کے شغل سے لطف اندوز ہو رہا تھا اور ابھی ابھی ایک جاسوس خادمہ نے یہ اطلاع بہم پہنچائی تھی کہ ڈاکٹر نے یہ انکشاف کیا ہے کہ ملکہ حاملہ ہونے کے بجائے ایک خوفناک مرض کا شکار ہے اور اس کے پھولے ہوئے پیٹ میں بچے کے بجائے ایک بدگوشت کا لوتھڑا ہے جسے عرف عام میں رسولی کہا جاتا ہے۔

خبر رینارڈ تک پہنچی تھی اور وہ خود بھونچکا رہ گیا تھا پھر اس نے خود کو سنبھالتے ہوئے یہ خبر فلپ کے گوش گزار کردی تھی۔

سب توقع فلپ بھی ششدر رہ گیا تھا اور نشے میں ہونے کے باوجود اس نے اس خبر کو سچ ماننے سے انکار کردیا تھا۔

"بھلا ایسا' کیسے ممکن ہے رینارڈ۔" اس نے بے یقین لہجے میں رینارڈ سے سوال کیا تھا اور فوری طور پر ملکہ کے پاس جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا تھا مگر رینارڈ نے اسے سمجھا بجھا کر روک لیا تھا اور وہ خاموشی سے بلوری پیمانہ لبریز کر کے چسکیاں لینے لگا تھا۔

اُدھر ڈاکٹر ماریہ ملکہ اور مسز کیٹی کو قائل کرنے کی تگ و دو میں مصروف تھی۔ مسز کیٹی شروع سے ہی ماریہ کی بات سننے اور ماننے کے حق میں تھیں مگر ملکہ کے غصے اور ناپسندیدگی کے ڈر سے وہ اب تک ملکہ کی ہاں میں ہاں ملا رہی تھی مگر اب ڈاکٹر ماریہ کا حوصلہ اور بے خوفی دیکھ کر اسے بھی حوصلہ ملا تھا اور آخر کار ملکہ قائل ہوگئی تھی اور اس نے حکم دیا تھا کہ ڈاکٹرز کے بورڈ سے معائنے کا فوری انتظام کیا جائے۔

ملکہ کا حکم ملتے ہی ڈاکٹر ماریہ تیزی سے کمرے سے نکل گئی تھی۔

اب مسز کیٹی ہراساں و پریشان سی ملکہ کے سرہانے اکیلے کھڑی تھی۔ اس کی مایوسی اور افسردہ نظریں ملکہ کے زردی مائل سیاہ چہرے پر جمی تھیں۔ جب سے وہ ملکہ میری کے قریب آئی تھی اس نے اسے مثل اولاد کے چاہا تھا۔ اس نے ہمیشہ ہی میری پر اپنی بے لوث ممتا لٹائی تھی۔ میری اسے ماں سمجھتی تھی یا نہیں مگر مسز کیٹی نے اسے ہمیشہ ہی اپنی عزیز اور چہیتی بیٹی تصور کیا تھا۔

وہ ایک حرماں نصیب اور کوکھ جلی عورت تھی۔ بانجھ اور بے اولاد شوہر کے مرنے کے بعد اس نے دوسری شادی کرلی تھی۔ پر دوسرا شوہر بھی اسے اولاد نہ دے سکا اور وہ ایسا کر بھی کس طرح سکتا تھا کیونکہ کیٹی بانجھ عورت تھی۔ چند سال بعد اس کا دوسرا شوہر اسے چھوڑ کر کہیں چلا گیا اور پھر کبھی لوٹ کر نہ آیا۔ مسز کیٹی نے جسم و جان کے رشتے کو باہم قائم رکھنے کی خاطر کسی کام دھندے کے بارے میں سوچا اور یوں قسمت اسے لارڈ لے ٹمر کے ولا پہ لے آئی تھی' لے ٹمر ایک مہذب اور اچھا انسان تھا۔ اس کے گھر میں ہاؤس کیپر کی حیثیت سے کام کرتے ہوئے مسز کیٹی بے حد مطمئن اور خوش تھی وہ بے اولادی کے غم کو تقریباً بھول ہی چکی تھی کہ بالکل اچانک ایک رات کیتھرین پارلے ٹمر کے ولا میں چلی آئی تھی اور اس حسین آنکھوں اور سنجیدہ خدوخال والی دلکش و رعنا لڑکی کو دیکھ کر پہلی بار مسز کیٹی کے دل میں اسے اپنی بیٹی بنانے کا خیال پیدا ہوا تھا۔ وہ کیتھرین کو ایک ماں کی طرح چاہنے لگی تھیں آپ سے آپ کیتھرین کے لیے اس کے دل میں مامتا کا سمندر ہلکورے لینے لگا تھا۔ کیتھرین نے جلد ہی یہ بات محسوس کرلی تھی وہ بھی قسمت کی ماری تھی۔ اس کی ماں کو ایک ظالم' زمین دار نے موت کی گھاٹ اتار دیا تھا اور اس کے باپ کو بیوی کے قتل کے الزام میں لاک اپ کردیا گیا تھا' اسے بھی زمین دار کی حویلی میں پہنچا دیا گیا تھا۔ مگر وہ کسی نہ کسی طرح وہاں سے جان اور عزت بچا کر نکلنے میں کامیاب ہوگئی تھی اور مدد کے لیے لارڈ لے ٹمر کے پاس پہنچی تھی۔ کیتھرین پار کے لیے یہ سفر بے حد مبارک ثابت ہوا تھا جہاں ایک طرف اسے مسز کیٹی جیسی چاہنے والی ماں مل گئی تھی تو دوسری طرف اس نے لے ٹمر کو اپنا شریک سفر بنانے کے لیے منتخب کرلیا تھا۔ یہ حقیقت تھی کہ لے ٹمر اور کیتھرین پار کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

عمروں میں بے حد فرق تھا۔ مگر کیتھرین کو اندازہ ہو گیا تھا کہ دنیا میں عزت سے سر اٹھا کر جینے کے لیے عہدے اور دولت کی کس قدر اہمیت ہے۔ سو اس نے لے دے کر مسز کیٹی سے شادی کا فیصلہ کر لیا تھا مسز کیٹی کو کیتھرین بے حد عزیز تھی اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ انیس سال کی حسین و جمیل کیتھرین ایک 60 سال کے بوڑھے لارڈ سے شادی کرے۔ مگر پھر وہ خاموش ہو گئی تھی' وہ تھوڑی سی خود غرض بن گئی تھی کیونکہ ایسی صورت میں کیتھرین اس کے ساتھ اسی ولا میں رہتی اور اس کے چلے جانے کا سوال ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتا۔

مسز کیٹی نے کیتھرین کو اولاد کی طرح چاہا۔ لارڈ لے ٹمر کے انتقال کے بعد اسی کی کوششوں سے اسے اور مسز کیتھرین پارکو محل میں کام ملا اور وہ آخر کار شہزادہ ایڈورڈ کی اتالیق مقرر ہوئی۔ اور یوں شہزادے کے ماموں جون سیمور نے کیتھرین کو دیکھا اور اس پر فریفتہ ہو گیا مگر اس سے پہلے کہ جون سیمور کیتھرین کے سامنے اپنی محبت کا اظہار کرتا بوڑھا بادشاہ ہنری ہشتم میدان میں کود پڑا تھا۔

مسز کیٹی کو جون سیمور بے حد پسند تھا اور وہ اسے دیکھ کر اکثر سوچتی تھی کہ اگر خدا اسے کوئی بیٹا دیتا تو وہ یقیناً سیمور جیسا مہذب شائستہ قابل اور ہینڈسم ہوتا۔ جانے کیوں سیمور کو دیکھ کر مسز کیٹی کے سینے میں ممتا امڈنے لگتی تھی اور اس کی خواہش اور کوشش تھی کہ سیمور اور کیتھرین کی شادی ہو جائے مگر اس سے پہلے کے مسز کیٹی کی کوشش بار آور ہوتی بادشاہ نے آگے بڑھ کر لاسہ پھینکا تھا اور ایک ہی جست میں بازی جیت لی تھی۔ کیتھرین نے بادشاہ کی خوشی کے سامنے سر جھکا دیا تھا اور چند ہی دنوں میں وہ بوڑھے ہنری ہشتم کی چھٹی ملکہ بنکر اس کے محل کی زینت بن گئی تھی۔ بادشاہ کے انتقال کے بعد مسز کیٹی کی ہی کوششوں سے آخر کار سیمور اور کیتھرین ایک ہو گئے تھے مگر یہ ساتھ انہیں راس نہ آیا تھا۔ سیمور کی بے پناہ محبت دیکھتے ہی دیکھتے بے اعتنائی اور لاپرواہی میں تبدیل ہو گئی تھی۔ سیمور کے رویے نے کیتھرین پار کو بھربھری ریت کی طرح ڈھا دیا تھا اور چند ہی برسوں میں وہ اس دار فانی سے کوچ کر گئی تھی۔

کیتھرین کی موت مسز کیٹی کے لیے اپنی اولاد کی موت جیسی تھی۔ وہ مہینوں روتی اور تڑپتی رہی تھیں پھر اس نے سیمور کی محبت کے دامن میں پناہ لینی چاہی تھی۔ مگر یہ پناہ بھی بے حد عارضی ثابت ہوئی تھی اور سیمور بھی اپنا دامن سمیٹ کے قبر کی گہرائیوں میں جا اترا تھا۔

سیمور کی موت مسز کیٹی کے لیے ایک جواں سال بیٹے کی موت سے کم نہ تھی..... اور تب اس نے فیصلہ کیا تھا کہ اب وہ کسی کو بھی اولاد کی نگاہ سے نہیں دیکھے گی کیونکہ شاید اس کے مقدر میں اولاد ہے ہی نہیں وہ جسے بھی بیٹا یا بیٹی مانتی ہے دیکھتے ہی دیکھتے وہ قبر کی تاریکیوں کا حصہ بن جاتا ہے اس سے بہتر ہے کہ وہ اب کسی کو بھی ممتا کی نظر سے نہ دیکھے۔

مگر اسے کیا کیجیے کہ الجھی ہوئی پریشان سی اور کسی قدر نفسیاتی مسائل کا شکار میری کو دیکھ کر ایک بار پھر مسز کیٹی کی ممتا انگڑائی لے کر جاگ اٹھی تھی اور خود کو لاکھ سمجھانے اور ڈانٹنے ڈپٹنے کے باوجود وہ میری کو اولاد کی طرح چاہنے پر مجبور ہو گئی تھی۔

کہتے ہیں دل کو دل سے راہ ہوتی ہے اسی طرح کہا جاتا ہے کہ محبت خود راستے بنا لیتی ہے سو مسز کیٹی کی محبت نے جلد ہی میری کے دل میں جگہ بنا لی تھی اور میری نے مسز کیٹی کو اپنی خاص خادمہ کے عہدے پر فائز کر کے 24 گھنٹوں کے لیے اپنے پاس رکھ لیا تھا۔

یہ قربتیں جلد ہی شدید محبتوں میں بدل گئیں تھیں۔ مسز کیٹی دل کی گہرائیوں سے اور تمام تر ممتا سمیت میری کو چاہنے لگی تھی۔ وہ لمحہ بہ لمحہ اس کی بھلائی اور بہتری کی خواہاں تھی' اسی کے مشوروں سے آخر کار وہ فلپ کا انتخاب کر سکی اور آج انگلستان کے تخت و تاج پر فائز تھی۔

مگر آج میری کو ایک انجانے مرض کا شکار ہوتے دیکھ کر مسز کیٹی کا دل انجانے وسوسوں سے لرز رہا تھا۔

کیا یہ بھی موت کی وادی میں اتر جائے گی؟ مسز کیٹی نے غم گین آنکھوں سے ملکہ میری کو دیکھتے ہوئے انتہائی کرب

سے سوچا..... "کیتھرین پار اور جون سیمور کی طرح کیا میری پر بھی کبھی میری نظروں سے اوجھل ہو کر منوں مٹی تلے جا سوئے گی؟

"اے میرے خدا! ایسا مت کرنا۔" مسز کیٹی نے لرز کر دعا کی۔ "میں لاولد تھی..... تو نے مجھے بے اولاد رکھا تھا مگر میں دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر..... تیرے فیصلے کو رد کرنے کا باعث بن گئی..... اور بے اولاد ہونے کے باوجود صاحب اولاد ہونے کی لذت سے آشنا ہونے کی کوشش کی مگر تجھے میری یہ خود مختاری شاید پسند نہیں آئی' تجھے اپنے فیصلے کی روگردانی ذرا نہ بھائی اور تو نے مجھ سے یکے بعد دیگرے میرے دونوں بچے چھین لیے.....

اور اب میری یہ تیسری بچی..... میرے جگر کا ٹکڑا میری' ملکہ میری بھی..... موت و زیست کی کشمکش میں مبتلا ہے۔ میرے پیارے رب..... اسے زندہ سلامت رکھنا۔ میں تجھ سے وعدہ کرتی ہوں۔ یہ جیسے ہی ٹھیک ہوئی میں اس کی زندگی اور اس کی دنیا سے کہیں دور چلی جاؤں گی۔"

اپنا ہی فیصلہ نشتر بن کر اس کے دل میں ترازو ہو گیا تھا اور ارمانوں کا لہو آنسو بن کر آنکھوں کو نم کر گیا تھا۔ ملکہ میری آنکھیں بند کیے بے دم سی بستر پر لیٹی تھی۔

کچھ ہی دیر میں شاہی مطب سے ڈاکٹرز کی ٹیم ملکہ کے معائنے کے لیے آ گئی تھی۔ پھر ڈاکٹرز کے باہم مشوروں کے بعد ملکہ کو شاہی ہسپتال میں منتقل کر دیا گیا تھا..... اور تین گھنٹوں تک اعلیٰ زیرک اور لائق ڈاکٹرز کی ٹیم نے ملکہ کا معائنہ اور چیک اپ کیا تھا اور آخر کار ایک حتمی نتیجے پر پہنچ گئے تھے۔

ادھر یہ ہو رہا تھا..... ادھر فلپ رینارڈ کے ساتھ' ناؤ نوش کی محفل سجائے بیٹھا تھا۔

"رینارڈ" کئی لمحوں بعد اس نے خمار آلود نظروں سے رینارڈ کو دیکھتے ہوئے اسے پکارا تھا۔

"جی فرمایئے....." رینارڈ فوری طور پر الرٹ ہوتے ہوئے بولا تھا۔

"کیا واقعی ایسا ممکن ہے..... کہ ملکہ حاملہ نہ ہو ..... بلکہ....."

اس نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ کر سوالیہ نظروں سے رینارڈ کی طرف دیکھا۔

"نہیں" رینارڈ نے حتمی لہجے میں وہی جواب دیا جس کی فلپ اس سے توقع کر رہا تھا۔ "سب بکواس ہے..... بھلا کہیں ایسا بھی ہوا ہے ایک عورت حاملہ ہوتی ہے..... ماہ بہ ماہ اس کا پیٹ بڑھتا ہے اور جب نو مہینے پورے ہو جاتے ہیں اور بچے کی ولادت کا وقت آتا ہے تو یہ بات سامنے آ جائے کہ جناب یہاں تو بچہ نام کی کوئی چیز ہے ہی نہیں....."

"ہاں" اس نے تحقیر بھرے انداز میں ہنکارہ بھرا۔

"بکواس ہے..... ایسا بھلا ممکن ہے۔"

"فرض کرو....." کافی دیر تک گہری سوچ میں ڈوبے رہنے کے بعد فلپ نے دھیمی اور لڑکھڑاتی آواز میں کہا۔

فرض کرو..... ایسا ہی ہے..... ملکہ حاملہ نہیں بلکہ کسی موذی مرض کا شکار ہو..... تو....."

"تو....." رینارڈ چونک کر سیدھا ہوتا ہوا بولا۔

"ہاں' تو کیا ہو گا؟" فلپ نے واضح سوال کیا۔

"ہاں ایک منٹ کے لیے سوچا جا سکتا ہے..... کہ..... اگر ایسا ہوا تو کیا ہو گا؟ رینارڈ نے سوچتی نظروں سے سوالیہ انداز میں فلپ کی طرف دیکھا۔

"جواب دو" فلپ خمار آلود آنکھوں سے اسے گھور کر دیکھا۔

رینارڈ سوچ میں پڑ گیا تھا۔ اس انداز میں تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ محض ایک افواہ ہے ملکہ کے بد خواہ اس طرح کی باتیں پھیلا کر اپنے دل کے پھپھولے پھوڑ رہے ہیں۔ مگر اس وقت فلپ کے سوال نے اسے سنجیدگی سے سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ چند لمحوں تک سوچنے کے بعد اس نے سرسری سے لہجے میں جواب دیا۔

"ہونا کیا ہے؟ مان لیا بچہ نہیں کوئی بیماری ہے..... تو چلو کوئی بات نہیں..... بیماری کا علاج ہو گا اور اس بار نہ سہی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دوسری بار..... ملکہ ایک بچے کو جنم دینے میں یقیناً کامیاب ہو جائے گی۔"

"نہیں ریناڈ۔" فلپ نے نہایت سنجیدہ اور رنجیدہ لہجے میں کہا۔ "اگر میری اس بار ماں نہیں بنی تو سمجھو پھر کبھی ایسا نہیں ہوگا۔" ابھی نہیں تو کبھی نہیں..... بعد کس نے دیکھا ہے..... آج ابھی یا پھر کبھی نہیں..... کیونکہ کل کبھی نہیں آتا۔"

"مگر فلپ....." ریناڈ نے اس کی رنجیدگی کو محسوس کرتے ہوئے اسے سمجھانا چاہا۔ "خداوند کریم کے کرم سے تم پہلے سے ہی صاحب اولاد ہو..... تو پھر....."

نہیں ریناڈ! تم غلط سمجھ رہے ہو..... یہ بچہ میں اپنے لیے نہیں اپنے ملک کے لیے چاہ رہا تھا..... میری کا بچہ انگلستان کا جاں نشین ہوتا..... اور اس طرح انگلستان اسپین کے زیر نگین آجاتا۔ مگر شاید..... ایسا ممکن نہیں..... کیونکہ میری کسی بچے کو جنم دینے کے قابل ہی نہیں ہے۔

میری اس وقت کس مشکل کا شکار تھی۔ اسے بھی بچے کا کس قدر انتظار تھا مگر بچے کے بجائے ایک موذی مرض کی خبر نے اسے خوفزدہ اور ہراساں کر دیا تھا۔ اس وقت اسے اپنے شوہر کی محبت' توجہ اور ہمدردی کی ضرورت تھی۔ مگر اس کا شوہر فلپ اس نیم تاریک کمرے میں بیٹھا بلا نوشی کر رہا تھا اور بچے کے نہ ہونے کا ملال کر رہا تھا۔ اسے میری کی ذرہ بھی پرواہ نہ تھی۔

یہ حقیقت تھی روز اول سے فلپ کو میری سے کبھی بھی محبت نہ رہی تھی شروع میں اس کی بے بس اور اذیت ناک زندگی کے پیش نظر فلپ کو اس سے ہمدردی تھی اور جب وہ بیٹھے بٹھائے انگلستان کی ملکہ بن گئی تو انگلستان کو اسپین کی کالونی بنانے کے لالچ میں فلپ نے اس سے شادی کا سوانگ رچا لیا تھا۔ ورنہ اس کے دل میں میری کی کوئی کشش تھی نہ چاہت۔

"اس کا مطلب یہ ہے کہ اب تم میری سے اور انگلستان سے اوب چکے ہو؟ چند لمحوں کی معنی خیز خاموشی کے بعد ریناڈ نے دھیمی آواز میں سوال کیا تھا۔

"بہت زیادہ" فلپ نے الکسی سے انگڑائی لیتے ہوئے جواب دیا۔ "میں اس فضول' سرد اور نفسیاتی مریضہ' عورت سے تنگ آچکا ہوں اب میں زیادہ عرصے یہاں نہیں رہنا چاہتا۔"

"مناسب یہی ہے کہ تم اسپین لوٹ جاؤ۔" ریناڈ نے مشورہ دیا۔

"ویسے بھی اب تمہارے والد چاہ رہے ہیں تم حکومت کی باگ ڈور سنبھالو..... انہیں اور ان کے ملک کو اب تمہاری زیادہ ضرورت ہے..... اب تمہیں اپنے وطن کی راہ لینی چاہیے۔"

"ہاں" فلپ نے اثبات میں سر ہلایا۔ "میں جلد از جلد یہاں سے کوچ کر جاؤں گا..... اپنے وطن..... اپنے گھر..... ہوم سویٹ ہوم..... اب تو میں سوچ رہا ہوں..... کہ وہاں جا کر..... میں کسی اچھی' نرم گداز اور خوبصورت لڑکی سے ایک شادی اور کر لوں۔"

"واقعی" ریناڈ نے حیرت سے دیکھا۔ "کیا تم ایک شادی اور کر لو گے؟

"ہاں' کاش کوئی ازابیلا جیسی نرم و حسین اور محبت کرنے والی لڑکی مل جائے..... اگر کوئی ازابیلا جیسی مل جائے..... تو میں فوراً شادی کر لوں گا۔"

وہ نرم نازک و حسین نہیں تھی ورنہ تو میری بھی فلپ کو بے پناہ چاہتی تھی۔ مگر شاید چاہت' کا جواب چاہت نہیں ہے۔ چاہت محض اس لیے نہیں ہو سکتی کہ سامنے والا بھی چاہتا ہے..... چاہت کے لیے نرمی لطافت دلکشی اور حسن کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔

محبت' محبت سے نہیں..... محبت حسن سے ہوتی..... اور شاید ہر حسن ایک دوسرے سے جدا ہوتا ہے۔ ازابیلا کا حسن بے مثال اور بے بدل تھا۔

"ازابیلا جیسی دوسری لڑکی کہاں؟ ریناڈ نے سرد آہ بھری۔

"ہاں' اگر ایسا ہوتا تو..... تم اب تک کنوارے نہ بیٹھے ہوتے؟"

فلپ نے آنکھیں میچ میچا کر اس کی طرف دیکھا۔ "میں جانتا ہوں..... تم نے اب تک اسی لیے شادی نہیں کی کیونکہ تمہیں کوئی دوسری ازابیلا نہ مل سکی۔

ریناڈ نے چونک کر حیران اور بے یقین نظروں سے فلپ کی طرف دیکھا۔

"یہ کیسی باتیں کر رہے ہو؟" خود اسے اپنی آواز اجنبی سی محسوس ہوئی تھی۔

"میں جانتا ہوں ریناڈ کہ تم..... ازابیلا سے محبت کرتے تھے..... اور شاید وہ بھی..... مگر اس سے پہلے کہ تم دونوں شادی کے بندھن میں بندھتے میں بیچ میں کود پڑا..... کیونکہ اسے دیکھتے ہی میں ہر بات بھول گیا تھا..... وہ تھی ہی ایسی کہ اسے دیکھ کر کوئی بھی سدھ بدھ بھول سکتا تھا۔ تم کیا..... میں کیا..... کوئی بھی اس پر مر سکتا تھا۔ وہ تھی ہی اتنی پیاری اور دلکش..... مگر..... موت اسے کھا گئی وہ میری خاطر بیٹے کو جنم دینے کی خوشی میں' خوشی سے موت کی وادی میں اتر گئی۔ کتنی کم عمری میں' وہ مر گئی میری محبت میری زندگی میری ازابیلا مر گئی۔"

وڈ کی منقش تپائی جس پر چاندی کی صراحی اور بلور کے پیالے دھرے تھے فلپ نے اس پر سر رکھ کر باقاعدہ رونا شروع کر دیا تھا۔ نشے میں ڈوبی اس کی گلابی آنکھیں موتی رول رہی تھیں اور وہ اپنی مرحومہ بیوی کو یاد کر کے زار و قطار رو رہا تھا۔

ریناڈ حیران نظروں سے اسے تکے جا رہا تھا۔

یہ سچ تھا کہ ریناڈ نے آج تک ازابیلا کی وجہ سے ہی شادی نہیں کی تھی مگر وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ فلپ کو یہ بات معلوم ہے۔

فلپ کی دوسری بیوی میری ٹیوڈر بستر مرگ پر پڑی موت و زیست کی کشمکش میں مبتلا تھی۔ مگر اسے اس کی ذرہ بھر فکر نہ تھی بلکہ وہ اس وقت اپنی مرحوم بیوی کو یاد کر کے ہچکیوں سے رو رہا تھا۔ عجب ہے یہ محبت بھی۔

کسی کے ساتھ ایک عمر گزارنے کے باوجود اس سے محبت نہیں ہوتی اور کسی پر محض ایک نظر ڈالتے ہی محبت ہو جاتی ہے۔

"فلپ خود کو سنبھالو۔" ریناڈ نے آگے بڑھ کر فلپ کے سر پر ہمدردانہ انداز میں ہاتھ رکھا۔ "وہ اب دنیا میں نہیں ہے۔" مگر جو دنیا میں ہے اسے تمہاری ضرورت ہے۔"

کون بھلا؟ فلپ نے آستین سے آنسو پونچھتے ہوئے سوال کیا۔

"میں ملکہ میری کی بات کر رہا ہوں۔"

ریناڈ کے جواب سے فلپ کے منہ کا ذائقہ خراب ہو گیا تھا۔

"پر مجھے اس کی ضرورت نہیں..... ریناڈ..... اٹھو..... سفر کی تیاری کرو..... میں ابھی..... اسی وقت یہاں سے جا رہا ہوں..... ابھی..... ابھی۔"

فلپ جھومتا ہوا اٹھا۔ چند لمحوں تک کھڑا ڈولتا رہا پھر لہراتا ہوا گرا اور مدہوش ہو گیا۔

☆

رات کی سیاہ ناگن سی گھڑیاں اپنا سفر طے کرتی' صبح کاذب تک آپہنچی تھیں۔ دور خاکستری اور سیاہی مائل بھوری' پہاڑیوں کے اس پار نیلگوں آکاش پہ دھندلا سا اجالا پھوٹ رہا تھا۔

خلاف معمول آج آسمان قدرے صاف تھا۔ گو کہ ہواؤں میں خنکی تھی۔ مگر یہ خنکی فرحت بخش اور تسکین آمیز تھی۔ ملکہ شاہی ہسپتال کے ایک کمرے میں بستر پر لیٹی تھی۔ اس کے نحیف و نزار جسم اور پھولے ہوئے پیٹ پر ایک عجب سی تھکن اور کسل مندی چھائی ہوئی تھی اور ستے ہوئے چہرے سے سراسیمگی اور دہشت کا اظہار ہو رہا تھا۔

مسز کیٹی اس سے کہیں زیادہ خائف اور پریشان تھی مگر وہ اپنے چہرے سے اظہار نہیں ہونے دینا چاہ رہی تھی۔ ابھی ابھی تمام' ڈاکٹرز باہر گئے تھے اور باہر جا کر کافی دیر تک وہ سب ڈسکس کرتے رہے تھے پھر کافی دیر کی بحث تمحیص کے بعد وہ کسی حتمی فیصلے پر متفق ہو گئے تھے اور انہوں نے حتمی طور پر اعلان کر دیا تھا۔

"کہ ملکہ میری ٹیوڈر' حاملہ نہیں بلکہ ایک موذی مرض کا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شکار ہے۔"

طلوع آفتاب کے ساتھ ہی یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پورے محل میں پھیل گئی تھی۔ کہ ملکہ کے ماں بننے کا واقعہ محض ایک افسانہ تھا۔ ورنہ ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہے بلکہ ملکہ ایک موذی اور جان لیوا مرض میں مبتلا ہے۔

یہ خبر سب سے زیادہ خود ملکہ کے لیے افسوسناک اور اذیت خیز تھی۔ اس آنے والے بچے کے لیے اس نے کیسے کیسے خواب بُنے تھے اپنے شوہر فلپ کے ساتھ ایک کامیاب اور خوشگوار زندگی گزارنے کے لیے یہ بچہ کس قدر اہم تھا یہ وہ ہی کچھ جانتی تھی۔ یہ بچہ وہ زنجیر ثابت ہونے والا تھا جو فلپ کو ہمیشہ ہمیشہ اس سے باندھے رکھتا اب وہ زنجیر باقی نہیں رہی تھی۔ اس کا وہ حسین اور رنگین خواب ریزہ ریزہ ہو کر فضا میں تحلیل ہو گیا تھا اور اس کا کانچ سے بے ست رنگے سپنے کی کرچیاں اس کی آنکھوں کو ہی نہیں دل کو بھی زخم زخم کر گئی تھیں۔

"ملکہ عالیہ" مسز کیتھی نے اسے سر کو خم دے کر اپنی جانب تکتے دیکھ کر تیزی سے آگے بڑھ کر کہا تھا۔ "آپ کیسی ہیں؟"

"مسز کیتھی......" میری نے اس کا سوال سنا ہی نہیں تھا' وہ اپنی رو میں بولی۔ "مسز کیتھی...... آپ نے سنا' سب کچھ ختم ہو گیا...... سب کچھ......"

"نن...... نہیں" اسے تسلی دینے کے لیے مسز کیتھی کے پاس الفاظ نہیں تھے۔ وہ بے بسی سے کسمسا کر درد بھری آواز میں بولی۔

"آپ ایسا کیوں سوچتی ہیں...... اس بار بچہ نہیں ہے تو کیا ہوا...... علاج کے بعد آپ جب بالکل ٹھیک ہو جائیں گی...... تو ایک بار پھر...... آپ حاملہ ہوں گی اور ایک صحت مند اور چاند سے بچے کی ماں بنیں گی۔"

"کاش ایسا ہو سکتا۔" میری نے رنج بھری آواز میں حسرت سے کہا۔ "کاش...... میں ماں بن سکتی اپنے پیارے فلپ کے بچے کی ماں...... مگر وقت نے ثابت کر دیا کہ ایسا ممکن ہی نہیں......"

"اب اتنی بھی مایوسی کی بات نہیں۔" مسز کیتھی نے ملکہ سے زیادہ خود کو باور کرواتے ہوئے کہا۔ "دیکھو' کچھ ہی عرصے میں سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"اب کچھ ٹھیک نہیں ہوگا۔" ملکہ کی بے رونق بجھی بجھی آنکھوں کے گوشے بھیگتے چلے گئے۔ "اب سب کچھ ختم ہو جائے گا سب کچھ......" اس نے بے چینی سے ہچکی لی اور آنکھیں بند کر لیں۔

"ملکہ عالیہ۔" مسز کیتھی بے تابانہ اس کی جانب لپکی۔ "آپ ٹھیک تو ہیں نا۔؟"

"مسز کیتھی...... اتنی جلدی نہیں جا رہی۔" ملکہ نے اذیت بھرے انداز میں ذرا سی آنکھیں کھول کر مسز کیتھی کی طرف دیکھا۔

"ابھی تو چند دن زندہ رہوں گی...... موت نے ابھی چند دنوں کی مہلت دے دی ہے۔"

"آپ ہرگز نہیں مریں گی۔" مسز کیتھی نے ہذیانی انداز میں کہا۔ "آپ زندہ رہیں گی...... آپ کو زندہ رہنا ہوگا خدا اتنا بے رحم نہیں ہو سکتا...... کہ وہ مجھ جیسی بانجھ اور لاولد عورت کی گود بار بار اُجاڑے۔ آپ کو میں نے جنم نہیں دیا مگر جب سے آپ مجھے ملی ہیں میں نے ہمیشہ آپ کو اپنی بیٹی مانا ہے۔ تو میرا خدا...... میرے ساتھ اب یہ ظلم نہیں کر سکتا وہ مجھ سے میری بیٹی کو جدا نہیں کر سکتا۔ ہرگز بھی نہیں کر سکتا۔

میری حیران نظروں سے مسز کیتھی کو تک رہی تھی۔ اسے آج بھی اپنی بیمار اور خستہ حال ماں کیتھرین آف اراگون یاد تھی۔ جو اسپین کی شہزادی تھی۔ مگر ناکام محبت نے اسے موم کی طرح پگھلا کر رکھ دیا تھا۔ سوکھی بیر کی مانند کر دیا تھا۔

ان دنوں میری این بولین کی بیٹی الزبتھ کی آیا کے فرائض انجام دے رہی تھی اوّل تو اس کے پاس اتنا ٹائم ہی نہیں ہوتا تھا کہ ماں کے پاس بیٹھے اور جب کبھی فرصت ملتی بھی تھی تو کیتھرین اس قابل نہ تھی کہ وہ بیٹی سے پیار محبت اور شفقت کا اظہار کر سکتی۔ آج اتنی مدت بعد اس نے ممتا کے رس میں بھی مسز کیتھی کی آواز سنی تو اس کے پیاسے دل میں ایک عجب

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سی ہوک سی اٹھی تھی اس نے ذرا سا اٹھ کر بازو پھیلائے تھے اور اشارے سے مسز کیتھی کو قریب بلایا تھا مسز کیتھی تیزی سے اس کے قریب جا پہنچی تھی۔ تب میری نے اپنے کھلے بازوؤں میں مسز کیتھی کو سمیٹ لیا تھا اور اس کے ممتا کی خوشبو میں بسے سینے پر سر رکھ کر بے اختیارانہ رونا شروع کر دیا تھا۔

"ملکہ عالیہ' ملکہ عالیہ" مسز کیتھی نے پریشانی میں اسے پکارا اور پھر اس کی دلی کیفیت کو محسوس کرتے ہوئے اسے اپنے پیار بھرے بازوؤں میں چھپا لیا تھا۔ "میری بچی...... میری شہزادی...... خداوند کریم تمہاری حفاظت کرے۔"

مسز کیتھی ملکہ کے بد رنگ اور روکھے بالوں پر ہونٹ دھرے دل ہی دل میں اس کے لیے ڈھیروں دعائیں کیے جا رہی تھی۔

کافی دیر تک رو لینے کے بعد اب ملکہ میری کا دل ہلکا ہو گیا تھا سو وہ آہستگی سے مسز کیتھی سے جدا ہو گئی مسز کیتھی نے اسے نہایت احتیاط اور پریم سے دوبارہ لٹا دیا تھا پھر بے حد ممتا بھرے انداز میں اسکے بھیگے رخسار پونچھے تھے اور اس کی پیشانی پر مہر محبت ثبت کر دی تھی۔

اب میری اپنے اندر ایک حوصلہ اور تقویت محسوس کر رہی تھی۔ گو کہ خواب بکھرنے کا دکھ تو تھا مگر خود کے بکھرنے کے امکانات معدوم ہو گئے تھے ممتا کے سینے سے لگ کر اس نے اپنے پُرزے ہونے کے امکان کو یکسر ختم کر دیا تھا۔

ڈاکٹرز کی ٹیم نے بڑے واضح الفاظ میں اعلان کر دیا تھا' کہ ملکہ میری ٹیوڈر کبھی حاملہ ہوئی ہی نہیں تھی۔ اس کے پیٹ میں بد گوشت جمع ہو گیا تھا جو ماہ بہ ماہ بڑھتا رہا جس کی وجہ سے پیٹ بڑا ہوتا رہا اور لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے کہ ملکہ حمل سے ہے' حالانکہ ایسا نہیں تھا۔ بلکہ ملکہ ایک موذی اور جان لیوا مرض میں مبتلا ہے۔

اس مرض سے چشم پوشی اور ملکہ کو غلط فہمی میں مبتلا کرنے کے سلسلے میں دائی اریتا نے اہم رول ادا کیا تھا۔ اس لیے اب وہ نہایت خوفزدہ سی اپنے گھر میں چھپی بیٹھی تھی۔

"ماں! تمہیں تو اس وقت ملکہ کے پاس ہونا چاہیے تھا؟" اس کی بیٹی نے ماں کو یوں گپ چپ گھر میں چھپے بیٹھے دیکھا تو قدرے حیرانی سے سوال کیا۔

"تم ہی نے تو بتایا تھا کہ مئی کے وسط میں ملکہ کے ہاں ولادت متوقع ہے اور آج 16 تاریخ ہے۔ تمہیں اس وقت ملکہ کے پاس ہونا چاہیے تھا' تاکہ تم یہاں چھپی بیٹھی ہو۔"

"بس مجھے کچھ یاد نہ کروا بیٹی۔" اریتا نے سراسیمہ سے لہجے میں جواب دیا۔ "تجھے کچھ پتہ ہی نہیں وہاں ملکہ پر کیسی آفت نازل ہوئی ہے۔"

کیا ہوا ماں؟ اس کی بیٹی نے حیران اور پُرتجسس لہجے میں سوال کیا۔ "ملکہ عالیہ خیریت سے تو ہیں نا؟"

"خیریت ہی تو نہیں ہے۔" بوڑھی دایہ نے بے بسی سے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ "جسے میں بچہ سمجھ رہی تھی وہ تو بد گوشت تھا جس کے باعث ملکہ کی جان کے لالے پڑ گئے ہیں' تب ہی میں گھر میں چھپی بیٹھی ہوں' مبادا مجھ پر کوئی آفت نازل ہو جائے۔"

"اوہ" لڑکی نے کرب بھرے انداز میں سر تھام لیا۔ "یہ تو بے حد افسوسناک خبر ہے...... خداوند کریم ملکہ کو صحت اور زندگی عطا کرے...... مگر سوال یہ ہے کہ کیا واقعی تمہیں ملکہ کی بیماری کا اندازہ نہیں ہوا تھا۔"

اندازہ تو ہوا تھا بیٹی...... مگر ملکہ بچے کے سوا کوئی اور بات سننے کو آمادہ ہی نہیں تھی۔ اسی لیے میں نے اسے گول مول سے لہجے میں بچے کے بارے میں تفصیل بتانی چاہی تھی مگر وہ کسی بھی قیمت پر سچائی سننے کو تیار نہ تھی۔ پھر میں کیا کرتی جو اس نے چاہا' وہی میں نے کہا۔"

تو ماں! اب کیا ہوگا؟ بیٹی کی پُرتشویش آواز نے ماں کو اور بھی تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔ کیونکہ وہ ملکہ کے غصے اور خون خواری کو بہت اچھی طرح جانتی تھی۔

☆

حسبِ معمول لندن کا آسمان سیاہ بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ گو کہ ابھی موسم سرما کا آغاز نہیں ہوا تھا۔ اس کے باوجود ہواؤں میں بڑی کاٹ تھی۔ بادلوں کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ

کسی بھی لمحے برس سکتے ہیں۔ ملکہ میری ٹیوڈر افسردہ اور ملول سی بستر پر لیٹی تھی۔ جب سے اس کی اولاد کی آس ٹوٹی تھی گویا کہ وہ خود بھی ٹوٹ گئی تھی۔ بیماری کے ثابت ہونے کے بعد وہ ایک دم سے ڈھے گئی تھی۔ اس کے شوہر فلپ کے رویے نے بھی اسے خاصہ مایوس اور دکھی کیا تھا۔ فلپ نے اسے تسلی دینے اور دل جوئی کرنے کے بجائے انتہائی سرد اور بے رخی کا رویہ روا رکھا تھا۔ گو کہ اس کی بیماری واضح ہوگئی تھی مگر پارلیمنٹ نے فیصلہ کیا تھا کہ ملکہ کی بیماری کو عوام سے پوشیدہ رکھا جائے۔ کیونکہ اس طرح اس میں بددلی اور مایوسی پھیلنے کا خدشہ تھا۔

چند انتہائی قریبی لوگوں کے سوا سب سے یہ راز چھپایا گیا تھا گارڈنر کو پتہ چلا تو وہ دوڑتا ہوا ملکہ کے پاس پہنچا تھا۔ وہ ملکہ کا سب سے زیادہ قریبی قابل اعتبار اور ہم خیال مشیر تھا۔ اسی کے مشورے اور کہنے پر ملکہ نے پروٹسٹنٹ مسلک رکھنے والے عیسائیوں کو زندہ جلا دینے کا حکم صادر کیا تھا اور ملکہ کا خیال تھا کہ وہ ایک انتہائی نیک اور متبرک کام کر رہی ہے۔ اس کے مشیروں پادری پال اور گارڈنر نے بھی اسے یہی باور کروایا تھا۔

"ملکہ عالیہ" گارڈنر جب اس کی عیادت کو آیا تو انتہائی حیرت اور دکھ بھرے لہجے میں بولا تھا۔ "آپ تو اتنا عظیم کام کر رہی ہیں۔ ملحد اور مذہب سے مرتد عیسائیوں کو راہ راست پر لانے کے لیے انہیں سزا دے رہی ہیں۔ اس امر سے تو خداوند کریم بے حد خوش ہوگا..... پھر..... یہ سب....."

"یہ سب اسی طرح ختم ہوسکتا ہے مسٹر گارڈنر۔" ملکہ نے نقاہت بھری آواز میں اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "کہ تم اپنی مہم تیز تر کر دو۔ سب ملحد اور مرتد عیسائیوں کو خشک لکڑیوں کی طرح دہکتے شعلوں کا ایندھن بنا دو۔ ہر روز دو چار لوگوں کو زندہ جلایا جائے۔ مجھے یقین ہے۔ اسی طرح خدا خوش ہوگا..... اور مجھ پر مہربان ہو کر مجھے اس بیماری سے نجات عطا کر دے گا۔"

"بالکل درست فیصلہ کیا ہے آپ نے۔" گارڈنر کے باریک لبوں پر شیطانی مسکراہٹ رقصاں تھی۔ "یقیناً اس صالح اور نیک کام کے بدلے وہ خداوند آپ پر کرم اور مہربانی کرے گا..... وہ ضرور آپ پر رحم کر کے آپ کو اس موذی مرض سے نجات دے گا۔"

جور و تشدد میں مزید اضافہ کر دیا گیا۔

آئندہ تین ماہ میں مزید پچاس بے گناہوں کی جان لے لی گئی۔ رعایا ملکہ کے جور و ستم سے تنگ آ چکی تھی..... اور اب اسے "خونی ملکہ" کے نام سے یاد کیا جانے لگا تھا۔

اب فلپ کا رویہ بھی بہت حد تک بدل چکا تھا۔ وہ پہلے ہی اس پر ایسا کچھ فریفتہ نہیں تھا۔ اولاد کی امید میں وہ اس پر کسی قدر مہربان ضرور ہو گیا تھا۔ مگر جب سے یہ امید جاتی رہی تھی اس کے طور طریقے بھی یکسر بدل گئے تھے۔ اب وہ ہفتوں اس کی خواب گاہ کا رخ بھی نہیں کرتا تھا۔ اس نے ملکہ کی بیماری کو جواز بنا کر اپنے لئے الگ خواب گاہ منتخب کر لی تھی۔ اب وہ زیادہ سے زیادہ وقت اس سے دور رہنے کی کوشش کرتا تھا ایک بیمار لاغر ہڈیوں کی مالا اور بے رونق عورت میں بھلا اسے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی؟

فلپ کی بے اعتنائی اور بے رخی ملکہ میری کے لیے اور بھی اذیت اور کرب کا باعث تھی۔ وہ چاہتی تھی فلپ اس کی غم گساری کرے اس کے سرہانے بیٹھے اس سے باتیں کرے اس کا حوصلہ بندھائے مگر وہ تو ہفتوں اس کی خبر ہی نہیں لیتا تھا' دسیوں پیغام بھیجنے کے بعد وہ کھڑے کھڑے آتا اور ناک بھوں چڑھاتا واپس لوٹ جاتا۔

☆

شام کے سرمئی سائے رات کی تاریکیوں میں گھل مل گئے تھے موسم سرما کے آغاز کے ساتھ ہی ہواؤں میں خنکی کا احساس بڑھ گیا تھا اسی لیے سرِ شام ہی دریچوں کو بند کر کے پردوں کو کھینچ دیا جاتا تھا تاکہ ہوا کی خنکی اور تندی سے محفوظ رہا جا سکے۔

اس وقت اسپین کے شاہی محل کے طویل ایوان میں شاہ اسپین چارلس پنجم کا دربار لگا تھا۔

آج کا اجلاس انگلستان کی ملکہ میری کی بیماری اور بیماری کے باعث پیدا ہونے والی صورت حال پر غور کرنے کے لیے طلب کیا گیا تھا۔ فروری میں پورے اسپین میں جشن منایا جا رہا تھا۔ شاہ و وزراء کو ہی نہیں عوام الناس کو بھی اسپین کی بہو انگلستان کی ملکہ میری کے ہونے والے بچے کا بے چینی سے انتظار تھا۔

اس بچے کے دنیا میں آتے ہی' انگلستان پر اسپین کا دعویٰ مستند ہو سکتا تھا۔ انگلستان پر فلپ کے بچے کی جاں نشینی تسلیم کیے جانے کے ساتھ ہی اسے اسپین کی ملکیت تسلیم کر لیا جاتا خاص و عام سب اس حقیقت سے آشنا تھے اور جلد از جلد' انگلستان کو اسپین کا حصہ دیکھنے کے متمنی تھے۔ وہ جشن وہ خوشیاں بھی اسی طمع کا شاخسانہ تھیں۔ مئی میں ملکہ کے ہاں بچے کی ولادت متوقع تھی۔

مگر مئی گزر گیا۔

پھر جون جولائی اور اگست بھی گزر گئے۔

مگر ملکہ نے کسی بچے کو جنم نہیں دیا اور اس کی اس بیماری کی خبر جسے پوشیدہ رکھا گیا تھا۔ اسپین تک پہنچ گئی۔ پورے اسپین میں رنج و غم کی ایک لہر دوڑ گئی۔ انگلستان کی ملکیت اس قدر آسانی سے ہاتھوں سے نکل جانے کا قلق سب ہی کو تھا۔

شاہ اسپین نے فوری طور پر یہ ہنگامی اجلاس طلب کیا تھا۔ اب کیا لائحہ عمل ہونا چاہیے؟ یہ سوال سب کے سامنے رکھا گیا۔ اب چارلس چاہتا تھا کہ وہ حکومت کی باگ ڈور فلپ کے حوالے کر کے خود آرام کرے۔ سو اس نے حکومت کے وزراء و مشیران کے سامنے ساری بات رکھ کر ان سے مشورہ طلب کیا تھا۔

"اب جبکہ ملکہ انگلستان ایک جان لیوا مرض میں مبتلا ہے کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کب اس جہان سے رخصت ہو جائے تو ایسی صورت میں شہزادے فلپ کا اپنا گھر بار اور ملک و حکومت چھوڑ کر وہاں پڑے رہنا کچھ مناسب اور سود مند نہیں ہے۔" ایک بوڑھے مشیر مسٹر لڈ نے اپنی گھنی داڑھی کھجاتے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

مجموعی طور پر تمام ہی لوگوں کا یہی خیال تھا' اس لیے متفقہ طور پر یہ فیصلہ کر لیا گیا کہ اب فلپ کو انگلستان سے بلوا لیا جائے۔

چنانچہ اگلے ہی دن فلپ کو واپس لوٹ آنے کا پیغام بھیج دیا گیا۔ ساتھ ہی یہ خبر بھی دے دی گئی کہ اب اس کا باپ شاہ اسپین تخت و تاج سے دست بردار ہونے کا خواہاں ہے فلپ واپس آ کر فوری طور پر عنان حکومت سنبھالے۔

یہ خبر پاتے ہی فلپ خوشی خوشی واپسی کے لیے تیار ہو گیا۔

"کیا؟" ملکہ نے سنا تو حیرت بھرے چہرے سے چیخ اٹھی۔

"فلپ میرے محبوب..... میرے سرتاج..... تم مجھے اس حال میں اس عالم کرب میں تنہا چھوڑ کر کس طرح جا سکتے ہو؟"

"میں بالکل جا سکتا ہوں۔" فلپ نے انتہائی بے رخی بلکہ کمینگی سے جواب دیا۔ "اب اس طرح یہاں پڑے رہنے کا کوئی جواز بھی تو نہیں ہے ادھر میرے والد صاحب مجھ پر حکومت کی ذمے داریاں ڈالنے کے خواہاں ہیں۔ اس لئے بہر حال مجھے جانا ہوگا۔"

"فلپ..... پلیز....." ملکہ نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے اپنے سنگدل شوہر کی طرف دیکھا۔ "مجھے اس وقت تمہاری ضرورت ہے۔"

تم سے زیادہ' اس وقت میرے وطن کو میری ضرورت ہے اس لیے بہتر ہوگا کہ میں واپس لوٹ جاؤں۔"

فلپ نے اپنا فیصلہ سنایا اور واپسی کے لیے مڑ گیا۔

"اور ہاں" جاتے جاتے وہ یکا یک پلٹ آیا۔ "میں تمہیں ایک اہم اور ضروری مشورہ دینا چاہتا ہوں۔"

ملکہ نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"کافی عرصے سے تمہارا رویہ تمہاری بہن الزبتھ کے ساتھ نہایت تکلیف دہ چلا آ رہا ہے۔ اب مناسب یہی ہے کہ تم اس کے ساتھ اپنا رویہ بدل لو..... اور اس کے ساتھ اچھا سلوک کرو..... کیونکہ..... بہت جلد' انگلستان کے تخت پر اسی کا راج ہوگا۔"

فلپ کی یہ تلخ بات نشتر کی طرح ملکہ کا دل چیر گئی تھی۔ مگر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

فلپ اس کے دل کو دولخت کر کے پلٹ کر دیکھے بنا، کمرے سے نکل گیا تھا۔ کل صبح اس کی روانگی تھی۔

آج اس ملک اور قصر میں اس کی آخری رات تھی۔

گو کہ سردی کا آغاز ہو چکا تھا۔ اس کے باوجود آج کی رات خاصی حسین اور خوشگوار تھی۔ گو کہ آسمان پر سفید اور سرمئی بدلیاں آنکھ مچولی کھیل رہی تھیں۔ مگر ساتھ ہی ننھے ننھے روپہلے تارے بھی جگر جگر کر رہے تھے۔ کبھی کبھی بدلیوں کی اوٹ سے چاند کا سنہری پیکر ہی نمودار ہو کر مسکرانے لگتا...... اور خنکی بھری فضا میں ٹھٹھری ہوئی سی، چاندنی بکھر جاتی۔

فلپ اس وقت اپنی خواب گاہ کے ادھ کھلے دریچے میں کھڑا پائیں باغ میں بکھری دھلی ہوئی چاندنی کو تک رہا تھا۔ سبزے کے مخملی فرش پر چاندنی بچھی ہوئی تھی اور ہوا کے نرم جھونکے پھولوں کو جھومنے پر مجبور کر رہے تھے۔ ایک عجب سا خوابناک سا ماحول بکھرا ہوا تھا، جب ہی اس کی نگاہ باغیچے کے اس جانب ذرا فاصلے پر واقع شہزادی الزبتھ کے رہائشی حصے کی جانب بکھرے مرغزار کی جانب اٹھ گئی تھی۔

الزبتھ کافی عرصے سے اپنے اطالیق جون لیور اپنے دوست ہیری اور اب نئے مشیر ولیم سیم کے ساتھ اپنی جاگیر پر مقیم تھی۔ مگر جب اسے ملکہ کی بیماری کی خبر دی گئی تو وہ فوری طور پر لندن چلی آئی تھی۔

شہزادی الزبتھ کو بغاوت میں ملوث، مان کر ملکہ میری اس سے خاصی بدظن ہو گئی تھی۔ مگر اس کے خلاف کوئی ثبوت سامنے نہ آ سکا چنانچہ ملکہ اسے آزاد کرنے پر مجبور ہو گئی تھی اور شہزادی الزبتھ لندن میں رہنے کے بجائے اپنی جاگیر پر چلی گئی تھی۔ مگر جب اسے اطلاع ملی کہ ملکہ سخت بیمار ہے تو وہ لندن چلی آئی تھی۔

آنے کے فوراً بعد وہ ملکہ سے ملنے اس کی خواب گاہ میں گئی تھی۔ اس کے ساتھ ولیم سیم بھی تھا۔

جب سے ولیم کو اس نے اپنا مشیر نامزد کیا تھا۔ وہ سائے کی طرح اس کے ساتھ لگا رہتا تھا۔ اس کے انداز و اطوار سے چھلکتی دلچسپی اور انسیت اور شہزادی کا اسے مسکرا مسکرا کر بڑھاوا دینا۔ یہ سب باتیں ہیری کے لیے اذیت ناک اور ناقابل برداشت تھیں۔ یہ سچ تھا کہ وہ الزبتھ کو بچپن سے ہی بے حد چاہتا تھا۔ مگر یہ بھی سچ تھا کہ الزبتھ اس کی چاہت سے بالکل نابلد تھی۔ حالانکہ اسے اندازہ تو تھا کہ ہیری اس پر مرتا ہے اور اس کا مرنا اسے اچھا بھی لگتا تھا۔ ایک آدھ بار اس نے اس کی حوصلہ افزائی بھی کی تھی مگر بظاہر ان دونوں کے مابین ایسا کوئی تعلق نہ تھا اور ایسے کسی تعلق کی گنجائش بھی نہ تھی۔

الزبتھ انگلستان کی تخت و تاج کی وارث تھی۔ ملکہ میری کے بعد اسے ہی حکومت کی باگ ڈور سنبھالنی تھی۔ اس کے علاوہ...... وہ اپنی ذات سے بھی قابل اعتبار نہ تھی۔ وہ چاہتی تھی ہر جواں اور ہینڈسم مرد اسے چاہے اسے سراہے اس کے پیچھے پیچھے گھومے مگر وہ کسی سے محبت نہ کرے کسی کے ہاتھ نہ لگے۔ عجب سوچ تھی اس کی مرد اسے دیکھ کر لحہ بھر کو دیکھتے ہی رہ جاتے تھے۔ یہ چیز اسے عجب سی خوشی دیتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ دنیا کا ہر مرد اس پر فدا ہو جائے۔ اسی لیے وہ ہیری کو نہ جانے دیتی تھی اور نہ ہی اس کی محبت کو پوری طرح مایوس ہونے دیتی تھی۔ انہی دنوں اس کی ملاقات روبرٹ ڈڈلی سے ہوئی تھی، روبرٹ کی شاندار شخصیت نے الزبتھ کے دل پر اثر کیا تھا اور اس نے اپنی اٹھتی جھکتی پلکوں کی چلمن سے روبرٹ کو اپنی جانب راغب کرنے کی کوشش بھی کی تھی۔ پھر ولیم سیم اسے مل گیا تھا اور اس نے فوری طور پر اسے اپنا مشیر مقرر کر دیا تھا۔

ہیری کے لیے الزبتھ کی یہ تمام حرکتیں سوہان روح تھیں۔ کئی بار وہ سب باتوں پر تین سلام بھیج کر اپنے گھر لوٹ گیا تھا مگر تا دیر وہ اپنے اس فیصلے پر قائم نہیں رہ سکا تھا، کبھی دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ خود ہی لوٹ آیا تھا اور جو کبھی اس نے دل مضبوط کر کے واپسی کا ارادہ ترک کیا تو شہزادی نے مہربان ہو کر اسے بلا لیا تھا اور وہ نا چاہتے ہوئے بھی لوٹ آیا تھا۔

مگر آج کل ولیم کے ساتھ اس کی بڑھتی ہوئی مہربانیاں ہیری کے دل پر نشتر بن کر دن رات زخم ڈالا کرتی تھیں اور آج کل وہ بے حد سنجیدگی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنے گھر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لوٹ جانے کا ارادہ کر رہا تھا۔ ویسے بھی آج کل اس کی ماں وینا کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی تھی۔

رات کے اس سہانے لمحوں میں بالکل اچانک ہی فلپ کی نگاہیں الزبتھ پر جا ٹھہری تھیں۔

اس وقت وہ بالکل تنہا تھی اور ایک خوبصورت سرخ لبادے میں ملبوس، سبز گھاس پر چہل قدمی کر رہی تھی، چاندنی کے مدھم اجالے میں اس کے سنہری بال چمک رہے تھے اور اس کے چہرے کا صندلی رنگ، دور سے بے حد دلکش اور پرکشش دکھائی دے رہا تھا۔

روز اول سے ہی فلپ الزبتھ پر فدا تھا۔

اس کا لیے دیے رہنے والا انداز اس کی نخوت سے تنی بھویں اور بے حد سنجیدہ اور سرد سا رویہ وہ اور لڑکیوں سے بے حد مختلف تھی وہ کوئی بے حد حسین و جمیل لڑکی نہ تھی۔ مگر اس کے انداز ایسے تھے کہ کئی بے حد حسین لڑکیاں بھی اس کے سامنے بے وقعت اور بے قیمت ہو جائیں اسے ملال بھی ہوا تھا کہ اس نے میری کے انتخاب میں شاید جلدی کر دی اگر وہ الزبتھ کو دیکھ پاتا تو شاید وہ پہلے اسے ہی پرپوز کرتا۔ وہ کم و بیش اس کی ہم عمر بھی تھی جبکہ میری اس سے گیارہ سال بڑی تھی۔

کل صبح وہ واپس اسپین جا رہا تھا۔ اس ملک اور اس قصر میں یہ اس کی آخری رات تھی...... اور اس رات کے ان خوابناک سے لمحوں میں اسے الزبتھ کا یوں دکھائی دے جانا بے حد اچھا لگ رہا تھا۔ وہ کئی لمحوں تک اسے ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا رہا تھا۔ پھر خواب کی سی کیفیت میں پلٹا تھا اور آہستگی سے کمرے سے نکل کر الزبتھ کی طرف چل دیا تھا۔

ولیم سیم آج اپنے گھر گیا ہوا تھا۔ لندن میں اس کا گھر تھا ماں اور بہنیں تھیں۔ چنانچہ آج شام کو وہ اپنے گھر، اپنے گھر والوں سے ملنے کے لیے چلا گیا تھا۔ جبکہ ہیری مسٹر جون لیور کے ساتھ کسی علمی گتھی کو سلجھانے میں مصروف تھا۔ چنانچہ الزبتھ اکیلے ہی باہر نکل آئی تھی۔

باہر ٹھنڈی ٹھنڈی چاندنی میں کاسنی عنابی نارنجی پھول مسکرا رہے تھے خنک مگر لذت آمیز ہواؤں کے نرم جھونکوں میں تو شگفتہ پھولوں کی مہک رچی ہوئی تھی اور آسمان پر دمکتے تارے آنکھیں جھپک جھپک کر اسے دیکھ رہے تھے۔ اس خوابناک سے ماحول میں سرخ لباس میں ملبوس، وہ خواب کی سی کیفیت میں چلتی ہر چیز کو محبت اور پسندیدہ نظروں سے تکتی آگے بڑھ رہی تھی تب ہی آہٹ پر اس نے پلٹ کر دیکھا تھا۔

اس سے چند قدموں کے فاصلے پر اسپین کا شہزادہ اور اس کی سوتیلی بہن میری کا شوہر فلپ کھڑا تھا۔ وہ اسے اس وقت اپنے باغیچے میں اس طرح موجود پا کر حیران تو ہوئی تھی مگر اپنے کسی انداز سے اس نے حیرت کا اظہار نہ ہونے دیا تھا۔ چند لمحوں تک وہ دونوں خاموش اور ساکت کھڑے ایک دوسرے کی جانب تکتے رہے تھے، پھر فلپ نے ہی یہ سکوت توڑا تھا۔

”آپ کی تنہائی میں مخل ہونے پر میں معافی چاہتا ہوں۔“ وہ دھیمے اور دلکش لہجے میں گویا ہوا۔ ”مگر کیا بتاؤں وہاں اپنی خوابگاہ کے دریچے سے آپ کو یہاں اس طرح خراماں خراماں ٹہلتے دیکھ کر میں خود پر قابو نہ رکھ سکا اور آپ کے پاس چلا آیا...... آپ کو ناگوار تو نہیں گزرا۔“

”آپ کی جگہ کوئی اور یہ حرکت کرتا تو...... شاید......“ الزبتھ نے دھیمی اور نرم آواز میں جواب دیا۔ ”مگر آپ کی بات دوسری ہے...... آپ......“

”خدا کے واسطے اب یہ نہ کہنا...... کہ میں تمہاری بہن کا شوہر ہوں...... اور اس رشتے۔“

”کیا نہیں ہیں؟“ الزبتھ نے نگاہ اٹھا کر قدرے ناز سے پوچھا۔

”آپ جانتی ہیں، وہ سخت بیمار ہے...... یہ رشتہ فی الحال اگر ہے بھی تو تا دیر نہیں چل سکے گا۔“

الزبتھ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس معاملے میں وہ بے حد محتاط تھی۔ اس نے ایک گہری سانس لے کے اپنی افسردگی کا اظہار کیا اور رخ موڑ کر دور پھولوں کی روش کے ساتھ لگے کیروسین لیمپ کی طرح دیکھنے لگی۔ لکڑی کے چوکھٹے پر دھرا شیشے کے چوکور ڈبے میں دھرا کیروسین سے جلنے والا لیمپ

مدھم روشنی بکھیر رہا تھا۔ روشنی کا دائرہ جوں جوں بڑھتا روشنی مدھم پڑتی جاتی پر ہر سمت یہ دھیمی سی روشنی ایک عجب خوابیدہ سا احساس جگا رہی تھی۔ فلپ نے الزبتھ کی نظروں کا تعاقب کرتے ہوئے اسی سمت دیکھا اور بے ساختہ اس کے لبوں سے نکلا......

"بے حد خوبصورت"

"ہوں" الزبتھ نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔ "یہ اجالے اور اندھیروں کے باہم ملاپ سے بنتے بگڑتے دائرے...... کبھی کبھی کس قدر خوبصورت احساس دے جاتے ہیں۔"

"ہاں' بے حد حسین۔" فلپ نے الزبتھ کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے رومینٹک لہجے میں کہا۔ "کبھی کسی نے آپ کو بتایا' کہ آپ کے چہرے پر بکھرے گرم جوشی اور سرد مہری کے سائے ایسا ہی تاثر دیتے ہیں۔"

الزبتھ کو فلپ سے اتنی بے باکی سے یہ بات کہہ دینے کی توقع نہیں تھی اسی لیے لاکھ کنٹرول کے باوجود اس کے چہرے پر ناگواری کے اثرات رونما ہو گئے تھے۔

"میں یہاں چہل قدمی کرنے آئی تھی۔" اس نے قدم بڑھاتے ہوئے دھیمے مگر سپاٹ لہجے میں کہا۔ "آپ کو برا نہ لگے تو میں ذرا ٹہل لوں۔"

اگر آپ برا نہ مانیں تو کیا' میں آپ کے قدموں سے قدم ملا کر آپ کے ساتھ چل سکتا ہوں۔" فلپ نے بے حد معنی خیز لہجے اور دھیمی میٹھی آواز میں سوال کیا۔ الزبتھ نے نگاہ اٹھا کر اس کی جانب دیکھا اور بے ساختہ مسکرا دی۔

"آپ یقین کریں' آپ مسکراتے وقت بے حد حسین دکھائی دیتی ہیں۔" فلپ نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے تحسین آمیز لہجے میں کہا۔

"اور جب مسکراتی نہیں ہوں تو...... بدصورت دکھائی دیتی ہوں؟ الزبتھ کی سنجیدگی سے کیے گئے سوال نے فلپ کو سٹ پٹانے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس کے اس طرح گڑبڑانے پر الزبتھ ایک بار پھر مسکرا دی تھی۔

"میں کل واپس جا رہا ہوں۔" فلپ نے دوستانہ لہجے میں بتایا۔ "وہاں جا کر مجھے حکومت کی باگ ڈور سنبھالنی ہے۔"

"مشکل کام ہے۔" الزبتھ نے کندھے اچکا کر کہا۔

"کچھ عرصے بعد یہ مشکل کام آپ کو بھی کرنا ہے۔"

فلپ کی بات پر الزبتھ نے سرد لہجے میں کہا۔ "یہ آپ نے ابھی سے کیوں فرض کر لیا ہے کہ ملکہ میری جلد از جلد اس دنیا سے رخصت ہو جائے گی' بحیثیت شوہر شاید آپ یہ بات اتنی آسانی سے کر سکتے ہیں مگر بہ حیثیت بہن میں یہ بات مشکل سے سننا بھی نہیں چاہتی۔ اس لیے براہ کرم میرے سامنے ایسی بات نہ کریں...... اور ہاں اب کافی دیر ہو چکی ہے اب میں سونے جاؤں گی گڈ نائٹ"

یہ کہہ کر وہ تیز تیز قدم اٹھاتی باغ کے داخلی دروازے کی طرف بڑھ گئی تھی اور فلپ ہکا بکا سا اسے دیکھتا ہی رہ گیا تھا۔

☆

فلپ اپنے وطن جا کر اپنی مملکت کی حکومت کی باگ ڈور سنبھال چکا تھا۔ مگر ملکہ میری ہنوز بستر پر تھی۔ علاج مسلسل جاری تھا مگر مرض کے خاتمے کی کوئی صورت نہ دکھائی دیتی تھی فلپ کے جانے کے بعد میری اور زیادہ اپ سیٹ اور دکھی رہنے لگی تھی۔ اسے واثق یقین تھا کہ وہ جس قدر پروٹسٹنٹ عیسائیوں کو موت کی گھاٹ اتارے گی اسی قدر خدا کی خوشنودی حاصل کر سکے گی۔

چنانچہ صبح شام لوگوں کو پکڑ پکڑ کر دہکتی آگ کی نذر کیا جانے لگا۔ لندن کے علاقے میں اسقف بونر نے 100 کنٹری بری میں پول نے 55 نارج میں ھوپ ٹن نے 56 پروٹسٹنٹ ملاحدہ زندہ جلوا دیے۔

مگر جلد ہی گارڈنر کو یہ بات سمجھ آ گئی تھی کہ تشدد سے لوگ مذہب نہیں چھوڑتے بلکہ دنیا کے سامنے ایسا تاثر قائم ہو رہا ہے کہ دین پروٹسٹنٹ ایسا دین ہے کہ جس کے لیے لوگ جان دینے کی بھی پرواہ نہیں کرتے۔ اس بات کے ادراک نے گارڈنر کو یہ احساس دلا دیا تھا کہ اس طرح لوگوں کو زندہ جلا کر وہ لوگ اس مذہب کی بیخ کنی نہیں بلکہ بہترین خدمت

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کر رہے ہیں اسی لیے اس نے فوری طور پر اس تشدد سے خود کو روک لیا تھا۔

مگر ملکہ کا جذبہ انتقام ابھی ٹھنڈا نہیں ہوا تھا۔ وہ ہر ہر روز قتل عام اور زندہ نذر آتش کیے جانے کی خبروں کی منتظر رہتی تھی۔

انگلستان کی پارلیمنٹ ملکہ کے اس تشدد پسندانہ جنوں سے بے زار ہو چکی تھی۔ مگر مزاحمت کرنا سخت دشوار تھا اگر یورپ کی سیاست کا اس وقت اس قدر الجھاؤ نہ ہوتا تو یہ یقینی بات ہے کہ انگلستان کے لوگ میری کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے اور اسے معزول کر کے الزبتھ کو تخت پر بٹھا دیتے' لیکن لوگ جانتے تھے کہ اگر انہوں نے ایسا کوئی قدم اٹھایا تو میری کا شوہر فلپ اسپینی فوج انگلستان میں اتارنے کا بہانہ ڈھونڈ رہا ہے۔ ایسی صورت میں فرانس کی مدد ناگزیر ہوتی اور کوئی دانش مند انگریز یہ دیکھنا پسند نہ کر سکتا تھا کہ فرانسیسی فوج انگلستان کی سرزمین پر آئے اور میری کی طرف دار ہسپانوی فوج سے جنگ کرے۔

اسی لیے ارباب فہم و ذکاء نے خاموشی سے مناسب وقت کا انتظار کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ کیونکہ سب کو ہی اندازہ ہو چکا تھا کہ میری زیادہ عرصے تک زندہ نہیں رہ پائے گی۔ اس کی موت کے بعد تخت و تاج از خود الزبتھ کو پہنچنے والا تھا۔

اس کے باوجود نوجوان انگریز خونی ملکہ کے اس جنوں سے سخت کبیدہ تھے۔ انہوں نے سن رسیدہ انگریزوں کے اس عاقلانہ ارادے کی پیروی نہ کی۔

اس شام لارڈ بکنگھم کے ولا میں اس کے جواں سال پوتے ٹامس اسٹیفرڈ نے اپنے ہی جیسے نوجوانوں کو مدعو کیا ہوا تھا۔ سب ایک مستطیل کمرے میں خاموش بیٹھے تھے۔ ان کی زبانیں گنگ مگر دل غصے اور نفرت سے بھرے ہوئے تھے۔ وہ سب ملکہ کے عمل کے باعث اس سے سخت نالاں و بیزار تھے۔

"ہمیں بہر حال فرانس سے مدد مانگنی ہوگی۔" کافی دیر کے سکوت کے بعد ایک نوجوان جس کا نام جم فیروڈ تھا' نے دھیمی مگر جوشیلی آواز میں کہا۔ "اب بس یہ طے کرنا ہے کہ مدد کی درخواست لے کر فرانس کون جائے گا۔"

"یہ خدمت میں انجام دینے کو تیار ہوں۔" ٹامس اسٹیفرڈ نے سیدھا ہاتھ اوپر اٹھاتے ہوئے دھیمے مگر مستحکم لہجے میں جواب دیا۔ "اور اس مقصد کے لیے میں اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ کل ہی فرانس کے لیے روانہ ہو جاؤں گا۔"

اگلی صبح' صبح کاذب کے ساتھ ہی تھامس اسٹیفرڈ اپنے چار نوجوان ساتھیوں کے ساتھ فرانس کے لیے روانہ ہو گیا تھا۔ فرانس پہنچ کر انہوں نے شاہ فرانس سے ملاقات کی اور انگلستان کے حالات اور ملکہ کی حماقت دیوانگی اور بیماری کا حال بیان کیا۔ فرانس کے حکمران ہنری دوئم کی آنکھوں میں حریص چمک جاگ اٹھی۔ اس نے اسی شام اپنے جرنلز کو بلوا کر مشاورت کی اور جزیرہ وائٹ میں فرانسیسی فوج کو اتارنے کا منصوبہ تیار کر لیا گیا۔

تھامس اسٹیفرڈ فرانسیسی فوج کا ایک دستہ لے کر فرانس سے چلا اور قلعہ اسکاربرو پر قابض ہو گیا۔ ملکہ کو جب تھامس اسٹیفرڈ کی بغاوت اور اسکاربرو پر قبضے کی خبر ملی تو وہ باوجود بیماری اور نقاہت کے غصے سے تن تنا اٹھی اس نے سپہ سالار کو بلا کر حکم دیا کہ وہ ایک چاق و چوبند اور قابل دستے کو اسکاربرو بھیجے اور اس لارڈ زادے کو گرفتار کر کے قتل کروا دے۔

ملکہ کے حکم کے مطابق جرنل میو ایک چاق و چوبند اور باحوصلہ دستہ لے کے اسکاربرو کی جانب روانہ ہوا اور جلد اس نے اسکاربرو کا محاصرہ کر لیا۔ تھامس نے مقابلے کی کوشش کی مگر وہ فرانسیسی سپاہیوں کو درست طریقے سے ہدایات نہیں دے سکا نتیجہ یہ نکلا کہ اس کے سپاہی شکست سے دوچار ہوئے اور اسے گرفتار کر کے ملکہ کے حضور پیش کیا گیا۔

تو تم...... میرے خلاف سازش کرتے رہے ہو؟ ملکہ نے اپنی زرد اور بے رونق آنکھوں سے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔ "بغاوت کی تم نے...... تم میری حکومت گرانا چاہتے تھے؟"

"ہاں" تھامس اسٹیفرڈ نے بے خوفی سے جواب دیا۔ "تم

ایک جنونی اور خونی ملکہ ہو...... تم جیسے پاگل حکمران کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ وہ تخت پر بیٹھ کر عوام کا خون بہانے کے احکامات دے......"

"اوہ...... تو تم بے حد نڈر ہو......" ملکہ نے خون خوار لہجے میں کہا۔ "تمہیں یہ حوصلہ کس نے دیا...... شہزادی الزبتھ نے تو نہیں۔"

"نہیں۔" تھامس اسٹیفرڈ چیخ کر بولا۔ "مگر میں یہ سب انہی کے لیے کر رہا ہوں کیوں کہ ہم سب تم سے تنگ آچکے تھے۔ کاش تم جلد مر جاؤ...... تاکہ ہم شہزادی الزبتھ کو تخت پر بٹھا سکیں۔"

"ارے کوئی ہے۔" ملکہ نے چیخ کر کہا۔ "جو ملکہ کو موت کی نیند سلانے کی آرزو رکھنے والے اس بد بخت کو موت کی گھاٹ اتار دے۔"

ملکہ کی بات ختم ہونے سے قبل ایک خوں خوار جلاد لپکتا ہوا آگے بڑھا اور اس نے تلوار کے ایک ہی وار سے تھامس اسٹیفرڈ کا سر تن سے جدا کر دیا تھا۔

☆

شاہ اسپین فلپ گہری نگاہوں سے حالات کا جائزہ لے رہا تھا اب وقت آچکا تھا کہ وہ اپنی بیوی ملکہ میری کو فرانس کے ساتھ جنگ کرنے کے لیے آمادہ کر سکتا تھا۔ چنانچہ اس مقصد کے حصول کی خاطر وہ چند دنوں کے لیے خود انگلستان آیا۔

اس کی آمد ملکہ کے لیے کسی انوکھی اور مثالی خوشی سے کم نہ تھی، فلپ کو اپنے سامنے پا کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی، فلپ نے اس کے آنسو پونچھنے کی کوشش نہیں کی، اس کی جو ہیئت ہو چکی تھی، اس میں فلپ اسے چھونے سے بھی گریزاں تھا۔ مگر میری اس کے سینے سے لگ کر رونا چاہتی تھی اس کے کاندھے پر سر رکھ کر اپنی روداد تنہائی سنانا چاہتی تھی۔ مگر فلپ کسی بھی طرح اسے جنگ کرنے کے لیے راضی کرنا چاہتا تھا وہ جتنے دن رہا مسلسل ملکہ کو جنگ کے لیے ابھارتا رہا۔

مگر انگلستان اس جنگ کی پوزیشن میں نہ تھا۔ میری شاہی آمدنی خانقاہیں اور چرچ دوبارہ آباد کروانے میں خرچ کرتی رہی تھی جہاز اور قلعے بے مرمت اور اجاڑ پڑے تھے۔ عوام الناس، ملکہ کی حرکتوں کی وجہ سے حکومت سے سخت نالاں تھی، ایسی حالت میں صرف جبری قرضے اور محاصل کے ذریعے روپیہ فراہم ہو سکتا تھا۔ مجلس شاہی کے چند مشیر جو ابھی تک شریک مشورہ ہوتے تھے بیشتر ایسے ہی نااہل کٹھ ملا خیال کے تھے جیسے کہ خود ملکہ......

گو کہ صاف ظاہر تھا کہ اس جنگ کو مول لینے میں نقصان اور ذلت آمیز شکست کے سوا کچھ ہاتھ نہ آئے گا۔ اسی لیے ملکہ فرانس سے بھڑنے میں ہچکچاہٹ سے کام لے رہی تھی۔

"میری! میری جان۔" ملکہ کو کسی طرح آمادہ پیکار نہ پا کر آخر فلپ نے دوسرا راستہ اختیار کیا۔ وہ جب سے آیا تھا پہلی بار اس نے میری کو شانوں سے تھام کر اپنے سامنے کرتے ہوئے بے حد پیار سے کہا۔ "میں سینٹ کوئین کے لیے فوج بھیج رہا ہوں، تم نیدرلینڈ کے لیے افواج روانہ کر دو...... وہاں دونوں ممالک کے سپاہ باہم مل کر فرانس سے مقابلہ کریں گی۔"

اس کے ساتھ ہی اس نے ملکہ کو بانہوں میں سمیٹ کر سینے سے لگا لیا۔ ملکہ پر مدہوشی چھاتی محسوس ہو رہی تھی۔ اب اس کے پاس انکار کا چارہ نہ تھا۔

انگریزی فوج جو نیدرلینڈ کے لیے بھیجی گئی اگرچہ وہ اتنی دیر میں پہنچی کہ فلپ کی سینٹ کوئین کی زبردست فتح میں شریک نہ ہو سکی تاہم قلعے پر یورش اور غارتگری میں حصہ دار رہی۔

فلپ اپنی تذبذب کے باعث فتح سے زیادہ فائدہ نہ اٹھا سکا فرانسیسیوں نے شہزادہ گیز کو جو کہ اٹلی گیا ہوا تھا، بلا کر قلعے پر حملے کی تیاریاں شروع کر دیں۔

اس وقت قلعے کی انگریزی حدود میں دو قصبے، گین اور ہیمے واقع تھے۔ جنہیں ہام کا قلعہ ایک دوسرے سے ملاتا تھا۔ دونوں قلعوں کی حفاظت کا معقول انتظام تھا۔ قلعے کا ناظم لارڈ وینٹ ورتھ اور گین کا قلعہ دار لارڈ گرے تھا دونوں اعلیٰ درجے کے لڑاکو اور سپہ سالار تھے۔ انہیں پہلے ہی سے معلوم تھا کہ میکے پر حملہ ہوا ہی چاہتا ہے۔ اسی لیے انہوں نے بارہا حکومت کو اطلاع بہم پہنچائی تھی کہ فرانسیسی فوجوں کے مقابلے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے لیے قلعے میں انگریزی فوج ناکافی ہے۔ لیکن حکومت نے کوئی توجہ نہ دی اور ہوتے ہوتے سامان رسد بھی قریب الختم ہو گیا۔ اور وہ بند کہ جس پر میکے کے پانی کا انحصار تھا ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھا۔ مدت سے مرمت اور صفائی نہ ہوئی تھی۔ دسمبر کے مہینے میں وینٹ ورتھ نے ایک بار پھر لکھا کہ فوری طور پر کمک بھیجی جائے، مگر کوئی جواب نہ پا کر 29 تاریخ کو اس نے ایک اور مراسلہ روانہ کیا اور اطلاع دی کہ عنقریب فرانسیسی پہنچا ہی چاہتے ہیں۔ لیکن حکومت پر کوئی اثر نہ ہوا بلکہ 31 دسمبر کو ملکہ کی طرف سے اسے جواب ملا کہ ہمیں خبر ملی ہے کہ میکے کے خلاف کسی لشکر کشی کی توقع نہیں ہے۔ اس لیے کسی کمک کی ضرورت نہیں ہے۔"

لیکن اگلی ہی صبح فرانسیسی قلعے کے سامنے صفیں تیار کر رہے تھے۔

فرانسیسی فوج کی تعداد کم و بیش 25 ہزار تھی جبکہ وینٹ ورتھ کے سپاہیوں کی تعداد کل 500 تھی۔ لیکن اس کے باوجود وہ اپنی حکمت عملی سے کسی نہ کسی طرح فرانسیسیوں کو 6 جنوری تک روکے رہا۔ سمندر بالکل صاف تھا۔ حکومت اگر توجہ کرتی تو کمک بھیجنا کچھ ایسا دشوار نہ ہوتا۔ مگر لگتا تھا ملکہ کو میکے سے کوئی دلچسپی ہی نہیں ہے۔ آخر کو تھک ہار کر وینٹ ورتھ نے ہتھیار ڈالنے کا فیصلہ کر لیا۔

10 جنوری کو حکومت نے لارڈ گرے کی التجا پر کمک بھیجنے کا ارادہ کیا تو، جنوب مشرق سے ایسی آندھیاں چلیں کہ رسد کی کشتیاں منتشر ہو گئیں اور مجبوراً 20 جنوری کو گرے نے بھی فرانسیسی حکومت کی اطاعت قبول کر لی۔

میکے پر فرانس کے قبضے کی خبر نے انگریزوں کو بے حد رنجیدہ کر دیا تھا یہ خبر انگلستان پر بجلی بن کر گری تھی۔ اس شکست کی ذمے دار حکومت تھی۔ حکومت کی لاپرواہی اور بے اعتنائی کے باعث میکے ہاتھ سے نکلا تھا۔ اسی لیے عوام الناس حکومت سے سخت برگشتہ ہو گئی۔

اب فرانس کے حملے کا خطرہ بڑھ گیا تھا۔

ہر چند، چند مہینوں میں انگلستان نے ہمت کر کے بیڑہ تیار کر لیا تھا اور گرو الین کے قریب فرانسیسی اور ہسپانوی سپاہ کی ساحلی جنگ میں اسی بیڑے نے قابل قدر حصہ لیا لیکن سقوط میکے سے ملک کی خودداری اور ہمت کو بے طرح دھچکا لگا تھا۔

اس نقصان کا سب سے زیادہ صدمہ خود ملکہ میری کو تھا۔

"ملکہ عالیہ! خود کو سنبھالیے!" مسز کیٹی اسے یوں سسکتے اور بلکتے دیکھتی تو تشفی دینے کی کوشش کرتی۔ "آپ دیکھیے گا...... جلد ہی سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"نہیں مسز کیٹی۔" اس شام وہ حسرت و یاس میں ڈوبی آواز میں گویا ہوئی تھی۔ "اب کچھ ٹھیک نہیں ہوگا...... مجھے صاف دکھائی دے رہا ہے کہ یہ موذی مرض جلد ہی میرا خاتمہ کر دے گا اور کچھ ہی دنوں میں الزبتھ اس تخت شاہی پر براجمان ہوگی...... اور وہ...... میری ساری حکمت عملی الٹ پلٹ کر دے گی۔"

اس دوران بالکل اچانک گارڈنر کا انتقال ہو گیا۔ اپنے اتنے اچھے مشیر اور ہم خیال مددگار کی اچانک موت نے بھی میری کو بے حد رنجیدہ کر دیا تھا۔ دوسری طرف پاپا نے میری کے دوسرے اہم ترین مشیر پول کو منصب وکالت سے معذول کر دیا۔ میری جانتی تھی عوام اس سے نفرت کرتی ہے اور اسے "خونی میری" کے نام سے یاد کرتی ہے اور الزبتھ کی جانشینی کے دن گن رہی ہے۔

سب ادراک کے باوجود میری کے انداز و اطوار میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ لوگ برابر جلتے شعلوں کی نذر کیے جا رہے تھے خانقاہیں اسی طرح تعمیر ہوتی رہیں۔

اور آخر...... وہ دن طلوع ہوا۔ جو میری ٹیوڈر کی زندگی کا آخری دن ثابت ہوا۔ طلوع سحر کے ساتھ ہی اس پر عجب اضطراب سا طاری تھا۔ وہ بے چین ہو ہو کر اپنے سنگ دل شوہر فلپ کو یاد کرتی اور آہ بھر کر رہ جاتی۔ وقت آہستہ روی سے آگے بڑھ رہا تھا اور اسے اپنا دم گھٹتا محسوس ہو رہا تھا۔ باہر موسلا دھار بارش ہو رہی تھی اور اندر میری ٹیوڈر آخری سانسیں گن رہی تھی۔

(جاری ہے)

حویلی

شہناز شورو

گویا کہ زندگی کے نئے سفر کی شروعات ہوئی۔ کپڑے اور زیور تو بے حد تھے۔اب ضرورت ہی کس چیز کی تھی؟ اور مردانہ حصے کے مطمئن ہونے کے لیے ڈھیروں جواز موجود تھے۔ مثلاً ''کنواری لڑکیوں'' کی شادیاں ہوگئی تھیں۔ گھروں کی ملکیت گھر میں ہی رہی اور کوئی جھگڑا نہ اٹھا۔ تھکی تھکی نظروں اور نئی عمر کے دبے دبے جوش میں جلتا لڑکیاں آنسوؤں میں بھگو دی گئی تھیں۔ ارمان قتل کردینے کے بعد اب وہ ماحول دکھائی نہ دیتا تھا جو اُن کی نیندیں اڑا دیا کرتا تھا۔

ایک پراسرار حویلی کی کہانی..... جہاں سوگوار' اشکبار آنکھیں کسی کی منتظر ہیں

حویلی کے زنانہ حصے میں شادیٔ مرگ کا سماں تھا۔ مردانہ حصہ ہمیشہ کی طرح فاتح ٹھہرا تھا۔ حق بخشوانے کی تقریب اختتام پذیر ہوئی تھی۔ مردوں کے ذہنوں سے بوجھ اتر گئے' سرخروئی نصیب ہوئی تھی۔ وہ کافی عرصے سے بڑی الجھنوں میں تھے۔ زمین کے متعلق' رشتوں کے متعلق' افواہوں کے متعلق اور لوگوں کی زبانوں کے متعلق اب تمام مسائل سلجھے ہوئے لگ رہے تھے۔

اس لیے تمام مرد بڑی حویلی میں جمع ہوئے۔ اطمینان اور خوشی ان کے چہروں سے ہویدا تھی۔ بادۂ ناب کے ساتھ مچھلی کے گرما گرم خستہ ٹکڑے سیخ کباب اور بکروں کی بھنی ہوئی رانوں کا انتظام تھا۔ موسیقی تھی' جھنکار تھی۔ تھرکتے ہوئے جسموں کا خصوصی اہتمام تھا۔ سازندے تیار ہو رہے تھے۔ رقاصائیں بناؤ سنگھار میں مصروف تھیں۔ ہار پھول' پان یہاں سے وہاں سفر کر رہے تھے۔ محفل شروع ہوا ہی چاہتی تھی۔

پہلی' دوسری اور تیسری بیویوں کی شکلوں تک سے الرجک وڈیروں نے اپنے اپنے من چاہے خصوصی ملازمین کو دوڑا دیا تھا تاکہ سندیسہ دے آئیں کہ تمام دن کی مشقت کے بعد صاحب بہادر تھکن سے چور ہیں اور آج رات بڑی حویلی میں ہی قیام ہوگا۔

دیہات اور شہروں میں رہنے والی بیویاں تک جانتی تھیں کہ تھکن دراصل کیا ہے البتہ چند نئی نویلی شکوک میں پڑ جاتی تھیں اور تسلیاں دیتی تھیں کہ سب وہم ہے۔

چند سال ساتھ گزارنے والیاں اور اپنے بالوں کی لٹوں کو اوپر نیچے کر کے صحیح عمر چھپانے والیاں سارا راز جان چکی تھیں۔ ان سب کو اصل بیویوں سے کوئی خطرہ تھا تو صرف یہ کہ زمین کے بٹوارے کے بعد ان کے چند بچوں کے پاس کیا بچے گا۔ کیوں کہ ان کم بخت دیسی گھی' مکھن اور شہد پہ پلی ہوئی دیہاتی عورتوں نے تو درجن درجن بھر بچے پیدا کرنے کا ٹھیکہ اٹھا رکھا تھا۔ اس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لیے شہری بیویاں اپنے شوہروں کی زندگی میں گاڑیاں خرید کر بنگلے اور زیورات تیار کروا کر اپنے اور اپنے بچوں کے نام لکھوانے میں جتی ہوئی تھیں۔ زیادہ بچے پیدا کرنے کی توانائی تو تھی مگر جسم کے ڈھلکنے کا خوف اس مقابلہ بازی سے دور رکھے ہوئے تھا۔

ان وڈیروں کے مرنے پر اصل بیویوں اور ان کے بچوں کے حقوق بڑے روشن نظر آتے تھے لہٰذا وہ ان کی زندگیوں اور اپنے جسمانی حسن کی طوالت کی دعائیں مانگا کرتیں۔ کبھی کبھار چار پانچ اکٹھی ہو جاتیں اور ایک دوسرے سے دل کی بھڑاس نکالتیں۔ ان کی نظر میں دوسری بیوی ہونا دراصل مظلومیت کی چھاپ تھی۔ پہلی بیویاں تو چڑیلیں لگا کرتیں انہیں اور بڑی کراہیت کے ساتھ ایک دوسرے سے پوچھا کرتیں کہ ان بدبودار' بدصورت دیہاتی عورتوں کے ساتھ رہنے سونے سے کیا ان مردوں کو گھن محسوس نہیں ہوتی؟

تیسری بیوی یا تیسری عورت کا تصور ان کے نزدیک بے حیائی تھی۔ اس خیال کے ساتھ ہی انہیں اپنے حقوق پہ ڈاکہ پڑتا محسوس ہوتا' خود پر رحم آتا' اپنے بچوں کی صورتوں پر بے باپ کے ہونے کی علامتیں نظر آنے لگیں۔ ایسی صورت میں چند ایک راتیں پیسوں کے عوض بخش دینے والی بازاری عورتیں انہیں گوارا لگتیں کہ ان سے "کم خطرہ محسوس ہوتا تھا۔"

پہلی بیویاں تو عرصۂ دراز سے شوہروں سے محروم ہو چکی تھیں۔ اب کبھی کبھار شام ڈھلے ازدواجی حقوق جبری مشقت کی طرح پورے ہو جاتے تھے۔ بنجر' پتھریلی زمین ذرا دیر کو سسک اٹھتی تھی اور پھر گرما گرم بھاپ' پھر لامتناہی انتظار' بے مراد انتظار' بے سود انتظار۔

راتیں تو ان کے مقدر میں گویا آتی ہی نہیں تھیں۔ ایک حویلی سے دوسری حویلی تک کا سفر تھا۔ بچے پیدا کرنے کی آزادی اور کنواری لڑکیوں کو نصیحتیں کرنے کی سند ملنے کا نام شادی تھا۔

خاندان بھر کے مردوں نے اولادیں پیدا کرنے کے مسئلے پر کبھی غور نہیں کیا تھا۔ ہاں لڑکوں کی پیدائش سے انہیں خصوصی دلچسپی تھی۔ پانچ چھ سالہ لڑکے کو عورتوں کے تسلط سے نکالنے اور مردانہ حصے میں خصوصی آمد ورفت کی خاص اجازت ہوتی تاکہ مردانہ سماج کے ماحول میں جلد ہی ڈھل جائیں۔

دس سالہ لڑکے کی خودمختاری اس قدر واضح ہوتی کہ وہ اپنی ماں' خالاؤں' پھپھیوں اور دوسری رشتے داریوں میں ملوث خواتین کے ننگے سروں کو دیکھ کر سختی سے سرزنش کر سکتا تھا اور ڈرائیوروں' خانساماؤں' گوالوں' ہاریوں اور ان کے بیٹوں کی زنان خانے میں آمد ورفت پر خصوصی نگاہ رکھ سکتا تھا۔

آج لڑکیوں کے حقوق بخشوانے یا قرآن سے شادی کی رسم ایک طویل عرصے بعد منائی گئی تھی۔ کل ملا کر ۳۲ لڑکیاں ہوئیں جن میں ۱۳ سال کی بچیوں سے لے کر ۴۲ سال تک کی عورتیں شامل تھیں۔ ان کی شادی "مردوں" سے نہ ہونے کی خاص وجوہات تھیں۔ کچھ کا دماغ چل گیا تھا۔

کچھ کے لیے خاندان میں لڑکے ناپید تھے۔ تھے تو بے حد چھوٹے کا بڑی لڑکیوں کے لیے اور بے حد بڑے' چھوٹی لڑکیوں کے لیے۔ پہلے شادی شدہ مردوں کی دوسری یا تیسری شادیاں کروائی گئی تھیں تو وہ خاندانی رنجشوں کا باعث بنی تھیں۔ لہٰذا اس بار اس خیال کو بھی ذہن سے نکال دیا گیا۔ کافی شادیاں یوں نہ ہو سکیں کہ ادلے بدلے میں رشتہ دستیاب نہ تھا۔ کچھ رشتے بہتر تھے مگر بڑوں کے اختلاف اور ضد کی وجہ سے شادیاں ممکن نہ تھیں۔ یہ سب خوف بہ ظاہر تھے مگر اصل خوف کچھ اور تھے۔ جائداد کا بٹوارہ' پگ کے نیچے ہونے کا خوف' بیٹی کو شریعت کے مطابق دیے جانے والا حصہ نکلنے کے بعد چھوٹے زمیں دار ہونے کا طعنہ' تنکا تنکا بکھرنے کے خوف نے انہیں یہ قدم اٹھانے پر مجبور کر دیا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھا اور پھر سب سے اہم مسئلہ لڑکیاں تھیں کہ کم بخت قدم قدم پر دکھائی پڑتیں اور مردوں کی غیرتوں پر تازیانے برس پڑتے۔ کسی کا سر کھلا نظر آ جاتا۔

کسی کی پنڈلی لپک جاتی دھوپ میں۔

کہیں کھلی بانہیں لشکارے مار جاتیں۔

اوڑھنیوں میں سے نکلنے کے لیے مچلتے تڑپتے سیاہ زلفوں کے سانپ۔ یہ سب کہیں نہ کہیں نظر آ ہی جاتا تھا۔ زنان خانے میں داخل ہوتے ہی مردوں کے مزاج چڑچڑے ہو جاتے اور باہر نکلتے ہی وہ ان عورت نما لڑکیوں کو شمار کرنے کے عذاب سے نکلنے کی جدوجہد میں لگ جاتے۔

کہیں بہ حالتِ مجبوری آنے جانے کے لیے نہایت شریف اور قابلِ اعتماد ڈرائیور موجود تھے۔ گاڑیاں تیار رہتی تھیں' جن میں اگلی اور پچھلی سیٹوں کے درمیان چادریں یا اجرکیں تنی ہوتی تھیں۔ شیشوں پہ ملتانی مٹی کا لیپ کر دیا جاتا تھا۔ عورتیں سرتاپا سیاہ برقعوں یا نقاب والی لمبی چادروں میں ملبوس ہوتیں مگر ان منحوسوں کے ہاتھ پھر بھی دعوتِ نظارہ دیتے رہتے اور یہی بات غیرت مند مردوں کی عزت پہ حرف بن جاتی تھی۔ کئی کئی راتوں تک وہ سکون سے سو نہیں سکتے تھے۔

مچھی مچھی یہ لڑکی..... کل پیدا ہوئی تھی اور آج لٹھ کی لٹھ۔ زنان خانے میں جب بھی کوئی "نئی عورت" نظر آتی تھی تو استفسار پر پتا چلتا تھا کہ یہ تو فلاں لڑکی ہے۔ ایڑی سے چوٹی تک آگ لگنے والا محاورہ صادق آتا تھا۔ کیا کھاتی تھیں بدبختیں جو یوں چناروں میں تبدیل ہوئے جا رہی تھیں۔

لہٰذا آج شام ممیروں' چچیروں' چاچوں' ماموؤں نے اتفاقِ رائے سے سالوں کا ٹیڑھا مسئلہ سلجھایا تھا۔

اپنی اپنی زمینوں پر لیے گئے قرضوں کا حساب کیا۔ پھر رقوم تقسیم کرنے کا طریقہ کار طے ہوا اور پھر سب لڑکیوں کو ان کی ماؤں اور باقی عورتوں کو ایک طرف بٹھا کر درمیان میں پردہ لگا کر اور دوسری طرف قرآن شریف رکھ کر نکاح خواں کو اشارہ کر دیا گیا۔ ۳۲ لڑکیاں ایک قرآن اور نہ رکھتی نہ شہنائی۔ سرخ سرخ لباسوں میں دلہن بنی ہوئی لڑکیاں جو نہ تو بیوہ تھیں نہ سہاگنیں۔

پردے کے دوسری طرف عورتوں کے لشکر سے کچھ ہلکی ہلکی دبی دبی آہیں' سسکیاں اور آوازیں بلند ہوئیں مگر ان سرگوشیوں کی کوئی واضح شکل نہیں تھی۔ کسی عورت کا سینہ سسکیوں سے پھٹنے لگا اور وہ ایک تیز چیخ کے ساتھ بین کرنا شروع ہوئی کہ ایک گرج دار مردانہ آواز نے ماحول کو مزید سہما دیا۔

پھر کوئی آواز احتجاج نہ کر سکی۔ جلتے بجھتے انگارے رہ گئے اور بس پھر خاموشی تھی۔ نیم جان جسم رہ گئے اور آنکھوں سے بہتا بے قدر پانی۔

طے ہوا تھا کہ زندگی کو آرام دہ اور سہل بنانے کے لیے ایک ایک شیدی عورت ہر ایک لڑکی کی خدمت پر مامور کر دی جائے سب کے کمروں میں جائے نماز' قرآن شریف' تسبیح' درود شریف' مناجات و وظائف کے نسخے رکھوا دیے گئے۔ اس کے ساتھ ساتھ دنیاوی زندگی سے رابطہ نہ توڑنے کے لیے ٹیلی ویژن' ڈی سی آر اور ڈش بھی فراہم کیے گئے۔

گویا کہ زندگی کے نئے سفر کی شروعات ہوئی۔ کپڑے اور زیور تو بے حد تھے۔ اب ضرورت ہی کس چیز کی تھی؟ اور مردانہ حصے کے مطمئن ہونے کے لیے ڈھیروں جواز موجود تھے۔ مثلاً "کنواری لڑکیوں" کی شادیاں ہو گئی تھیں۔ گھروں کی ملکیت گھر میں ہی رہی اور کوئی جھگڑا نہ اٹھا۔ ٹھنگتی مشکی نظروں اور نئی عمر کے دبے دبے جوش میں مبتلا لڑکیاں آنسوؤں میں بھگو دی گئی تھیں۔ ارمان قتل کر دینے کے بعد اب وہ ماحول دکھائی نہ دیتا تھا جو اُن کی نیندیں اڑا دیا کرتا تھا۔

اب تو کمروں میں سسکیوں کا ڈیرہ تھا۔ سسکتا ہوا ماتم تھا۔ کئی دنوں تک گھر کے کسی کنگھے کو بالوں کی خوشبو

نصیب نہیں ہوئی۔ مائیں بیٹیوں کے مقدر پر گریہ کناں تھیں۔ بہنیں اور رشتے کی بہنیں گلے مل کر اپنے اپنے دکھوں کو بہانے کی کوشش کرتی تھیں' پھر..... برسوں کی تجربے کار' ایسے ماحول کو کئی بار دیکھنے والی شیدی عورتوں نے انہیں سہارا دینا شروع کیا۔ ان کے دکھوں کو بانٹنا شروع کیا اور ماحول کو ایک نئی ڈگر پہ لانے کی کوشش کرنے لگیں۔

سوگوار اور اشک بار آنکھیں ماحول میں کچھ تلاش کرنے کی عادی ہوئیں..... کہ اب چارہ ہی کیا تھا زندگی کا سفر زیادہ لمبا دکھائی دینے لگا تھا۔ وقت کاٹنا عذاب تھا..... سو دل چسپی پیدا کرنے والوں نے اپنا فرض نبھانا شروع کر دیا۔

قابلِ بھروسا ادھیڑ عمر گوالے اب محنت کے قابل نہیں رہے تھے۔ ان کے بچے جو چند سالوں کی عمر سے ہی حویلی میں آنے جانے پر مامور تھے۔ اب قدرے جوان ہو رہے تھے اور چہروں پہ داڑھی اور مونچھوں کی جگہ سیاہ بال خودرو گھاس کی طرح اُگ رہے تھے ان میں سے کچھ تو بزرگ خواتین کے دلارے تھے۔

ڈرائیوروں کا بھی یہی حال تھا۔ پرانے چل بسے تھے یا کھاٹ پر پڑے پڑے اپنی آل اولاد کو وڈیروں سے سچا' نمک حلال اور وفادار رہنے کی تاکید کرتے رہتے۔ ان کے پاس مزید کچھ نہ تھا۔

ڈرائیور' گوالے اور خانساماں گھر کی خواتین کے لیے بہت اہمیت رکھتے ہیں' وہ باہر کی دنیا سے ان کا رابطہ بحال رکھے ہوئے تھے۔ گو کہ ان مردوں یعنی ملازمین کا سفر بڑے گیٹ سے باورچی خانے' آنگن یا گیراج تک ہی ہوتا تھا مگر ان کو ہر کمرے کے حدود اربع' رہائش پذیر خاتون' ذمے دار اور قابلِ بھروسا ملازمہ..... غرض کہ ہر چیز کے بارے میں مکمل معلومات ہوتی تھیں۔

رات کے اندھیرے میں جب دوسری بیویوں کے گھروں میں شمع دان گل ہوتے تھے اور نیند گھروں پہ چھا جاتی تھیں۔ بڑی حویلی میں سرسراہٹیں بڑھ جاتی تھیں۔ بے چینیاں اور اضطراب جسموں میں انگارے سلگا دیتی تھی۔ ڈھیروں ڈھیر کمرے شہر ہزار داستان کا روپ بھر لیتے تھے۔ ہر کمرا رازوں کا دفینہ بن جاتا تھا۔ بڑی عمر کی بیبیاں تو سب جانتی تھیں اسی لیے خود کو سرِ شام ہی ملازماؤں کے ساتھ کمروں میں مقید کر لیتی تھیں۔

مرد حضرات کبھی کہاں تو کبھی کہاں' کبھی دوسری بیوی کے پاس کبھی کسی تقریب میں۔ کبھی کبھی خاص محفل میں اور کبھی ملک میں تو کبھی ملک سے باہر اور نہیں تو میٹنگز ہی ختم ہونے کو نہ آتی تھیں۔ شغل جاری تھے۔ اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک بھی اور اندر حویلی میں زنانہ حصے مزاروں پہ جانے کے لیے ہمہ وقت ٹولیوں کی شکل میں تیار رہتا تھا۔ یہ واحد جگہ تھی جہاں جانے کے لیے کچھ منع نہ تھا۔ اگربتیاں' چادریں' پھول' بتاشے' چنے ہر چیز منگوائی جاتی اور سیہون شریف جانے کا خاص اہتمام ہوتا۔ زرق برق لباس پہنے جاتے۔ خصوصی دعائیں یاد کی جاتیں اور عید کا سماں نظر آتا۔

یہاں "دنیا" دیکھنے کو ملتی۔ لوگوں کے چہرے نظر آتے۔ مجاور بھی انہیں پہچاننے لگ گئے تھے کہ اندرونِ سندھ کی بیبیاں آئی ہیں۔ سر کے بل ان کی خدمت میں جانا چاہتے تھے مگر دور سے ہی نظارہ کرنے کی اجازت تھی کہ ملازمین کا پہرہ بڑا سخت ہوتا تھا۔ یہ تفریح یا پکنک جلد جلد ہونے لگی اور مزاروں پر شناسا پیدا ہونے لگے۔

انہی دنوں ڈرائیور نبی بخش پہ سائیں اللہ ڈنو کی نظرِ عنایت کم ہونے لگی' کہاں تو وہ منظورِ نظر ڈرائیور کہ اس کا مشورہ تک سن لیا کرتے تھے اور کہاں کہ اس کی شکل تک دیکھنے کے روادار نہیں رہے۔ وجہ کسی کی سمجھ میں بھی نہیں آ رہی تھی' مگر خیال غالب تھا کہ گاڑی میں رکھی فحش فلموں کی کیسٹیں سائیں نے دیکھ لی تھیں جو کہ حویلی کے اندر سے نبی بخش کا بیٹا لایا تھا۔ سائیں اللہ ڈنو کا تو دماغ ہی گھوم گیا۔ کیسٹیں اٹھا کر الٹ پلٹ کر دیکھیں اور برہم

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چہرے پہ سرخ سرخ آنکھیں لیے نوکر پر دھاڑے۔ یہ گلو ڈرائیور کہاں مر گیا ہے۔ اسے بولو گاڑی نکالے۔

نبی بخش ڈرائیور خاموشی سے گاڑی سے اتر گیا' اس کا رنگ اُڑ گیا اور دل کی دھڑکن قابو میں ہی نہیں آ رہی تھی۔

سائیں تو اسلام آباد چلے گئے پانچ دن کے دورے پر اور ڈرائیور نبی بخش کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ وہ سب نوکروں پہ حکمرانی کرتا تھا۔ بیبیوں کا چہیتا بھی تھا اور سائیں کا لاڈلا بھی' دونوں تمغے چھن گئے۔ باورچیوں اور دوسرے ڈرائیوروں کی نظروں میں تضحیک آ گئی مگر ان کی یہ خوشی عارضی تھی کیوں کہ چھوٹی بی بی "صفیہ" کو جن آنے لگا اور وہ بھی پورے جوش و ولولے کے ساتھ۔ جن کی آواز میں چھوٹی بی بی بولتیں تو بڑوں بڑوں کے چھکے چھوٹ جاتے' جن کا رعب اتنا تھا کہ پورا زنان خانہ سر جھکائے رہتا باقی بیبیوں کے جن نہیں بلکہ مختلف "جنڑیاں" آتی تھیں جو کہ اتنی طاقت ور نہیں تھیں مگر پھر بھی ان کو بال کھول کر' کپڑے تار تار کر کے دھمال ڈالنے پہ مجبور کر دیتی تھیں۔

بی بی صفیہ کا تو حال ہی برا تھا۔ دھم دھام جاری تھی۔ سینے پر دو ہتڑ مارے جا رہی تھیں اور "مجھے سیہون لے جاؤ۔ مجھے سیہون لے جاؤ" کا ورد جاری تھا۔

سائیں اللہ ڈنو کی آمد کے ایک گھنٹے بعد نہایت احترام و ادب سے انہیں بی بی صفیہ کے آقا بڑے سائیں مربی جن کے بارے میں بتایا گیا جو سیہون شریف جانے کے علاوہ کسی اور جگہ جانے پر رضامند ہی نہ تھا۔

سائیں کے دریافت کرنے پہ بھی جن ذرا نہ جھجکا۔ "بس سیہون کی زیارت کرنی ہے۔ سائیں قلندر شہباز نے بلوایا ہے حاضری دینی ہے۔" جن کو جلال آیا ہوا تھا۔

سائیں کے حامی بھرتے ہی جن نے بی بی صفیہ کی جان چھوڑ دی اور یہ جا وہ جا۔ چھوٹی بی بی جو گردن لمبی کیے اکڑ کر بیٹھی تھیں زمین پر ڈھے گئیں۔ ان کے منہ سے جھاگ بہنے لگا۔ جسم پورا اکڑا ہوا تھا' آنکھیں اوپر کو چڑھ گئیں۔ خواتین کی سسکیاں بلند ہوئیں اور سینہ کوبی جاری تھی کہ سائیں نے حکم دیا تیاری پکڑو اور سیہون نکلو۔

قرعہ فال کسی اور ڈرائیور کے نام نکلتا تو پھر پردے اور غیرت کے بڑاوے آنکھوں کے سامنے ناچنے لگتے اس لیے پھر نبی بخش کو بلوایا گیا۔ تیاری مکمل ہوئی اور پانچ چھ خواتین کا قافلہ اور چند چھوٹے بچے اور ملازمین علیحدہ گاڑی میں لال شہباز قلندر کے بلوانے پر لبیک کہتے ہوئے روانہ ہوئے۔

وقت سکون سے گزر رہا تھا مگر جب رئیس غلام حسین کی بیگم نے سنا کہ صاحب نے اسلام آباد میں کسی فرانسیسی دوشیزہ سے شادی کر لی ہے تو وہ "گھوڑ اُڑے" کہتے ہی بے ہوش ہو گئی۔ نوکرانیوں نے تیل اٹھائے خوشبو سنگھائی۔ پیروں' ہاتھوں اور سر کی مالش کی تب جا کر بڑی بی بی کو ہوش آیا۔

اور آہ و بکا جاری ہو گئی۔ ہائے اب کیا ہو گا..... یہ گوری میمیں تو جادو گرنیاں ہوتی ہیں۔ میرا سب کچھ چھین کر لے جائیں گی۔ باقیوں نے تو پیسے سے یاری کی ہے یہ تو دل قابو کر لے گی۔ بچوں کو ایک دو ماہ میں شکل دیکھنا تو نصیب ہوتی تھی۔ اب تو پتا نہیں کیا ہو..... ارے کوئی پتا کرو..... حق مہر میں کیا لکھوایا ہے۔ اسلام آباد والی کوٹھی تو نہیں لے لی اس سوتن نے۔ آگ لگے بے حیائی کو..... میں کیا کروں رے..... کہاں جاؤں' کس کو ڈکھڑا سناؤں..... بڑی بی بی بال نوچے جا رہی تھیں۔ آنکھوں سے جھر جھر نیر بہا رہی تھیں۔ خادمائیں دلاسے دے رہی تھیں' مگر ان تسلیوں سے ان کی تشفی ممکن ہی نہیں تھی۔

سائیں سائیں ہوش کرو۔ اللہ آپ کو بیٹے کی خوشیاں

مبارک کرے۔ یہ کلموہیاں تو آج ہیں کل نہیں۔ آپ دادا کی نسل سے ہیں۔ آپ کی جگہ کون لے سکتا ہے۔ آپ کی حکم رانی ختم ہونے کی نہیں۔ آپ دل چھوٹا کیوں کرتی ہیں۔

مگر چھنے ہوئے شوہر کے مزید چھننے کا خطرہ اور تکلیف آہستہ آہستہ ہی رفع ہوتی ہے ان کے بیٹے کے ختنے کی تقریب نزدیک تھی۔ ایسی خوشیاں ان کی زندگی میں نہایت اہم ہوتی تھیں۔ اس کے باوجود رئیس غلام حسین کی بیگم کی خواہشوں کو زنگ لگا ہوا تھا۔ کہاں تو پورے دس سال انہوں نے اس دن کا انتظار کیا تھا کہ کب بیٹے کی خوشی دیکھنے کو ملے گی...... اور وہ رانی بن کر زیورات سے لدی پھندی بیٹھیں گی اور سہرے گائے جائیں گے۔ تحفے تحائف سے گھر بھر جائے گا۔ رونق دیکھنے کے لائق ہوگی اور قصے کہانیاں سالوں تک چلیں گی۔ سب عورتوں کو موضوع مل جائے گا۔ ایک نئی تقریب کے ہونے تک۔

وہ بے دلی سے تیار ہو رہی تھیں۔ ست لڑیوں کا ہار گلے میں ڈالتے ہوئے بھی فخر نہیں جاگا اور خوشبو لگاتے ہوئے بھی بجھی بجھی رہیں۔

ان کی بیٹی بی بی صفیہ کا کمرا علیحدہ تھا۔ وہ قرآن سے حق بخشوانے والوں میں شامل تھی مگر ماں کی دل جوئی کی خاطر وہ آج ماں کے کمرے میں ہی اپنی ملازمہ ''پھاگل'' کے ساتھ تھی۔ پھاگل جس کا چنچل پن مشہور تھا' بڑی شوخ اور مزاجا بڑی مرچیلی تھی۔ اس کا کام ہی روتوں کو ہنسانا تھا۔ آج وہ اپنی مالکن کو چٹکلے سنا رہی تھی اور چھوٹے سائیں کے ختنہ کے بعد شادی کی نوید سنا کر خوش کرنا چاہ رہی تھی۔

مرد حضرات باہر اوطاقیں آباد کیے بیٹھے تھے۔ دیگیں چڑھی ہوئی تھیں۔ مختلف مسالے جات کی خوشبو فضا میں پھیلی ہوئی تھی۔ رنگین پروگرام بھی ترتیب دیا ہوا تھا' جو آج رات کو منعقد ہونا تھا اور کل رسمِ ختنہ ہونی تھی۔

اندر حویلی میں بیگمات نے اپنے تمام زیورات جسموں پہ سجائے ہوئے تھے۔ ڈھولک کی تھاپ پر گیت گائے جا رہے تھے۔ چند بیبیاں روپے نچھاور کر رہی تھیں۔ ملازمائیں خود کو نہایت خوش اور وفادار ثابت کرنے کے لیے بڑے شوخ و شنگ کپڑے پہنے ہوئے قہقہے لگاتی ہوئی ناچ رہی تھیں۔

پھاگل کا جوبن پھٹا پڑ رہا تھا۔ وہ ایک طرف نوٹ پکڑنے کے لیے شمال کی طرف لپکتی تو دوسرا قدم جنوب میں ہوتا۔ اس کے لیے ایسے دن قسمت سے ہی آتے تھے۔

بڑی بی بی...... یہ نوٹ آپ کی طرف سے۔ اونہوں چھوٹا ہے۔ اس نے ناک چڑھائی۔

بھلا یہ دوسرا...... رئیس غلام حسین کی بیگم موج میں آ گئی اور پانچ سو کا نوٹ اسے دکھایا۔ تھوڑا سا بڑا۔

پھاگل نے زبان چڑائی اور نوٹ لیتے ہوئے دوسری بی بی کا گال ہی نوچ لیا...... ''او مریں تیرے سب'' بڑی بی بی نے ہنستے ہوئے اسے چپت رسید کی۔

بدمعاش ہے بڑی...... لا ہزار ہزار کے نوٹوں کی گڈی لا۔ اب کی بار بیگم غلام حسین ترنگ میں آ گئیں۔ یہ کل کی چھوکری پیٹ ہی نہیں بھرتا اس کا...... اس کی ماں تو پانچ روپے کے نوٹ کو بھی چوم کر رکھا کرتی تھی اور اس کے نخرے ہی پورے ہونے کو نہیں آتے۔

بیگم غلام حسین کی دیکھا دیکھی دوسری بیبیوں نے بھی اشارے کیے اور بڑے نوٹ حاضر کر دیے گئے۔ سب کی نظریں پھاگل پہ لگی ہوئی تھیں جو آدھی رات کو کھلے آسمان کے بیچوں بیچ کمر تک بال بکھرائے سیاہ ستاروں سے بھرے تنگ کپڑوں میں ناگن بنی جھوم رہی تھی۔ ہنسی اس کے ہونٹوں سے فوارہ بنی چھوٹ رہی تھی۔

باقی شیدی ناچنے والی عورتیں تو سب ایک طرف ہو گئیں اور وہ بیبیوں کے نرغے میں آ گئی۔ دھم دھا دھم...... چھم چھما چھم...... ڈھول اور پائل دونوں کا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

...ہونے لگا۔

...دھر ہزار کے نوٹ اس کے پیروں میں مچلنے لگے۔ ...یک بڑی بی بی نے پینترا بدلا...... یہ بندے ڈھائی ...کے...... ہیرے جڑے ہوئے ہیں اس میں...... یہ ...گل کوئی کرشمہ دکھائے تب نہ...... ناچ تو سارا جگ ...ہے۔ آج میرے سانول کے جشن میں ہیرے کے ...ے...... ڈھائی لاکھ......

...ست پھاگل دھن دھنا دھن ہو گئی...... اس کی قمیص یہ ...وہ جا...... ڈھول پیٹتی ہوئی عورتوں پر جا پڑی...... ...یاں خوشی میں پاگل ہو گئیں۔

...اور پھاگل آپے میں کہاں تھی۔ کسی نے کنگن پھینکا تو ...کسی نے میکلس' کسی نے ہیرے جڑی انگوٹھی دان ...کر دی۔ پھاگل نے دھجیوں تک سے نجات حاصل ...کر لی۔ اس کی اس رات کی جتنی کمائی اس کی ساری ...ری نسلوں نے نہ کی تھی۔ ڈھول بجانے والیاں تھک ...گئیں۔ تالیاں پیٹنے والیوں کے ہاتھ شل ہو گئے۔ پرس ...بے جان ہو گئے مگر پھاگل تھرکتی رہی۔ ایسا جشن زنان ...خانے میں برپا ہوا کہ مردوں نے کیا خاک کیا ہوگا۔ ...ری رقاصاؤں کی بناوٹی اداؤں نے انہیں اُلو ضرور بنایا ...ہوگا مگر یہ سرور نہ بخشا ہوگا۔

...پرندوں اور جانوروں کو بھی وصل کے موسم نصیب ...ہوتے ہیں۔ بقایا تمام جان دار بھی ایسے موسموں میں ...زنجیریاں تڑوا کر اپنی منزل حاصل کرتے ہیں...... تو پھر ...انسان کس طرح مغلوب نہ ہو' جب کہ جولانیاں بھی ...آب تاب پر ہوں۔ یہ موسم اپنے تقاضوں سے مجبور ...ہوتے ہیں۔ ایسے میں فطرت کوئی جبر سہنے پر آمادہ نہیں ...ہوتی۔ ایسے ہی دنوں میں اس حویلی کے تپے ہوئے جبر ...اور ماحول میں نئی کونپلیں بھی سر اٹھاتیں' یہ اور بات کہ ...انہیں وہیں کچل دیا جاتا تھا۔ ان کونپلوں کو مسلنے کی ...سازشوں سے سارا ماحول پُراسرار ہو جاتا۔ دائیوں کی ...قدر ورفت بڑھ جاتی ان کے وارے نیارے

ہو جاتے۔

ملازمائیں چوکیدارنیاں بن جاتی کمروں میں نوزائیدہ بچوں کی ایک آدھ گھٹی گھٹی چیخ' نگاہوں کے اشاروں کو مہمیز کر دیتی اور پھر سناٹا۔

گورکن بھی شناسا ہو گئے تھے۔ ان کی مٹھی گرم کر دی جاتی تھی۔ ننھی ننھی بے شمار قبریں بن چکی تھیں۔ کبھی کپڑے کی گٹھڑیوں میں نازک جانیں خاموش ہوتی تھیں تو کبھی پلاسٹک کی تھیلیوں میں ان کے گلے گھونٹے جاتے تھے۔ کئی چیخیں تو حویلی کے در و دیوار سے چمٹ کر رہ گئی تھیں جو تاریک' خاموش راتوں میں گونج اٹھتی تھیں۔

ڈرائیور خانساماں اور دیگر ملازم...... سب اب تک نہ جانے حویلی میں کتنے بچوں کے باپ بن چکے ہوتے اگر یہ قبریں نہ کھودی جاتیں۔ اس حویلی میں کسی کو ماں بننے کا اعزاز حاصل نہیں ہو رہا تھا۔ کوئی باپ ہونے کی سند حاصل نہیں کر رہا تھا...... اور قبریں تھیں کہ بڑھتی جا رہی تھیں۔

زنانہ حصہ تو اس بات کو خوب سمجھتا تھا لہٰذا خاموش تھا۔ قرآن سے حق بخشوانے کی رسم کے بعد یہ عورتیں بچوں کو چھاتی سے لگانے' دودھ پلانے اور ماں بننے کی حیثیت سے یکساں محروم تھیں۔ سالوں سے یہ سلسلہ دائیوں کے بھروسا اور رحم و کرم پہ چل رہا تھا' مگر اس بار حویلی میں تاثرات مختلف تھے اور اس رات تو یوں لگ رہا تھا کہ ساری حویلی جاگ رہی ہے۔ کہاں تو راتیں تاریک تر تھیں اور کہاں دن کا سا اُجالا...... آزمودہ دائیوں کے چہرے لٹکے ہوئے تھے۔

بی بی صفیہ کے کمرے سے سسکیاں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ ایک رات اور ایک پورا دن اسی اضطراب میں گزرا...... مگر دوسری رات ہوتے ہوتے بی بی صفیہ کی چیخیں آسمان کو چھونے لگیں۔ سب سناٹے میں آ گئے۔ صفیہ بی بی کی ماں دلاری بیٹی کا سر گود میں رکھے

زور زور سے روئے چلی جارہی تھی۔

"ہائے کوئی سبیل کرو۔ کوئی تدبیر کرو..... اری رحیماں کم بخت تیرا منہ کالا ہو۔ ساری زندگی کہاں گزاری۔ اری تو کوئی علاج کر۔ میری بچی مر جائے گی۔ ارے میری مظلوم مسکین بچی کے ساتھ کیا ہوگیا۔ ارے کچھ کرو۔ ارے کچھ کرو۔"

"سائین بڑے سائیں نے پچھوایا ہے..... کیا ہوا ہے اندر حویلی میں.....؟" ایک ملازمہ سہمی ہوئی سوال لے کر آئی۔

"اری کیا نہیں ہوا۔ میں کرموں جلی۔ میری جوان بیٹی مٹی میں مل گئی۔ رُل گئی' میری بیٹی کی جوانی کو گہن لگ گیا۔"

"ارے سب کچھ ختم ہورہا ہے..... بلا لاؤ کوئی سائیں کو۔"

"نہ نہ مالکن نہ....." دبی سہمی آوازیں مالکن کو منع کرنے لگیں..... مگر ماں کا دل پھٹا جارہا تھا..... وہ کب باز آنے والی تھی۔

"ارے کیا کرے گا کوئی۔ میری بچی کو کچھ ہوگیا تو میں خاک ہوجاؤں گی....."

ابھی بین جاری تھا کہ ڈری سہمی کانپتی ملازماؤں کے پیچھے سے صفیہ بی بی کے والد رئیس غلام حسین نمودار ہوئے۔

"کیا معاملہ ہے.....؟"

سب عورتیں اپنی خاکی رنگتوں سمیت باہر کو لپکیں۔ بڑے مالک' مالکن اور بیٹی اکیلے رہ گئے۔ صفیہ بی بی زرد چہرہ لیے گردن سے پاؤں تک سفید چادر میں ملبوس لیٹی ہوئی' کپڑے کا گولا منہ میں ٹھونسے آنسوؤں سے تر چہرہ لیے انہیں دیکھ رہی تھی۔

"اسے ڈاکٹرنی کی سخت ضرورت ہے۔" مالکن انعام سائیں کے پیروں میں گر گئی۔

"ہوا کیا ہے اسے.....؟"

بڑے سائیں ان جان بنے تھے یا ان جان بننے کی ایکٹنگ کررہے تھے۔ "اس کی طبیعت بہت خراب ہے۔ خدا کے لیے....." ماں بلک رہی تھی۔

"مرنے دو اسے یہیں۔ کہاں لے کر جاؤں اسے اس آدھی رات کو....." باپ کا دل سخت تھا۔ "ڈاکٹرنی کو فون کردو..... وہ اپنے گھر پہ ہی دیکھ لے گی۔ یا بلا دو اسے..... اللہ کے واسطے میری معصوم بچی کی زندگی بچا دو۔"

"گھر پہ بلاؤں تاکہ گوٹھ راج سب تماشا دیکھیں....." سائیں کیا سمجھ رہے تھے معلوم نہیں۔ ڈاکٹر صاحبہ کو فون کیا۔ شاید مسئلہ دریافت کیا تھا لیڈی ڈاکٹر نے۔

"پیٹ میں مروڑ اٹھ رہے ہیں۔"

"جی شادی شدہ....."

"نہیں تو....." سائیں کی آواز ہکلا گئی۔

باہر ڈرائیور نبی بخش بے قرار بیٹھا ہوا تھا۔ "جی سائیں!"

"پردہ لگواؤ بڑی گاڑی میں۔"

اندر ماں' ملازمہ اور بی بی صفیہ بیٹھے اور سائیں ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گئے۔ بی بی صفیہ کے منہ میں کپڑا بہ دستور ٹھنسا ہوا تھا۔

ڈاکٹرنی کے گھر میں تینوں عورتیں داخل ہوئیں۔ باہر بڑے سائیں ایک گھنٹے گاڑی میں پیچ و تاب کھاتے رہے..... ایک گھنٹے بعد..... بچے کی چیخ کے ساتھ ہی جیسے بڑے مالک کے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ ڈال دیا گیا ہو۔

اگلے روز صبح چار بجے جب مؤذن نے جمائیاں لیتے ہوئے مسجد کا رُخ کیا تو سیڑھیوں پہ ٹھوکر لگی۔ ایک نوزائیدہ بچے کی جلی ہوئی مسخ شدہ لاش کپڑے میں لپٹی ہوئی رکھی تھی۔

☆☆☆

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پرائیویٹ جاسوس

محترم فہمیدہ صاحبہ

السلام علیکم!

اس مرتبہ ایک جاسوسی کہانی لے کر حاضر ہوا ہوں۔ امید ہے اسے پرچے کی زینت ضرور بنائیں گی۔ اجازت اس دعا کے ساتھ کہ اللہ پاک اس پرچے کو مزید مقبولیت سے سرفراز فرمائے۔

آمین

فقط

شہاب شیخ

میں اس وقت اپنے آفس میں میز پر ٹانگیں پھیلائے بیٹھا تھا۔ میرا سر میری کرسی کی پشت سے ٹکا ہوا تھا اور میں نے آنکھیں موند رکھی تھیں اور میرے کانوں میں واک مین کے اسپیکر لگے ہوئے تھے۔ میں اپنی پسند کا ایک گانا سن رہا تھا۔ میں نے واک مین کا والیم ہلکا کررکھا تھا تاکہ اگر کوئی میرے آفس کے دروازے پر دستک دے دستک دیئے بغیر اندر آجائے تو مجھے اس کی آوازیں آجائیں۔

اچانک دھڑاک سے میرے آفس کا دروازہ کھلا' اس کے ساتھ ہی میری آنکھیں بھی کھل گئیں۔ آفس میں ایک خوب صورت عورت داخل ہوئی تھی۔ اس کی عمر تیس برس کے لگ بھگ تھی۔ اس نے نیلا منی اسکرٹ اور کالی شرٹ پہن رکھی تھی۔ اس کے کاندھے پر کالا بیگ لٹک رہا تھا۔ اس کے بال سنہری تھے' جن میں سے کچھ اس کی پیشانی پر بھی آئے ہوئے تھے۔

میں نے فوراً ٹانگیں کھینچ کر نیچے رکھ لیں۔ ساتھ ہی ٹیکر کان سے نکالے اور ٹھیک طور پر بیٹھتے ہوئے اپنا لباس درست کرنے لگا۔ اس وقت مجھے کسی کلائنٹ کے آنے کی توقع تو تھی نہیں کیوں کہ میں نے اپنے آفس کے باہر ملاقات صبح نو بجے سے شام چھ بجے تک لکھا ہوا تھا اور اس وقت شام کے سات بجنے والے تھے' ایسے میں مجھے اپنے کسی دوست وغیرہ کے آنے ہی کی توقع تھی' جبکہ آنے والی عورت کے بارے میں میرا خیال تھا کہ وہ میری خدمات حاصل کرنے آئی ہوگی کیونکہ اس کا شمار میرے شناساؤں میں نہیں تھا۔ وہ بڑی بے تکلفی سے میرے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی اور بغیر کسی تمہید کے بولی۔ "میرا نام جولیٹ ہے' جولیٹ کرسٹوفر..... میں تمہاری خدمات حاصل کرنا چاہتی ہوں۔"

"بالکل بالکل..... مجھے تمہارے لئے سروسز دے کر بہت خوشی ہوگی۔" میں نے مسکرا کر کہا۔

"تمہیں خوشی ہونا چاہئے کیونکہ تمہارے پاس اس وقت کوئی کام کاج تو ہے نہیں۔" اس نے بڑی بے باکی سے کہا۔ بات سچ تھی اور میں سمجھ گیا تھا کہ وہ کسی سے میرے بارے میں معلومات لے کر آرہی ہے' اس لئے میرے لبوں پر مخبل مسکراہٹ آگئی۔ میں نے کہا

"تمہیں کس نے دے دیں میرے بارے میں

معلومات؟"

"میں نے یہیں کے کچھ لڑکوں سے جاسوسوں کے بارے میں معلومات حاصل کی ہیں' پتہ چلا کہ تم وہ پرائیویٹ جاسوس ہو۔ جس کا معاوضہ سب سے کم ہے اور تم اس وقت فارغ بھی ہو بلکہ..... اکثر فارغ ہی رہتے ہو۔" اس نے میری اَنا پر چوٹ ماری تھی لیکن اس کا کہنا غلط نہیں تھا کوئی اور معاملہ ہوتا تو شاید میں اسے اس کا انداز گفتگو درست کرنے کا کہتا لیکن یہاں معاملہ میرے روزگار کا تھا۔ ویسے بھی میں گزشتہ ایک ماہ سے بالکل فارغ ہی تھا' اس سے قبل میں نے ایک کیس کیا تھا جو کہ ایک شخص مسٹر تھامس کا تھا' اس کی ایک قیمتی گھڑی چوری ہوگئی تھی' تھامس ایک امیر آدمی تھا' وہ شاید اس گھڑی کی گمشدگی کو جھیل جاتے لیکن مسئلہ یہ تھا کہ وہ گھڑی اس کی مرحومہ ماں کی نشانی تھی' اس لئے وہ اسے ہر حال میں دوبارہ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ میری خوش قسمتی یہ تھی کہ میں نے اس کی وہ گھڑی تلاش کر لی تھی۔ وہ اس کے بھتیجے فریڈ نے چرائی تھی' اس کامیابی کے بعد میری شہرت کا گراف کچھ اوپر آ گیا تھا۔ اس سے قبل میں اور کیسز میں ناکام ہو چکا تھا اور میری ساکھ کو کافی نقصان پہنچا تھا لیکن مسٹر تھامس نے اس وقت وہ کیس مجھے اس لئے دے دیا تھا کہ اسے کوئی پرائیویٹ جاسوس دستیاب نہیں ہو سکا تھا۔

"بتاؤ..... میں تمہاری کیا خدمت کر سکتا ہوں؟" میں نے جولیٹ کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھ کر کہا۔

"میرا ایک نیکلس چوری ہو گیا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ تم مجھے وہ تلاش کر کے دے دو..... جس طرح تم نے مسٹر تھامس کی گھڑی تلاش کر کے دی تھی۔" وہ بولی۔

میں نے ایک گہری سانس لی اور اس سے بولا۔ "اس کا مطلب ہے کہ تم میرے بارے میں کافی معلومات لے کر آئی ہو؟"

"ہاں..... اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ تم کم سے کم معاوضے پر بھی کام کر لیتے ہو۔" وہ بولی۔

"ایک بار پھر میری اَنا پر چوٹ پڑی لیکن چونکہ یہ بات بھی حقیقت تھی اس لئے میں اسے بھی جھیل گیا اور پھر یہ کہنے کی صورت میں کلائنٹ کے ہاتھ سے چلے جانے کا اندیشہ بھی تھا اور میں اس وقت اسے کسی صورت ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتا تھا کیونکہ گزشتہ ایک ہفتے سے میں دوستوں سے قرض لے کر گزارا کر رہا تھا۔

"لیکن میرا کم سے کم معاوضہ بھی پانچ سو ڈالر فی ہفتہ ہے۔" میں نے اپنی اَنا کا گراف اوپر کرنے کے لئے کہا لیکن میرا لہجہ اٹل نہیں تھا' اس میں لچک تھی اور ساتھ ہی میں نے اپنی بات کو نرم رکھنے کیلئے مسکراہٹ کا سہارا بھی لیا تھا۔

"میں تمہیں صرف سو ڈالر فی ہفتہ دوں گی۔" اس نے جواب طلب نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

"یہ تو کم ہے۔" میں نے سانحہ انداز میں کہا۔

"تو پھر کیا میں کوئی اور جاسوس دیکھوں؟" ایک بار پھر اس نے میری طرف جواب طلب نگاہوں سے دیکھا۔

"دوسرے جاسوسوں کا معاوضہ مجھ سے کہیں زیادہ ہے اور وہ..... رعایت بھی نہیں کرتے ہیں۔" میں نے اب بھی اپنا لہجہ نرم ہی رکھا۔

"لیکن ان کی شہرت..... ان کا کام؟" اس نے سانحہ انداز میں میری طرف دیکھا۔

میں نے سوچا کہ زیادہ بحث مباحثہ اس معاملے کو یہیں ختم کر سکتا ہے' اس لئے میں نے غصے سے دونوں ہاتھ میز پر مارتے ہوئے کہا۔ "اچھا چلو ٹھیک ہے..... جیسا تم چاہتی ہو ویسا ہی ہوگا لیکن کام کے آخر میں تم میری ساری فیس ادا کرنے کی پابند ہو گی؟"

"تم اس کی فکر نہ کرو' وہ تمہیں مل جائے گی۔" اس نے تشفی دی۔

"اچھا..... اب مجھے اس نیکلس کے بارے میں تفصیلات بتاؤ؟" میں نے کہا۔

اس نے اپنا بیگ گود میں سے اٹھا کر میز پر رکھ دیا اور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس میں سے ایک تصویر نکال کر میرے سامنے رکھ دی۔ وہ اس کا اپنا سنگل پوز تھا۔ اس کے گلے میں نیکلس موجود تھا جو واضح طور پر نظر آ رہا تھا۔

"اس تصویر میں تم جو نیکلس میرے گلے میں دیکھ رہے ہو..... یہی نیکلس چوری ہوا ہے۔" جولیٹ نے کہا۔

میں نے نیکلس کو ذرا غور سے دیکھا اور پھر جولیٹ کی طرف دیکھ کر بولا۔ "ٹھیک ہے..... اب اس کی مزید تفصیلات بھی دو مجھے اور اگر تمہیں کسی پر شک ہے تو مجھے اس کے بارے میں بھی بتا دو؟"

"ہاں..... مجھے اپنی سہیلی کیتھرین پر شک ہے۔" اس نے فوراً کہا۔

"او کے!..... اس کے بارے میں بتاؤ؟"

اس نے مجھے کیتھرین کی تصویر دکھائی اور ساتھ ساتھ دیگر معمولات بھی دے دیں اور بولی۔ "میں کب تک امید رکھوں کہ تم یہ نیکلس حاصل کر لو گے؟"

"کم سے کم دو ہفتے میں۔" میں نے جواب دیا۔ میں اس نوعیت کے کیسز میں اتنا وقت ضرور بتاتا تھا۔

"لیکن کوشش کرنا کہ اس سے قبل حل کر لو۔ اس طرح تمہارا معاوضہ بھی تمہیں جلدی مل جائے گا۔" اس نے بیگ واپس گود میں رکھتے ہوئے کہا۔

"تم بے فکر رہو..... میری تو یہی کوشش ہو گی کہ یہ کیس جلد از جلد حل ہو جائے۔" میں نے اسے تسلی دی۔

"ہوں۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا اور بیگ میں ہاتھ ڈال کر رقم نکالی' اس میں سے کچھ نوٹ میری طرف بڑھاتے ہوئے اس نے کہا۔ "یہ رہے تمہارے دو سو ڈالر ایڈوانس۔"

میں نے اس سے نوٹ لے لئے اور کافی طمانیت مسرت محسوس کی۔ اس کی طرف دیکھ کر میں نے کہا۔ "بس اب تم بالکل بے فکر رہو..... جلد ہی میری طرف سے خوش خبری کا فون تمہارے پاس آ جائے گا۔"

"میں صرف تمہارے فون کا انتظار نہیں کروں گی بلکہ وقتاً فوقتاً خود تمہیں فون کرتی رہوں گی۔" وہ بولی۔

"بے شک' بے شک! تم جب چاہو مجھے فون کر لینا۔" میں نے فوراً کہا۔

"او کے!..... اب میں چلتی ہوں۔ امید ہے کہ تم آج ہی اس کیس پر کام شروع کر دو گے؟" اس نے اٹھتے ہوئے کہا اور کھڑی ہو کر سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگی۔

"آج سے نہیں بلکہ ابھی سے۔" میں نے مسکرا کر کہا۔

"او کے!" اس نے میری طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ نام کی کوئی چیز نہیں تھی' میں نے اس سے مصافحہ کیا اور ساتھ ہی اٹھ کھڑا ہوا' میں اس کے ساتھ کمرے کے دروازے تک آیا اور اسے رخصت کرنے کے بعد واپس آ کر اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا اور جولیٹ کے بارے میں سوچنے لگا۔ وہ کافی اکھڑ مزاج معلوم ہوتی تھی اور ساتھ ہی بڑی منہ پھٹ بھی تھی' اس کی جگہ کوئی عام عورت ہوتی تو میں زیادہ سے زیادہ رقم لینے کیلئے کئی حربے آزماتا اور خوب چرب زبانی کا مظاہرہ کرتا لیکن جولیٹ نے تو مجھے اپنی گفتگو سے بے بس کر کے رکھ دیا تھا اور اپنی مرضی کے مطابق مجھے دو سو ڈالر دینے کے بعد مجھے اپنے کام کے لئے پابند کر گئی تھی۔ میں چونکہ ان دنوں بہت کڑکی میں تھا' اس لئے یہ دو سو ڈالر بھی مجھے غنیمت محسوس ہو رہے تھے اور ساتھ ہی توقع تھی کہ جب میں یہ کیس حل کر لوں گا جولیٹ کی طرف سے مجھے مزید رقم بھی ملے گی۔

میں کیس کو حل کرنے کا منصوبہ بنانے لگا۔

کافی دیر کی سوچ بچار کے بعد بالآخر میں نے ایک منصوبہ ترتیب دے دیا' جس کے تحت سب سے پہلے مجھے کیتھرین سے ملاقات کرنی تھی۔ جولیٹ نے مجھے بتایا کہ اس کے تعلقات اب بھی کیتھرین سے اچھے ہیں' لہٰذا میں براہ راست اسے اپنی تفتیش کی زد پر نہیں لے سکتا تھا۔ ہاں اس نے مجھے یہ ضرور کہا تھا کہ میں کیتھرین سے

یہ کہہ کر ضرور مل سکتا ہوں کہ جولیٹ نے مجھے کہا ہے کہ کیتھرین ذہین عورت ہے اور اس سلسلے میں میری کچھ نہ کچھ مدد کر سکتی ہے' ساتھ ہی جولیٹ نے مجھے سخت طور پر یہ ہدایت کی تھی کہ میں کسی بھی طرح کیتھرین پر یہ ظاہر نہ ہونے دوں کہ میں اس پر شک کر رہا ہوں۔

میں نے اپنی میز پر بکھری چیزیں ترتیب سے رکھیں اور پھر ایک جانب دیوار میں آویزاں قد آدم آئینے کے سامنے پہنچ گیا۔ اس میں اپنا عکس دیکھ کر میں نے اپنا لباس درست کیا اور بال سنوارے' اس کے بعد میں اپنے کمرے سے باہر آ گیا میں نے دروازے کو لاک کیا اور کوریڈور میں تیز تیز قدموں سے چل پڑا۔

ذرا ہی دیر بعد لفٹ کے ذریعے میں گراؤنڈ فلور پر آ گیا اور پھر تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا عمارت سے باہر آ گیا' بائیں ہاتھ کی طرف پارکنگ لان تھا' جس میں میری کار کھڑی تھی' جو بڑی خستہ حال تھی۔ میں نے بڑی کوشش کی تھی کہ اس کی جگہ کوئی اچھی گاڑی لے لوں لیکن معاشی ناہمواریوں کی وجہ سے میں ابھی تک اپنی اس خواہش کو پایہ تکمیل تک نہیں پہنچا سکا تھا۔

میں اپنی کار میں روانہ ہو گیا' مجھے اس بات کی خوشی تھی کہ بظاہر میری کار کی حالت خستہ تھی لیکن اس کے انجن میں ابھی کافی جان تھی۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد میں اس عمارت کے سامنے پہنچ گیا جس کی تیسری منزل پر کیتھرین کا اپارٹمنٹ تھا اور پھر کچھ ہی دیر بعد میں نے پارکنگ لان میں اپنی کار کھڑی کر دی' اس سے اتر کر میں عمارت کا جائزہ لیتا ہوا اس کے داخلی دروازے کی جانب بڑھا۔

ذرا دیر بعد میں عمارت کے اندر داخل ہونے کے بعد لفٹ کے پاس پہنچ گیا۔ لفٹ اوپر جا کر پانچویں منزل پر رکی ہوئی تھی اور اس کے انتظار میں کچھ لوگ کھڑے ہوئے تھے۔

کچھ دیر بعد لفٹ نیچے آ گئی' اس کا دروازہ کھلا اور اس میں سے لوگ برآمد ہونے لگے۔ سب باہر آ گئے' لفٹ آپریٹر اندر رہ گیا تو باہر کھڑے لوگ اس میں سوار ہو گئے۔ لفٹ آپریٹر نے بٹن پش کر دیا۔ لفٹ اوپر کی جانب روانہ ہو گئی۔

پہلی اور دوسری منزل پر رکنے کے بعد تیسری منزل پر رک گئی' دروازہ کھل گیا۔ میرے ساتھ کچھ اور لوگ بھی لفٹ سے باہر آ گئے' میں اپارٹمنٹس کے نمبر دیکھتا ہوا چلنے لگا اور بالآخر کیتھرین کے اپارٹمنٹ کے سامنے پہنچ کر رک گیا' میں نے کال بیل کا بٹن دبایا۔ اندر بیل بجی اور کچھ ہی دیر بعد کیتھرین نے دروازہ کھول دیا۔ اس کے چہرے پر سوالیہ تاثرات تھے' اس سے قبل کہ وہ کچھ کہتی' میں نے اس سے کہا۔ "میرا نام جیمز ہے..... میں پرائیویٹ جاسوس ہوں اور تم سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"کس سلسلے میں؟" اس نے ٹٹولنے والی نگاہوں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

"وہ دراصل تمہاری سہیلی کرسٹوفر کے گمشدہ نیکلس کے سلسلے میں تم سے بات کرنی ہے..... اس نے کہا تھا کہ تم اس کی ذہین سہیلی ہو اور اس سلسلے میں میرے لئے مددگار ثابت ہو سکتی ہو۔" میں نے کہا۔

اس نے چند لمحے سوچا اور دروازہ مزید کھولتے ہوئے بولی۔ "اچھا تم اندر آ جاؤ۔"

میں اندر داخل ہو گیا۔ اس نے دروازہ بند کر دیا' پھر وہ مجھے سٹنگ روم سے لے آئی' ہم صوفوں پر بیٹھ گئے' اس نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "بولو..... میں تمہاری کیا مدد کر سکتی ہوں؟"

"تم خود سوچو کہ تم میری کیا مدد کر سکتی ہو؟" میں نے کہا۔

وہ ذرا سوچ کر بولی۔ "جولیٹ ایک پاگل عورت ہے..... بہتر ہے کہ تم اس کی باتوں کو سنجیدگی سے نہ لو۔"

میں اس کی بات پر بھونچکا رہ گیا اور پھر بولا۔ "میں سمجھا نہیں تمہاری بات۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"اس کا خیال ہے کہ نیکلس میں نے چرایا ہے' حالاں کہ میں اسے واضح طور پر کہہ چکی ہوں کہ میں نے اس کا نیکلس نہیں چرایا۔" وہ بولی اور میں ایک بار پھر ششدر رہ گیا' پھر میں نے کہا۔

"شاید اس نے تم سے ایسی بات کہی ہو' لیکن مجھ سے اس نے ایسی کوئی بات نہیں کہی بلکہ مجھے تو اس نے یہ کہا تھا کہ تم اس کی ایک اچھی اور مخلص سہیلی ہو اور میں چاہوں تو اس کیس کے سلسلے میں تم سے مدد لے سکتا ہوں۔"

"یہ جھوٹ ہے" وہ بلا توقف بولی۔ "میں اسے جانتی ہوں..... وہ میری تعریف کر ہی نہیں سکتی۔ وہ تو مجھے اب تک اپنے نیکلس کی چور سمجھتی رہی ہے اور اب بھی یقیناً اس نے تمہیں اس لئے یہاں بھیجا ہوگا تاکہ تم اپنی ذہانت سے مجھ سے کچھ اگلوا سکو؟" اس نے جواب طلب نگاہوں سے میری طرف دیکھا' تو میں نے اس سے نظریں چرائیں اور بولا۔

"تم غلط سمجھ رہی ہو..... اس نے تم پر شک نہیں کیا ہے..... اگر تم ناراض ہو رہی ہو تو میں یہاں سے چلا جاتا ہوں؟"

"نہیں..... تم اب میرے مہمان ہو اور اگر میں تمہیں یہاں سے جانے کا کہہ دوں تو یہ بڑی بداخلاقی ہوگی۔ بہر حال..... ہم جولیٹ پر بھی بات کرتے رہیں گے' یہ بتاؤ کہ تم کیا پینا پسند کرو گے؟" وہ بولی۔

"میں..... اس وقت کافی پینا چاہوں گا۔" میں نے کہا۔ میں یہاں رکنا چاہتا تھا اور کچھ پینے کا پوچھ کر کیتھرین نے مجھے موقع فراہم کر دیا تھا۔

"اوکے..... تم بیٹھو' میں لے کر آتی ہوں۔ وہ بولی اور اٹھ کر روم سے باہر جانے لگی۔ میں اس کی طرف دیکھنے لگا' اس کا چہرہ ہی خوبصورت نہیں تھا بلکہ اس کا جسم بھی بڑا دلکش اور متناسب تھا۔ اس کی عمر جولیٹ سے دو تین سال کم ہی لگتی تھی۔

وہ روم سے باہر چلی گئی تو میں نے ایک گہرا سانس لیا اور اپنے بدن کو ڈھیلا چھوڑتے ہوئے میں ادھر اُدھر کا جائزہ لینے لگا۔ وہاں کوئی ایسی خاص چیز نہیں تھی جو میری توجہ کا مرکز بن سکتی۔

کچھ دیر بعد کیتھرین واپس آ گئی۔ اس کے ہاتھ میں ٹرے تھی' جس میں دو مگ رکھے ہوئے تھے۔

اس نے وہ ٹرے سینٹر ٹیبل پر رکھ دی اور ایک مگ اٹھا کر مجھے دے دیا اور دوسرا خود تھام لیا۔ کافی کی ایک چسکی لینے کے بعد اس نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ "ہاں تو اب ہم بات کرتے ہیں جولیٹ کے بارے میں..... وہ میری سہیلی ہے' لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ اس نے کبھی مجھ پر اعتبار نہیں کیا۔ اکثر اس طرح کا رویہ رکھتی ہے کہ میں دل برداشتہ ہو جاتی ہوں۔ لیکن بہر حال میں اس سے ناطہ نہیں توڑ سکتی' اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ میرے کام بھی بہت آتی ہے۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ تمہاری ایک اچھی سہیلی بھی ہوئی تھی؟" میں نے جولیٹ کے بارے میں اس کا رویہ نرم ہوتے دیکھ کر فوراً کہا۔

اس نے ذرا سوچا اور پھر اثبات میں سر ہلا کر بولی۔ "ہاں..... یہ کہا جا سکتا ہے۔"

ہم دونوں مختلف امور پر بات چیت کرتے رہے اور یوں رات کے نو بج گئے۔ اب تک میں اس سے اپنے مطلب کی کوئی بات اگلوانے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔

میں نے سوچا کہ وہ یقیناً میری وجہ سے ڈسٹرب ہو رہی ہو گی' اس لئے میں نے اس سے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ ہم اپنی ملاقات کسی اور وقت کے لئے رکھ لیتے ہیں کیوں کہ تم یقیناً اس وقت اپنے معمولات کی طرف متوجہ ہونا چاہو گی؟"

"میری طرف سے فکرمند نہ ہو۔" وہ بولی۔ "بلکہ میں تو یہ کہوں گی کہ میرے ڈنر کا وقت ہو رہا ہے اور اگر تم بھی میرے ساتھ ڈنر کرو تو مجھے خوشی ہوگی۔"

"اگر تمہیں زحمت نہ ہو تو میں ضرور تمہارے ساتھ ڈنر

کروں گا۔" میں نے اس کے ساتھ مزید وقت گزارنے کا موقع دیکھ کر کہا۔

"مجھے کوئی زحمت نہیں ہوتی۔" وہ ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ "اچھا تم بیٹھو میں ڈنر لگاتی ہوں۔" وہ اٹھ کر ڈرائینگ روم سے باہر چلی گئی۔

کچھ دیر بعد وہ سٹنگ روم کے دروازے پر آ کر رک گئی اور بولی۔ "آؤ جیمز..... میں نے کھانا لگا دیا ہے۔"

میں اٹھ کر چل پڑا۔

کچھ دیر بعد وہ مجھے ایک اور روم میں لے آئی۔ یہاں ڈائننگ ٹیبل لگی ہوئی تھی، جس پر کھانا موجود تھا۔

ہم دونوں کرسیوں پر ایک دوسرے کے مدمقابل بیٹھ گئے اور کھانا کھانے لگے۔ ادھر اُدھر کی باتیں شروع ہو گئیں اور پھر اس نے کہا۔ "تم پراسرار باتوں پر یقین رکھتے ہو..... میرا مطلب ہے کہ بدروحوں وغیرہ پر؟"

"ہاں کسی حد تک۔" میں نے جواب دیا۔

"کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ ایسی چیزوں کا وجود ہے؟" اس نے میری طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

"میں نے کبھی ایسی کوئی چیز اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھی، اس کے باوجود میں ایسی باتوں پر یقین رکھتا ہوں کیوں کہ میرے جاننے والوں میں بہت سے لوگوں نے ایسی چیزیں دیکھی ہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"میں تمہیں ایک ایسی ہی بدروح کی کہانی سناؤں..... کیا تم سننا پسند کرو گے؟" وہ بولی۔

اس نے جو موضوع چھیڑ دیا تھا، اس سے مجھے زیادہ دلچسپی تو نہیں تھی لیکن چونکہ میں چاہتا تھا کہ وہ میری طرف سے بور نہ ہو، اس لئے میں نے اس سے کہا۔ "ہاں..... ہاں..... ضرور سناؤ۔ ایسی کہانیاں سننے کا تو میں شوقین ہوں۔"

"اچھا۔" اس نے پرخیال انداز میں کہا۔ "یہ ایک ایسی بدروح کی کہانی ہے جو نوجوان مردوں کا قتل کر کے بے حد خوش ہوتی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک نوجوان مرد نے اس کے ساتھ دھوکا کیا تھا، اس سے پیار کا ناٹک کیا تھا اور پھر اس کا سب مال اور دولت لے کر فرار ہو گیا تھا۔ اس نے جاتے ہوئے اس لڑکی کو زہر دے دیا تھا، جس کی وہ بدروح تھی۔"

"اوہ..... یہ تو بڑی افسوس ناک بات تھی کہ اس مرد نے اس سے بے وفائی کی۔" میں نے کہا۔

"اور اس کی بے وفائی کی وجہ سے بدروح مردوں سے انتقام لینے لگی۔" اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"لیکن..... یہاں یہ بھی قابل افسوس بات ہے کہ وہ بدروح تمام ہی مردوں سے انتقام لینے لگی جبکہ قصور تو صرف ایک مرد کا تھا۔" اس نے بات بڑھائی۔

"تمہاری بات درست ہے لیکن اس بدروح کو یہ بات سمجھ نہیں آتی تھی..... وہ ہر سال ایک آدمی کا قتل کرتی رہی ہے اور پھر اس آدمی کی لاش کسی فٹ پاتھ وغیرہ سے ملتی تھی۔" اس نے بتایا۔

"ویسے..... یہ کس جگہ کا قصہ ہے؟" میں نے پوچھا۔

"یہیں..... ہمارے شہر لندن کا۔" اس نے جواب دیا۔

"لندن کا!" میں نے حیرت سے کہا۔ میں خود بھی یہاں کا رہائشی تھا اور اخبارات وغیرہ پر بھی گہری نظر رکھتا تھا، اس لئے مجھے معلوم تھا کہ ایسی کوئی خبر اخبارات میں نہیں چھپی، کم سے کم گزشتہ پندرہ بیس سال سے تو نہیں چھپی تھی۔ اس سے قبل میں ذرا باقاعدگی سے اخبارات وغیرہ کا مطالعہ کرتا تھا۔

"ہاں..... یہ واقعہ لندن کا ہے۔" اس نے میری بات کا جواب دیا۔

"یہ کب کی بات ہے؟" میں نے پوچھا۔

"گزشتہ پانچ سال پہلے اس کا قتل ہو گیا۔" اس نے پر خیال انداز میں جواب دیا۔

"اخبارات میں اس کے بارے میں کچھ چھپا تھا؟" میں نے اس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نہیں۔" اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ "اخبارات تک تو قتل پہنچ ہی نہیں سکے۔ اخبارات نے ان مردوں کی ضرور شائع نہ کی تھیں اور ان کا قتل نامعلوم قاتل کھاتے میں ڈال دیا تھا۔"

"ہاں..... مجھے یاد آیا۔" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ "نے گزشتہ سالوں میں ایسی خبریں ضرور پڑھی تھیں۔"

"دراصل..... جس تاریخ کو وہ لڑکی قتل ہوئی تھی، اس تاریخ کی رات کے وقت وہ کسی نہ کسی مرد کا قتل کرتی ہے یادہ ہر سال کرتی ہے۔" اس نے بتایا۔

"یہ تم نے مجھے دلچسپ بات بتائی لیکن یہ حقائق تم تک پہنچے۔ کیا تم بھی عملیات وغیرہ میں دلچسپی رکھتی ہو؟" نے پوچھا۔

"ہاں..... میں عملیات جانتی ہوں۔" وہ بولی۔

"او..... ویری گڈ..... یہ تم نے مجھے بڑی دلچسپ بات ئی..... مجھے کسی اچھے عامل سے ملنے کی ہمیشہ خواہش ہے اور آج یہ خواہش پوری ہو گئی ہے۔" میں نے ش انداز میں کہا۔ "ویسے تم کس حد تک عملیات جانتی تم نے کس سے سیکھے ہیں یہ عملیات۔"

"میں نے ایک استاد سے سیکھے ہیں..... اور میں اس سے بہت کچھ جانتی ہوں۔" وہ بولی۔

"اس کا مطلب ہے کہ تم یہ بھی بتا سکتی ہو گی کہ کوئی چیز ہاں موجود ہے؟" میں نے مطلب کی بات کی طرف تے ہوئے کہا۔

"ہاں بالکل..... میں بتا سکتی ہوں۔" وہ بولی۔

"او..... ویری گڈ..... ویسے کیا تم اس سلسلے کے سے میری مدد کر سکتی ہو؟" میں نے کہا۔

اس نے گہری نظروں سے میری طرف دیکھا اور مسکرا ر بولی۔ "ٹھیک ہے..... میں تمہیں اس کے بارے میں ؤں گی کہ وہ کہاں ہے۔"

"کیا واقعی؟" میں نے فوراً کہا۔

"ہاں بالکل۔"

"میں تمہارا شکر گزار رہوں گا۔"

"لیکن اس سلسلے میں، میں جو عمل کروں گی اس کا وقت رات بارہ بجے ہے..... تمہیں انتظار کرنا ہو گا..... کوئی کام تو نہیں ہے تمہیں۔"

"نہیں..... نہیں..... میں فارغ ہوں اور پھر میرا آگے پیچھے کوئی بھی نہیں ہے..... میں نے جو کمرہ کرائے پر لیا ہوا ہے اس کو میں نے آفس بنایا ہوا ہے اور میری رہائش بھی وہیں ہے۔" میں نے بتایا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر اس نے عملیات کے ذریعے نیکلس کا نہ بھی بتایا تو بھی میں اس سے باتوں ہی باتوں میں کسی نہ کسی طرح اگلوا لوں گا کہ اس نے نیکلس چرایا ہے یا نہیں۔

کھانے سے فارغ ہو کر ہم ایک بار پھر سٹنگ روم میں آ کر بیٹھ گئے وہ کافی بنا کر لے آئی تھی۔ ہم کافی پینے کے ساتھ ساتھ بات چیت بھی کرتے جا رہے تھے۔ میں عملیات سیکھنے کے حوالے سے اس کی تعریفیں کئے جا رہا تھا اور پھر میں نے پوچھا۔ "تم نے کتنے عرصے میں عملیات سیکھے۔"

"مجھے یہ سیکھے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا ہے..... یہی کوئی تین چار سال ہوئے ہوں گے۔" اس نے بتایا۔

"کس استاد سے سیکھے؟" میں نے سوال کیا۔

"مسٹر رچرڈ سے..... وہ امریکہ میں ہوتا ہے..... یہاں اکثر آتا رہتا ہے۔"

"کیا میں بھی یہ سب کچھ سیکھ سکتا ہوں؟"

"ہاں بالکل۔"

"کیا تمہارے پاس اتنا وقت ہو گا کہ تم مجھے سکھا سکو یا مجھے بھی مسٹر رچرڈ کی شاگردی کرنی پڑے گی؟"

"میں سکھا دوں گی۔"

"اوہ..... یہ تو میرے لئے بڑی خوشی کی بات ہو گی۔" اس سلسلے میں کیا مجھے کچھ اخراجات بھی کرنے ہوں گے اور کیا تمہاری کوئی فیس بھی ادا کرنی پڑے گی؟"

وہ دھیرے سے ہنس کر بولی۔ "میں کوئی پرائیویٹ

جاسوس نہیں ہوں کہ تم سے فیس لوں گی۔"
میں بھی اس کی بات پر ہنس دیا اور بولا۔ "تو پھر کب تم سکھاؤ گی مجھے؟"
"میں تمہیں آج ہی سے سکھانا شروع کر دوں گی۔" اس نے جواب دیا۔
"اوہ..... ویری گڈ....." میں نے خوشی کا اظہار کیا۔
"رات میں بارہ بجے سے پہلے تمہیں اس ٹیکلس کے بارے میں بتاؤں گی اور اس کے بعد تمہیں عملیات کا ایک سبق بھی دے دوں گی۔"
"یہ تو بہت اچھا رہے گا..... کیا مجھے روزانہ تمہارے پاس آنا پڑے گا۔"
"نہیں..... بس ہفتے میں ایک بار۔"
"بہت خوب..... پھر تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے' ہفتے میں ایک روز تو میں آسانی سے آ سکتا ہوں۔" اچھا یہ بتاؤ کہ تم نے خود ہی جولیٹ کو کیوں نہیں بتا دیا کہ اس کا ٹیکلس کہاں ہے..... حالاں کہ اس نے تم پر الزام بھی لگایا' یعنی تمہارے بقول؟" میں نے کہا۔
"وہ ایسی باتوں کو نہیں مانتی ہے۔" وہ بولی۔
"لیکن..... جب اس کا ٹیکلس مل جاتا تو مان جاتی۔" میں نے کہا۔
"میرے لئے اور مصیبت ہو جاتی..... وہ یہی سمجھتی کہ میں نے عملیات کا بہانہ کر کے اس کا ٹیکلس واپس کر دیا ہے۔" اس کی بات میں وزن تھا۔
ذرا دیر ہم دونوں خاموش رہے' پھر اس نے مجھ سے کہا۔ "تم اگر چاہو تو میں ایک عمل کے ذریعے اس بدروح سے بھی تمہاری ملاقات کروا سکتی ہوں جو مردوں کو قتل کرتی ہے؟"
"میں اس سے مل کر کیا کروں گا؟" میں نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ درحقیقت میں اس طرح کے معاملات میں نہیں پڑنا چاہتا تھا اور مجھے ایسی باتوں سے کچھ خوف بھی آتا تھا۔
"تم ڈرتے ہو ایسی باتوں سے؟" اس نے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ میری طرف دیکھا۔
"نہیں' نہیں..... ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔" میں نے ہلکی سی ہنسی کے ساتھ کہا۔ "دراصل میں اس طرح کے معاملات میں پڑنا نہیں چاہتا۔"
"چلو..... جیسے تمہاری مرضی۔" وہ بولی۔ اس کے انداز میں ابھی طنز تھا۔
ہم پھر عام امور پر بات چیت کرنے لگے۔ میں بار بار دیوار گیر گھڑی کی طرف دیکھتا جا رہا تھا اور جب رات کے بارہ بجے میں پانچ منٹ رہ گئے تو میں نے اس سے کہا۔ "بارہ بجنے والے ہیں..... تم بارہ بجے اپنا عمل شروع کرو گی ناں؟"
"ہاں بالکل..... تم فکر نہ کرو..... مجھے وقت کا بڑا احساس ہے۔" وہ بولی
کچھ دیر بعد اس نے کہا۔ "آؤ..... اب میرے ساتھ دوسرے کمرے میں آ جاؤ' میں وہاں عمل کروں گی۔"
ہم دونوں اٹھ کھڑے ہوئے اور پھر وہ مجھے ایک کمرے میں لے آئی۔ یہاں ایک کونے میں صرف ایک کالا بیگ رکھا ہوا تھا۔ کیتھرین نے مجھے کمرے کے تقریباً وسط میں بیٹھنے کیلئے کہا۔
میں بیٹھ گیا اور وہ اس بیگ کے پاس چلی گئی۔ پھر اس نے بیگ میں سے ایک چھوٹی سی انسانی کھوپڑی اور ایک آئینہ نکال لیا' وہ میرے پاس آ کر میرے مدمقابل بیٹھ گئی۔ اس نے آئینہ میرے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ "اس میں دیکھ سکو گے کہ وہ ٹیکلس کہاں ہے۔"
"اچھا....." میں نے کہا۔
اس نے وہ کھوپڑی اپنے سامنے قالین پر رکھ لی' پھر میری طرف دیکھ کر بولی۔ "میں ایک عمل پڑھوں گی' تمہیں اس آئینے میں منظر آنے لگے گا اور اس میں تمہیں ٹیکلس بھی نظر آ جائے گا۔"
"ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"بس اب تم مسلسل آئینے میں دیکھتے رہو۔" اس نے ہدایت کی۔
میں آئینے کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ بڑبڑانے لگی۔ کچھ دیر بعد آئینے میں رات کا منظر آنے لگا۔ کوئی شخص تھا جو کار میں بیٹھا تھا۔ اس کی کار چل رہی تھی' پھر ایک جگہ اس نے کار روک لی' مجھے وہ جگہ دیکھی بھالی معلوم ہوتی تھی اور مجھے یاد آ گیا کہ وہ تو اسی بلڈنگ کا پارکنگ لاٹ ہے' جس میں اس وقت میں بیٹھا ہوا تھا۔
وہ شخص کار سے اترا تو اس پر روشنی پڑی اور مجھے حیرت کا جھٹکا لگا کیونکہ وہ شخص وہی تھا جس کے قتل کی میں نے اخبارات میں خبر پڑھ چکا تھا اور مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ اس کے بارے میں اخبارات نے یہی لکھا تھا کہ اسے کسی نامعلوم قاتل نے قتل کیا ہے جو مفرور ہے اور پولیس اس سرگرمی سے تلاش کر رہی ہے اور بعد کے کسی اخبار میں' میں نے اس کے قاتل کی گرفتاری کے بارے میں کوئی خبر نہیں پڑھی تھی۔
وہ آدمی بڑے مطمئن انداز میں چلتا ہوا عمارت کے اندر آ گیا اور پھر وہ لفٹ کے ذریعے تیسرے فلور پر آ گیا اور کیتھرین کے فلیٹ پر آ کر رک گیا۔
اس نے کال بیل بجائی اور کچھ ہی دیر بعد کیتھرین نے دروازہ کھول دیا۔
"کیسی ہو پیاری تم؟" اس آدمی نے بڑے پیار بھرے لہجے میں کیتھرین سے پوچھا۔
"تمہارے آنے سے قبل اداس تھی اور اب بہت خوش ہو گئی ہوں۔" کیتھرین نے جواب دیا۔
وہ آدمی اپارٹمنٹ میں آ گیا۔ کیتھرین نے دروازہ بند کر دیا۔ وہ دونوں سٹنگ روم میں آ کر بیٹھ گئے' دونوں ایک دوسرے کے ساتھ چپک کر بیٹھے تھے۔ اس آدمی نے کیتھرین کا بازو پکڑ کر اپنے قریب کر لیا اور اس سے بولا۔ "تم سے ملنے کیلئے میں بڑا بے چین تھا۔" اس نے اپنے لب کیتھرین کے لبوں پر رکھ دیئے۔ کیتھرین نے بھی گرم جوشی کا مظاہرہ کیا۔ دونوں ایک دوسرے کو بھینچنے لگے' اس آدمی نے کیتھرین کے نائٹ ٹاؤن کا بیلٹ کھول دیا۔ ٹاؤن کیتھرین کے جسم سے پھسلتا چلا گیا اور اس کا پرکشش بدن نظر آنے لگا۔ وہ آدمی مزید پیش قدمی کرنے لگا تو کیتھرین نے اسے اپنے سے الگ کر دیا اور بولی۔ "یہ جگہ مناسب نہیں ہے..... چلو کمرے میں چلتے ہیں۔"
"ہاں چلو....." وہ آدمی بولا۔
وہ دونوں اٹھ کھڑے ہوئے اور پھر اس کمرے میں آ گئے جہاں اس وقت کیتھرین اور میں بیٹھے ہوئے تھے۔
وہ دونوں قالین پر لیٹ گئے' اس آدمی نے بڑی بے تابی کے ساتھ کیتھرین کا گاؤن اتار دیا۔ اب کیتھرین کے جسم پر صرف انڈر گارمنٹس ہی تھے۔ وہ آدمی کیتھرین سے لپٹ گیا اور کیتھرین بھی جوش میں آ گئی اور پھر اس نے ایک دم اس آدمی کے بال پکڑ لئے اور اس کا سر ایک جھٹکے سے اپنے آپ سے دور کر دیا۔ اس آدمی کے چہرے پر الجھن تھی اور پھر وہ خوف زدہ ہو گیا کیونکہ اس کی نگاہ کیتھرین کے اطراف کے دانتوں پر پڑی جو دوسرے دانتوں کی نسبت کافی لمبے ہو گئے تھے۔ اس کی آنکھیں زیرو واٹ کی بلب کی طرح سرخ ہو گئیں اور اس کے منہ سے بھی سرخ زبان نکل آئی۔
وہ آدمی خوف زدہ ہو کر پیچھے ہٹا لیکن اس کے پیر کیتھرین کی گرفت ہی میں تھے۔ کیتھرین نے ایک جھٹکے سے اسے اپنے قریب کیا اور اس کی گردن پر اپنے دانت رکھ دیئے جو ذرا ہی دیر اس آدمی کی گردن کے اندر پیوست ہو گئے اور وہاں سے خون بہنے لگا۔
میں نے خوف زدہ ہو کر کیتھرین کی طرف دیکھا۔ وہ بھی میری طرف دیکھ رہی تھی' اس کے لبوں پر پراسرار مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔
"یہ..... یہ سب کیا ہے کیتھرین؟" میں نے تھوک نگل کر اس سے پوچھا۔
"کیا..... اب بھی نہیں سمجھے؟" وہ بولی۔

"یعنی..... تم ہی وہ بدروح ہو!" میں نے کہا۔

"ہاں بے شک۔"

"لیکن..... وہ..... جولیٹ....."

"اسے بھول جاؤ..... بس اس وقت یہ یاد رکھو کہ تم اس سال کا میرا شکار ہو۔"

"نہیں....." میں آئینہ پھینک کر اس سے دور ہو گیا۔

وہ دھیرے سے ہنسی اور بولی۔ "یہاں سے بچ کر آج تک کوئی نہیں جا سکا ہے..... تم بھی نہیں جا سکتے۔"

"لل..... لیکن..... میرا قصور کیا ہے؟" میں ہکلایا۔

"تم ایک مرد ہو..... یہی تمہارا قصور ہے۔" اس نے خوں خوار انداز میں کہا۔

"لیکن میں نے تو تمہارا کچھ نہیں بگاڑا۔"

"میں نے بھی اس مرد کا کچھ نہیں بگاڑا تھا جو مجھے قتل کر کے چلا گیا تھا۔" اس کا لہجہ نفرت آمیز تھا۔

"وہ مرد میں تو نہیں تھا..... ہر مرد ایک جیسا تو نہیں ہوتا ہے۔"

"میرے لئے ہر مرد ایک ہی جیسا ہے۔" وہ میری طرف مڑنے لگی۔ میں ہاتھوں پر زور دے کر بیٹھے بیٹھے پیچھے ہٹنے لگا۔ یہاں تک کہ میں دیوار سے جا لگا۔ مجھے اپنی موت صاف نظر آ رہی تھی۔

میں نے سرعت سے دائیں جانب دیکھا۔ وہاں کافی دور دروازہ تھا' میں نے اس جانب چھلانگ لگا دی' پھر میں نے اٹھ کر دروازے کا ہینڈل پکڑ کر اسے گھمانا چاہا لیکن وہ نہ گھوما' حیرت کی بات تھی کہ اسے لاک نہیں کیا گیا تھا لیکن اب وہ لاک تھا۔ میں نے اسے ایک بھرپور جھٹکا دیا لیکن کوئی مثبت نتیجہ سامنے نہ آ سکا۔

اس وقت کیتھرین میرے قریب پہنچ گئی۔ اس نے غرا کر مجھے دبوچنا چاہا لیکن میں نے وہاں سے لمبی چھلانگ لگا دی اور کھڑکی کی طرف بھاگا لیکن کھڑکی تک پہنچنے سے قبل ہی مجھے کیتھرین نے چھلانگ لگا کر دبوچ لیا۔

میں بے اختیار چیخنے اور خود کو اس کی گرفت سے آزاد کرانے کی جدوجہد کرنے لگا۔

"اس نے مجھے گھورتے ہوئے ایک قہقہہ لگایا اور پھر اس کی آنکھیں زیرو واٹ کے بلب کی طرح سرخ ہو گئیں' اس کے اطراف کے دانت بڑے ہو گئے اور اس کے منہ سے بھی سرخ زبان باہر آ گئی۔

بس اب میری موت مجھ سے ذرا ہی دور رہ گئی تھی۔

اچانک کمرے کا دروازہ ایک زوردار دھماکے کے ساتھ کھلا اور کیتھرین نے فوراً مجھے چھوڑ دیا۔ میں اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور گر پڑا۔ اس دوران میں دیکھ چکا تھا کہ دروازے سے کمرے میں ایک پادری داخل ہوا تھا۔ ان کے ہاتھ میں تقریباً ایک فٹ لمبی صلیب تھی۔

"تم یہاں کیا کرنے آئے ہو؟" کیتھرین نے کسی درندے کی طرح غراتے ہوئے ان سے کہا۔

"تمہیں تمہاری کوشش میں ناکام بنانے۔" پادری نے نفرت آمیز اور سخت لہجے میں جواب دیا۔

"تم ایسا نہیں کر سکو گے۔" وہ بولی۔

"فادر!..... مجھے اس خونی کے ہاتھوں سے بچا لیں۔" میں نے فادر سے التجا کی۔

"میرے بچے!..... تم فکر نہ کرو..... یہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گی۔" فادر نے مجھے تسلی دی۔

"تم میرے راستے سے ہٹ جاؤ۔" کیتھرین ان کی طرف دیکھ کر غرائی۔

"تم اب کسی اور کا خون نہیں کر سکو گی۔" فادر نے اس کی جانب بڑھتے ہوئے کہا۔ وہ بھی فادر کی جانب بڑھنے لگی اور وہ دونوں ایک دوسرے سے تقریباً دو قدم کے فاصلے پر پہنچ کر رک گئے۔

"میں اب بھی کہتی ہوں کہ میرے راستے سے ہٹ جاؤ۔" کیتھرین نے ان سے کہا۔

"نہیں..... بس اب بہت ہو چکا..... تم نے بہت سے بے گناہ لوگوں کو مار دیا ہے..... اب ایسا نہیں ہو گا۔ آخر کیوں کرتی ہو یہ ظلم؟" فادر بولا۔

"اس لئے کہ..... یہ سب مرد ہیں۔" اس نے کہا۔

"لیکن..... یہ تمہارے قصوروار نہیں ہیں' جو تمہارا قصور تھا' اسے تو تم مار ہی چکی ہو اور پھر ہر مرد ایک سا تو نہیں ہوتا ہے۔" فادر نے اسے سمجھایا۔

"ہر مرد ایک سا ہوتا ہے۔" وہ بولی۔

"نہیں..... ہر مرد ایک سا نہیں ہوتا' میں تمہارے سامنے ہوں' میں نے کبھی کسی کو دھوکا نہیں دیا۔ یہ..... یہ نہیں....." انہوں نے میری طرف اشارہ کیا۔ اس نے بھی کبھی کسی کو دھوکا نہیں دیا۔ پھر سارے مرد ایک جیسے کیسے ہو گئے..... تم نے اپنے مجرم سے اپنا انتقام لے لیا ہے' اس لئے بہتر ہے کہ تم اب یہاں سے چلی جاؤ ورنہ میں تمہیں جلا کر راکھ کر ڈالوں گا۔"

"نہیں..... تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے..... میں..... میں تمہیں بھی ختم کر دوں گی۔" وہ چیخی۔

"جاؤ..... آرام سے یہاں سے چلی جاؤ۔ مجھے مجبور نہ کرو کہ میں تمہیں جلا ڈالوں۔" فادر نے نرم لہجے میں اس سے کہا۔

"میں نہیں جاؤں گی۔" وہ پھر چیخی۔

"اچھا تو پھر ٹھیک ہے....." فادر نے ہاتھ میں پکڑی صلیب اس کی طرف کی' ساتھ ہی زیر لب کچھ پڑھنے لگے۔ انہوں نے اس کی جانب قدم بڑھایا تو اس نے ان پر حملہ کر دیا لیکن وہ ان سے ذرا دور ہی رہی' انہیں چھو نہ سکی' حالاں کہ وہ انہیں گرفت میں لینے کی بھرپور کوشش کر رہی تھی اور ساتھ ہی خود کو صلیب سے بچائے ہوئے بھی تھی۔

فادر نے صلیب والا ہاتھ اس کے قریب کر دیا۔ وہ ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹ گئی۔

فادر صلیب اس کی طرف کرنے لگے اور وہ پیچھے ہٹتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ وہ دونوں کمرے سے باہر چلے گئے۔

میں اپنی طرف متوجہ ہوا تو پتہ چلا کہ میں کسی خزاں رسیدہ پتے کی طرح کانپ رہا ہوں۔ موت کو اتنے قریب سے دیکھ کر اس طرح کانپنا ایک فطری عمل تھا۔

فادر نے آ کر معاملہ سنبھال لیا تھا۔ اس کے باوجود مجھ میں اٹھ کر کھڑے ہو جانے کی ہمت نہیں تھی۔ اعصاب بری طرح شل ہو چکے تھے۔

کچھ دیر بعد فادر واپس آ گئے۔ انہوں نے میرے قریب آ کر میرے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے ملائم لہجے میں کہا۔ "بس اب فکر نہ کرو میرے بچے..... آؤ اٹھ جاؤ۔" انہوں نے مجھے سہارا دینے کیلئے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھایا' میں ان کا ہاتھ پکڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

چکنی مٹی کا قدرتی ماسک

چکنی مٹی کا ماسک جلد پر Detoxifying اثرات مرتب کرتا ہے اور بھاپ لینے کے بعد بہت اچھے نتائج فراہم کرتا ہے۔ یہ جلد کو اس کے لیے درکار معدنیات (Minrals) پہنچاتا ہے اور ساتھ ہی جلد پہ ان کے توازن کو برقرار رکھتا ہے' جلد کی ساخت کی مرمت کرتا ہے۔ اس کے استعمال کے بعد جلد بہت زیادہ چمک دار اور روشن ہو جاتی ہے اور چہرہ دمکنے لگتا ہے یہ کوئی ایسا مہنگا نسخہ بھی نہیں ہے۔ چکنی مٹی کو نیم گرم پانی میں حل کر کے پیسٹ بنا لیں ساتھ تھوڑی مقدار میں دہی یا پھر جو کا آٹا مکس کر کے چند منٹ کے لیے ایک طرف رکھ دیں۔ اگر جلد چکنی ہے تو پیسٹ بناتے وقت عرق گلاب مکس کر لیں اور خشک ہے تو انڈے کی زردی شامل کر لیں۔ اس کے بعد اس ماسک کو چہرے پر 10 منٹ کے لیے لگا کر رکھیں۔ اگر آپ کی جلد خشک ہے تو اس ماسک کو 15-20 منٹ کے لیے جلد پر لگا کر رکھیں اس کے بعد نیم گرم پانی سے اسے دھو کر صاف کر لیں بعد میں ٹھنڈے پانی کے چھینٹے چہرے پر مار لیں۔ چوں کہ چکنی مٹی کے ماسک میں معدنیات (Minerals) کی کثیر مقدار موجود ہوتی ہے اسی لیے چکنی مٹی میں موجود یہ قدرتی حسن افزاء اجزاء جلد میں جذب ہو کر خون کی گردش میں اضافہ کر کے اس میں نئی جان ڈال دیتے ہیں۔ اس کے استعمال سے چہرے پر نئی تازگی اور چمک آ جاتی ہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

”یہ...... یہ سب کیا تھا فادر؟“ میں نے فادر کی طرف دیکھ کر کہا۔ خوف کی وجہ سے میری آواز میں اب بھی ارتعاش تھا۔

”وہ ایک بد روح تھی۔“ انہوں نے اطمینان سے جواب دیا۔ ”ہر سال یہاں ایک آدمی کا خون کر رہی ہے۔ میں نے اپنی روحانی قوتوں سے پتہ لگایا تھا کہ اس اپارٹمنٹ میں کیا کھیل کھیلا جاتا ہے اور میں نے تہیہ کرلیا تھا کہ میں اب کبھی یہاں کسی کو قتل نہیں ہونے دوں گا اور اس طرح میں نے تمہیں بچالیا۔“

”لیکن...... فادر...... آپ بہت دیر سے آئے...... کیا یہ ممکن نہیں تھا کہ پہلے ہی آجاتے؟“ میں نے سوال کیا۔

ان کے لبوں پر ہلکا سا تبسم آگیا وہ بولے۔ ”اس میں بھی کافی طاقت ہے...... اس نے مجھے اپنی طاقت سے روکا ہوا تھا اور بالآخر میں یہاں آنے میں کامیاب ہوگیا۔ میں نے اسے قابو کرنے کی پوری پوری کوشش کی لیکن وہ بچ کر نکل گئی ہے۔ فکر نہ کرو، میں جلد ہی اسے قابو کرلوں گا...... چلو آؤ چلتے ہیں۔“

ہم دونوں چل پڑے۔

”فادر!...... کیا آپ واقعی اسے جلا کر بھسم کر سکتے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں...... لیکن یہ اتنا آسان نہیں ہے، اس طرح میری جان کو زیادہ خطرہ ہے، ہاں کم خطرناک بات یہ ہوگی کہ میں اسے قابو کرلوں اور ایک دو ماہ کی مزید محنت و ریاضت کے بعد میں اسے قابو کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔“ انہوں نے جواب دیا۔

ہم دونوں اپارٹمنٹ سے باہر آگئے اور پھر جلد ہی لفٹ کے ذریعے گراؤنڈ فلور پر اور اس کے بعد عمارت سے باہر آگئے۔ ”اچھا...... اب تم بے فکر ہو جاؤ میرے بچے، گھبرانے کی بالکل ضرورت نہیں ہے...... اب وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی، میں نے ایک خاص عمل کر دیا ہے، وہ آج کی رات زمین پر نہیں آسکتی، فضا میں معلق رہے گی اور آج کی رات گزر جانے کے بعد وہ اگلے سال کی [illegible] تاریخ کو کسی کے لئے خطرہ بن سکتی ہے اور اس سے قبل [illegible] میں اسے اپنے قابو میں کرلوں گا۔“

”اور فادر...... وہ جولیٹ کا کیا قصہ ہے؟“ میں [illegible] پوچھا۔

”اس کے دماغ پر قابو پا کر کیتھرین کی روح نے [illegible] تمہارے پاس بھیجا تھا، اب تو وہ تمہیں پہچانے گی [illegible] نہیں......“ وہ بولے۔

”میں فادر کو سلام کرنے اور الوداعی کلمات کہنے [illegible] بعد اپنی کار میں روانہ ہوگیا، میرے دل میں جولیٹ [illegible] ملنے کا تجسس تھا، اس لئے میں اس کے فلیٹ پر پہنچ گیا۔ میں نے کال بیل بجائی، ذرا دیر بعد اس نے دروازہ کھو[لا] اور اجنبی انداز میں مجھ سے بولی۔ ”کس سے ملنا [ہے] تمہیں؟“

”تمہارا نام سوزی ہے؟“ میں بھی انجان بن گیا۔

”نہیں سوری!...... میرا نام جولیٹ ہے۔“ وہ بولی۔

”آئی ایم سوری!...... مجھے مس سوزی سے ملنا تھا، میں ایک پرائیویٹ جاسوس ہوں، اسے مجھ سے کو[ئی] کام تھا۔ یقیناً میں غلط ایڈریس پر آگیا ہوں۔ آئی ا[یم] سوری۔“ میں نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔

”کوئی بات نہیں۔“ وہ مسکرا کر بولی۔

”میں پلٹ کر چل پڑا۔ مجھے اپنے عقب سے درو[ازہ] بند ہونے کی آواز آئی۔

کچھ دیر بعد میں اپنے آفس پہنچ گیا۔ وہیں ایک جا[نب] موجود اپنے بیڈ پر ڈھیر ہوگیا۔ مجھ پر اب بھی کیتھرین [کا] خوف سوار تھا۔

اچانک مجھے جولیٹ کے دیئے ہوئے دو سو ڈالر کا خیال آیا، میں نے فوراً اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور وہ ڈالر نکال لئے۔ جہاں میں کیتھرین کی وجہ سے خوف زدہ تھا وہیں یہ دو سو ڈالر کافی حد تک مجھے مطمئن کر رہے تھے۔

☆☆☆

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

خدا گواہ

قراۃ العین سید

وہ اپنے اندورنی جذبات کو کیسے بیاں کرتا۔ پوچھنے والے تو ظاہری کو دیکھتے ہیں۔ ان کو کیا معلوم کہ انسان کے اندر کیا دھکڑ پکڑ چل رہی ہوتی ہے۔ بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو کسی کے اندر جھانک کر اس کی ضرورت کو پورا کردیتے ہیں اور پھر اگر انسان کی جائز خواہش پوری نہیں ہوتی تو وہ شرافت کے لبادے میں ہوتے ہوئے بھی ”شر“ اور ”آفت“ کا روپ دھار لیتا ہے۔ ایک پر تاثر کہانی۔

انسان کے اندرونی جذبات سے بڑی بڑی قیامت سرزد ہو جاتی ہے۔ وہ خاموش تھا لیکن تھا خدا گواہ!

”سب جگ سوئے ہم جاگیں
تاروں سے کریں باتیں
ہو...... چاندنی راتیں
ہو...... چاندنی راتیں“

”عروسہ اپنی بھونڈی آواز بند کرو، مجھے تم گانا گاتی ہوئی زہر لگ رہی ہو۔“ ریحان نے زہریلی نظروں سے عروسہ کو گھورتے ہوئے کہا۔

”بھونڈی ہوگی آواز تمہاری، میں تو خود ملکہ ترنم سے کم نہیں ہوں۔“

”ہاں! ملکہ ترنم تمہیں ہی تو اپنا جانشین بنا کر گئی تھیں۔ افسوس انہیں تم زندگی میں نہیں ملیں ورنہ تو تمہاری تاج پوشی ضرور کر دیتی۔“

عروسہ اور ریحان کی روایتی نوک جھوک جاری تھی۔ بڑے بابا جان جیسے ہی کمرے میں داخل ہوئے ریحان فوراً ہی کمرے سے نکل گیا اور عروسہ آنچل سر پر ڈالتے ہوئے ”آداب!“ بڑے بابا جان کہتے ہوئے جان

بچا کر بھاگ نکلی۔ دروازے سے جاتے ہوئے صرف ''جیتی'' رہو کی آواز اس کے کان میں پڑی اور وہ یہ جا وہ جا.....

بڑے بابا جان اس نئی جنریشن کے لیے خوف' رعب اور دبدبے جیسے جذبات کا سمبل تھے ان سے بات کرنا تو درکنار سامنے آنے سے بھی کتراتے تھے اور بڑے بابا جان..... کیا وہ خود سب لوگوں کے ایسے رویے سے خوش تھے ہرگز نہیں..... ان کے اندر بھی کچھ تو ٹوٹ پھوٹ ہوتی رہتی ہوگی۔ اکیلا پن ستاتا ہوگا بچوں کے قہقہے' چھیڑ چھاڑ' گھریلو دلچسپیاں اور مختلف موضوع پر تبادلہ خیال کیا وہ سب چیزوں سے مبرا ہو گئے تھے یا پھر انہوں نے ذمہ داریاں نبھانا چھوڑ دی تھیں۔ سفید کرتا پاجامہ' ہلکی ہلکی داڑھی' خاموش مگر پرسکون آنکھیں اور چہرے پر موجود شگفتگی نے ان کی مجبوری شخصیت میں ایک دل فریب نکھار پیدا کر دیا تھا۔ حد سے زیادہ سنجیدگی نے انہیں وقت سے پہلے بڑھاپے کی دہلیز پر قدم رکھنے پر مجبور کر دیا تھا۔ بچے تو بچے خاندان کی بیاہی عورتیں اور مردان کے سامنے خاموش ہو جاتے تھے بس ایک دکھ..... لامتناہی احساس محرومی کے ساتھ ان کے ساتھ لگ گیا تھا اور وہ سب کے لیے قابل احترام لیکن اپنی نظروں میں' اپنے رب کے سامنے بہت شرمندہ رہتے تھے۔ اسی احساس نے ان کی تمام خوشیاں چھین لی تھیں' ان دیکھے خواب مسمار کر دیے تھے اور ایک یاس اور حسرت کی امر بیل ان کے دل کو دیمک کی طرح چاٹ رہی تھی۔

بڑے بابا بستر پر آنکھیں موندے لیٹے تھے نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی لیکن..... ایک نقرئی قہقہے نے انہیں عمر کے بیس سال پیچھے دھکیل دیا۔ عروسہ کی ہنسی ہو بہو اپنی چھوٹی خالہ جیسی تھی اس بچی کو دیکھ کر دل کی شکستہ حالی پر قابو نہیں رہتا تھا بس ایک ہی دعا کرتے تھے کہ خدا اس بچی کو اپنی امان میں رکھے۔ اس پر کبھی کسی کی بری نظر نہیں پڑے اور وہ خوش و خرم زندگی گزارے۔

''بیس سال پہلے' ہاں ٹھیک بیس سال پہلے' مجھے سب کچھ یاد ہے۔ کیا ہوا تھا؟ یہ بھی کوئی بھولنے والی بات ہے۔'' سوچوں کی گہرائیوں سے وہ بول رہے تھے۔ اپنے آپ سے مخاطب تھے۔

''صائمہ اپنی بڑی بہن کے گھر پبلک سروس کمیشن کے امتحان کی تیاری کے لیے نوابشاہ آئی تھی جنید بھائی جو کہ رشتے میں صائمہ کے بہنوئی تھے انہوں نے اپنے ایک دوست فیصل کو خاص طور پر صائمہ کی مدد کے لیے بلوالیا تھا اور فیصل' صائمہ کو روز پرچوں کی تیاری کروانے آتا تھا میں یعنی جمشید جو کہ عمر میں تو جنید سے بڑا تھا لیکن والد کے انتقال کے بعد کچھ گھریلو ذمہ داریوں میں ایسا گھرا کہ چھوٹوں کے فرائض ادا کرنے کے لیے باپ کا کردار ادا کرتا رہا اور خود کو بھول گیا درویش اور ایک بھائی کی شادی کے بعد اماں بھی اللہ تعالیٰ کو پیاری ہو گئی تھیں اب پورے گھرانے کی ذمہ داری تھی۔ جنید کی بیوی جب سے اس گھر میں آئی تھی ہمارے آنگن میں خوشیاں چہچہا رہی تھیں اس کی خوب صورتی کے آگے چاند شرماتا تھا۔ انتہائی سلیقہ مند اور مہذب قسم کی عورت تھی میں بھی جیٹھ ہونے کی حیثیت سے اس کی بہت عزت کرتا تھا اور وہ بھی میرا بہت خیال کرتی تھی دبے دبے لفظوں میں کئی بار اظہار کر چکی تھی کہ ''بڑے بھیا..... اگر آپ اجازت دیں تو میں خود آپ کے لیے کوئی اچھی سی لڑکی دیکھ لوں۔'' لیکن کیا میں اس بات کے لیے خود اقرار کرتا کہ دیکھ لو ایک انجانی سی شرم میرے اور بھاوج کے بیچ تھی جس کا میں اظہار نہیں کر سکتا تھا۔ خاندان کے بڑے بوڑھوں نے تو یہ تک کہنا شروع کر دیا تھا کہ اب تو جمشید کی عمر نکل گئی ہے وہ شادی کی ذمہ داری سے گھبراتا ہے اس لیے شادی کے لیے حامی نہیں بھرتا۔ خیر عاصمہ بھابی اپنی دانست میں اپنے چالیس سالہ جیٹھ کے لیے لڑکی ڈھونڈتی پھر رہی تھیں۔ لیکن اس گھر میں عاصمہ بھابی کے علاوہ کوئی دوسری عورت نظر آئی تو وہ ان کی بہن صائمہ تھی۔ ہو بہو اپنی بہن جیسی خوب صورت

سلیقہ شعار اور انتہائی مہذب بس اسے ایک ہی شوق تھا۔ بروقت گنگناتے رہنے کا نہ چاہتے ہوئے بھی میری نظریں اس کی سریلی آواز کا تعاقب کرتی رہتی تھیں اور میں اس پختہ عمر میں داخل ہونے کے باوجود اسے چھپ چھپ کر دیکھا کرتا تھا۔ میری اور صائمہ کی عمروں میں فرق کا احساس مجھے مارے ڈالتا تھا اور یہی ڈر تھا کہ کہیں میری آنکھیں محبت کے احساس کو آشکار نہ کر دیں میں صائمہ سے چھپتا اور خاص طور پر جب وہ ڈائنگ روم یا ڈائنگ روم میں ہوتی میں کترا کر وہاں سے نکل جاتا۔ وہ بے چاری بس اسے میرا تکلف ہی سمجھتی لیکن..... میرے دل کا چور ابھی تک دیوار پھاند کر باہر نہیں آیا تھا۔ صائمہ باقاعدگی سے فیصل سے ایگزیم کی تیاری میں مدد لے رہی تھی۔ خود فیصل پبلک سروس کمیشن کے امتحان میں اچھی پوزیشن لے کر ایک کالج میں اسسٹنٹ پروفیسر لگا ہوا تھا صائمہ بھی اسی امیریشن کے تحت اس سے بڑھ کر مطمئن تھی مجھے فیصل کا ہر وقت صائمہ کے پیچھے لگے رہنا' بات بات پر قہقہے لگانا اور مسکرا مسکرا کر اسے دیکھنا بالکل اچھا نہیں لگتا تھا۔ حسد سے میرا سینہ پھٹا جاتا تھا اور جب میں جان بوجھ کر اس کمرے میں جاتا تو صائمہ کی پھنسی پھنسی آواز جو کہ میرے جانے کے بعد نکلتی تھی مجھے زہر لگتی تھی کہ اب میں آ گیا ہوں تو کیسے مسکرائے گی۔ مجھے دیکھ کر جان نکل گئی ویسے خوب قہقہے نکل رہے تھے میں دل ہی دل میں اس بے چاری کو کوستا رہا۔

ایک دن عاصمہ بھابی برابر والے گھر میں گئی ہوئی تھیں۔ میں جان بوجھ کر دفتر سے جلدی گھر پہنچا کہ فیصل کے آنے سے پہلے ہی پڑھنے والے کمرے میں ڈیرہ جما لوں اسی ارادے سے میں اس کمرے میں داخل ہو گیا۔ صائمہ اکیلی گھر میں تھی مجھے دیکھ کر بری طرح بوکھلا گئی اور اپنی کتابیں سمیٹنے لگی۔ میں اسی وقت اس کی یہ حرکت دیکھ کر بہت جلد اور انتہائی شائستہ لہجے میں صائمہ کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

''آپ پلیز یہیں بیٹھی رہیں میں اپنے کمرے میں چلا جاتا ہوں۔''

بہت بہت شکریہ جمشید صاحب میں بچوں کے کمرے میں چلی جاتی ہوں دروازہ بند کر کے پڑھ لوں گی اس وقت گھر میں کوئی نہیں ہے آپ یہی بیٹھیں۔'' وہ اپنی کتابیں سمیٹ کر اپنی بہن کے کمرے میں جانے لگی۔ میں ارادتاً اس کمرے میں آیا تھا لیکن اب مجبوری تھی مجھے ہی کمرے سے جانا پڑا۔ اپنی شرافت کا لبادہ اوڑھے میں کمرے سے باہر نکل گیا اور اپنے کمرے میں جا کر کپڑے تبدیل کرنے لگا کپڑے تبدیل کر کے میں پھر صائمہ کے کمرے کی طرف چل دیا اور اسے باہر ہی سے آواز دی۔

''صائمہ بھابی کب تک آئیں گی؟''

''وہ ساتھ والی کشور آنٹی کو اپنے بیٹے کی شادی کے کپڑے لینا ہے اس لیے دیر سے آئیں گی' کہہ کر گئی ہیں۔'' صائمہ نے جواب دیا اور میں پھر دوبارہ وہاں سے چلا آیا کیا کروں؟ بستر پر انگارے کس نے بچھا دیے ہیں۔'' کسی کروٹ چین نہیں آ رہا تھا۔ ''دیر سے آئیں گی' دیر سے آئیں گی کی بازگشت کانوں میں گونج رہی تھی۔ انسان کو شیطان بننے میں کتنی دیر لگتی ہے صرف ایک لمحہ اور میں اس وقت انسان کے روپ میں نہیں تھا دوڑ کر گیا مین گیٹ کو بند کیا اور پھر برآمدے کے راستے پر پردے گراتا ہوا صائمہ کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ صائمہ میرے لیے انتہائی احترام کا احساس رکھتی تھی فوراً کھڑی ہو گئی۔

آپ یہاں بیٹھ جائیں میں چائے لے کر آتی ہوں بجو تو دیر سے آئیں گی میں نے جاتی ہوئی صائمہ کا ہاتھ پکڑ لیا اور پھر کیا تھا؟

میں اس وقت جس روپ میں اس کے سامنے کھڑا تھا وہ کسی شائستہ مہذب یا باعزت انسان کا روپ نہیں تھا میری شعلہ برساتی نظریں جیسے ہی اس کی نظروں سے ملی وہ کانپ کر رہ گئی۔ بہ ظاہر بہت پڑھی لکھی اور بولڈ قسم کی لڑکی ہی سہی لیکن ایک عورت ہونے کے ناطے انتہائی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کمزور...... اس کی کمزوری...... میری بہادری کے آگے ہاتھ جوڑے کھڑی تھی۔

”جمشید صاحب! اس گھرانے کی عزت کا خیال کیجیے اگر میرے چیخنے کی آوازیں باہر نکلیں تو آپ کے خاندان کی عزت خاک میں مل جائے گی آپ کے بہن بھائیوں کا کیا ہوگا اور میرے ماں باپ کی عزت......“ یہ سب باتیں مجھے اس کی طرف سے غریب لگ رہی تھیں کہ وہ مجھ سے اتنا خوف زدہ ہو کر کیوں بھاگ رہی ہے اس وقت میں اپنی عمر، رتبہ اور حیثیت سب کچھ بھول چکا تھا اس کی گذارشات پر میں نے کان نہیں دھرا اور اپنے من کا کہنا مانتا چلا گیا۔ کمرے میں رکھے گلدان کرچی کرچی ہو گئے صائمہ کی کتابیں اس کی عصمت کی طرح بکھری پڑی تھیں اور میں اس مظلوم کو اپنی حیوانگی کا نشانہ بناتا رہا اور اس بند کمرے میں اس کی آواز اور فریاد سننے والا کون تھا؟ کوئی نہیں میں نیم غشی کی حالت میں اسے کمرے میں لٹا کر واپس اپنے کمرے میں آ گیا آج ایک فتح کا احساس میرے اندر سرایت کر رہا تھا ایک ادھورا پن ختم ہوتا ہوا محسوس ہوا۔ سرشاری کی کیفیت بیان نہیں کر سکتا کیسی تھی۔

میں نے اپنے آفس والے کپڑے تبدیل کیے جوتے پہنے اور واپس آفس کے راستے کی طرف چل دیا کہ اگر کوئی مجھے دیکھ بھی لے تو یہی سمجھے کہ میں ابھی آفس سے آ رہا ہوں الٹی راہ چلتے چلتے میں ایک ہوٹل میں جا کر بیٹھ گیا گھر جو کر کے آیا تھا پھر اسے یاد کر کے مسرور ہو رہا تھا آج کی شام شاید میری زندگی میں دوبارہ نہیں آئے گی لیکن میں نے اپنے دل کا کہنا مان کر صائمہ کی حالت ایسی کر دی تھی کہ اب اگر میں صائمہ سے شادی کا کبھی سے کہتا تو کچھ برا نہ ہوتا اور کمرے سے نکلتے وقت میری دھمکی تو یقیناً صائمہ کو ضرور یاد ہو گی کہ اگر میرا ذکر کسی سے کیا تو تمہاری بہن کا گھر بھی اجڑ جائے گا میرا بھائی یہ الزام کسی صورت بھی برداشت نہیں کرے گا اور اسے بھی گھر سے نکال دے گا۔

آج میں جو قلعہ فتح کر کے آیا تھا اس کی خبر لینے آٹھ بجے کے قریب گھر گیا۔ لیکن گھر میں...... تو چیخ پکار مچی ہوئی تھی عاصمہ بھابی کا رو رو کر برا حال ہو رہا تھا میں تو حیران نظروں سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ بہر حال ان جان بنتے ہوئے ماجرا پوچھا کہ کیا ہو گیا ہے۔ الفاظ ساتھ نہیں دے رہے تھے، زبان لڑکھڑا رہی تھی جنید نے میرے قریب آ کر آہستگی سے کہا۔

”صائمہ نے پنکھے سے لٹک کر خودکشی کر لی ہے خودکشی......“ ایک بم دھماکے سے یہ جملہ میری سماعت سے ٹکرایا۔ لیکن کیوں......؟ یہ الفاظ میری زبان تک نہیں آ سکے یہ خودکشی تھی یا قتل اس راز سے کوئی واقف نہیں ہو سکا کوئی ثبوت ہوتا تو ہاتھ لگتا۔ صرف خدا گواہ تھا۔ گواہی دینے والی خود موت کی آغوش میں سو چکی تھی۔ اپنے بھاری بوجھ کے ساتھ، شکستہ دل کے ساتھ اور اپنی نام نہاد عزت کے ساتھ میں آج بھی زندہ ہوں۔ صائمہ کی مسکراتی آنکھیں، خوب صورت سراپا آج بھی میری نظروں کے سامنے آتا ہے لیکن اس کا سراپا دیکھتے ہی دیکھتے کسی سانپ کا روپ دھار لیتا ہے جو مجھے اکثر تنہائی میں ڈسنے آتا ہے...... کاش! میں نے اسے اپنانے کے لیے سیدھا راستہ اختیار کیا ہوتا۔ کاش! وہ آج میرے ساتھ ہوتی ۔ میرے اس گھناؤنے فعل سے صرف میرا خدا ہی واقف ہے جس کے سامنے میں جتنا بھی روؤں کم ہے۔ اب عروسہ کی شکل میں ایک مسلسل انتقام میری نظروں کے سامنے ہے۔ میری بھتیجی اپنی خالہ کی ہم شکل اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک اور میرا خون ہے۔ میں اس کو دیکھے بنا جی نہیں سکتا۔ اس کے بغیر یہ گھر سونا لگتا ہے۔ اسی لیے تو میں اس کے لیے ہر وقت یہ دعا کرتا ہوں۔

”خدا کرے تمہیں کسی کی بری نظر نہ لگے۔“

☆☆☆

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اچھا دوست جو روٹھ گیا

ایم الیاس

انور احسن صدیقی کی یاد میں

انور احسن صدیقی اگست 2012ء کو طویل علالت کے بعد داغ مفارقت دے گئے۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے آمین۔ جب ہر اچھا آدمی اس دنیا سے رخصت ہوتا ہے تو ایک خلا پیدا ہو جاتا ہے۔ لہٰذا قلم قبیلہ میں ان کی وفات سے جو خلا پیدا ہوا ہے وہ شاید ہی پر ہو سکے۔

انور احسن صدیقی سے میری پہلی ملاقات 1957 میں ہوئی تھی۔ ان سے میرا تعارف جوانوں میں معروف آرٹسٹ احمد باگام نے کرایا تھا۔ اس کے بعد سے ملاقاتوں کا سلسلہ دراز ہوتا گیا۔ کوئی شام ایسی نہ تھی کہ ان سے ملاقات نہ ہوتی ہو۔ ریگل بس اسٹاپ کے مقابل کوالٹی ریسٹوریٹ اور کیفے جارج ایرانی ریسٹورنٹ تھا جہاں ہر شام کے نوجوانوں کا اجتماع ہوتا تھا۔ ان میں شاعر ادبی اور قلم کار جمع ہوتے تھے۔ بڑی رونق ہو جاتی تھی۔ چائے کی میز پر بڑے خوش گوار ماحول میں بحث و مباحثہ تکرار اور نوک جھونک کا سلسلہ جاری رہتا۔ انور احسن صدیقی تقریباً روز ہی پیش پیش رہتے تھے۔ وہ لوح و قلم کے مدیر اور طلاع کی ادارت میں بھی شامل تھے۔ نوجوان طلبا کے وہ دوست اور رہنما بھی تھے۔

وہ شعلہ بیان شاعر تھے۔ وہ جس محفل اور شاعروں میں اپنی نظمیں سناتے تھے چھا جاتے تھے۔ ان کی انقلابی شاعری تھی ان کی تمام نظموں پر سیاسی رنگ کا زیادہ

اثر تھا۔ وہ بے حد مقبول اور پسندیدہ شاعر تھے۔ ان کا بیش تر وقت لوح و قلم کو بہتر سے بہتر بنانے اور سنوارنے میں صرف ہوتا تھا۔

ایوب خان کا دور حکومت تھا۔ بارہ عدد طلباء کو سیفٹی ایکٹ کے تحت جیل میں ڈال دیا گیا۔ ان میں انور احسن صدیقی بھی تھے۔ مجھے واحد بشیر کا نام یاد رہ گیا ہے۔ بہت سارے نام میری یادداشت سے نکل گئے۔ ان تمام ساتھیوں نے مستقبل میں بڑی شہرت پائی اور نام پایا اور صحافت کو اپنا لیا۔

میں ان دنوں ماہنامہ آج کل نکالا کرتا تھا۔ انور احسن صدیقی نے متعدد نظمیں اشاعت کے لیے خصوصی طور پر دیتے تھے۔ جب وہ اور ان کے ساتھی جیل میں تھے تب میں انہیں آج کل پہنچاتا تھا۔ اس میں تعاون احمد باگام کا ہوتا تھا۔ میری عرصہ دراز سے احمد باگام سے ملاقات نہیں ہے۔ ورنہ ماضی کی وہ یادیں جو انور احسن صدیقی سے وابستہ تھیں انہیں تحریر میں لے آتا۔ پچپن برس کی بہت پرانی اور ساری یادیں اور باتیں دھندلا سی گئی ہیں۔

میں نے ایوان ادب کے نام سے ایک بزم قائم کی تھی جس کی باقاعدگی سے ہر ماہ تنقیدی نشست منعقد ہوتی تھی۔

انور احسن صدیقی اور دوسرے بہت سے نوجوان مقبول اور معروف قلم کار شرکت کرتے تھے۔ رئیس امروہوی اور سید محمد تقی صدارت کر چکے ہیں۔ منہاج برنا بھی ان دنوں یوگوسلاویا سے جان آئرک بھی آئے تھے جنہوں نے وہاں کی یونیورسٹی سے اردو کی تعلیم حاصل کی تھی اور اعلیٰ سندیں حاصل کی ہوئی تھیں۔ وہ پروفیسر بھی تھے۔

انور احسن صدیقی عمر میں مجھ سے بڑے تھے بلکہ ہر لحاظ سے وہ سینئر تھے۔ میں انہیں انور احسن صدیقی صاحب اس لیے نہیں لکھ رہا ہوں کہ اجنبیت کا سا احساس ہوتا ہے۔

گاہے گاہے ان سے کہیں نہ کہیں ملاقات ہو جاتی۔ وقت گزرتا گیا۔ وہ ایک ادبی شخصیت تھی۔ پر ان کا رجحان کالم نگاری اور ڈائجسٹوں کی طرف ہو گیا۔ اردو ادب کے محقق، نقاد، شاعر اور ادیب بڑے تنگ نظر اور متعصب ہوتے ہیں انہیں ڈائجسٹوں سے خدا واسطہ کا بیر ہے۔ وہ پڑھتے نہیں لیکن اس پر اعتراض کرتے ہیں وہ اپنی انا اور خول میں بند رہتے ہیں۔ آج اس ادب کا کیا حال ہے۔ انہیں کوئی پڑھنے والا نہیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

رہا ہے۔ جو ادبی رسائل چھپ رہے ہیں ان کی اشاعت دو تین سو سے زیادہ نہیں ہے۔ انہیں کوئی خریدتا نہیں ہے۔ بلکہ اعزازی طور پر تقسیم کر دیا جاتا ہے یا پھر ان اداروں میں جن سے وہ منت سماجت کر کے اشتہار حاصل کرتے ہیں۔

ریڈر شپ ڈائجسٹوں نے دی ہے۔ ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں لوگ پڑھتے رہے ہیں۔ گو آج کل ان کی اشاعتیں الیکٹرانک میڈیا اور مہنگائی کے باعث سابقہ نہیں رہیں تاہم ان کی اشاعت ہزاروں کی ہے اور ادبی رسائل کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے۔ لوگ خریدتے اور پڑھتے ہیں۔

انور احسن صدیقی کو ڈائجسٹوں نے بہت متاثر کیا تھا۔ انہوں نے مسٹری میگزین اور ایڈونچر میں لکھنا شروع کیا۔ ان کی بہت ساری کہانیاں، سلسلے وار اور ناول بھی شائع ہوئے۔ انہوں نے اس میدان میں جو طبع آزمائی کی اس نے انہیں شہرت کے بام عروج تک پہنچایا۔ وہ برسوں لکھتے رہے۔

مسٹری میگزین وایڈونچر کے قارئین انہیں الف صدیقی کے نام سے جانتے ہیں۔ ان کی مشہور سلسلہ وار کہانیوں میں سنگسار، زنجیر، ناسور، ایندھن، چیمپئن، دائرے، حصار، عذاب گر، گردش، امید سحر، دلدل اور دیدہ ور خاص طور پر قابل ذکر ہیں اس کے علاوہ انہوں نے مسٹری وایڈونچر کے لیے ایک خبر ایک کہانی اور مشہور کردار خاتون وکیل صالحہ عبدالکریم کے نام سے تخلیق کیا اور 200 سے زائد کہانیاں لکھیں اور بے شمار کہانیوں کے تراجم بھی کیے۔

ایڈونچر اور مسٹری میگزین میں ان کی شائع ہونے والی تحریریں یادگار اور ناقابل فراموش ہیں۔ جو ان کی یاد دلاتی رہیں گی۔ ان کی کمی محسوس ہوتی رہے گی وہ ایک سنجیدہ مگر ہنس مکھ شخصیت کے مالک تھے۔ ان سے ایک مرتبہ ملنے کے بعد ان سے دوبارہ ملنے کی خواہش ہوتی تھی۔ اس لیے وہ بڑے با اخلاق تھے۔ ان سے میری آخری ملاقات شادی کی ایک تقریب میں ہوئی تھی۔ وہ صحت مند، ہشاش بشاش تھے۔ آج یقین نہیں آتا ہے کہ وہ اتنی جلدی روٹھ جائیں گے۔ ایک اچھا دوست، مخلص انسان اور محبت کرنے والا اب نہیں ہے لیکن ان کی محبت اور خوبیاں ہیں۔ جو انہیں دل میں ہمیشہ بسائے رکھیں گی۔

☆☆

تو وہ کون تھی؟

ایس امتیاز احمد

چھن چھن کی آواز اور قدموں کی چاپ اور قریب آگئی تھی اور اب میں اندھیرے میں بھی ایک چلتی پھرتی سیاہی دیکھ سکتا تھا۔ اندھیرے کا وہ حصہ میرے قریب آتا جارہا تھا۔ میں نے ڈر کر اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ اچانک چھن چھن کی آواز بند ہوگئی۔

شواہد کے باوجود وہ حقیقت نہیں تھی

سوار ہونے کو تو میں اس ٹرین پر سوار ہوگیا تھا لیکن راستے بھر ڈرتا آیا تھا کہ اگر حسب معمول آج بھی یہ ٹرین لیٹ ہوگئی تو میں کیا کروں گا۔

میرے دوست نے مجھ سے منع کیا تھا کہ میں اس ٹرین سے نہ آؤں کیونکہ زیادہ تر یہ ٹرین لیٹ پہنچتی ہے اور اگر زیادہ لیٹ ہوئی تو پھر میں پریشانی میں پڑ جاؤں گا۔

اس نے یہ بھی کہا تھا کہ آنے سے پہلے میں اسے فون کردوں کہ وہ اسٹیشن پر مجھے لینے آجائے، لیکن میں نے اسے فون نہیں کیا تھا اور اسی ٹرین سے سفر بھی شروع کردیا تھا۔

دراصل میں ایڈونچر کا شوقین ہوں۔ لوگوں کو حیرت زدہ کرنا میری عادت سی بن گئی ہے۔ میں نے سوچا تھا کہ جب اچانک میں اپنے دوست کے گھر پہنچوں گا تو وہ کافی حیرت زدہ ہوگا اور میں خوب خوب محظوظ ہوں گا۔

لیکن اب اس وقت میری عجیب حالت تھی۔ ٹرین حسب معمول آج بھی ساڑھے چار گھنٹے لیٹ پہنچی تھی۔ نتیجے میں ساڑھے چار بجے اس اسٹیشن پر پہنچنے کے بجائے نو بجے پہنچ سکی تھی۔

میں نے اپنی گھڑی کی طرف دیکھا۔ ٹھیک نو بجے تھے۔ اپنے ایک ہاتھ میں سوٹ کیس پکڑ کر میں اسٹیشن پر آگیا۔ کہر میں ڈوبی ہوئی جاڑے کی رات نے میرا استقبال کیا تھا۔ اس چھوٹے سے اسٹیشن پر اترنے والا شاید میں اکیلا مسافر تھا۔

میں نے چاروں طرف اندھیرے میں دیکھا لیکن کوئی بھی نظر نہ آیا۔ نہ تو کوئی قلی، نہ اسٹیشن ماسٹر کوئی نہیں۔ گاڑی چھوٹ چکی تھی۔

ٹھنڈی ہوا چلی اور السٹر پہنے ہونے کے باوجود میرے پورے جسم میں ایک سردی لہر دوڑ گئی۔ خاموش، سنسان، کالی رات چاروں طرف سناٹا تھا۔ ایک ہو کا عالم اور میں اکیلا اسٹیشن پر کھڑا تھا۔

میرا دل چاہا کہ میں لوٹ جاؤں میں مڑا بھی لیکن ٹرین جا چکی تھی اور ٹرین کے آخری ڈبے کی سرخ لائٹ نے میرا منہ چڑا دیا۔ میں نے ایک ٹھنڈی سانس بھری، سوٹ کیس کو ہاتھ میں تھاما اور دھیمے دھیمے قدم رکھتا ہوا باہر کی طرف بڑھنے لگا۔

باہر آکر میں نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ دور تک سوائے اندھیرے کے کچھ نظر نہ آیا۔ کوئی بھی سواری نہ تھی جو مجھے دوست کے گھر تک پہنچا سکتی۔

آسمان پر بھی بادل چھائے ہوئے تھے لہٰذا رات اور اندھیری ہوگئی تھی میں نے آسمان کی طرف دیکھا اور تھکے قدموں سے پھر اسٹیشن کے اندر کی طرف پلٹ پڑا۔

پلیٹ فارم پر پہنچ کر مجھے اپنی حماقت پر ہنسی آگئی۔ اتنے چھوٹے سے اسٹیشن پر ویٹنگ روم کی تلاش ایک حماقت نہیں تو اور کیا تھی۔ چہل قدمی کرتے ہوئے میں پلیٹ فارم کے ایک سرے سے دوسرے تک گیا لیکن وہاں اسٹیشن ماسٹر کے روم کے علاوہ اور کوئی کمرا ہی نہ تھا اور وہ بھی اس وقت بند تھا۔

تھوڑی دیر ٹہلنے کے بعد میں ایک پتھر کی بنچ پر آکر بیٹھ گیا اور آنکھیں بند کرلیں۔ اچانک گڑگڑاہٹ سی ہوئی اور میں چونک پڑا پھر بجلی چمکی اور پانی برسنے لگا۔ سردی تیز ہوگئی تھی۔ میں نے سوٹ کیس کھول کر کمبل نکالا اور اوڑھ کر بیٹھ گیا۔

اب اولے بھی گرنے لگے تھے۔ سفید چھوٹے چھوٹے پتھر۔ میں غور سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اچانک چھن چھن کی آواز میرے کانوں میں گونجی۔ میں نے جلدی سے پلٹ کر دیکھا لیکن اندھیرے میں کوئی نظر نہ آیا چھن چھن کی آواز بدستور آرہی تھی۔

اولے گرنے بند ہوگئے تھے اور ٹھنڈی ہوا اتنی تیزی سے چلنے لگی تھی کہ میرے دانت بج رہے تھے۔ سائیں سائیں کرتی ہوئی ہوا کی آواز یوں لگ رہی تھی جیسے چڑیلیں ناچ رہی ہوں اور خبیث روحیں قہقہہ لگا رہی ہوں۔

میں سہما، سکڑا ہوا بیٹھا تھا اور اپنے آپ کو کوس رہا تھا۔ اچانک چھن چھن کی آواز تیز ہوگئی۔ میں نے غور سے چاروں طرف دیکھا لیکن کوئی نظر نہ آیا۔

چاروں طرف فضا میں سائیں سائیں ہو رہی تھی اور سردی قہقہہ لگا رہی تھی۔ میں نے سوچا شاید میرے کان بج رہے ہیں۔ لیکن اچانک میں اٹھ کھڑا ہوا۔ چھن چھن کے ساتھ کسی کے قدموں کی چاپ بھی میں بغور سن رہا تھا۔

اور پھر فضا میں کسی کا نسوانی قہقہہ گونجا اور میرے بدن کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ پھر مجھے ایسا لگا جیسے یہ قہقہے میرے چاروں طرف ناچ رہے ہیں۔

اب میں بالکل بے ہوش سا ہو رہا تھا۔ مجھے وہ تمام قصے یاد آرہے تھے جو میں بچپن سے آج تک سنتا آیا تھا۔ چڑیلوں کے قصے، بھوتوں کی کہانیاں!

چھن چھن کی آواز اور قدموں کی چاپ اور قریب آگئی تھی اور اب میں اندھیرے میں بھی ایک چلتی پھرتی سیاہی دیکھ سکتا تھا۔ اندھیرے کا وہ حصہ میرے قریب آتا جارہا تھا۔ میں نے ڈر کر اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ اچانک چھن چھن کی آواز بند ہوگئی۔

میں نے جلدی سے اپنی آنکھیں کھولیں۔ کوئی میرے بالکل قریب کھڑا تھا۔

"کون ہیں آپ؟" یہ کسی جوان عورت کی آواز تھی پھر اس نے ٹارچ جلا کر میرے چہرے کو دیکھا اور بولی۔

"اوہ! کوئی مسافر۔"

"تم کون ہو؟" میں نے ڈرتے ڈرتے سہمے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"ہوں..... ہوں..... ہوں۔" وہ عجیب انداز سے ہنسی۔ "میں اس اسٹیشن کی مالک ہوں۔"

"کیا.....؟"

"ہاں! میں ملکہ ہوں۔ دیکھو میری طرف۔" اس نے بڑے تیکھے انداز میں کہا تھا۔ اب میں نے نظر بھر کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ ایک خوب صورت جوان لڑکی تھی۔ زیادہ سے زیادہ سولہ برس کی رہی ہوگی۔ اس کے ہونٹوں پر لالی تھی۔ آنکھوں میں اس نے کاجل لگا رکھا تھا جسم پر تمام زیورات تھے اس کے کپڑے بھی سرخ تھے۔ ٹارچ کی بھرپور روشنی اس نے اپنے چہرے پر کر رکھی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور ہونٹوں پر ایک عجیب قسم کی مسکراہٹ تھی۔

وہ کوئی دیہاتی لڑکی تھی جو دلہن کے روپ میں میرے سامنے کھڑی تھی۔ وہ آنکھیں بند کیے کھڑی تھی اور میں اس کے حسن کو دیکھ رہا تھا۔ "بابو! دیکھ چکے"۔ اچانک اس کی آواز گونجی اور پھر وہ عجیب انداز سے ہنس دی۔ میں چونک پڑا اور اس نے ٹارچ بجھا دی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"کہاں جانا ہے؟"

"چمن پور۔"

"اس وقت تو کوئی سواری نہیں مل سکتی۔"

"ہاں میں جانتا ہوں۔ رات یہیں گزار دوں گا۔ صبح سواری ملنے پر جاؤں گا؟"

"میرے ساتھ چلو گے؟"

"کہاں؟"

"میرے گھر۔"

ابھی میں کچھ جواب بھی نہیں دینے پایا تھا کہ اچانک ایک کھانسی کی آواز سنائی دی۔ لڑکی نے گھبرا کر دیکھا اور جلدی سے بولی۔

"پھر ملوں گی۔" اور ایک طرف بھاگتی چلی گئی۔

کھانسنے والا میرے قریب آتا جا رہا تھا۔ اب میں اس کے کراہنے کی آواز بھی سن رہا تھا۔ وہ میرے بالکل قریب آ گیا اور بولا۔

"کون ہے؟"

"مسافر۔"

"مسافر! اتنی رات میں"

"ہاں۔"

"کہاں جانا ہے؟"

"چمن پور۔"

"بابو جی! چمن پور کے لیے تو اس وقت سواری نہیں مل سکتی۔"

"تم کون ہو؟" اچانک میں نے سوال کیا۔

"میں اکا چلاتا ہوں صاحب! گھوڑا گاڑی۔"

"تمہاری گھوڑا گاڑی کہاں ہے؟" "باہر موجود ہے بابو جی۔"

اس سے یہ معلوم کر کے کہ اس کے پاس سواری کے لیے گھوڑا گاڑی ہے، مجھے بڑا اطمینان ہوا۔ اب میرا ڈر غائب ہو چکا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔

"تو مجھے چمن پور پہنچا دو۔ چوگنے پیسے دوں گا؟"

"نہیں بابو جی! اپنی جان تھوڑی دینا ہے۔"

"کیوں؟ کیا بات ہے؟"

"ایک تو ادھر کی سڑک بہت خراب ہے دوسرے چور چمار بھی بہت رہتے ہیں۔"

"ارے یار چلو بھی۔"

"نہ بابو جی! میں نہیں چل سکتا۔ کہو تو بستی تک پہنچا دیں۔"

"بستی تک! کون سی بستی؟"

"یہاں سے جو سب سے قریب گاؤں ہے وہ ایک میل دور ہے۔ کہو تو وہاں پہنچا دیں کسی کے یہاں۔"

"لیکن وہاں تو مجھے کوئی جانتا ہی نہیں۔"

"تو رات ہمارے یہاں گزاریں بابو جی! سردی بہت ہے۔"

"نہیں، ٹھیک ہے، میں یہیں رہ لوں گا۔"

"جیسی مرضی سرکار کی۔" کہہ کر وہ مڑ گیا۔

اور اسی وقت سرد ہوا کا ایک جھونکا آیا اور میری ہڈی تک میں سردی کی لہر دوڑ گئی، میں کانپ اٹھا۔ میں نے نظر اٹھا کر دیکھا، گھوڑا گاڑی والا کھانستا ہوا باہر کی طرف چلا جا رہا تھا۔

سردی اتنی زیادہ ہو چکی تھی کہ اب برداشت نہیں ہو رہی تھی اور پھر میں نے کچھ سوچ کر گھوڑے والے کو آواز دے دی۔ وہ پلٹ پڑا، قریب آنے کے بعد بولا۔

"بابو جی! ہم تو پہلے ہی کہہ رہے تھے کہ سردی زیادہ ہے۔ ہمارے ساتھ چلیں۔" کہتے ہوئے اس نے میرا سوٹ کیس اٹھا لیا۔ وہ چل پڑا میں بھی اٹھ کھڑا ہوا تھا اور اب اس کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔

باہر پہنچ کر مجھے اس کی گھوڑا گاڑی کہیں نظر نہ آئی لیکن وہ ایک طرف نشیب میں بڑھتا گیا۔ نشیب میں واقعی گھوڑا گاڑی موجود تھی۔ اس نے میرا سوٹ کیس گاڑی پر رکھ دیا اور بولا۔ "بابو جی بیٹھ جائیے۔" میں بیٹھ گیا اور گھوڑا گاڑی چل پڑی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گھوڑا گاڑی چلی جا رہی تھی اور میں خاموش بیٹھا ہوا اپنی آج کی حماقت کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اچانک مجھے وہ لڑکی یاد آئی میں نے گھوڑے والے سے پوچھا۔

"گھوڑے والے! اسٹیشن پر کیا کوئی لڑکی رہتی ہے؟"

"لڑکی۔ نہیں بابو جی۔ کیوں؟"

"تمہارے آنے سے پہلے وہاں ایک لڑکی ملی تھی۔"

"جل تو جلال تو، آئی بلا کو ٹال تو، لڑکی..... کوئی چڑیل ہی ہو گی بابو جی۔"

"کیا.....؟"

"ہاں!" پھر اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور جیسے اپنے آپ بڑبڑایا۔ "زینت! تو نہ مانے گی!" اور پھر اس نے گھوڑی کو ایک سونٹا زور سے رسید کیا۔

مجھے ایسا لگا جیسے کوئی زور سے رویا ہو۔ میں چونک پڑا جلدی سے میں نے گھوڑے والے سے کہا۔

"کیا کوئی دب گیا؟"

"نہیں بابو جی! آپ کے کان بجے ہوں گے۔"

اچانک گھوڑا گاڑی ایک دروازے پر آ کر رک گئی گھوڑے والا نیچے اترا۔ اس نے سوٹ کیس ہاتھ میں اٹھا لیا اور بولا۔ "آیئے بابو جی!"

گھر کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ مجھے حیرت تو ہوئی لیکن میں خاموشی سے اس کے پیچھے چلتا رہا۔ ایک چھوٹے سے کمرے میں پہنچ کر اس نے سوٹ کیس رکھ دیا اور جیب سے دیا سلائی نکال کر ایک چراغ جلا دیا۔

میں نے دیکھا، کمرے میں پوال بچھا ہوا تھا اور اس پر ایک کمبل پڑا ہوا تھا۔ "بابو جی! بس رات اسی پر کسی طرح کاٹ لیجیے۔" میں نے جوتے کھولے اور خاموشی سے پوال پر بیٹھ گیا۔ "اچھا اب آپ لیٹیں صبح ملاقات ہو گی۔" کہتے ہوئے وہ دروازہ بھیڑ کر چلا گیا۔

میں نے سوٹ کیس سے دوسرا کمبل بھی نکال لیا اور دونوں کمبلوں کو لپیٹ کر لیٹ گیا۔ جیب سے نکال کر ایک سگریٹ سلگائی اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔

اچانک مجھے ایسا لگا جیسے کوئی دھیرے دھیرے دروازہ کھٹکھٹا کر کہہ رہا ہو۔ "بابو جی دروازہ کھولو۔" میں جلدی سے اٹھا اور دروازہ کھول دیا۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ میرے سامنے اسٹیشن والی لڑکی کھڑی تھی۔

"تم..... یہاں.....!"

"میں نے کہا تھا نا کہ میں آپ سے ملوں گی۔"

"لیکن تم یہاں پہنچیں کیسے؟"

"یہی تو میرا گھر ہے۔ میں آپ کے ساتھ ہی تو آئی ہوں۔" اس نے دھیرے سے ایک قہقہہ لگایا۔

"اور وہ گھوڑا والا....."

"وہ میرے بابا ہیں۔"

"لیکن تم تھیں کہاں.....؟"

"اب دروازے پر ہی بات کیے جایئے گا کہ اندر بھی آنے دیجیے گا؟" کہتی ہوئی وہ کمرے کے اندر چلی آئی۔

"اوہو..... ہو!" اس نے کپکپاتے ہوئے کہا۔ "سردی بہت ہے اور پھر وہ میرے کمبلوں کے بیچ گھس گئی۔

میں ابھی تک حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"آؤ نہ بابو جی!" اس نے ایک انگڑائی لے کر کہا۔ "سردی آج بڑی غضب کی ہے۔"

اور مجھے لگا واقعی سردی بہت زیادہ ہے۔ میں اس کی طرف بڑھا۔ "آؤ نہ بابو جی!" میں ٹھٹکی میں پوال پر بیٹھ چکا تھا اور پھر وہ میری طرف بڑھی اور اس نے کپکپاتے ہوئے کہا۔

"س.....س..... سردی!" وہ میرے سینے سے لپٹ گئی۔

ساری رات میں اس کو گرم کرتا رہا۔ اس کی سردی ختم کرتا رہا۔ ساری رات وہ میری دلہن بنی رہی۔ صبح قریب آ گئی تھی۔ وہ مسکرا کر میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے مسکرا کر اس کے ہونٹ چوم لیے۔

"اب بس"۔ اس نے کہا۔ "اب میں چلی، بابا آتے ہوں گے۔ پھر ملیں گے۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی میں نے

سگریٹ جلا کر اس کی طرف دیکھا اور اچانک ذہن میں نہ جانے کیا آیا کہ میں نے اس سے پوچھا۔

"اچھا یہ تو بتا دو۔ رات تم کیسے آئی تھیں؟"

"آپ کے ساتھ۔"

"لیکن نظر تو نہیں آئی تھیں۔ گھوڑا گاڑی میں کہاں بیٹھی تھیں؟"

"بیٹھی!" وہ بڑے زور سے ہنسی۔ "میں ہی تو گاڑی کھینچ رہی تھی۔ یاد نہیں تم کو چھیڑنے کی بات پر بابا نے مجھے ایک سونٹا مارا تھا۔ یہ دیکھو پیٹھ پر نیل بن گیا ہے۔"

"کیا.....؟"

اور میں بے ہوش ہو گیا۔ جب میں ہوش میں آیا تو میرا دوست میرے سامنے کھڑا تھا۔

"میں کہاں ہوں؟"

"اسٹیشن پر۔" میرے دوست نے کہا پھر غصے سے بولا۔ "یہ کیا حرکت تھی۔ رات بھر سردی میں اکڑ گئے مر جاتے تو؟ اگر اس وقت اتفاق سے میں نہ آ جاتا تو تمہاری نہ جانے کیا حالت ہوتی۔"

"کیا؟" میں نے حیرت سے کہا۔ "لیکن میں تو بستی میں ایک مکان میں تھا۔ وہاں گھوڑے والا..... اور لڑکی....."

"یار خواب میں دیکھا ہوگا۔ صورت تو دیکھیے جناب کی ننھی لڑکی۔" میرے دوست نے قہقہہ لگایا۔

"نہیں یار! میں سچ کہہ رہا ہوں میرے ساتھ گاؤں میں چلو تو میں تمہیں وہ گھر بھی دکھا دوں گا جہاں میں نے رات بسر کی ہے۔" میرے ضد کرنے پر میرا دوست مجھے بستی کی طرف لے چلا ہم ایک گھوڑا گاڑی میں روانہ ہوئے میں راستہ بتاتا جا رہا تھا اور میرا دوست حیرت سے دیکھ رہا تھا۔

اور پھر ہماری گھوڑا گاڑی رات والے مکان کے سامنے پہنچ گئی مکان کے دروازے پر تالا لگا ہوا تھا۔ میں نے مکان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"یہی وہ مکان ہے۔"

میرے دوست نے بڑے تعجب سے کہا۔ "یہ!"

"ہاں۔!"

"رات کیا ہوا تھا؟" میرے دوست نے پوچھا۔ میں نے اپنے دوست کو پورا واقعہ بتا دیا۔ پورا واقعہ سننے کے بعد میرے دوست نے ایک قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

"یار تم نے خواب دیکھا ہوگا۔"

"کیوں.....؟"

"ارے بھئی! یہ مکان تو پچھلے آٹھ برسوں سے بند ہے۔ اس مکان کا مالک ایک گھوڑا گاڑی والا تھا۔ یہ صحیح ہے۔ یہ بھی غلط نہیں کہ اس کی ایک لڑکی تھی، لیکن آج سے آٹھ سال پہلے وہ دونوں مر چکے ہیں۔"

"کیا.....؟ لیکن کیسے.....؟" میں نے جلدی سے دریافت کیا۔

"گھوڑا گاڑی والے نے ایک شخص سے اپنی لڑکی کی شادی کی لیکن لڑکی کو یہ شادی پسند نہیں تھی۔ وہ کسی اور سے محبت کرتی تھی۔ جس رات لڑکی دلہن بنائی گئی اس نے زہر کھا لیا اور اس کا باپ اس کے غم میں پاگل ہو گیا۔ اس نے اسی دن اپنی گھوڑا گاڑی سجائی اور اپنی لڑکی کی لاش گھوڑا گاڑی میں لے کر چل کھڑا ہوا۔ پاگل تو تھا ہی گاڑی کو ایک کھڈ میں لیتا چلا گیا اور وہ بھی مر گیا۔ اس دن سے یہ مکان بند ہے۔"

"میں نہیں مانتا۔ مکان کھلوا کر دیکھو میں نے سگریٹ پی تھی۔ رات بھر سویا تھا۔ میرے پاس سوٹ کیس....."

"سوٹ کیس تمہارے پاس ہے اور اب یہ واقعہ بھول جاؤ۔" میرے دوست نے کہا۔ لیکن میری ضد بڑھتی گئی۔ مکان کھولا گیا۔ میں اور میرا دوست کئی دوسرے لوگوں کے ساتھ اندر داخل ہوئے۔ رات میں جس کمرے میں سویا تھا اس کمرے میں پہنچا اور پھر واقعی سب حیرت زدہ رہ گئے۔

میری پی ہوئی سگریٹ کا ٹکڑا اب بھی وہاں موجود تھا۔

☆☆☆

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آتش فشاں

ایم اے راحت

- ایک ایسے شخص کی کہانی' جس نے قید و بند کی صعوبتوں میں دہشت گردی کی تربیت حاصل کی
- نگری نگری گھومنے والے اس شخص کی کہانی' جس کو انتقام کی آگ نے جلا کر دہشت گرد بنا دیا
- وہ اپنا انتقام مکمل کرنے کے لیے در در بھٹکا اور آخر کار اس کو اپنی منزل مل گئی
- تجسس' ایکشن' ڈرامائی واقعات اور حالات پر مبنی مسٹری میگزین کا نیا قسط وار سلسلہ **آتش فشاں**

موت ہمارے چاروں طرف منڈلا رہی تھی اور آخر کار ہم فیصلہ کر چکے تھے کہ میرے باپ نے بے شک اپنا انتقام پورا کر لیا تھا لیکن بہت سے بے گناہ بھی اس کے ہاتھوں ہلاک ہوئے تھے۔ قدرت کا انتقام بے شک بڑی حیثیت رکھتا ہے۔ شاید میری ماں نے میرے اور میرے باپ کی زندگی کے لیے اللہ سے کچھ ایسی دعائیں مانگیں تھیں کہ اللہ نے انہیں نظر انداز نہیں کیا اور اس وقت جب ہم موت سے چند قدم دور تھے۔ ہمیں ایک روشنی نظر آئی۔ روشنی سیفون اس بستی کی مسجد کے بلند مینار کا جلتا ہوا چراغ تھا۔ جس نے مسکرا کر ہمیں زندگی کا پیغام دیا اور ہم نے ان انسانوں کو دیکھا جو جذبہ اخوت سے سرشار موسم کی شدت بھول کر ہماری مدد کے لیے دوڑ پڑے تھے۔ اس خوفناک موسم میں جبکہ انسان اپنی انگلی بھی گرم جگہ سے باہر نکالنے کی ہمت نہیں کر سکتا موسم کی اس تباہ کاری سے بے نیاز اعظم خان صاحب اور ان کے دونوں بیٹے ہمارے پاس آئے اور جو کہا جاتا ہے ناں کہ نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں۔ تقدیریں ان کے اس ایثار نے میرے باپ کی فطرت کو بدل دیا۔ یہی سب کچھ نہ ہوا بلکہ اس نے کچھ اور بھی دیکھا۔ اس نے دیکھا کہ اپنے حجرے سے اعظم خان صاحب اپنے بال بچوں سمیت بند جگہ سے باہر نکل گئے اور ہمیں وہاں جگہ دی جہاں سردی سے بچاؤ کی گنجائش تھی۔ تب میرے باپ کو احساس ہوا کہ خزانہ وہ نہیں ہوتا۔ جو سونے چاندی کے سکوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ بلکہ خزانہ وہ ہوتا ہے۔ جو انسانی ہمدردی اور محبت کے جذبوں پر مشتمل ہوتا ہے اور ہم سیفون...... ہم اس خزانے سے محروم تھے۔ جو ہمیں یہاں آ کر مل گیا۔ وہ عظیم الشان خزانہ پوشیدہ کر دیا گیا اور ہم دوسرے خزانے کو فروغ دینے لگے۔ جو اعظم صاحب نے ہمیں دیا تھا۔ میرے باپ نے زمین خرید کر مکان بنایا اور ہم محنت سے اپنا ایک مقام تخلیق کرنے لگے۔ آج ہمارے والدین اس دنیا میں نہیں ہیں لیکن میرے دل میں اعظم صاحب کا دیا ہوا سبق زندہ ہے یہ سنہرے سکے ضرورت مندوں کے لیے ہیں۔ میری نگاہ میں ان کی کوئی وقعت نہیں ہے۔ سیفون خدا کی قسم کسی ضرورت مند کو لے آؤ اور اس سے کہو۔ کہ سونے کے یہ ڈھیر اٹھا کر لے جائے۔ مجھے ذرا بھی اعتراض نہیں ہوگا۔" بدر شیر کے لہجے میں حقارت تھی اور سیفون سکوت کے عالم میں اسے دیکھ رہی تھی۔ بہت دیر تک خاموش رہی پھر اس نے کہا۔

"اگر کوئی ضرورت مند تم سے مجھے مانگے بدر شیر تو۔" بدر شیر نے چونک کر اسے دیکھا اور عجیب سے انداز میں سوچتا ہوا بولا۔

"نہیں۔ سیفون میں انسان ہوں اور انسان کمزوریوں کا مجموعہ ہوتا ہے۔ میں کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔ اس وقت بھی ایک سچ بول رہا ہوں کہ میں تمہیں چاہنے لگا ہوں تمہیں کھونے کے بعد میں سانسوں کا بوجھ برداشت نہیں کر سکوں گا۔ میں اپنا سب کچھ دے سکتا ہوں صرف تمہارے علاوہ۔"

"میری عزت' میری عصمت کی قیمت کیا ہے بدر شیر؟" سیفون نے عجیب لہجے میں پوچھا۔

"بدر شیر کے جسم میں دوڑتا ہوا سارا خون اس کے آگے بے وقعت ہے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"کیا تم خلوص دل سے یہ بات کہہ رہے ہو؟"

"ہاں سیفون' پورے اعتماد سے۔" بدر شیر کا لہجہ پہاڑوں سے زیادہ بلند تھا۔

"تو پھر سنو..... آج میں بھی تمہیں ایک کہانی سنانے آئی ہوں۔" سیفون نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا اور بدر شیر ہمہ تن گوش ہو گیا۔

سیفون اسے انور زمان کی کہانی سنانے لگی مکمل ہوئی تو بدر شیر نے کہا۔

"اب تم کیا چاہتی ہو سیفون؟"

"سزا..... اپنی توہین کی سزا دینا چاہتی ہوں میں اور زمان کو۔"

"تو پھر میں جو کہہ رہا ہوں اسے غور سے سنو۔" بدر شیر اسے کچھ سمجھانے لگا۔ پھر اسی منصوبے کے تحت سیفون انور زمان سے ملی اور اس نے اسے سنگانیہ کی پہاڑیوں میں چھپے خزانے کی تفصیل بتائی۔

انور زمان نے خوشی کے عالم میں دونوں بازوں پھیلائے اس نے سیفون کو اپنی آغوش میں لینے کی کوشش کی لیکن وہ پیچھے ہٹ گئی۔

"نہیں انور زمان میں تمہارے نزدیک نہیں آؤں گی میں پہاڑوں کی بیٹی ہوں۔ بے شک میں نے پہاڑوں کے ریت ورواج سے بغاوت کی ہے' لیکن پھر بھی یہ مٹی میری تقدیر کا باعث ہے۔ اب تم مجھے باعزت طور پر حاصل کر لو گے تو میں تمہاری کسی خواہش کو نہیں ٹھکراؤں گی۔"

"آہ..... سیفون تم نے میرے خوابوں کی تکمیل کر دی ہے۔ اب دنیا میرے قدموں کے نیچے ہو گی۔ میں ساری دنیا دیکھوں گا۔ ساری دنیا۔" انور فرط مسرت سے دیوانہ ہو رہا تھا۔ سیفون نے چبھتی ہوئی نگاہوں سے اسے دیکھا اور وہ بولی۔

"اور..... میں..... میں؟"

"ہاں..... ہاں تم بھی..... تم بھی بتاؤ ہم کب وہاں چلیں گے؟"

آج ہی رات میں سنگانیہ کی پہاڑیوں میں مشعل جلاؤں گی تم اس روشنی کو دیکھ کر چلے آنا۔" سیفون نے جواب دیا۔

سنگانیہ کی پہاڑیاں چراغ جان نے موچھیں مروڑتے ہوئے زیر لب کہا اور پھر مسکرانے لگا۔ پھر اس کے حلق سے آواز نکلی۔

"وہاں میں بھی تم دونوں کو ملوں گا۔ میرے بچو! بڑوں کا فرض ہے کہ وہ بچوں کی نگرانی کریں۔" اور پھر وہ دبے قدموں وہاں سے کھسک گیا۔ تاکہ کسی کی نگاہ اس پر نہ پڑ جائے۔ وہ سائے کی طرح سیفون کا پیچھا کرتا تھا اور اس وقت بھی اس نے ان دونوں کی ساری باتیں سن لیں تھیں اور پھر وہ شام ڈھلے سنگانیہ کی پہاڑیوں میں اپنے لیے کوئی مناسب جگہ تلاش کر رہا تھا۔ ایک جگہ اس نے اپنے لیے پسند کی اور وہاں پوشیدہ ہو گیا۔

اور پھر جب رات گہری ہو گئی۔ تو اس نے بہت دور ایک مشعل کی روشنی دیکھی اور حواس باختہ ہو گیا۔ "آہ! یہ تو بہت فاصلہ ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ لوگ اپنا کھیل مکمل کر لیں اور میں پیچھے رہ جاؤں۔"

چنانچہ وہ اپنی جگہ سے نکلا اور برق رفتاری سے یہ فاصلہ طے کرنے لگا۔ مشعل کی روشنی انور زمان نے بھی دیکھی تھی اور دھڑکتے دل کے ساتھ روشنی کی جانب قدم بڑھا دیئے تھے اور یہ روشنی نہیں بلکہ ان کی تقدیر کا سہارا تھی جو پوری آب وتاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔ "اس کے بعد تو میری حیثیت ہی بدل جائے گی۔" وہ قدم تیز رفتاری سے اٹھاتا ہوا روشنی کی طرف بڑھ گیا۔ مشعل سیفون کے ہاتھ ہی میں تھی اور وہ جب نزدیک پہنچا تو سیفون مسکرانے لگی۔

"کوئی دقت تو نہیں ہوئی انور زمان؟"

"نہیں..... میری زندگی' میری روح' جب تم میری رہبر ہو تو دقت کیسے ہو گی بتاؤ وہ خزانہ کہاں ہے؟"

"آؤ میرے ساتھ۔" سیفون نے کہا اور انور زمان کو ساتھ لیے ہوئے راستے طے کرتی ہوئی ایک غار میں داخل ہو گئی۔ تاریک غار میں مشعل کی روشنی ناکافی تھی۔ غار وسیع

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھا لیکن سیفون کی رہنمائی میں انور زمان غار کے ایک کونے میں پہنچ گیا اور اس کے بعد سیفون نے مشعل جھکا دی۔ کافی بڑا چوبی صندوق کھلا ہوا تھا اور نچلی سطح میں اشرفیاں چمک رہی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی بیش قیمت زیورات جگمگا رہے تھے۔ انور زمان نے اس عظیم الشان خزانے کو دیکھا اور اس کا بدن کانپنے لگا۔ دیر تک اس کی آواز ہی نہیں نکل سکی تھی۔ وہ لرزتے ہوئے لہجے میں بولا۔

"آہ..... اتنا بڑا خزانہ اتنا کچھ خرچ کرنے کے بعد بھی اتنا بڑا خزانہ میں تو یہ سوچ رہا ہوں کہ اتنے بڑے خزانے کے ساتھ ان لوگوں نے اتنا بڑا سفر کیسے طے کیا ہو گا لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہم اسے کس طرح یہاں سے لے جائیں گے۔ اس کا تو میں نے غور بھی نہیں کیا تھا۔

"یہ سوچنا تمہارا کام ہے۔ انور زمان۔" انور زمان پریشان ہو گیا۔ ابھی وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پایا تھا۔ کہ اچانک غار میں روشنی بڑھنے لگی۔ کوئی تیز مشعل تھی۔ جو کسی کے ہاتھ میں روشن تھی اور اس مشعل سے دوسری بہت سی مشعلیں روشن کی جا رہی تھیں یہ دوسری مشعلیں غار کی دیواروں پر نصب تھیں اور ایک فولادی وجود جو روشنی بڑھ جانے کے بعد نگاہوں میں آ گیا تھا۔ دیکھا جا سکتا تھا۔ جو بڑے اطمینان سے ان مشعلوں کو روشن کر رہا تھا۔ انور زمان کی نگاہ اس پر پڑی اور اس کے ہاتھ پاؤں بے جان ہونے لگے۔

یہ بدر شیر تھا۔ آخر مشعل روشن کرنے کے بعد وہ پلٹا اور کسی سنگی ستون کی مانند انور زمان کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

"ضرور تم جانتے ہو گے انور زمان میں اس خزانے کا رکھوالا ہوں۔ تم یہ خزانہ حاصل کرنے آئے ہو ناں..... آؤ..... آگے بڑھو مجھ سے جنگ کر لو اور اس خزانے کو یہاں سے لے جاؤ۔" یہ آواز تھی یا بادلوں کی گرج' انور زمان کی جان نکل گئی۔ اس کا دل حلق میں آ گیا۔ آواز پھر ابھری۔

اگر مجھ سے جنگ نہیں کر سکتے تو ایک اور ترکیب بھی میرے ذہن میں ہے۔ تم سیفون سے پیار کرتے ہو۔ ناں..... شاید وہ بھی تم سے پیار کرتی ہے لیکن میں بھی اسے چاہتا ہوں۔ اگر تم اسے ہمیشہ کے لیے میرے حوالے کر دو۔" بدر شیر جملہ ادھورا چھوڑ کر خاموش ہو گیا لیکن اس کے الفاظ نے انور زمان کے جسم میں دوبارہ زندگی دوڑا دی تھی۔ اس نے کہا۔

"اگر تم خزانے کے بدلے سیفون کو حاصل کرنا چاہتے ہو۔ تو میں تیار ہوں۔ خدا کی قسم میں تیار ہوں۔"

"انور زمان! یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ میں تمہیں چاہتی ہوں۔ میں تمہیں یہاں تک لائی ہوں۔" سیفون نے کہا' لیکن انور زمان نے جیسے سیفون کی بات ہی نہیں سنی تھی۔ دوبارہ بدر شیر سے بولا۔

"میں بالکل تیار ہوں بدر شیر' میں بالکل تیار ہوں' فیصلہ کرو۔" اسی وقت سیفون نے اپنے ہاتھ کی مشعل نیچے پھینک دی۔ آگے بڑھی اور انور زمان کے منہ پر تھوک دیا۔

"کتے' ذلیل کمینے تو میرے بارے میں فیصلہ کرنے کا کیسے حق رکھتا ہے۔ کون ہوں میں تیری' میرا اپنا وقار ہے۔ اپنا مقام ہے' اسی مشعل سے میں تیرا چھلسا دیتی لیکن ایک احسان بھی ہے تیرا مجھ پر تو نے مجھے بدر شیر تک آنے کی تحریک دی تھی بدر شیر سے محبت کر کے اس سے شادی کر کے اس کے خزانے کو حاصل کرنے کا لالچ مجھے میرے چچا چراغ جان نے بھی دیا تھا لیکن میں نے اس کے بارے میں یہ سوچا تھا کہ وہ ایک لالچی انسان ہے۔ بہر حال اس کے الفاظ سے میرا بھرم ٹوٹا تھا۔ میں نے پہلی بار سوچا تھا کہ دولت مجھ سے زیادہ قیمتی شے ہے۔ میرا حسن میرا پندار کوئی حیثیت نہیں رکھتا لیکن میں نے اپنی شکست کو اس لیے برداشت کر لیا کہ یہ الفاظ ایک لالچی بوڑھے کی زبان نے ادا کیے تھے۔ پھر تجھے آزمایا اور جب تو نے بھی اس خزانے کے عوض اس خزانے کو ترجیح دی۔ تو میں ریزہ ریزہ ہو گئی۔ میرے وجود کی ساری کرچیاں بکھر گئیں۔

میری آنکھوں کے چراغ دھندلا گئے۔ میں نے خود اپنا مذاق اڑایا۔ میں نے مرنے کا فیصلہ کیا۔ تب میرے ذہن میں ایک اور خیال آیا۔ میں نے سوچا کہ کیوں نہ ایک ایسے

شخص کو بھی آزماؤں جو خود ہی خزانے کا مالک بھی ہے۔ اس کی آنکھوں اس کے دل میں جھانکوں اور اگر ہو سکے تو اس کے وجود میں اپنے پندار حسن کی زندگی تلاش کروں۔ تب میں اس کے سامنے بکھر گئی اور جب میں اس کے سامنے بکھر گئی۔ تو اس نے میرے وجود کی ریزہ ریزہ کر چیاں بڑے احترام سے چنیں اور انہیں سینے میں چھپا لیا اس نے مجھے نئی زندگی دے دی۔ اس نے مجھے موت سے بچا لیا۔ میں نے سوچا کہ میں نے اب تک کتوں کے درمیان زندگی بسر کی ہے۔ میں خود ہی انسانوں سے دور رہی ہوں۔ انور زمان میں اپنے سارے وجود کو دنیا کے اس حسین ترین نوجوان کے قدموں میں نچھاور کرتی ہوں۔ جس نے مجھ ٹوٹی ہوئی عورت کو جوڑا ہے۔ مگر تیری سمجھ میں یہ باتیں کیا آئیں گی۔

مجھے تیری تصویر دیکھنی تھی اور اب تو اپنا عبرتناک انجام دیکھ۔" انور زمان نے ایک بار پھر خوفزدہ نگاہوں سے اس سنگی ستون کو دیکھا۔ جو اس کے سامنے تنا ہوا کھڑا تھا۔ اس ستون کے سامنے کھڑے ہونے کی سکت اس میں نہیں تھی۔ اسے اپنی آنکھوں کے سامنے موت نظر آ رہی تھی۔ تب سیفون نے کہا۔

"بدر شیر اسے سزا دو ایسی عبرتناک سزا دو کہ یہ موت کے بعد بھی یاد رکھے۔" بدر شیر کے بدن میں جنبش ہوئی پھر وہ اپنی جگہ سے ہٹا اور غار کے ایک دوسرے حصے میں پہنچ گیا۔ انور زمان میں اتنی بھی ہمت نہیں تھی۔ کہ وہ یہاں سے اُٹھ کر بھاگ جائے۔ بدر شیر نے غار کے اس حصے میں کچھ کارروائی کی اور پھر ایک بڑا بریف کیس لیے ہوئے انور زمان کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے مسکراتی نگاہوں سے انور زمان کو دیکھا اور پھر بریف کیس کھول کر اس کے سامنے کر دیا۔ سنہرے سکے بریف کیس میں اُوپر تک بھرے ہوئے تھے۔ اس کی بھاری آواز ابھری۔

نوجوان خزانہ تمہارے لیے زندگی کی حیثیت رکھتا ہے۔ میں آج تک لوگوں کو زندگی دینے کا خواہاں رہا ہوں۔ میں نے زندگی لینے کی کوشش کبھی نہیں کی کیونکہ زندگی اللہ کا عطیہ ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی عطا کی ہوئی کسی شے کو کسی سے چھینے میں نے اسے بڑے خزانے میں سے تمہارے لیے منتخب کیا ہے۔ اس سے زیادہ میں تمہیں نہیں دے سکتا۔ یہ دولت تمہاری جوانی کا سہارا بن سکتی ہے اور اس کے بعد ایک عبرتناک بڑھاپا تمہارے سامنے ہوگا۔ جس کے پاس جو کچھ ہوتا ہے۔ وہی دوسرے کو دیا جاتا ہے۔ تمہاری فطرت میں لالچ مکاری اور عیاری تھی۔ جو تم نے سیفون کو دی۔ میرے پاس محبت اور درگزر کرنے کا جذبہ ہے۔ جو میں تمہیں دے رہا ہوں۔"

اس نے بریف کیس بند کر کے انور زمان کی طرف بڑھا دیا اور پھر سیفون کی طرف رخ کر کے بولا۔

"سیفون تم اس سزا کے بارے میں کیا رائے رکھتی ہو؟"

"سبحان اللہ سبحان اللہ یہ بڑی انوکھی سزا ہے۔" سیفون کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"لیکن ایسی سزا جسے یہ مرنے کے بعد بھی یاد رکھے گا۔ سیفون یہ دولت بہت بڑی ہے۔ اس کے سہارے یہ لالچی انسان اپنی جوانی کو رنگین بنا سکتا ہے۔ یہ اس دولت کے سہارے پرتعیش زندگی گزارنے گا اور اس کی ساری جوانی خاک میں مل جائے گی دولت کبھی کسی کا ساتھ نہیں دیتی۔ ایک دن یہ اس کے پاس ختم ہو جائے گی لیکن اس کا سارا وجود سہل پسندی کا عادی ہو چکا ہوگا اور پھر بچی کچی زندگی میں یہ مارا مارا پھرے گا۔ انسان کے پاس اس کی سب سے بڑی دولت اس کے بازوؤں کی جدوجہد ہوتی ہے۔ میں اس دولت کے ذریعے اس کے بازو ناکارہ کر رہا ہوں جاؤ جو ان یہ بریف کیس یہاں سے لے کر چلے جاؤ اور سنو..... آئندہ اس علاقے میں یا اس بستی میں نظر مت آنا۔ یہ خزانہ چونکہ اب تمہاری نظروں میں آ چکا ہے۔ اس لیے اب یہ یہاں نہیں ہوگا۔ جاؤ کہیں میری سیفون کی توہین مجھ سے میری ریاضت نہ چھین لے۔"

بدر شیر کی آواز غراہٹ میں بدل گئی اور انور زمان جیسے کسی سحر سے آزاد ہو گیا۔ اس نے بادل نخواستہ بھاری بریف

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کیس اٹھا لیا اور اسے لیے ہوئے باہر کی طرف دوڑنے لگا۔ تاروں کی چھاؤں میں وہ چھوٹی چھوٹی چٹانیں پھلانگتا ہوا دوڑ رہا تھا اور اس کے قدموں کی آواز نے ہی پہاڑوں میں سرگردان چراغ جان کو اس کا نشان بتایا۔ آہ..... اس نے خزانہ حاصل کر لیا۔ وہ خزانہ لے کر یہاں سے بھاگ رہا ہے۔ چراغ جان کے حلق سے غراہٹ نکلی۔

"کتے تو یہ دولت لے کر یہاں سے فرار نہیں ہو سکتا۔ میں نے بھی اس کے حصول کے لیے بڑی جدوجہد کی ہے۔ انور زمان میں بھی تو یہ ہی چاہتا ہوں۔" چراغ جان کے ہاتھ میں دبے ہوئے پستول سے دو گولیاں نکلیں اور انور زمان کی چیخ فضا میں لہرا گئی۔ چند ہی لمحوں میں چراغ جان دوڑتا ہوا اس کے سر پر پہنچ گیا اور پھر اس نے سنہرے سکوں سے بھرا ہوا بریف کیس اپنے قبضے میں کیا اور تاریکی میں دوڑنے لگا اس کے ذہن میں سیفون کا خیال بھی آیا تھا۔ اس نے راتوں رات اس بستی سے فرار ہونے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اِدھر گولیوں کی آواز پر سیفون اور بدر شیر باہر نکل آئے تھے۔ نیچے پستیوں میں انہوں نے ایک پست انسان کو ایڑھیاں رگڑتے ہوئے دیکھا۔ دوسرا بریف کیس لیے دوڑا چلا جا رہا تھا۔ وہ لوگ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے آگے بڑھے اور انور زمان کے نزدیک پہنچ گئے جو دم توڑ چکا تھا۔

"یہ خدا کا فیصلہ ہے جو اس کے ساتھ بھی ہوگا آؤ۔ سیفون بستی چلیں اور سنو اب تم مجھ سے دوبارہ ملنے کی کوشش نہیں کرو گی۔ میں تمہارے گھر آؤں گا۔ کچھ بزرگوں کے ساتھ اور تمہیں خدا کے قانون کے دائرے میں رہ کر گھر لے آؤں گا۔ آؤ..... ہمیں بستی والوں کو اس حادثے کی خبر بھی دینی ہے۔"

ابھی یہ الفاظ بدر شیر کے منہ سے نکلے ہی تھے۔ کہ انہوں نے ایک اور چیخ سنی جو لہراتی ہوئی گہرائیوں کی جناب آ رہی تھی۔ یہ چیخ اس دوسرے بڑے اور لالچی انسان کی تھی۔ جو خزانہ ہاتھ میں آ جانے کے بعد بے حواس ہو گیا تھا اور اپنے سامنے موجود کھائی کو نہیں دیکھ سکا تھا۔ جو اس کے استقبال کے لیے تیار تھی۔

"اور خدا کے فیصلے بھی آخری حیثیت رکھتے ہیں انسان کی اپنی سوچ بے معنی ہوتی ہے۔ کچھ نہیں ملتا اپنے طور پر سوچنے والے کو۔ صندل وادی بے شک ماضی قدیم میں مشکلات کا شکار رہتی تھی لیکن وہاں کا سکون دیکھنے کے قابل تھا۔" آنی ماں کے منہ سے نکلا پھر وہ بولی۔

"اور یہ ایک پرانی بات ہے۔ اس کے بعد صندل وادی کی شکل بدل گئی۔"

"آنی ماں..... اس کے بعد صندل وادی کی شکل بدل گئی۔ وہ لوگ مصائب اور مسائل کا شکار تھے۔ کوئی ایسی آنکھ انہیں دیکھنے والی نہیں تھی۔ جوان کے مشکل حالات میں ان کی مدد کرتی۔ جو کہانی ختم ہوتی اس کے بعد برسوں صندل وادی ان لوگوں کے زیر اثر رہی۔ جنہوں نے وہاں صنعتی ادارے قائم کر رکھے تھے اور پھر آنی ماں میں جوان ہو گئی۔ میں نے شروع ہی سے یہ بات محسوس کی تھی کہ صندل وادی پر باہر کے لوگوں کا قبضہ ہوتا جا رہا ہے۔ چنانچہ آنی ماں میں نے خفیہ طور پر کام کرنا شروع کر دیا۔ وہ آبشار جو کسی بھی طرح نیاگرہ آبشار سے کم نہیں تھا اور وہ صندل وادی کے مشرقی سمت میں تھا اور جسے ان لوگوں نے ایک ڈیم کی شکل میں تبدیل کر دیا تھا اور وہ آہستہ آہستہ صندل وادی کے اطراف پر قابض ہوتے جا رہے تھے آنی ماں! میں نے محسوس کیا کہ کچھ عرصے کے بعد صندل وادی غیروں کے قبضے میں ہوگی۔ جبکہ میری نگاہیں دور دور تک دیکھ رہی تھیں۔ میں صندل وادی کا روشن مستقبل دیکھ رہی تھی لیکن روشن مستقبل کی تلاش کے لیے روشنیوں ہی کے سہارے لینا ہوتے ہیں چنانچہ میں نے اپنے طور پر کوششیں شروع کر دیں۔ پانچ آدمی تھے۔ اس وقت میرے ساتھ آنی ماں! صرف پانچ آدمی۔ جنہوں نے میری بھرپور مدد کی میں نے اس ڈیم میں ایک جگہ بڑا سوراخ کرنا شروع کر دیا اور یہ سوراخ اتنا بڑا ہو گیا۔ کہ میری ضروریات پوری ہو جائیں۔ تو آنی ماں

میں نے اس سوراخ میں بارود کا ذخیرہ کرنا شروع کر دیا۔ میرے ذہن میں ایک بڑا منصوبہ تھا۔ میں نے اس سوراخ کو بارود سے بھر دیا۔ اتنا بارود جمع ہو گیا وہاں کہ جب اسے آگ دکھائی جائے تو وہ پورے ڈیم کو اڑا دے آنی ماں! آخر کار میں نے اپنے منصوبے پر عمل کیا۔ میرے دو آدمیوں نے جان کی قربانی دی اور اس بارود کے ذخیرے کو آگ دکھا دی۔ ڈیم میں اتنا خوفناک دھماکہ ہوا کہ بے شمار مکانات گر گئے ان دونوں آدمیوں کا نام و نشان نہ رہا۔ جنہوں نے ڈیم اڑایا تھا اور ڈیم کے پانی نے اس نئی آباد شدہ بستی کی طرف رخ کر لیا اور آنی ماں اس بستی میں بسنے والا ایک ایک شخص فنا ہو گیا۔ وہاں کچھ نہ رہا بلکہ طویل عرصے تک وہ علاقہ جھیل بنا رہا۔

تعزیتی پیغامات آئے۔ حکومت کی جانب سے بڑے افسوس کا اظہار کیا گیا۔ ڈیم کے تباہ ہونے کی تحقیقاتیں شروع ہو گئیں۔ پھر رفتہ رفتہ علم ہوا کہ حکومت کی طرف سے جب بھی وہاں کوئی وفد آتا واپس نہیں جاتا تھا۔ وہ پراسرار طریقے سے غائب ہو جاتا تھا اور اس طرح میں نے اپنے بے شمار ہموا پیدا کر کے صندل وادی کو باہر کی دنیا سے محفوظ کیا اصل میں صندل وادی کی حقیقت کو کبھی تسلیم ہی نہیں کیا گیا۔ وہ لوگ جو لوگ پہلے صندل وادی کے رہائشی تھے۔ اس بات پر غور نہیں کر پائے تھے۔ کہ صندل وادی کو اس طرح استعمال کیا جا سکتا تھا۔

آنی ماں! اس کے اردگرد موجود پہاڑ اور باقی تمام چیزیں جس طرح ناقابل تسخیر ہیں۔ آپ نے دیکھ لیا ہوگا۔ میں نے گہری نگاہوں سے اس کا جائزہ لیا تھا۔ پھر میں نے ایک بھرپور تعلق قائم کیا اور صندل وادی کو ایک قلعہ بنا دیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ صندل وادی والوں نے میرا بھرپور ساتھ دیا اور انہی کی مدد سے میں نے سب کچھ کیا۔ یہاں تک کہ جب صندل وادی میری مرضی کے مطابق ہو گئی تو میں نے اس میں منشیات کی کاشت کا آغاز کیا اور آنی ماں میں نے بھرپور طریقے سے اپنی قوم اپنے لوگوں کو ان کی ضرورتوں سے بہرہ ور کیا۔ آنی ماں وہ لوگ دولت مند سے دولت مند ترین ہوتے چلے گئے۔ تب پھر میں نے اس کے بعد انجلز کارپوریشن سے رابطہ قائم کیا اور آج صندل وادی جس شکل میں ہے۔ آپ دیکھ رہی ہیں۔ یہ ناقابل تسخیر ہے۔ اگر پوری فوج بھی اس پر حملہ آور ہوتی ہے۔ تو ہم اسے بدترین شکست سے دوچار کر سکتے ہیں۔ آنی ماں...... یہ سب کچھ میں نے کہا ہے۔ سو آنی ماں...... میں نے صندل وادی کی بھرپور حفاظت کی اور اسے اس قابل بنا دیا۔ یہ میرا مزاج ہے آنی ماں! کہ میں اپنی مرضی کے خلاف کسی چیز کو قبول نہیں کرتی۔

آنی ماں! میں نے یہ ہی کیا ہے۔ آج تک جہاں تک میرے شوہر اور میرے بیٹوں کا تعلق ہے۔ تو وہ بے شک میری ضرورت تھے لیکن میں اپنے مزاج کے خلاف کسی کو برداشت نہیں کر سکتی۔ آنی ماں جس نے بھی میری مخالفت کی یا میرے مزاج سے الگ کام کیا میں نے اسے اپنے راستے سے ہٹا دیا۔ سچ پوچھو تو آنی ماں! میں نے اپنی قوم کی خدمت کی ہے۔ اتنی خدمت کی ہے کہ میں آپ کو بتا نہیں سکتی۔ بہت محنت کی ہے میں نے آنی ماں! بہت محنت کی ہے لیکن یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ میری محنت کا کوئی دوسرا فائدہ اٹھاتا۔"

"بے شک تو نے اپنی قوم کے لیے محنت کی لیکن باقی دنیا تو نے بھلا دی بخت جان دنیا میں اور بھی تو رہتے ہیں۔ ان سب کے ساتھ کیا کیا تو نے اور پھر کیا نہیں ہوا تیرے ساتھ۔ بول کون ہے اس وقت دنیا میں تیرا کیا کرے گی ان ساری چیزوں کو۔ کیا موت سے لڑ سکتی ہے تو۔ کیا تو یہ سوچتی ہے کہ تو ہمیشہ قائم دائم رہے گی۔ جواب دے مجھے خان زادی جواب دے مجھے۔"

"میں مر گئی آنی ماں...... مر گئی آنی ماں۔ آخر کار مجھے موت آ گئی۔ اس کم بخت نے میرا دل چھین لیا ہے۔ مجھے بتاؤ آنی ماں کیا کروں۔ وہ میرا پوتا ہے۔ آنی ماں! میں اس کی دادی ہوں۔ لیکن وہ مجھے نہیں جانتا میں نے اپنے بیٹوں کو اپنے ہاتھوں سے قتل کر دیا لیکن وہ کم بخت آنی ماں! میں کیا کروں میری مدد کرو دیکھو! آپ کو میری مدد کرنا ہو گی۔ میں کبھی کسی اور سے مدد نہیں مانگتی۔ یہ لفظ صرف تمہارے سامنے زبان پر آیا ہے۔"

"میں کیا مدد کر سکتی ہوں تیری؟"

"مجھے بتاؤ کہ میں کیسے اسے تلاش کروں۔ کیسے اسے اپنی جانب راغب کروں۔ ایک نگاہ دیکھا ہے اسے اور میرا دل اس کے لیے ہی تڑپتا رہتا ہے۔ پاگل ہو گئی ہوں میں اس کے لیے آنی ماں مجھے بتاؤ۔ میں چاہتی ہوں کہ وہ صندل وادی آئے اور میں اپنا یہ سارا کاروبار زندگی اس کے حوالے کر دوں۔ صندل وادی کا حکمران بناؤں اسے اور وہ صندل وادی میں عیش و آرام کی زندگی بسر کرے۔ آنی ماں! میں...... میں......" اچانک ہی خان زادی اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔ وہ خاموشی سے آنی ماں کے پاس سے اٹھ کر ایک جانب چل پڑی تھی۔ زیر زمین تہ خانے میں داخل ہو کر اس نے بڑی بڑی ٹرانس میشن پر کام شروع کر دیا۔ اس نے کسی کو مخاطب کر کے کہا۔

"ڈاکٹر کلاؤڈ...... ڈاکٹر کلاؤڈ میں خان زادی بول رہی ہوں۔"

"میں...... آپ کا خادم ڈاکٹر کلاؤڈ خان زادی۔"

"ڈاکٹر کلاؤڈ...... میرے ذہن میں ایک تصویر ہے۔ اس تصویر کو حاصل کرو اور دنیا کے گوشے گوشے میں اسے پھیلا دو۔ جہاں جہاں ہمارے کارکن موجود ہیں انہیں یہ تصویر فراہم کر دو اور ان سے کہو کہ تصویر والے نوجوان کو جس طرح بھی ہو اپنے قبضے میں کریں۔ اسے تلاش کرو اور اسے صندل وادی تک لے آؤ۔ یہ اعلان کر دو ڈاکٹر کلاؤڈ کہ شاہ ور کو صندل وادی تک پہنچانے والے کو ایک ارب ڈالر انعام دیا جائے گا اور خان زادی اپنے منہ سے جو کچھ کہتی ہے اس سے کبھی گریز نہیں کرتی۔ ایک ارب ڈالر اسے دیا جائے گا ڈاکٹر کلاؤڈ اور تمہارا انعام الگ۔"

"میڈم ڈاکٹر کلاؤڈ آپ کا خادم ہے۔ آپ کا پیغام ہر جگہ پہنچا دیا جائے گا۔ اب براہ کرم زیرو ٹاک پر آ جائیے۔ میں آپ کے دماغ سے وہ تصویر حاصل کروں گا۔ جسے مجھے پھیلانا ہے۔ آپ کی نگاہیں زیرو ٹاک اسکرین پر ہونی چاہئیں۔ میں تصویر صحیح طور پر حاصل کر لوں۔ تو آپ اسے لیس کر دیجیے۔"

"ٹھیک ہے۔" خان زادی نے کہا اور وہاں سے اُٹھ کر ایک دوسری مشین کے سامنے پہنچ گئی۔ اس نے مشین کے کچھ بٹن آن کیے اور مشین کے سامنے پڑی ہوئی کرسی پر جا بیٹھی اس نے کرسی پر لگے ہوئے ہک اپنے سر پر باندھے اور اس کے بعد مشین کے کچھ بٹن آن کر دیے۔ ایک تیز روشنی اس کے سر پر پڑنے لگی۔ وہ اس کے ماتھے کے عین درمیان ایک چھوٹے سے دائرے کی شکل اختیار کرنے لگی اور پھر سامنے والی اسکرین پر کچھ خاکے ابھرنے لگے۔ ناک، سر، آنکھیں، کان، بال، اور تھوڑی دیر کے بعد شاہ ور کی تصویر اسکرین پر نمایاں ہو گئی۔ خان زادی اس وقت شاہ ور کے چہرے کو ذہن میں لائے ہوئے تھی۔ اس نے کہا۔

"لیس...... یہ ہی چہرہ ہے۔" روشنی کا ایک تیز جھماکا ہوا اور اس کے بعد ڈاکٹر کلاڈ کی آواز ابھری۔

"لیس خان زادی کام ہو گیا ہے۔ تصویر حاصل کر لی گئی ہے۔"

"او کے۔" خان زادی نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔

☆

پندرہ دن تک اسے ایمروگے کے بارے میں بریف کیا جاتا رہا تھا۔ اسے ایمروگے کے ایک ایک گوشے سے روشناس کرایا گیا تھا اور اس کی یادداشت میں یہ تمام چیزیں رکھی گئی تھیں۔ شاہ ور کی کیفیت بحال ہوتی جا رہی تھی۔ وہ لوگ اس کے لیے جو کچھ بھی کر رہے تھے۔ شاہ ور اس سے بھی واقف تھا اور اسے اپنا ماضی بھی یاد آتا جا رہا تھا۔ بے شمار باتیں اس کے ذہن میں گردش کر رہی تھیں۔ غالباً ان کی کسی ایسی سائنسی کارروائی سے شاہ ور کے ذہن کی وہ رگیں کھلی تھیں۔ جو کچھ عرصے پہلے اسی اپنے آپ سے بیگانہ کیے ہوئے تھیں اور اب اسے سب کچھ یاد آ رہا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اپنا در..... اپنا گھر..... اپنا سب کچھ اپنی زندگی ڈاکٹر فولاد وزیر پاشا اپنی ماں۔ وہ تمام چیزیں آہستہ آہستہ اس کے ذہن میں گردش کرتی جارہی تھیں اور آخر کار ایک دن اسے یاد آ گیا کہ وہ شاہ ور ہے۔ شاہ..... ور صرف شاہ ور جو جیل میں پیدا ہوا اور جس نے جیل میں پرورش پائی۔ باہر کی دنیا میں آیا تو دنیا سے روشناس نہیں تھا۔ وزیر پاشا نے اور اس کے بعد سب ہی نے مل کر اس کے لیے کچھ نہ کچھ کیا اور وہ اپنی اصلیت میں آ گیا لیکن سب سے بڑا ظلم اس کے ساتھ یہ ہوا تھا کہ اس کی ماں اس سے چھین لی گئی تھی۔ اس کی ماں اس کے ساتھ نہیں تھی۔ وہ کہاں ہے۔ زندہ ہے۔ یا نہیں اس دنیا سے جا چکی ہے۔ کچھ نہیں معلوم تھا اسے بس ایک حسرت اس کے دل میں دن رات رہتی تھی وہ یہ کہ اس کی ماں اسے مل جائے۔ بارہا اس نے دنیا میں رہنے والوں کے بارے میں سوچا تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ اس دنیا کے لوگ کس طرح آرام اور آرائش کی زندگی گزارتے ہیں کوئی مشکل نہیں ہوتی انہیں اور وہ اپنی پسند کی زندگی گزار کر زندہ رہتے ہیں۔ یہ ساری باتیں اس کے اپنے ذہن میں آتی تھیں اور وہ بڑا رکھ محسوس کرتا تھا کہ اس کی ماں اس کے پاس نہیں ہے۔ کاش زندگی کی ہر شے اس سے چھین لی جاتی بس اسے اس کی ماں سے ملا دیا جاتا۔ تو وہ اپنے آپ کو دنیا کا سب سے خوش نصیب انسان سمجھتا۔

اِدھر ڈینوکا اسے اپنی امیدوں کا مرکز بنائے ہوئے تھا اور اعلیٰ درجے کی اس کی تربیت کر رہا تھا۔ وہ اسے بہت جلد ایمرو گے بھیجنا چاہتا تھا۔ اس نے اسے بتا دیا تھا کہ ایمرو گے میں سے کیسے کیسے لوگوں سے واسطہ پڑے گا۔ اس نے ایمرو گے کے حکمران بگ ہارڈو کے بارے میں بتایا تھا۔ کہ بگ ہارڈو بہت ہی سخت گیر انسان ہے۔ انسانوں کو زندگی سے موت کی طرف دھکیل دینا اس کے لیے دنیا کا سب سے آسان کام ہے اور جب وہ بگ ہارڈو کے مقابلے پر آئے گا۔ تو اسے اپنی زندگی کی سخت ترین جدوجہد کرنا پڑے گی۔ شاہ ور نے اپنے آپ کو اس کے لیے آمادہ ظاہر کر دیا تھا۔

اب اپنی اصل حیثیت میں واپس آنے کے بعد وہ جانتا تھا کہ ان تین افراد سے اسے نمٹنا ہے۔ ساگان ہری ڈان فارگوس اور ڈینوکا۔ لیکن اس کے دل میں خشیات کے ان سوداگروں کے لیے مسلسل نفرت ہی نفرت پروان چڑھ رہی تھی اور اس کی دلی آرزو تھی کہ ان میں سے جس کو جتنا نقصان پہنچا سکتا ہے۔ پہنچائے۔

آخر کار ڈینوکا نے اس کی روانگی کے لیے تیاریاں مکمل کر دیں۔ ڈینوکا نے اس سے کہا۔

"میں تمہیں نہ زمینی ذرائع سے بھیجوں گا اور نہ فضائی ذریعے سے۔ کیونکہ بگ ہارڈو نے اس سلسلے میں تمام تر انتظامات کر رکھے ہیں ہاں۔ اگر وہ کمزور ہے تو سمندری راستوں سے اور اس نے اس جانب کبھی کوئی بڑی توجہ نہیں دی ہے۔ کیونکہ اس کے خیال میں اسے کبھی کوئی سمندری خطرہ درپیش نہیں ہو سکتا۔" ڈینوکا نے آخری بات کہی۔

"ایک آبدوز تمہیں لے کر ایک مخصوص علاقے تک جائے گی اور وہاں سے ایک کشتی تمہیں ساحل تک پہنچائے گی۔ جو ماہی گیروں کی کشتی ہوگی۔ ساحل پر تمہیں یوگان یا اس کے آدمی ملیں گے۔ یوگان کو دیکھ کر حیران نہ ہونا کیونکہ وہ میرا دوسرا روپ ہے لیکن ذرا مختلف انداز کا آدمی بس یوں سمجھ لو کہ وہاں تم مجھے یوگان ہی کا درجہ دو گے اور یوگان تمہیں بتائے گا کہ ڈیمونا کی تشکیل کے لیے تمہیں کس انداز میں کام کرنا ہے۔ بس یوں سمجھ لو کہ تم پر ایک بہت بڑا بھروسہ کیا جا رہا ہے کیا سمجھے؟" شاہ ور نے گردن ہلا دی تھی۔

اب اپنی اصل حیثیت میں آنے کے بعد اس کی تمام ذہنی قوتیں بھی جاگ اٹھی تھیں اور وہ سمجھتا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ بہر حال کسی آبدوز کے ذریعے سفر کرنا اس کی زندگی کا پہلا تجربہ تھا۔ آبدوز کا عملہ بالکل خاموش تھا اور وہ شاہ ور کو بہت احترام دے رہا تھا۔ اس احترام کے ساتھ وہ اپنی منزل پر پہنچ گیا۔ ایمرو گے تک کا سفر ایک یادگار سفر تھا اور پھر آبدوز نے انتظار کیا دن کی روشنی میں وہ اپنی کارروائی نہیں کر سکتے تھے۔

چنانچہ رات کی تاریکی میں وہ سطح سمندر پر بلند ہوئی وہ کشتی جو بادبانی کشتی تھی۔ آبدوز سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھی۔ غالباً ان لوگوں کو مکمل طور پر تربیت دے دی گئی تھی۔ چنانچہ شاہ ور کو بہت ہی شاہانہ طریقے سے کشتی پر منتقل کر دیا گیا اور کشتی پر موجود عملے کے افراد اسے لے کر چل پڑے پھر وہ ساحل پر پہنچ گئی۔ ساحل پر بھی انتہائی پراسرار طریقے سے اس کو خوش آمدید کہا گیا اور وہ لوگ وہاں سے اسے لے کر چل پڑے۔

خاصا سفر پیدل ہی طے کیا گیا۔ کیونکہ یہاں ریت کے ٹیلے بکھرے ہوئے تھے اور کسی قسم کی سواری یہاں نہیں آ سکتی تھی لیکن ریت کے ٹیلوں کے اختتام پر انہیں ایک ٹوٹی پھوٹی جیپ نظر آئی جس کا انجن کھڑ پھڑ بولتا تھا۔ یہاں ایک شخص نے اس سے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

"سر میرا نام وارڈو ہے اور میں آپ کا غلام خاص ہوں اور یوں سمجھ لیجیے کہ میرا اور آپ کا ساتھ رہے گا۔ آیئے چلتے ہیں۔" شاہ ور نے کوئی جواب نہیں دیا۔ جیپ پھڑ پھڑ کرتی ہوئی آخر کار ایک عمارت تک پہنچ گئی یہ عمارت بھی باہر سے بوسیدہ تھی لیکن اندر کا منظر دیکھ کر شاہ ور حیران رہ گیا کیونکہ اندر سے یہ عمارت خاصی شان دار تھی۔ یہاں یوگان نے اس سے ملاقات کی اور یوگان کے ساتھ ہی ہیلی بھی تھی۔ ایک تیس بتیس سالہ لیکن نہایت خوبصورت عورت جس نے مسکراتی نگاہوں سے شاہ ور کو دیکھا اور بولی۔

"خوبصورت لوگ میری کمزوری ہیں لیکن یہ نہ سمجھنا کہ میں انہیں غلط انداز میں حاصل کرنے کی کوشش کروں گی۔ تم بہت پیاری شکل وصورت کے مالک ہو۔ مسٹر یوگان مجھے خوشی ہے کہ آپ نے مسٹر شاہ ور کو میرے ساتھ شامل کیا۔"

شاہ ور کو یہاں اس بات کی خوشی تھی کہ یہاں کم از کم یہ لوگ اسے اس کے اصل نام سے پکار رہے تھے۔ ویسے لاتعداد باتوں میں وہ بالکل کورا تھا اور اسے نہیں معلوم تھا کہ یوگان اسے کس انداز میں جانتا ہے لیکن حیرت کا دوسرا پہاڑ اسے یوگان کی صورت دیکھ کر ہوا تھا۔ درحقیقت وہ یوگان نہیں بلکہ ڈینوکا تھا۔ سو فیصدی ڈینوکا جسامت' آواز' مسکراہٹ' سب کچھ ڈینوکا جیسی ہی تھی اور اگر شاہ ور یہ سمجھنے کی کوشش کرتا کہ درحقیقت وہ یوگان کے روپ میں ڈینوکا ہی ہے تو غلط نہیں تھا اور اگر یہ صرف مماثلت تھی۔ تو اسے دنیا کی حیرت انگیز مماثلت کہا جا سکتا تھا۔ کیونکہ چہرے بہر طور اتنے نہیں ملتے لیکن جو کچھ نگاہوں کے سامنے تھا وہ بھی الگ نہیں تھا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ یہ شخص بالکل ڈینوکا کا ہم شکل ہے۔ چند رسمی باتیں ہوئیں اور اس کے بعد ہیلی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اور ابتدائی میزبانی جو ہوتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ مہمان کو آرام کا پورا پورا موقع دیا جائے تاکہ وہ کام کرنے کے لیے چاک وچوبند ہو جائے۔"

"میں کام کرنے کے لیے تیار ہوں۔ اس چیز کی پرواہ نہ کی جائے کہ میں تھکا ہوا ہوں۔"

"نہیں یہ پرواہ کرنا تو ضروری ہے مسٹر شاہ ور' ظاہر ہے ہم آپ کے میزبان ہیں اور آپ کی ہر خوشی ہمیں زندگی کی طرح عزیز ہے۔"

"شکریہ' آپ لوگ بہت اچھے ہیں۔" شاہ ور نے جواب دیا۔

"ابھی کہاں ہماری اچھائیاں تو آہستہ آہستہ آپ کے علم میں آئیں گی۔ آیئے۔" ہیلی بے تکلفی سے اسے اپنے ساتھ لے کر چل پڑی وارڈو بھی ساتھ تھا۔ ان لوگوں کا رویہ شاہ ور کے ساتھ بہت ہی اچھا تھا۔

پھر اس کے بعد شاہ ور ان لوگوں سے گھلتا ملتا چلا گیا تقریباً ایک ہفتہ انہوں نے اسے مختلف معاملات سمجھانے میں خرچ کیا تھا۔ پھر یوگان نے اس سے ملاقات کی۔

"یوں سمجھ لو مائی ڈیئر شاہ ور کہ مسٹر ڈینوکا نے جو تم پر ذمہ داریاں عائد کی تھیں۔ ان کا آغاز بس کچھ وقت میں ہونے والا ہے۔"

"ایک سوال کر سکتا ہوں مسٹر یوگان۔"

"ضرور....."

"آپ ڈینوکا کے اس قدر ہمشکل کیوں ہیں؟"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

”سو فیصدی اتفاق...... بلکہ یوں سمجھ لو کہ دنیا کا حیرت انگیز اتفاق۔ اگر تم ہمارے درمیان کوئی رشتہ تلاش کرنا چاہتے ہو تو خدا کے لیے ایسا نہ کرنا۔ خیر مختصر طور پر میں تم کو بتادوں۔ کہ بگ ہارڈو کی ایک کمزوری ہمارے پاس موجود ہے۔ یہ کمزوری ایک لڑکی کی شکل میں ہے۔ جسے ہم لوگ ایلاسی کا نام دیتے ہیں۔ یہ نام بھی ہمارا اپنا تراشہ ہوا ہے۔ اصل میں ایلاسی ایک خاص قبیلے پورنا کی باشندہ ہے اور پورنا یوں سمجھ لو کہ ایمروگے کا سب سے بڑا اور طاقتور قبیلہ ہے۔ بگ ہارڈو اگر خوفزدہ ہے تو صرف پورنا قبیلے سے اور ایلاسی اس قبیلے کے کسی ایسے اہم فرد کی بیٹی ہے۔ جو یوں سمجھ لو کہ ایمروگے میں تباہی مچا سکتا ہے۔

بگ ہارڈو نے قبیلے کے سردار سے ایلاسی کے تحفظ کی ذمے داری قبول کی تھی لیکن لڑکی ہمارے قبضے میں آچکی ہے۔ فی الحال یوں سمجھ لو کہ ڈینوکا ہی کہ ایماپر اس لڑکی کی ذمہ داری تمہیں دی جائے گی تمہیں اسے قابو میں کرنا ہے۔ تم یہ سمجھ لو کہ اگر لڑکی ہمارے قابو میں آگئی تو ہم بہت زبردست کامیابیوں سے دوچار ہوسکیں گے۔“ شاہ ور کو یہ سب کچھ بہت دلچسپ محسوس ہوا تھا۔ بہر حال اسے بڑے اعتماد کے ساتھ یہاں پر بلایا گیا تھا۔ اسے یہ بھی اندازہ ہوگیا تھا کہ لڑکی کافی خطرناک ہے اور کسی عام آدمی کے بس کی بات نہیں ہے کہ اس کی نگرانی کر سکے۔“

یوگان نے کہا۔ ”میں تمہیں ایک بات اور بتانا چاہتا ہوں۔ یقینی طور پر تم یہ معلوم کرنا چاہو گے وہ لڑکی آخر ہے کیا تو اس کے لیے بس اتنا سمجھ لو کہ یہ ایک مشترکہ راز ہے اور راز کو راز رکھنا ضروری ہے۔ کیونکہ اسی میں ہماری زندگی کا راز پوشیدہ ہے۔ یہ راز بے شک کھلے گا لیکن اپنے مخصوص وقت پر۔ تم یقیناً اس کے بارے میں تجسس کا شکار ہو گے اور اس کی قربت پانے کے بعد ہو سکتا ہے۔ تم پر بہت سے انکشافات ہوں لیکن میں چاہتا ہوں کہ تم اس سے متعلق ہر راز اپنے سینے میں رکھو اور اگر کوئی بہت ہی اہم بات معلوم ہو تو ... مجھ تک

منتقل کردو۔ تم یقین کرو کہ وہ ہم لوگوں کے لیے بڑی قیمتی اہمیت کا حامل ہے اور ہم اس کے لیے زندگی اور موت کی بازی لگائے ہوئے ہیں۔ وہ سرکش تندخو اور خطرناک ہے۔ کسی بھی وقت اس سے کسی بھی عمل کی توقع کی جاسکتی ہے۔ ہمارا ایک خاص آدمی مونٹے اس کی خاص نگرانی کے لیے مخصوص کردیا گیا ہے۔

بس یوں سمجھ لو کہ وقت آنے پر تمہیں اس کے بارے میں سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔ اگر میں تمہیں وقت سے پہلے کچھ بتانے کی کوشش کروں گا تو ایک ایسی بدعہدی کا مرتکب ہوں گا جو مجھے سزائے موت تک دلوا سکتی ہے۔ میں تمہاری زبان سے سننا چاہتا ہوں کہ کیا تم اس سلسلے میں میرے ساتھ تعاون کرو گے۔“

”مجھے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ میں تو یہاں آیا ہی اس لیے ہوں۔“

”تم اسے دیکھو گے تو بہت سی باتیں تم پر منکشف ہوں گی۔ مثلاً اس کا لباس جو بوسیدہ رہتا ہے اور حلیہ اتنا خراب رہتا ہے کہ وہ کسی کو اپنے قریب نہیں آنے دیتی اس نے کئی افراد کو زخمی کردیا۔ ایک عورت جو اسے غسل کرا کر سنوارنا چاہتی تھی۔“

”کیا وہ ہماری زبان بولتی ہے۔“

”شاید بول سکتی ہے لیکن بولتی نہیں ہے۔“

”اور قبیلہ پورنا کیا ہے؟“

”یوں سمجھ لو کہ وہ ایک انتہائی پراسرار جگہ ہے تم اگر اس سلسلے میں کوئی معلومات حاصل کرنا چاہو۔ تو معلوم کرو۔“ شاہ ور ایک گہری سانس لے کر خاموش ہوگیا بڑا عجیب و غریب تاثر پیدا کردیا گیا تھا اس لڑکی کے بارے میں حالانکہ ڈینوکا نے اسے بہت ساری ذمے داریاں دینے کی کوشش کی تھی اور اسے تربیت بھی دی گئی تھی لیکن یہاں اسے صرف اتنا کام بتایا گیا تھا۔ کہ اس لڑکی کی نگرانی کرے۔ بہر حال اس نے اپنے طور پر فیصلہ کرلیا تھا کہ اس سلسلے میں اسی انداز میں کام کرے گا جس طرح یوگان کہہ رہا ہے یوگان

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نے کہا۔

”تم اپنی ضرورت کے مطابق کچھ افراد کو اپنے ساتھ رکھ سکتے ہو۔ اس وقت مونٹے موجود نہیں ہے۔ وہ کسی کام سے گیا ہوا ہے۔“

”لڑکی کے پاس میں کیسے جاسکتا ہوں۔“

”تمہیں وہاں پہنچا دیا جائے گا اور سمجھ لو کہ اس تک پہنچنے کے بعد یہیں سے تمہاری ذمے داری کا آغاز ہو جائے گا۔ یہ ذمہ داری وارڈو کے سپرد کی گئی تھی۔“ شاہ ور نے وارڈو سے سوال کیا تو اس نے کہا۔

”جناب عالی! میں ہی آپ کو اس تک پہنچاؤں گا اور لڑکی کی دیکھ بھال کی سلسلے میں جیسا کہ میں نے آپ سے ذکر کیا آپ کی معاونت مجھے ہی کرنی ہے۔ بہر حال شاہ ور نے اس سلسلے میں بڑی سنسنی محسوس کی تھی۔ اس کے دل میں اس لڑکی کو دیکھنے کی خواہش بھی بیدار ہوگئی تھی۔ جس نے اتنے بڑے گروپ کو چکرا کر رکھ دیا تھا۔ جب شاہ ور وارڈو اور چار آدمیوں کے ساتھ اس جگہ پہنچا جہاں یہ لڑکی موجود تھی۔ تو اس نے اپنے آپ کو بڑی سنسنی کا شکار محسوس کیا۔ پھر پہلی بار اس نے اس لڑکی کو دیکھا اور دیکھتا رہ گیا۔ جنگلی پھول معلوم ہو رہی تھی۔ بڑا حلیہ بنا ہوا تھا لیکن اس کا حسن بے مثال تھا۔ دیوار سے کمر لگائے ہوئے بیٹھی تھی۔ شاہ ور اندر داخل ہوا تو اس نے اس کی جانب رخ بھی نہیں کیا۔ شاہ ور اس کا جائزہ لیتا رہا۔ پھر اس نے کہا۔

”یہ کمرا بہت گندہ ہو رہا ہے اور اس کا لباس بھی۔ تم اس کے لیے لباس کا بندوبست کرو۔“ وارڈو کے چہرے پر خوف کے ہلکے سے آثار پیدا ہوگئے۔ اس نے کہا۔

”یہ انتہائی خطرناک کام ہے۔ جناب! آپ غور کر لیجیے۔“

”میں نے غور کرلیا ہے۔ لباس کا بندوبست کرو اور ایک ایسی لڑکی کا بھی جو اسے لباس تبدیل کرا سکے۔“

”ٹھیک ہے۔ جو آپ کا حکم۔“ وارڈو نے کہا اور یہ انتظام کرنے چلا گیا۔ شاہ ور آہستہ آہستہ اس لڑکی کے قریب پہنچا اور پھر اس نے اسے آواز دی۔

”مس ایلاسی! اب تک تمہارے ساتھ جو کچھ ہوتا رہا ہے۔ مجھے اس کا انتہائی افسوس ہے۔ میں تم سے یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ میرے ہاتھوں تمہیں کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی اور تم مجھے اپنی ضروریات کے بارے میں اشاروں میں بھی بتادو تو میں انہیں پوری کرنے کی کوشش کروں گا۔ کاش! تم میری بات سمجھ رہی ہو۔“ لڑکی کا چہرہ سپاٹ رہا اور شاہ ور کی گہری نظروں نے یہ اندازہ لگایا کہ وہ شاید اس کے الفاظ نہیں سمجھ سکی ہے۔ شاہ ور اس کے سامنے پہنچ گیا۔ تو لڑکی نے پہلی بار اسے نگاہیں گھما کر دیکھا۔ وہ اسے سپاٹ نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد وارڈو واپس آگیا۔ اس کے ساتھ ایک خادمہ بھی تھی۔

”چلو یہ لباس اسے پہنادو۔“

”سر!! اگر اس نے مجھے نقصان پہنچایا تو؟“

”ہم تم سے زیادہ دور نہیں ہوں گے۔“

”وہ تو ٹھیک ہے سر! لیکن......“

”کیا تم اس کام سے انکار کرنا چاہتی ہو۔ میں نے کہا ہے ناں کہ ہم دروازے پر موجود ہیں۔“ ملازمہ خاموش ہوگئی اور شاہ ور وارڈو کے ساتھ باہر نکل آیا۔ جس کمرے میں لڑکی اس وقت موجود تھی۔ اس کمرے میں باہر آنے کا ایک یہ ہی دروازہ تھا۔ جس کے سامنے یہ لوگ رک گئے تھے اور مستعدی سے باہر کی آہٹوں کا جائزہ لے رہے تھے۔ پانچ، دس، پندرہ، پچیس منٹ خاموش کھڑے گزر گئے۔ اس کے بعد خادمہ نے ہی گردن باہر نکالی تھی۔ جسے ہی دروازے پر آہٹ ہوئی۔ شاہ ور اور وارڈو چونک کر سنبھل گئے لیکن خادمہ کا مطمئن چہرہ دیکھ کر انہیں سکون ہوا تھا۔

”کیوں کیا ہوا؟“

”حکم کی تعمیل ہوگئی۔ اس نے کوئی ایسا کام نہیں کیا۔ جس سے مجھے کوئی تکلیف ہوتی۔“

”لباس تبدیل کرلیا اس نے؟“

”ہاں...... آپ اسے دیکھ سکتے ہیں۔“ شاہ ور وارڈو

کے ساتھ اندر داخل ہوگیا۔ لڑکی اندر سامنے بستر پر موجود تھی۔ اس کو دیکھ کر ایک عجیب سی کیفیت کا احساس ہوتا تھا۔ خادمہ نے اسے بالکل صاف ستھرا کر دیا تھا۔ اس کا گندہ چہرہ دھلا دیا تھا اور غالباً نہلایا بھی تھا۔ اس کے بال گیلے لیکن نہایت خوبصورت نظر آرہے تھے۔ باقی چہرہ بھی بہت ہی حسین لگ رہا تھا۔ اس کی شخصیت نکھر آئی تھی اور وہ کافی حسین لگ رہی تھی لیکن اس نے ان لوگوں کی جانب توجہ بھی نہیں دی اور خاموشی سے اس طرف بیٹھی رہی۔ شاہ ور نے خادمہ سے کہا۔

"تم انعام کے قابل ہو۔ میں تمہیں اس کارکردگی کا انعام دوں گا اور تعریف کروں گا اور اگر یہاں کوئی کام ہوا تو میں تمہیں ہی طلب کیا کروں گا۔"

"بہت شکریہ جناب! میں تو بہت ڈری ہوئی تھی۔"

"جاؤ..... اسے باہر چھوڑ آؤ وارڈو!" شاہ ور نے کہا اور وارڈو خادمہ کو لے کر باہر نکل گیا۔ شاہ ور نے لڑکی کی طرف دیکھ کر کہا۔

"تم نے جو تعاون کیا ہے۔ اس کے لیے میں تمہارا شکر گزار ہوں۔ کوئی بھی ضرورت ہو۔ جس انداز میں بھی چاہو۔ مجھ سے کہہ سکتی ہو۔ ویسے میں تمہارا خیال رکھوں گا تمہیں اس کے بعد یہاں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ آرام سے رہو۔" یہ کہہ کر شاہ ور بھی باہر نکل آیا۔ باہر آکر اس نے دروازہ بند کر دیا تھا۔ اس جانب سے مطمئن ہونے کے بعد اس نے تنقیدی نگاہ سے اس عمارت کا جائزہ لیا اور پرخیال انداز میں گردن ہلانے لگا لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہی لڑکی کے معاملے میں اس کی دلچسپی اور تجسس ابھرا ہوا تھا۔ پتہ تو چلنا چاہیے کہ یہ ہے کیا بلا۔ بڑی پراسرار شخصیت کی حامل تھی۔ بہر حال وارڈو کے مشورے سے اس نے یہ طے کیا کہ اسے اپنا ٹھکانہ بھی یہیں بنا لینا چاہیے۔ حالانکہ یوگان کی طرف سے اس پر کوئی پابندی عائد نہیں کی گئی تھی۔ اس نے یہ چار آدمی اسی لیے شاہ ور کو دیئے تھے کہ وہ ہر وقت وہاں موجود رہیں اور شاہ ور کو آسانیاں حاصل رہیں۔

بہر حال وقت گزرنے لگا ہیلی بھی اس کے ساتھ تھی اور باتیں کرتی رہتی تھی۔ اس وقت بھی وہ شاہ ور کے پاس ہی کھڑی تھی اور کہہ رہی تھی۔

"مجھے تم سے بہت شکایت ہے ڈیئر۔"

"کیوں مس ہیلی؟"

"میں تمہارے بارے میں اتنا کچھ معلوم کر چکی ہوں کہ اب تم مجھ سے چھپنا بھی چاہو تو نہیں چھپ سکتے۔"

"اچھا بڑی بات ہے۔"

"آؤ گے میرے ساتھ۔"

"کہاں؟"

"باہر۔" باہر کا منظر بھی بہت خوبصورت تھا۔ وہ شاہ ور کے ساتھ ایک گھاس کے قطعے پر جا کر بیٹھ گئی اور شاہ ور سے بولی۔ "بیٹھو..... پلیز بیٹھو۔"

"شکریہ۔"

"میں تم سے ایک آخری جواب چاہتی ہوں۔"

"کس سلسلے میں ڈیئر ہیلی۔"

"تم شاید اس بات پر یقین نہ کرو کہ انسان اس طرح کبھی کبھی مجبور ہو جاتا ہے۔ کہ بتا نہیں سکتا اصل میں' میں اپنے دل میں تمہارے لیے بہت بڑی جگہ پاتی ہوں۔ اس دور میں ہر انسان کاروباری ہے۔ بہتر مستقبل کی طرف دیکھتا ہے۔ بہر حال یہ آسائشیں تمہاری ضرورت ہیں۔ بولو ہیں یا نہیں۔"

"ہیں۔" شاہ ور نے کہا۔

"میرے دل میں تمہارے لیے محبت پیدا ہو چکی ہے۔" مسٹر شاہ ور اور اگر تم کو یہ بات معلوم ہو کہ ہم لوگ اپنے مستقبل کے لیے آزاد ہوتے ہیں۔ میں سمجھتی ہوں کہ تم اگر میرے بارے میں سوچو تو مجھے خوشی ہوگی۔ میں تمہیں اپنی زندگی میں شامل کرنا چاہتی ہوں۔" شاہ ور کی کھوپری پر بچھو ڈنک مارنے لگے تھے۔ بے باکی کا ایک ایسا اظہار تھا۔ جس کے بارے میں سوچا نہیں جا سکتا تھا۔ شاہ ور کو سوچ سمجھ کر جواب دینا تھا۔ کیونکہ بہر حال اسے جن حالات میں گزارا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کرنا پڑ رہا تھا۔ ان میں پتہ نہیں کب اور کہاں کس مشکل کا سامنا کرنا پڑ جائے بہر حال اس نے کہا۔

"لیکن آپ یہ دعویٰ کیوں کرتی ہیں کہ آپ کو میرے بارے میں بہت معلومات حاصل ہیں۔ آپ ذرا اس بات پر غور کیجیے؟"

"کیا؟"

"مجھے خود اپنی شخصیت کا اندازہ نہیں ہے۔"

"کیا مطلب ہے؟"

"میں نہیں جانتا کہ مجھے یہاں کیا مقام حاصل ہوگا۔"

"بڑی بات ہے یہ..... سوچنے کے لیے وقت درکار ہے لیکن مسٹر یوگان نے آپ کو اس لڑکی کی نگرانی میں بے مقصد نہیں لگایا ہوگا۔"

"میں نہیں سمجھتا کہ مسٹر یوگان کیا چاہتے ہیں۔" تنہائی میں شاہ ور نے ان ساری باتوں کے بارے میں سنجیدگی سے غور کیا۔ ڈینوکا نے اسے یہاں بھیجا تھا اور صورتحال یہ تھی وہ لوگ بگ ہارڈو کے ساتھ مل کر کام کرنا چاہتے تھے۔ نجانے کتنے کھیل تھے جن میں شاہ ور الجھا ہوا تھا۔ اس وقت بہر حال اس وقت اس کی تمام دلچسپی کا مرکز وہ پراسرار لڑکی تھی۔ جس کے قریب رہنے کا اسے پورا پورا موقع مل گیا تھا۔ یہ ساری باتیں بڑی عجیب و غریب تھیں۔ پتہ نہیں لڑکی کے ساتھ یہاں کیا سلوک کیا گیا تھا۔ اب چونکہ اسے صاف ستھرا رکھنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ اس لیے کبھی کبھی اس کے چہرے کے نقوش میں کچھ تاثرات چھپے نظر آجاتے تھے۔ اس دوران شاہ ور نے کئی بار اس کا بغور جائزہ لیا تھا۔ تنہائی میں بھی اس کی وہی کیفیت رہتی تھی۔ اس دن یہ ساری باتیں ہو رہی تھیں کہ وارڈو نے کہا۔

"آپ کئی حصوں میں تقسیم ہو گئے ہیں سر۔"

"کیا مطلب؟"

"پہلے آپ نے نجانے کیا کیا ذمے داریاں سنبھالی ہوئی تھیں لیکن اب صورتحال بالکل مختلف ہے۔ چلیے چھوڑیے یہ بتائیے کہ لڑکی کے بارے میں آپ کا کیا اندازہ ہے۔"

"ابھی تک کچھ نہیں سمجھ سکا وارڈو لیکن پھر البتہ ایک سوال تم سے کرنا چاہتا ہوں۔"

"جی سر!"

"یہ ایلی کس ٹائپ کی لڑکی ہے؟" جواب میں وارڈو ہنس پڑا تھا۔

"لڑکیوں کا ایک ہی ٹائپ ہوتا ہے سر! کہیں بھی انہیں کسی بھی جگہ کوئی بھی مقام دے دیجیے۔ وہ آپ سے محبت ضرور کریں گی۔ میرا خیال ہے آج کل مس ہیلی آپ کے عشق میں گرفتار ہو گئیں ہیں۔"

"اور آج کل سے تمہاری کیا مراد ہے؟"

"نہیں میرا مطلب ہے کہ یہاں میں نے ایسا محسوس کیا ہے۔" بہر حال وقت گزرتا رہا۔ یوگان ہی سے شاہ ور کا واسطہ تھا اور شاہ ور سوچ رہا تھا کہ یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی۔ ڈینوکا نے تو اسے یہاں بڑی جدوجہد کے لیے بھیجا تھا لیکن ابھی تک یہاں کچھ نہیں ہو سکا تھا۔

لڑکی بہر طور اس سے مانوس ہو گئی تھی اور وہ یوگان کی ہدایت کے مطابق لڑکی کی بھرپور نگرانی کر رہا تھا۔ سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ لڑکی ہے آخر کیا چیز اور اس سلسلے میں آخر کار اس نے یوگان سے سوال کر ہی ڈالا۔

"مسٹر یوگان میں آپ کا ہر حالت میں احترام کرتا ہوں لیکن اب میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ یہاں آکر ایک طرح سے میرے راستے رک گئے ہیں۔ میں اس سلسلے میں وضاحت چاہتا ہوں۔ مسٹر ڈینوکا نے مجھے یہاں اس لیے بھیجا تھا کہ میں یہاں بگ ہارڈو کے خلاف کام کروں اور اس طرح کے اقدامات کروں۔ جس سے بگ ہارڈو کی حکومت کو گرانے کا موقع مل جائے لیکن ابھی تک یہاں مجھے کچھ بھی کرنے کا موقع نہیں ملا۔" یوگان مسکرا دیا پھر اس نے کہا۔

"مسٹر ڈینوکا سے میرا مسلسل رابطہ موجود ہے۔ مسٹر ڈینوکا جو کچھ چاہتے ہیں۔ اس کی مختصر تفصیل میں تمہیں بتانا ضروری سمجھتا ہوں۔ مسٹر شاہ ور اصل میں مسٹر ڈینوکا ایمروگے کی

حکومت کو تبدیل کر کے ایک نیا نام دینے کے خواہشمند ہیں اور اس نئی مملکت کا نام ہوگا۔ ڈیمونا ہم ڈیمونا کے لیے کام کر رہے ہیں۔ ہمارے پاس مکمل طاقت موجود ہے اور جب ہم اس طاقت کو استعمال کریں گے تو ایمروگے میں ایک انقلاب آجائے گا لیکن ہم خونریزی نہیں چاہتے۔ ہماری خواہش ہے کہ کوئی بڑی خونریزی کیے بغیر ہم ایمروگے کی حکومت کو ڈیمونا میں تبدیل کر سکیں۔ کیونکہ ایمروگے کے لوگوں کو ہلاکت میں ڈالنا ہمارا مقصد نہیں ہے۔ آپ کو یقینی طور پر ساگان ہری اور ڈان فارگوس کے بارے میں معلومات حاصل ہوگی۔ یہ تینوں افراد تین بڑی تنظیموں کے مالک ہیں اور ان کی خواہش ہے کہ دنیا کے بیشتر حصوں میں ان کی مرضی کی حکومتیں قائم ہوں۔ یہ اس کی قوت بھی رکھتے ہیں اور ان کی کوششیں بے مثال ہیں لیکن بہرحال یہ سارے معاملات اس طرح آسان نہیں ہوتے۔ اس کے لیے بڑی ذہانت سے کام لینا پڑتا ہے۔ وہ لڑکی جس کا نام ایلاسی ہے۔ ایک قبیلے پورنا کی باشندہ ہے اور اس کا کوئی ایسا خاص مقصد ہے۔ جس کے بارے میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ اصل میں بہت عرصے پہلے کی بات ہے۔ جب مسٹر ڈینوکا ایک خاص مقصد کے تحت کچھ علاقوں کا سروے کر رہے تھے۔ ایمروگے کے شمالی علاقے قبائلی علاقے کہلاتے ہیں اور ان میں کچھ قبیلے بڑے پراسرار ہیں۔ ہم ان قبیلوں میں سے کسی ایک خاص حصے کو اپنے خاص کے لیے استعمال کرنا چاہتے تھے۔ آپ کو شاید اس بات کا علم نہیں ہے۔ کہ اس قبیلے کے چاروں اطراف میں اس قسم کی جڑی بوٹیاں موجود ہیں جن سے بہت ہی اعلیٰ قسم کی منشیات بنائی جاسکتی ہیں۔

ایچ بی او کے بارے میں شاید آپ جانتے ہوں، ایچ بی او کی تلاش میں نجانے کیا کیا کچھ کیا جاچکا ہے۔ خاص طور سے ڈان فارگوس ہر قیمت پر ایچ بی او کا حصول چاہتا ہے۔ میں اس مہم کی بات بتا رہا تھا۔ ہم اس علاقے سے کافی فاصلے پر پہاڑوں اور جنگلوں میں بھٹک رہے تھے اور پورنا کے آس پاس جہاں غیر مہذب قبائل آباد تھے گئے ہوئے تھے ان قبائل کی داستانیں بڑی عجیب وغریب تھیں۔ ہم نے ان داستانوں کے بارے میں چھان بین کی اور ہمیں بڑی پر اسرار کہانیوں کے بارے میں معلومات حاصل ہوئیں۔ اگر وہ علاقہ دیکھو گے تو حیران رہ جاؤ گے۔ زیادہ تر خطے برفانی ہیں اور وہاں آباد قبائل سے الگ نہیں ہیں۔ ان کی داستانیں بڑی عجیب ہیں اور ان میں ایسی ایسی کہانیاں ملتی ہیں کہ انسانی عقل اسے تسلیم کرنے سے انکار کردے۔

انسان کی دوسری شخصیت میں صبح اور شام کی طرح دو رخ موجود ہیں۔ ایک وہ جو سمجھ میں نہیں آتا اور وہ رخ تو شاید زندگی کی آخری سانس تک سمجھ نہیں آئے گا۔ کیونکہ اس میں انسان کی دلچسپی وابستہ ہے۔ بہرحال ہمیں ایک برفانی غار میں ایک بوڑھا شخص ملا۔ جس کا نام ہوگو تھا۔ ہوگو شدید زخمی تھا اور اس غار میں زندگی کے آخری دن گزار رہا تھا لیکن اسی غار میں ہمیں یہ لڑکی بھی ملی جس کے پیروں میں زنجیریں بندھی ہوئی ہیں اور زنجیر کو ایک بہت بڑے پتھر سے دبا دیا گیا تھا۔ وہاں بھی یہ اسی شکل میں ملی اور اس کے اندر شدید وحشت خیزی تھی۔ ہوگو نے پہلے تو ہم پر کچھ فائر کیے لیکن غالباً یہ اس کی رائفل کے آخری کارتوس تھے۔ جو بیکار ہو گئے۔ اس کے بعد اس نے چیخ چیخ کر اپنی شکست کا اعلان کیا اور ہم سے درخواست کی کہ ہم اسے گولی مار دیں وہ جینا نہیں چاہتا۔ ہم لوگوں نے اسے قریب سے دیکھا تو اس کے پیٹ میں ایک بہت بڑا زخم نظر آیا۔ جس میں کیڑے پڑے ہوئے تھے اور اس کا نچلا دھڑ مفلوج ہو چکا تھا۔ جب اسے اس بات کا اطمینان ہوگیا کہ ہم اس کے دشمن نہیں ہیں۔ پھر اس نے ہمیں اپنی یہ آخری کہانی سنائی۔ اس نے بتایا کہ ایمروگے کے اس شمالی علاقے کے جنوب میں پورنا کے نام سے ایک قبیلہ آباد ہے اور اس قبیلے میں بڑی عجیب وغریب داستانیں ہیں۔ اس نے کہا۔ یہ انوکھا قبیلہ بہت ہی پراسرار قبیلہ ہے اور اس قبیلے میں دولت کے اتنے ذخائر ہیں کہ انسانی ذہن اس کا تصور بھی نہ کر سکے دنیا کے اعلیٰ ترین ہیرے اور سونے کے انبار اور ظاہر ہے۔ میرے دوست کہ انسان جس طرح اپنی زندگی کی دوسری ضروریات کے لیے سرگرداں رہا ہے۔ اسی طرح عظیم الشان خزانے بھی اس کی زندگی کا مقصد رہے ہیں۔ ہوگو کی داستان میں جو تفصیلات تھیں ان میں سے ایک شخص کا تذکرہ بھی تھا۔ جس کا نام پیلوسا تھا۔

پیلوسا بھی اسی ٹیم کا سربراہ تھا۔ جس میں ہوگو کام کر رہا تھا لیکن بہت ہی بددماغ اور عجیب سا آدمی زمانہ قدیم میں جرائم پیشہ لوگوں سے اس کی کسی بات پر ٹھن گئی اور ہوگو اس لڑکی کو وہاں سے لے کر فرار ہوگیا۔ جس کے بارے میں اس کا کہنا تھا کہ اس کا تعلق پورنا سے ہے اس قبیلے سے جس میں سونے کے ذخائر بکھرے پڑے ہیں۔ چنانچہ پیلوسا اس کے پیچھے لگ گیا دونوں کے درمیان جنگ بھی ہوئی۔ جس سے ہوگو کے پیٹ میں یہ زخم آیا لیکن کچھ وہاں کی فضائیں کچھ زخم کی نوعیت' ہوگو کو بالآخر اس غار میں پناہ لینے پر مجبور ہونا پڑا۔

پیلوسا اس وقت بھی اس کی تلاش میں تھا۔ ہوگو نے لڑکی کے بارے میں بتایا کہ اگر اس لڑکی کو صحیح طور پر استعمال کیا جائے تو یہ ایسے عظیم الشان خزانے تک پہنچا سکتی ہے۔ جس کے حصول کا تصور ہی انسان کو پاگل کر دے اور ہماری اس مہم میں ایک اور شخص بھی شامل تھا۔ جس کا نام لاک آئزر تھا۔ لاک آئزر جو ایک عجیب وغریب شخص تھا۔ انتہائی طاقتور اور توانا بہرحال ہوگو زندگی سے محروم ہوگیا تو آئزر نے اس لڑکی کو اپنے قبضے میں کرلیا اور اس کے بعد ہمارا آمنا سامنا پیلوسا سے ہوگیا۔ بڑی زبردست جنگ ہوئی۔ جس کے نتیجے میں ہمیں اپنی وہ مہم چھوڑ کر واپس آنا پڑا۔

لیکن لاک آئزر نے لڑکی کو نہیں چھوڑا اس نے ہم لوگوں سے درخواست کی کہ کچھ عرصے بالکل خاموشی سے گزارہ جائے۔ تاکہ پیلوسا کو صحیح اندازہ نہ ہو سکے کہ ہم کہاں ہیں اس کے بعد ہم نئے سرے سے اس اپنی مہم کا آغاز کریں گے اور پورنا تک پہنچنے کی کوشش کریں گے۔ چنانچہ لڑکی کو میرے حوالے کر دیا گیا اور لاک آئزر وہاں سے چلا گیا۔

کافی وقت گزر چکا ہے۔ ڈینوکا اور لاک آئزر بہت گہرے دوست ہیں۔ اس دوران یہ بھی فیصلہ کیا گیا تھا کہ اس لڑکی کو مہذب بنانے کی کوشش کی جائے۔ تاکہ یہ ہماری راہنمائی پورنا تک کر سکے لیکن ابھی تک ہم اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکے۔ میں یہ ہی کوشش کر رہا ہوں اور نجانے کیوں تمہیں اس کام کے لیے ڈینوکا نے منتخب کیا ہے۔ بس یوں سمجھ لو کہ لاک آئزر بھی یہاں پہنچنے والا ہے۔ یہ ہے مکمل کہانی لیکن ابھی تک یہ انسانوں سے مانوس نہیں ہو سکی۔ پتہ نہیں اس کے قبیلے کا طرز زندگی کیا ہوگا۔ وہاں کون سی زبان بولی جاتی ہوگی۔ اس سلسلے میں ہر ممکن کوشش کر لی گئی ہے لیکن کچھ پتہ نہیں چل رہا۔

بہرحال ڈینوکا نے تمہارا انتخاب بے مقصد نہیں کیا ہے۔ یہ بہت بڑی بات ہے کہ اگر ہم پورنا تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاتیں تو ہمیں کب ہارڈو کی حکومت کو گرانے میں بہت آسانی حاصل ہو جائے گی۔"

"وہ ہی میں معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ کس طرح؟"

"بس یوں سمجھ لو کہ بگ ہارڈو کی بہت بڑی کمزوری ہمارے ہاتھ میں آگئی ہے۔"

"بات اصل میں میری سمجھ میں نہیں آئی۔ شاہ ور نے کہا۔"

"واقعی بہت عجیب وغریب کہانی ہے ویسے ایک بات بتاؤ شاہ ور کیا۔ ایلی تمہیں پسند نہیں آئی۔"

"دیکھو ایلی یا کوئی اور میری زندگی کا مقصد نہیں ہے ڈینوکا نے مجھ سے یہ کہا تھا کہ وہ ایمروگے کی حکومت کو تباہ و برباد کر کے اس ملک کا نام ڈیمونا رکھنا چاہتے ہیں اور اس کے لیے ساری جدوجہد ہو رہی ہے۔ اب یہاں ایک نئی کہانی سامنے آئی ہے خزانے کی کہانی۔"

"نہیں میرے دوست! یہ کہانی نئی نہیں ہے گھوم پھر کر بات بگ ہارڈو تک ہی پہنچ جاتی ہے۔ براہ کرم تم اس لڑکی کے سلسلے میں جو کچھ کر رہے ہو۔ اسے جاری رکھو۔ تم دیکھنا اس کے نتائج وہی ہوں گے جو ڈینوکا چاہتا ہے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس رات شاہ ور بڑی عجیب وغریب کیفیت کا شکار رہا تھا۔ بے شمار کردار اس کے سامنے اس طرح آئے تھے۔ کہ کچھ عرصے کے لیے وہ اپنے آپ کو بھول گیا تھا۔ اس کے ساتھ جو واقعہ پیش آیا تھا اس کے بعد ڈاکٹر نے جس طرح اس کی تیمارداری کی تھی۔ وہ بہت عجیب تھا لیکن بہرحال شاہ ور کو ان سارے معاملات میں بڑی عجیب وغریب کیفیت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ نجانے کیوں اسے یوں محسوس ہوتا تھا کہ اب تک جو کوئی بھی ملتا ہے اسے صرف اپنے مقصد کے لیے استعمال کرنا چاہتا ہے۔ جبکہ اس کی زندگی کا مقصد صرف ماں تھی۔ ماں اگر مل ہو جاتی تو وہ دنیا کے کسی بھی گوشے میں سکونت اختیار کر لیتا اور صرف ماں کی خدمت کرے۔ جس طرح بھی ممکن ہو سکتا۔ طرح طرح کے مکروہ کردار اس کے سامنے آتے رہے تھے۔ ہیلی جو اس پر اپنے عورت پن کا رنگ جمانے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ بھی اور دوسرے لوگ بھی ڈینوکا ساگان ہری' اور ڈان فارگوس' ویسے ایک نئی بات اس کے علم میں آئی تھی۔ جسے یوگان نے شاید بے اختیاری کے عالم میں ہی اسے بتا دیا تھا۔ یعنی وہ ایک ایسا خطہ جہاں ایچ بی او کی موجودگی کا امکان پایا جاتا تھا۔ یعنی دنیا کے لیے زیرکا ایک اور معاملہ جو اگر اصلی شکل میں آ جائے۔ تو نجانے کتنے انسان اس زہر کا شکار ہو جائیں۔ وہ ہی سب کچھ' وہی سب کچھ یہ رات بڑی بے کلی کی رات تھی۔ نجانے کیوں اس پر ایک عجیب سی کیفیت طاری تھی اور وہ سوچ رہا تھا کہ کیا زندگی ہے آج تک وہ دوسروں کے لیے ایک کھلونا ہی بنا رہا تھا۔ کیا زندگی بھر ایسا ہی رہے گا۔ ماں کی تلاش ختم کر دے تب پھر زندگی میں کیا مقصد رہ جاتا تھا۔ وہی مقصد ہے صرف وہی مقصد..... یعنی ماں کی تلاش اور ان زہر فروشوں کے خلاف مہم جوئی۔ جو ہمیشہ اس طرح سامنے آتے تھے جو اسی کی زندگی کا ایک حصہ بن جاتا تھا۔ کب تک ایسا ہوگا۔ آخر کب تک؟

یہ نہیں ہونا چاہیے۔ کسی قیمت پر نہیں ہونا چاہیے لیکن آخر کس طرح..... سر میں درد شروع ہو گیا تھا۔ دماغ پھٹتا جا رہا تھا۔ کچھ فیصلے کرنے تھے۔ لازمی طور پر کچھ فیصلے کرنے تھے۔

"میں اپنی زندگی کا خود مالک ہوں۔"

اس سے پہلے بھی کئی بار اس پر یہ کیفیت طاری ہو چکی تھی۔ کچھ عرصہ تو ذہن بالکل ہی بے قابو رہا تھا۔ لیکن اس کے بعد جب سے یادداشت واپس آئی تھی شاہ ور زندگی کے اسی کھیل میں الجھا ہوا تھا۔ تین خطرناک آدمی اس کے پیچھے لگ گئے تھے۔ ساگان ہری' ڈینوکا اور ڈان فارگوس اسے تینوں کے بارے میں معلومات حاصل تھیں۔ البتہ ایک کردار ذرا تاریکی میں رہتا تھا اور اس کا نام تھا ساگان ہری' ساگان ہری ایک کاہن یا درویش ٹائپ کا آدمی تھا۔ این تن اور ساگان ہری جن کا تعلق ایک ہی مذہب سے تھا۔ کچھ عجیب سے لگتے تھے اُسے اور اُسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ان کی شخصیتیں بڑی پراسرار ہوں۔ بہرحال ایک بار پھر اس پر اسی کیفیت کا حملہ ہوا تھا۔ ادھر یوگان اور ہیلی اس کے ساتھ جو سلوک کر رہے تھے وہ ایسا تھا کہ وہ ان کے احسانات تلے دبا جا رہا تھا۔ اس نے یوگان سے سوال کر ہی ڈالا۔

"مسٹر یوگان حیرت انگیز طور پر آپ ڈینوکا کے ہمشکل ہیں اور کبھی کبھی میں عجیب سی الجھن میں گرفتار ہو جاتا ہوں اور یہ سوچتا ہوں کہ کہیں آپ ڈینوکا ہی کا دوسرا روپ تو نہیں ہیں۔"

"فرض کرو میری جان! اگر میں ڈینوکا کا دوسرا روپ ہوں بھی سہی تو تم پر کیا اثر پڑتا ہے اس بات کا۔"

"یہ ہی تو اُلجھن کی بات ہے مسٹر یوگان۔"

"مجھے بتاؤ..... کیا؟"

"دیکھیں..... دو الگ الگ مشن ہو جاتے ہیں۔ مسٹر ڈینوکا کا کہنا تھا کہ مجھے بگ یارڈو کی حکومت گرانے میں اپنا کردار ادا کرنا ہے اور ان کے خلاف ایک باقاعدہ مہم کا آغاز کرنا ہے۔ آپ نے اب پورنا' ایلاسی اور خزانے کا کھیل شروع کر دیا ہے جس میں میرا کردار انتہائی اہم رکھا گیا ہے۔ میں یہ سوچتا ہوں کہ کہیں یہ دو الگ الگ باتیں نہ ہوں۔" یوگان کے چہرے پر سنجیدگی کے آثار نظر آنے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لگے۔ اس نے کہا۔

"فرض کرو۔ اگر یہ دو الگ الگ باتیں ہوں گی تو تمہارا کیا فیصلہ ہوگا۔"

"صرف اور صرف یہ کہ میں مسٹر ڈینوکا کی ہدایت پر عمل کروں گا۔"

"یعنی بگ یارڈو کی حکومت کو گرانے کا عمل۔"

"ہاں۔"

"مجھے علم ہو چکا ہے کہ تمہارے کانوں تک اصلیت پہنچا دی گئی ہے۔"

"کون سی اصلیت؟"

"یہ ہی کہ بگ یارڈو کو گرانے کا ایک راستہ ایلاسی کو کنٹرول کرنا ہے اور اس کے ذریعے وہ کام کرنا ہے جو ہماری خواہش ہے یعنی خزانے کا حصول۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں لیکن اگر آپ یہ تسلیم کر لیں کہ آپ ہی ڈینوکا ہیں۔ تو مجھے یہ کام کرنے میں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ دوسری صورت میں..... سوچنا پڑے گا۔" شاہ ور نے سپاٹ لہجے میں کہا اور یوگان سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر اسی رات یوگان نے اسے اپنے پاس بلایا اور ایک بڑے ٹرانسمیٹر کے سامنے کر دیا۔ ٹرانسمیٹر پر درمیان میں ایک اسکرین لگا ہوا تھا اور اس اسکرین پر ڈینوکا کی تصویر نظر آ رہی تھی یوگان شاہ ور کے پاس ہی بیٹھا ہوا تھا۔ ڈینوکا نے کہا۔

"مسٹر شاہ ور! میں فخر کرتا ہوں اپنے ایسے دوست پر جو میری ہدایت پر عمل کرنے کے لیے کسی کی بھی ہدایت قبول کرنے پر تیار نہیں ہوتا۔ مسٹر یوگان نے اس بات کا اظہار کیا کہ آپ شاید مجھے اور انہیں ایک شکل کا دیکھ کر یہ محسوس کرتے ہیں کہ کہیں ہم ایک ہی شخصیت کے مالک نہ ہوں اگر ایسا ہوتا میرے دوست! تو میں تمہیں اس سے لاعلم نہیں رکھتا۔ کیونکہ اب میرے اور تمہارے درمیان راستے براہ راست میں یوگان الگ ہے اور میں الگ لیکن جو مشن میں نے تمہارے سپرد کیا ہے۔ وہ تھوڑا سا اُلجھنوں میں لپٹا ہوا ہے۔ تم اگر چاہو تو اسی ٹرانسمیٹر پر ساگان ہری اور ڈان فارگوس سے میں تمہارا رابطہ کرا سکتا ہوں تاکہ وہ دونوں بھی میرے اس عمل کی تصدیق کر دیں کہ میں نے جس کام کا آغاز کیا ہے۔ وہ بالکل ٹھیک ہے۔"

"آپ یہ سمجھتے ہیں مسٹر ڈینوکا کہ جو کام مسٹر یوگان میرے سپرد کر رہے ہیں وہ آپ ہی کے مقاصد کا ایک حصہ ہے۔"

"سو فیصدی۔ سو فیصدی..... سو فیصدی۔"

"ٹھیک ہے۔ میں پھر مسٹر یوگان سے تعاون کرنے کو تیار ہوں۔"

"میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور اس کے بعد خصوصاً آپ سے کہتا ہوں کہ اگر کوئی ایسا عمل ہوا جس میں تبدیلی کی ضرورت ہوئی تو آپ سے رابطہ کیے بغیر میں وہ عمل شروع نہیں کروں گا۔"

"اوکے۔"

"اور کوئی ایسی بات جو آپ کے ذہن پر بوجھ بنی ہوئی ہو؟"

"نہیں..... اور کوئی بات نہیں ہے۔" سلسلہ منقطع ہو گیا۔ یوگان نے مسکراتے ہوئے شاہ ور سے ہاتھ ملایا اور بولا۔

"اب تو تمہارے ذہن میں کوئی اُلجھن نہیں رہی ہے۔ مائی ڈیئر شاہ ور۔"

"نہیں ٹھیک ہے۔" شاہ ور نے اس رات اپنے آپ کو سمجھایا اور کہا۔ کہ زندگی راستے منتخب کرتی ہے۔ ان راستوں سے جب دل چاہے ہٹا جا سکتا ہے لیکن جب تک کوئی ایسی صورت حال پیش نہ آئے۔ جس میں ہٹنا بہت ہی ضروری ہو تو اپنا کام جاری رکھنے میں کوئی حرج نہیں ہے اور اس بات سے مطمئن ہونے کے بعد اس نے ایک بار پھر اپنے آپ کو اس لڑکی کے ساتھ تعاون کرنے پر آمادہ کر لیا۔ جس کا نام ایلاسی تھا اور جس سے وہ تھوڑا بہت متاثر بھی تھا۔ "میری سمجھ میں ایک بات نہیں آئی مائی ڈیئر۔ وہ یہ کہ بعض مسائل تو اس طرح اُلجھ جاتے ہیں کہ سمجھ میں بات نہیں آتی۔ میں خاص طور سے ہیلی کے بارے میں سوچتا ہوں۔ ہیلی مجھ سے

کہہ رہی تھی کہ وہ شخص عجیب وغریب انسان ہے۔ ویسے وہ تمہارے لیے اپنے دل میں ایک انوکھا مقام رکھتی ہے۔ میں نے اسے تمہارے لیے مضطرب دیکھا ہے۔ وہ بہت زیادہ متاثر ہوگئی ہے تم سے۔"

"بہرحال میں کیا عرض کرسکتا ہوں۔"

"نہیں تمہارا اپنا کردار بھی ایسا ہی ہے۔ کہ تم نے ہمارے دل جیت لیے ہیں خیر چھوڑو اب یہ بتاؤ ایلاسی کیسی ہے۔"

"پہلے سے بہت تیز اصل میں آپ نے اسے مونٹے کے حوالے کیا تھا اور مونٹے کوئی انتہائی جاہل آدمی معلوم ہوتا ہے۔ مجھے ملے تو میں اس کا دماغ درست کروں' اس نے لڑکی کو خاصا دہشت زدہ کردیا ہے۔"

"آؤ..... ذرا دیکھیں اسے۔" یوگان نے کہا اور شاہ ور کے ساتھ ساتھ اس عمارت میں آ گیا جہاں وہ لڑکی موجود تھی۔ وہ اپنے کمرے میں تھی اور خاموش بیٹھی ہوئی تھی لیکن اس وقت وہ جیسی سلیقے کی نظر آ رہی تھی۔ اسے دیکھ کر یوگان بھی حیران رہ گیا اس نے تعجب سے کہا۔

"کمال ہے۔ تم نے تو اسے واقعی انسان بنا دیا۔"

"انسان تو وہ ہے۔ مسٹر یوگان۔" شاہ ور نے مسکرا کر کہا۔

"نہیں واقعی پہلے بھی کئی بار ایسی کوشش کی گئی تھی کہ اسے صاف ستھرا اور باسلیقہ رکھا جائے لیکن کوئی اس کوشش میں کامیاب نہیں ہوسکا۔"

"مونٹے جیسے لوگ کبھی کامیاب نہیں ہوسکتے۔ مجھے تعجب ہے کہ آپ نے اس جیسے غلط انسان کو اس کام کے لیے کیوں مامور کیا۔" شاہ ور نے کہا اور یوگان کے چہرے پر اس قسم کی ہچکچاہٹ نظر آنے لگی جیسے وہ کچھ بتانا چاہتا ہو لیکن بتانے سے گریز کر رہا ہو۔ پھر وہ گہری سانس لے کر بولا۔

"جو ہونا ہوتا ہے۔ وہ تو ہو ہی جاتا ہے اور انسان کی عقل پر پتھر پڑ جاتے ہیں۔ ویسے وہ کبھی تمہیں نظر تو نہیں آیا۔"

"کون..... کون..... مونٹے؟"

"ہاں....."

"نہیں۔"

"پھر بھی میں تمہیں ایک مشورہ دوں کہ مونٹے بہت کینہ پرور آدمی ہے۔ جس کام میں وہ ناکام ہو جاتا ہے۔ اس میں وہ کسی اور کو کامیاب ہوتے نہیں دیکھنا چاہتا۔ بہرحال تم نے یہ کمال کیا ہے اور میں تو یہ سمجھا ہوں کہ یوگان نے پھر جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور اس کے بعد پشیمان نگاہوں سے شاہ ور کو دیکھتا ہوا بولا۔

"کیا بتاؤں..... زبان بندی ہے ورنہ تم سے زیادہ قابل اعتماد میرے لیے اور کون ہوسکتا ہے۔ ویسے اس لڑکی کو دیکھ کر میں حیران رہ گیا ہوں اور سوچ رہا ہوں کہ اب اس سلسلے کو مکمل کرلیا جائے ویسے لاک آئزر بھی میرے پیچھے پڑا ہوا ہے کہ اب میں کتنا انتظار کروں گا۔"

"ایک بات بتاؤ؟"

"جی۔"

"اگر ہم کوئی سفر کریں اور یہ لڑکی ہمارے ساتھ ہو تو کیا تم اسے کنٹرول کرلو گے؟" پہلے تو شاہ ور کچھ دیر سوچتا رہا پھر بولا۔

"ہاں..... ایسا میں کرلوں گا کوئی مشکل نہیں ہوگی میرے لیے۔"

"اعتماد سے کہہ رہے ہو یہ بات۔"

"ہاں..... بالکل اعتماد سے۔"

"اس کا مطلب ہے۔ مجھے لاک آئزر کو اطلاع کردینی چاہیے۔" یوگان نے کہا اور شاہ ور خاموش ہی رہا۔ ایک بار پھر اس کے دماغ میں یہ سوال ابھرا تھا کہ آخر لاک آئزر ہے کون بہرحال اس نے اس سلسلے میں کوئی بات نہیں کی۔ کافی دیر یوگان اس کے ساتھ رہا اور پھر پرخیال انداز میں گردن ہلاتا ہوا۔ باہر چلا گیا۔

یوگان ایک اچھا انسان تھا۔ پتہ نہیں کیا مشکل تھی اس کے راستے میں کہ وہ وضاحت کے ساتھ کوئی بات کرنے سے گریز کرتا تھا۔ لاک آئزر کا یہ حوالہ اور زبان بندی کی یہ بات یہ ظاہر کرتی تھی کہ شاید ان کے درمیان کوئی اخلاقی معاہدہ ہوتا ہے تو ہوتا رہے۔ میرے اوپر کیا اثر پڑتا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہے۔ بس ٹھیک ہے حالات جس حد تک میرے علم میں آ چکے ہیں وہ مجھے اس بات کا احساس دلاتے ہیں کہ کم از کم صورت حال بہتر ہی رہے گی اور کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی۔ اس سلسلے میں قدم آگے بڑھاتے ہوئے یہ رات شاہ ور کے لیے تعجب خیز تھی۔ رات کے کھانے کا وقت ہوگیا تھا اور پروگرام یہ ہی تھا کہ وہ پہلے لڑکی کو کھانا کھلائے اور اس کے بعد اسے آرام سے سلا کر اپنی رہائش گاہ میں جائے۔ اس سارے پروگرام کو مرحلے وار طے کرتا ہوا آخرکار شاہ ور لڑکی کے کمرے میں پہنچ گیا۔ اب اس کا کمرہ بھی بالکل صاف ستھرا رکھا جاتا تھا اور اس سلسلے میں بڑی محنت کرنی پڑتی تھی۔ بعض اوقات کو شاہ ور کو خود اپنے ہاتھ سے کچھ کام کرنے پڑتے تھے۔

لڑکی کو ایک جانور کی طرح سدھانے کے لیے وہ خود بھی خاصا مصروف عمل تھا اور سچی بات یہ ہے کہ اس کام میں اسے دلچسپی محسوس ہوئی تھی۔ ایک جانور نما لڑکی کو انسان بنانا ایک مشکل کام ہوسکتا ہے اور وہ بھی ایک خوبصورت لڑکی۔ بہرحال عام معاملات سے فراغت کے بعد شاہ ور نے محبت سے اسے اس کے بستر تک پہنچایا۔ لڑکی بستر پر لیٹ گئی۔ صاف ستھرے بستر پر نجانے آج وہ بہت دلکش کیوں نظر آ رہی تھی۔ شاہ ور نے محسوس کیا تھا کہ وہ کبھی اس سے نگاہیں نہیں ملاتی۔ عموماً دیوار کو ہی دیکھتی رہتی ہے۔ اس کا چہرہ زیادہ تر بے تاثر رہتا ہے لیکن اس وقت بڑی عجیب بات ہوئی۔

شاہ ور نے اس کو بستر پر لٹایا اور محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور پھر سیدھا ہوا ہی تھا۔ کہ اس نے لڑکی کو خود پر نگاہیں جمائے دیکھا یہ پہلا موقع تھا کہ وہ شاہ ور کو براہ راست دیکھ رہی تھی۔ شاہ ور چونک کر رک گیا اور یہ اندازہ لگانے لگا کہ یہ صرف ایک اتفاق تھا یا وہ جان بوجھ کر اسے دیکھ رہی ہے لیکن اس کی نگاہیں مسلسل شاہ ور پر ٹکی ہوئی تھیں۔ اس کی آنکھیں اس وقت بے حد حسین لگ رہی تھیں اور پھر اچانک وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے دونوں ہاتھ بستر پر ٹکائے چہرہ اوپر اٹھایا اور اچانک ہی اس کے ہونٹ ہلنے لگے اس کے ہونٹ بڑی تیزی سے ہل رہے تھے اور اس کی ایک عجیب سی کیفیت تھی۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اس سے کچھ کہہ رہی ہے لیکن اس کے منہ سے کوئی آواز نہیں نکل رہی تھی۔ بس ہونٹ تیز رفتاری سے ہل رہے تھے۔ آنکھیں شاہ ور پر جمی ہوئی تھیں اور ایسی سوگوار کیفیت طاری تھی ان آنکھوں میں کہ شاہ ور کا دل پگھل کر موم ہوگیا۔ وہ اس کے پاس بستر پر بیٹھ گیا۔ لڑکی بدستور اس سے شکستی انداز میں کچھ کہے جا رہی تھی لیکن بے آواز اس کے ہونٹ اتنی تیزی سے ہل رہے تھے کہ اسے تعجب ہو رہا تھا۔ پھر اچانک ہی اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اس کے ہونٹ اب بھی مسلسل ہل رہے تھے۔

نجانے کیوں شاہ ور کو اس سے بڑی محبت کا احساس ہوا اور اس نے دل ہی دل میں کہا۔ کاش تو بے آواز نہ ہوتی تو میں تیرے دل کے درد کو سمجھ سکتا۔ پھر اچانک ہی لڑکی نے دونوں ہاتھ سیدھے کیے اور شاہ ور کی گردن میں حمائل کر دیئے۔ شاہ ور ایک دم چونک پڑا تھا۔ کچھ عجیب سے جذبات اُمنڈ آئے تھے اس کے تصور میں بھی۔ بہرحال یہ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ اس خونخوار لڑکی سے جسے وہ انتہائی وحشت زدہ دیکھ چکا تھا کس قسم کی بات کی توقع کی جاسکتی ہے۔ کچھ عجیب سے جذبات کا اظہار ہو رہا تھا مگر اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ بہت دیر تک وہ شاہ ور سے اسی طرح لپٹی رہی۔

اس کے بعد اس نے اسے چھوڑ دیا۔ وہ اب بھی مسلسل روئے جا رہی تھی لیکن اس کے چھوڑنے کے بعد شاہ ور نے اس کی طرف ہاتھ بڑھائے اور اس کے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا۔

"بول سکتی ہو اگر..... اگر اپنی زبان کو کسی خاص وجہ سے خاموش کر رکھا ہے۔ تو بول دو مجھ سے..... اپنے دل کے تمام راز کہہ دو۔ میں تمہارا بہترین رازدار ثابت ہوں گا۔ دنیا سے لڑ جاؤں گا تمہارے لیے۔ میں سب کو پیچھے چھوڑ سکتا ہوں ایک بے زبان شخصیت کے لیے۔ دوسرے تو اپنی من مانی کر

سکتے ہیں۔ وہ سب کچھ کر سکتے ہیں جو وہ چاہتے ہیں لیکن تم بول دو لڑکی..... تم بول دو..... پرہیز کر رہی ہو اگر تم..... بولنے سے گریز کر رہی ہو تو بول دو۔" وہ شاہ ور کو دیکھتی رہی۔ پھر کچھ اس طرح مسکرائی کہ وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگا اسے یوں لگا جیسے اچانک ویرانوں میں لاتعداد پھول کھل گئے ہوں۔ ہوائیں مسکرانے لگی ہوں لیکن وہ کچھ بولی نہیں۔ بڑی عجیب سی کیفیت تھی اس کی۔ اب اس کی آنکھوں میں سکون نظر آ رہا تھا۔ اس نے ایک بار پھر شاہ ور کو دیکھا گردن جھکائی اور اس کے سینے کو چوم لیا۔ اس کے بعد وہ آرام سے لیٹ گئی تھی۔ شاہ ور دیر تک اسے دیکھتا رہا۔ پھر بولا۔

میں جاؤں؟" لیکن لڑکی نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ اس کی نگاہیں ایک بار پھر چھت کی طرف اٹھ گئی تھیں۔ شاہ ور نے کئی بار اسے آواز دی لیکن اس نے نظریں نہ ہٹائیں۔ اس کے بعد اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

شاہ ور نے اندازہ لگا لیا کہ وہ سونے کی کوششوں کر رہی ہے۔ تب وہ وہاں سے واپس پلٹ پڑا لیکن اس رات وہ سکون کی نیند نہیں سو سکا تھا۔ کھانے وغیرہ سے فراغت حاصل کرنے کے بعد اس نے اس پر غور کیا اور یہ ہی فیصلہ کیا کہ وہ واقعی نہیں بول سکتی لیکن کیوں..... آخر کیوں؟ اس کیوں کا جواب ابھی نہیں مل سکتا تھا۔ بہر حال اس نے بھی ذہن کو بوجھ سے آزاد کر دیا۔ وقت کے فیصلے سب سے بہتر ہوتے ہیں اور وقت ہی بتائے گا کہ اس لڑکی کی کہانی کیا ہے۔ بہر حال اس کے بعد وارڈو نے اس کو اس بارے میں اطلاع دی تھی۔ اپنے معلومات سے فراغت کے بعد شاہ ور انیکسی میں آیا اور وارڈو نے معمول کے مطابق اس کے لیے کھانا لگا دیا لیکن وہ افسردہ تھا۔ شاہ ور نے اس کے چہرہ پر یہ افسردگی دیکھی تو بولا۔

"کیا بات ہے۔ وارڈو تمہاری طبیعت خراب ہے؟"

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔"

"لگ رہا ہے مجھے۔"

"نہیں میں ٹھیک ہوں۔"

"اور میں یہ بھی محسوس کر رہا ہوں کہ اگر کوئی بات ہے تو تم مجھے بتانے سے گریز کر رہے ہو۔ لیکن بہر حال میں تمہیں مجبور کرنے کا کوئی حق نہیں رکھتا۔ چنانچہ میں خاموش ہو جاتا ہوں۔" وارڈو میرے سامنے زمین پر بیٹھ گیا اور اس نے اپنی پیشانی شاہ ور کے گھٹنے پر رکھ دی اور شاہ ور نے پیار سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"طبیعت خراب ہے تو مجھے بتاؤ۔ وارڈو میں تم سے بہت متاثر ہوں۔ تم میرے دوست ہو۔ میرے ساتھی ہو۔"

"کیا آپ کو اس بات کا علم ہے جناب کہ آپ لوگ ایک مہم پر جانے والے ہیں۔"

"ہاں تھوڑی سی کہانی میرے علم میں آئی ہے لیکن یوگان نے مجھے اس بارے میں کچھ بتایا نہیں ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ اس وقت میں زیادہ وقت نہیں لگے گا۔ میں اپنے لیے افسردہ ہوں کہ بدقسمتی سے میں بھی انسان ہوں جانور تک اپنے مالک سے محبت کرتے ہیں تو انسانوں کے دل میں تو یہ محبت جانوروں سے کہیں زیادہ ہو سکتی ہے۔ میرے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے تمہیں سمجھانے کا۔"

"تم جو کچھ کہنا چاہتے ہو کہو۔"

"زیادہ وقت نہیں ہوا ہے۔ آپ کی خدمت کرتے ہوئے لیکن جیسا کہ میں نے آپ سے پہلے بھی کہا کہ ہر شخص کے اندر ایک انسان ہوتا ہے اور بدقسمتی سے ہر انسان کے اندر ایک دل بھی ہوتا ہے۔ محبت تو فطری بات ہے مجھے آپ سے جدائی کا افسوس ہے۔"

"اوہ..... بس۔"

"ہاں۔ یہ معمولی بات نہیں ہے۔"

"اگر ہم کہیں ایسی جگہ جا بھی رہے ہیں۔ جہاں تم ہمارے ساتھ نہیں ہو گے تو واپسی تو ہو گی ناں۔"

"میں نے جان بوجھ کر یہ گفتگو نہیں سنی لیکن یوگان اپنی آرام گاہ میں یہ کہہ رہے تھے اور طے کر رہے تھے کہ یہاں سے ملازموں میں سے کسے ساتھ لیا جائے گا ان میں میرا نام نہیں تھا۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"شاید اس لیے کہ مہمات میں خاصی خانفشانی کرنی پڑتی ہے۔ موسم جھیلنے پڑتے ہیں صعوبتیں اٹھانی پڑتی ہیں۔"

"میں جانتا ہوں لیکن میں کمزور نہیں ہوں۔"

"اگر تمہیں بھی ساتھ لے لیا جائے؟"

"پتہ نہیں کیوں مسٹر یوگان میرے بارے میں ایسی بات نہیں سوچتے۔"

"کب تک جا رہے ہیں یہ لوگ؟"

"بس تیاریاں ہو رہی ہیں۔" بہر حال شاہ ور نے اس سلسلے میں وارڈو کو کوئی تسلی نہیں دی لیکن یہ فیصلہ کیا کہ وہ اس سلسلے میں بات ضرور کرے گا۔ بہر حال دو تین دن کے بعد ہی ایک صبح یوگان کو کچھ افراد کے ساتھ اصطبل میں جاتے ہوئے دیکھا اور پھر اس نے شاہ ور کو بھی طلب کر لیا۔ ایک سرکش گھوڑا وہاں موجود تھا۔ جو کسی کے قابو میں نہیں آ رہا تھا۔ یوگان نے کہا۔

"اور تم یہ کہتے ہو کہ جانسن کہ یہ گھوڑا بے کار ہے اصل میں تمہارے پاس کوئی صحیح سائیس نہیں ہے۔ جو ایک گھوڑے کو قابو میں کر سکے۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں۔"

"بالکل۔ میں چونکہ تمام گھوڑے تمہارے ہاتھ فروخت کر رہا ہوں اس لیے میں یہ نہیں چاہوں گا کہ یہ گھوڑا اکیلا پڑا اصطبل میں سڑتا رہے۔ مجھے گھوڑوں سے اتنی محبت ہے کہ میں اپنے گھوڑوں کی پرورش خود ہی کرتا ہوں اور کسی پر اعتبار نہیں کر سکتا۔"

"لیکن تم کہتے ہو کہ کوئی اسے قابو میں نہیں کر سکتا ہے۔"

"یہ کچھ بھی نہیں ہے۔ تمہارے پاس اگر کوئی نہایت سرکش گھوڑا ہو تو اسے لے آؤ۔ میرے پاس ایک ایسا آدمی ہے۔ جو اس پر سواری کر کے دکھا دے گا۔"

"تو پھر اسی پر کیوں نہ سواری کی جائے۔" جس شخص کا نام جانسن لیا گیا تھا اس نے مذاق اڑانے والے انداز میں یوگان کو دیکھا اور یوگان نے شاہ ور کو اشارہ کر دیا۔ شاہ ور نے گردن خم کی اور آگے بڑھ گیا۔ گھوڑے کی لگام پکڑی اور دو چار چکر دینے کے بعد وہ اچھل کر اس کی پشت پر بیٹھ گیا۔ بہر حال کافی دیر تک شاہ ور گھوڑے کو دوڑاتا رہا اور پھر جب رُکا تو جانسن نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ یوگان یہ گھوڑا میرا ہو گیا لیکن کیا تم یہ ہیرا بھی مجھے دے سکتے ہو۔" یہ اشارہ اس نے شاہ ور کی طرف کیا تھا۔

"اس سے پہلے بھی ایک شخص نے مجھ سے یہ سوال کیا تھا اور مجھ سے اس کی قیمت پوچھی تھی۔ جانتے ہو میں نے اس سے کیا کہا۔"

"کیا؟" جانسن نے سوال کیا۔

"میں نے اس سے کہا کہ اس کی قیمت کے طور پر جتنا کچھ تمہارے پاس ہے مجھے دے جاؤ اور خود میرے اصطبل میں نوکری کر لو تو میں تمہیں یہ آدمی دے سکتا ہوں۔" جانسن نے ایک بے تکا سا قہقہہ لگایا اور بولا۔

"چلو ٹھیک ہے ہمارا سودا ہو گیا۔"

"ٹھیک ہے۔ تم جاؤ..... اور سنو! رات کو کھانے سے فراغت حاصل کرنے کے بعد میرے پاس آنا مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔" شاہ ور کے ذہن میں سنسنی پیدا ہو گئی تھی۔ پھر اسی شام سورج چھپنے سے پہلے جب وہ ملازمہ کے ذریعے اس لڑکی کو صاف ستھرا لباس پہنوا رہا تھا۔ خود یوگان ایک اجنبی شخص کے ساتھ وہاں پہنچ گیا۔ یہ اجنبی شخص خاصی عجیب سی کیفیت کا مالک تھا۔ بہر حال یوگان نے اس شخص کو مخاطب کر کے کہا۔

"اور مائی ڈیئر لاک آئرز تم نے اب دیکھا ہو گا کہ اب وہ اس قدر خوفزدہ نہیں ہے۔" اشارہ لڑکی کی طرف تھا۔

"کون؟" لاک آئرز نے پوچھا۔

"اسی لڑکی کی بات کر رہا ہوں۔"

"وہ کہاں ہے؟"

"بلاتا ہوں۔" اسے ہمارے اس دوست نے پوری طرح کنٹرول کر لیا ہے۔"

"تعجب کی بات ہے۔" بہر حال شاہ ور کو اشارہ کیا گیا اور

شاہ ور اس لڑکی کو لے کر ان کے سامنے آ گیا۔ لڑکی نے ایک جھجکتی ہوئی سی نگاہ اُن پر ڈالی اور اس کے بعد گردن جھکا کر واپسی کے لیے مڑ گئی۔

”یہ تو واقعی جادوگری ہے۔“ لاک آئزر نے کہا اور یوگا قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

”اور یہ جادوگری جس طرح ہمارے کام آئے گی تم خود سوچ بھی نہیں سکتے۔“

”ٹھیک ہے۔“ لاک آئزر بولا اور یوگان نے شاہ ور سے کہا۔

”مسٹر شاہ ور تم پروگرام کے مطابق میرے پاس پہنچو گے۔“

”مجھے یاد ہے۔“ شاہ ور نے جواب دیا۔

بہرحال مقررہ وقت پر وہ یوگان کی رہائش گاہ پر پہنچ گیا۔ اس رہائش گاہ میں جانے کی کسی کو اجازت نہیں تھی۔ یوگان نے کہا۔

”بہت عجیب بات ہے کہ تم اتفاقیہ طور پر مجھے ملے مائی ڈیئر تمہاری اپنی شخصیت میں بھی کوئی ایسا نقطہ پوشیدہ ہے۔ بہرحال وہ لڑکی جسے تم نے بڑے کمال کے ساتھ سنبھال لیا ہے بڑی عجیب و غریب شخصیت ہے۔ دیکھو! خدا کا دیا میرے پاس سب کچھ موجود ہے۔ وہ لڑکی جس قبیلے سے تعلق رکھتی ہے۔ ہم اسے اس قبیلے میں لے جانا چاہتے ہیں، تاکہ اسے اس قبیلے کے سامنے پیش کر کے اس قبیلے کی محبت حاصل کریں اور اس کے بعد وہ عظیم الشان خزانہ جو روایتی حیثیت رکھتا ہے لیکن ہمارا مقصد صرف یہ ہی نہیں ہے۔ ہم اس خزانے کے حصول میں ناکام بھی ہو گئے تو کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ اصل میں ہمارا مسئلہ کچھ اور ہی ہے۔ میں تمہیں اس بارے میں ضرور بتاؤں گا۔ بہرحال میں تمہیں اپنا دست راست بنانا چاہتا ہوں۔ میرے لیے تم اپنے دل میں یہ گنجائش نکال سکتے ہو۔“

”میں آپ سے صرف اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں کہ میری اپنی زندگی میں [illegible] مقصد ہے۔ میری ماں گم ہو گئی ہے اور میں اپنی ماں کو تلاش کرنا چاہتا ہوں یہ کام جاری ہے اور جاری رہے گا۔ میں نہیں جانتا کہ وہ زندہ ہے یا اب اس دنیا میں نہیں ہے لیکن میری زندگی کا مقصد اب اس کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں ہے۔“

”ہم لوگ تین گروہ کی شکل میں یہاں سے روانہ ہو رہے ہیں حالانکہ لڑکی کو تمہارے ساتھ ہونا چاہیے لیکن میں ایسا نہیں کر رہا اگر ہم لڑکی کو اپنے ساتھ لے کر وہاں پہنچیں گے تو تم یہاں سے صرف تین افراد کے ساتھ روانہ ہو گے۔ یہ تینوں افراد ایسے ہیں جو ابھی تک تمہارے سامنے نہیں آئے۔ ایک اور شخص ایسا ہے۔ جس پر میں بہت اعتبار کرتا ہوں۔ تم اس سے مل کر بہت خوش ہو گے اور تمہیں بڑی خوبیاں نظر آئیں گی۔ اس شخص میں، جس کا نام میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔ وہ شخص انسائیکلو پیڈیا ہے دنیا کے مختلف علاقوں کے بارے میں اتنا کچھ جانتا ہے کہ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا۔ وہ ایڈونچر پسند ہے اور اس سلسلے میں میں صرف تمہیں اپنا راز دار بنا رہا ہوں بس صورتحال کو پوری طرح اپنے کنٹرول میں دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”ٹھیک! وہ شخص کیا مقامی آدمی ہے؟“

”ہاں...... اس کا نام زمران ہے۔ زمران...... وہ کون ہے کیا ہے اس کی تفصیل پھر کبھی بعد میں بتا دوں گا۔“

”لڑکی کے بارے میں کیا کہتے ہیں آپ؟“ شاہ ور نے سوال کیا۔

”میں اسے تمہارے ساتھ نہیں بھیجنا چاہتا۔ کچھ ایسے ہی معاملات ہیں۔“

”آپ زیادہ بہتر سمجھتے ہیں۔“

”تو اب تم ہی بتاؤ کہ ہمیں اس سلسلے میں مزید اور کیا کرنا چاہیے؟“

”میں صرف ایک بات کہوں گا۔“

”ہاں...... بولو۔“

”کیا اپنے ساتھ کچھ ملازموں کو بھی لے جا رہے ہیں آپ۔“

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

”کوئی صحیح فیصلہ نہیں کر پائے ہم لوگ۔ ہم نے سوچا کہ دوسروں کی زندگیاں کیوں خطرے میں ڈالیں مگر تم نے یہ سوال کیا؟“

”بس یوں ہی۔“

”میں وارڈ کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔“

”مناسب نہیں ہوگا اور کوئی ملازم بھی نہیں جا رہا ہے یہاں سے؟“

”نہیں......“

”ٹھیک ہے اگر ایسی بات ہے تو میں اپنی یہ خواہش واپس لیتا ہوں۔“

جو ٹیم یوگان نے تیار کی تھی وہ خاص مضبوط ٹیم تھی۔ ان میں کچھ لڑکیاں بھی تھیں اور کچھ مرد تھے۔ بیلی بھی اس ٹیم میں شامل تھی لیکن شاہ ور نے محسوس کیا تھا کہ جب وہ ایلاسی کی قربت میں ہوتا ہے تو بیلی کے چہرے پر رقابت کے آثار نمودار ہو جاتے ہیں۔ تاہم سارے معاملات اپنی جگہ تھے...... شاہ ور اپنا کام سرانجام دے رہا تھا۔ ایلاسی کو پھر ایک منصوبے کے ساتھ شاہ ور ہی کی تحویل میں دے دیا گیا تھا۔ یوگان نے شاید کوشش کی تھی کہ ایلاسی کو شاہ ور سے دور رکھا جائے لیکن یہ کوشش ایک دم نقصان دہ ثابت ہوئی تھیں اور محسوس کر لیا گیا تھا کہ اگر لڑکی کو قابو میں رکھنا ہے۔ تو اسے شاہ ور کے ساتھ ہی رہنا ہوگا۔ ایک لمبا سفر طے کیا گیا اور وہ لوگ اس علاقے میں پہنچ گئے۔ جہاں کی نشاندہی کہیں سے ہوئی تھی لڑکی شاہ ور کے ساتھ ہی رہتی تھی۔ وہ اسے لے کر بڑی دور دور تک نکل جاتا۔ ابھی تو لڑکی کے اندر میں کوئی ایسی بات نہیں پائی گئی تھی۔ جو اس بات کا اظہار کرتی کہ یہ لوگ پورنا قبائل کے قریب ہیں۔ یوگان نے اپنے گروپ کو الگ رکھا تھا اور دو تین الگ الگ پارٹیاں تیار کیں تھیں۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ اگر کسی پارٹی کو کوئی نقصان پہنچ جائے تو دوسری پارٹی اس کی مدد کے لیے تیار رہے۔ لاک آئزر کو بھی ایک الگ جگہ دے دی گئی تھی۔ کیمپ لگا دیئے جاتے تھے۔ تھوڑے ہی دن کے بعد شاہ ور کو اس سفر سے شدید بے زاری ہونے لگی۔ وہ یہ ہی سوچ رہا تھا کہ کس مصیبت میں گرفتار ہو گیا۔ یہ تو گیم ہی نیا ہو گیا ہے۔ ایچ بی او کا نام بھی سامنے آیا تھا۔ منشیات کے ان سوداگروں کی چپقلش اگر منشیات تک ہی محدود ہوتی تو کم از کم یہ کہا جا سکتا تھا کہ انہیں کسی نہ کسی طرح جال میں پھانس لیا جاتا لیکن اب یہ خزانے کا چکر آ چلا تھا۔ یوگان کا تو مقصد ہی کچھ اور تھا۔ بہرحال لڑکی کو اب شاہ ور سے خاصی انسیت ہو گئی تھی اور اس نے سوچا تھا کہ باقی لوگ بھاڑ میں جائیں اگر اس رواروی میں کوئی کام ہو جاتا ہے تو ٹھیک ہے۔ ورنہ لڑکی کو اس کے قبیلے تک پہنچانے کے بعد وہ ان سارے معاملات پر غور کرے گا۔ کون ڈان فارگوس کون ڈینو کا کون یوگان، کون ساگان ہری سب جہنم میں جائیں میری اپنی ایک دنیا ہے۔ بلاوجہ نجانے کہاں آ کر پھنس گیا ہوں۔ مجھے واپس اپنی دنیا میں جانا چاہیے لیکن تھوڑے سے وقفے کے بعد......

اور وہ اپنے ذہن میں ایک الگ منصوبے بنانے لگا۔ وہ اس لڑکی کے ساتھ ان لوگوں سے الگ ہو جانا چاہتا تھا۔ حالانکہ وہ جانتا تھا کہ یہ ایک انتہائی خطرناک قدم ہے لیکن بہرحال اب اس نے جو کچھ بھی فیصلہ کیا تھا۔ وہ تو کرنا ہی تھا۔ سفر جاری رہا۔ اس دن سفر کے بعد جہاں قیام کیا گیا۔ وہاں بدصورت پہاڑیوں کا ایک عظیم سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ یہ پہاڑیاں انتہائی بدنما اور ہیبت ناک تھیں جگہ جگہ غار نظر آ رہے تھے۔ قد آدم درختوں کی بہتات تھی اور ان کے درمیان کیڑے مکوڑے گردش کرتے ہوئے نظر آ رہے تھے لیکن کیونکہ ہر طرف یہ سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ اس لیے کسی اور مناسب جگہ کی تلاش نہیں کی جا سکتی تھی۔ اس کے ساتھ جو گروپ تھا۔ وہ ایک اور شخص کی راہنمائی میں تھا۔ جس کا نام گوپند تھا۔

گوپند ایک نارمل سا آدمی تھا لیکن کچھ خوبیوں کا مالک بھی تھا۔ بہرحال یہاں خیمے لگا دیئے گئے۔ جگہ جگہ آگ روشن کر دی گئی۔ تاکہ کیڑے مکوڑے ان خیموں کے درمیان سے بھاگ جائیں۔ یہ جگہ زیادہ قیام کی نہیں تھی۔ بس تھوڑا سا

قیام کرنے کے بعد یہاں سے روانہ ہو جانا تھا۔ خیمہ زنی کے دوران ہی شاہ ور نے ان پہاڑیوں میں موجود غاروں کو دیکھا اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ غار انتہائی خطرناک ثابت ہو سکتے تھے۔ چھوٹے موٹے کیڑے مکوڑے تو انہوں نے دیکھ ہی لیے تھے لیکن ہو سکتا ہے کہ غاروں میں سانپ بھی ہوں مگر اس سے بہتر جگہ اور کوئی نہیں ہو سکتی تھی۔ جو شاہ ور کے منصوبے کی تکمیل میں مدد دیتی۔

چنانچہ اس نے گہری نگاہوں سے ان غاروں کی کا جائزہ لیا اور پھر ایک غار منتخب کر لیا۔ کچھ ایسی جگہ تھی یہ کہ عام لوگوں کو نظر نہیں آ سکتی تھی کیونکہ اس کے دہانے پر لمبی لمبی جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں لیکن اس وقت اس کا جائزہ لینا مناسب نہیں تھا۔ کہ یہاں کے لوگوں کو کوئی شبہ نہ ہو جائے شاہ ور نے اِدھر اُدھر کا اندازہ لگانے کے بعد کہ کسی کی نگاہیں اس کی جانب ہیں یا نہیں اس غار کے دہانے کی جھاڑیاں ہٹائیں اور اس کے بعد اندر داخل ہو گیا۔ احتیاط کے طور پر اس نے روشنی کے لیے ایک چھوٹا سا لیمپ ساتھ لے لیا تھا۔ اس وقت کوئی اسے اس غار میں دیکھ بھی لیتا تو اس کے لیے کوئی خطرہ نہیں تھا کیونکہ کسی کو اس کی نیت کا کوئی اندازہ نہیں تھا۔ جھاڑیاں سخت اور کانٹے دار تھیں لیکن بہر حال ان سے اندر داخل ہونا اتنا مشکل ثابت نہیں ہوا جتنا کہ شاہ ور سوچ رہا تھا۔

غار کا دہانہ ان جھاڑیوں نے پوری طرح چھپا رکھا تھا۔ بس اچانک ہی اسے یہ احساس ہوا کہ اگر ان جھاڑیوں کے عقب میں کوئی غار ہے۔ بڑے محتاط انداز میں روشنی کر کے اس غار میں داخل ہوا تو حیران رہ گیا کیونکہ غار اندر سے کافی کشادہ تھا۔ اس کی چھت میں ایک سوراخ بھی تھا۔ جس سے ہوا کے جھونکے اندر آ رہے تھے اور حیرانی کی بات یہ تھی کہ باہر کے منظر کے برعکس غار بالکل صاف ستھرا تھا۔ اس کی دیواریں کھردری اور صاف تھیں اور اس میں کوئی رخنہ نہیں تھا۔ اگر رخنہ ہوتا تو کیڑے مکوڑوں کا خدشہ بھی ہوتا۔ وہ نہیں سمجھ سکا کہ یہ غار اتنا صاف ستھرا کیوں ہے لیکن تھوڑا سا اندازہ لگانے کے بعد یہ احساس ہوتا تھا کہ باہر موجود سخت اور مضبوط جھاڑیاں کوڑا کرکٹ اندر آنے سے روک دیتی ہیں اور کیڑے مکوڑے ان کانٹے دار جھاڑیوں سے گزرنا پسند نہیں کرتے اس لیے غار اس قدر صاف ستھرا ہے۔

شاہ ور کے لیے اس سے بہتر جگہ اور کوئی نہیں ہو سکتی تھی چنانچہ کچھ لمحوں کے بعد وہ غار سے باہر نکل آیا اور اب اس کے ذہن میں اس کا منصوبہ جڑ پکڑ رہا تھا اور اب وہ اس پر عمل کرنے کا آخری فیصلہ کر چکا تھا۔ اس نے ان لوگوں کو اپنے اپنے کاموں میں مصروف دیکھا جبکہ ایلا اسی جگہ موجود تھی جہاں اسے رکھا جاتا تھا۔ صرف شاہ کو یہ آزادی حاصل تھی کہ وہ اس کے ساتھ کسی بھی لمحے کسی بھی وقت آ جا سکتا تھا۔ باقی وہ لوگ اس پر پوری پوری نگاہ رکھتے تھے۔

شاہ ور خاموشی سے اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ اس نے لڑکی کے دو لباس نکالے اور اسے ایک جگہ پیک کر لیا اور پھر کچھ ایسی کچھ چیزیں جن کا تعلق لڑکی سے اور اس سے ظاہر ہوتا تھا۔ اس نے اپنے ساتھ لے لی تھیں۔ اس کے بعد وہ یہ چیزیں لے کر ان بدنما پہاڑوں کے ایک مخصوص حصے میں پہنچ گیا۔ اس نے ماحول کا اچھی طرح جائزہ لے لیا تھا۔ ایک بلندی پر پہنچ کر اس نے لباس اور چیزیں ایک بنڈل کی شکل میں تیار کیں اور انہیں ایک طرف اچھال دیا وہ بہت دور جا کر گری تھیں۔ اس نے ایک باقاعدہ منصوبہ بنایا تھا۔ اس کے تحت وہ کام کر رہا تھا وہاں سے پلٹ کر اس نے انتہائی محتاط انداز میں گوپند کے خیمے میں جا کر کھانے پینے کی اشیاء کا ذخیرہ اکٹھا کیا۔ ان اشیاء کے پیکٹ بنائے اور انہیں سامان میں پوشیدہ کر لیا۔ پانی وغیرہ کا انتظام بھی کر لیا تھا۔ بہر حال اس وقت کھانا تیار ہو گیا تھا اور معمول کے مطابق شاہ ور نے ان سب کے ساتھ کھانے میں شرکت کی آسمان پر ہلکے ہلکے بادل پھیلے ہوئے تھے اور موسم کسی قدر خنک تھا۔ دوران سفر تھک جانے والے اپنے اپنے خیموں میں جا گھسے تھے۔ صرف چند تھے جن کے سپرد پہرے کی ذمے داری تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جہاں جہاں آگ روشن کی گئی تھی۔ وہاں سے دھواں اُٹھ رہا تھا۔ مزید آگ روشن کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی تھی۔ اس نے اپنے منصوبے کی تکمیل کرنے کے بعد اس طرف کا رخ کیا جہاں لڑکی موجود تھی۔ شاہ ور کو دیکھ لیے جانے کا خطرہ بھی نہیں تھا۔ کیونکہ گوپند نے اس کے سلسلے میں مکمل ہدایات دے دی تھیں۔ اوّل تو کوئی سامنے نہیں آتا تھا اور اگر کوئی آئے بھی تو ان کی ہدایت کے زیر اثر شاہ ور کی جانب توجہ نہیں دیتا تھا۔

چنانچہ شاہ ور خیمے میں داخل ہو گیا لڑکی جاگ رہی تھی۔ شاہ ور کو دیکھ کر اس کے چہرے پر ہمیشہ ہی ایک عجیب سی کیفیت پھیل جاتی تھی۔ اس وقت بھی اس کے ہونٹوں پر ایک دلنواز مسکراہٹ پھیل گئی اور اس نے سوالیہ نگاہوں سے شاہ ور کو دیکھا۔ شاہ ور نے اشارے سے کھڑی ہونے کے لیے کہا تو وہ کھڑی ہو گئی۔ پھر اس نے اس کے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے چپ اور محتاط رہنے کا اشارہ کیا اور اس کے بعد باہر آنے کا اشارہ کر کے باہر نکلنے لگا۔ لڑکی اب شاہ ور کے اشاروں کو سمجھنے لگی تھی اور اس سے تعاون بھی کرتی تھی۔ چنانچہ وہ دبے پاؤں اس کے ساتھ آگے بڑھ گئی اور کچھ لمحوں بعد دونوں خیمے سے باہر نکل آئے۔ اب شاہ ور ایک ایک قدم پھونک پھونک کر رکھ رہا تھا۔ دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں تھیں اپنے منصوبوں پر اس نے غور تو کر لیا تھا لیکن اس سے آگے کے تمام معاملات تقدیر کے ہاتھوں میں تھے۔ اس نے ایسے راستے اختیار کیے تھے۔ کہ اس کا سامنا کسی سے نہ ہو سکے اور اس کے بعد خیموں کے اس حصار سے باہر نکل آیا اور آہستہ قدموں سے رات کی تاریکیوں میں اس غار کی جانب بڑھنے لگا۔ اس ماحول میں ایک اور سنسنی خیز تبدیلی عمل میں آنے والی تھی۔ دیکھنا تھا کہ یہ تبدیلی کون سے نئے رنگ لاتی ہے۔

☆

ڈان فارگوس اپنی عالیشان رہائش گاہ میں بیٹھا اپنے کچھ منصوبوں پر غور کر رہا تھا۔ کہ ٹرانسمیٹر پر اسے اشارہ موصول ہوا اور اس نے چونک کر ٹرانسمیٹر کو دیکھا۔ پھر ہاتھ بڑھا کر اس کا سوئچ آن کر دیا۔ فوراً ہی آواز آئی۔

"سر! میں یونور بول رہا ہوں۔"

"بولو۔" ڈان فارگوس نے کہا۔

"سر! ایک آدمی پکڑا گیا ہے۔ جو مشکوک حیثیت کا مالک ہے۔ اس کے پاس سے ایک تصویر برآمد ہوئی ہے اور تصویر شاہ ور کی ہے۔ جسے مشینی ذرائع سے یادداشت کے سہاروں پر بنایا گیا ہے لیکن وہ سو فیصدی شاہ ور کا چہرہ ہے۔ ہم نے ابھی تک اس شخص سے اس بارے میں کوئی معلومات حاصل نہیں کیں۔ اسے گرفتار کرنے کے بعد آپ کو اطلاع دی گئی تھی۔"

"اسے کہاں سے گرفتار کیا گیا ہے؟"

"ہمارے برانچ آفس کے ایک کمرے سے وہ اس کمرے میں الماریوں کی تلاشی لے رہا تھا۔ اُس نے لیزر کٹر سے ان الماریوں کے لاک کاٹے ہیں۔"

"گڈ..... دلچسپ اور سنسنی خیز خبر ہے۔ اسے ڈارک روم میں لے جاؤ۔ میں وہیں آ رہا ہوں۔"

"یس سر!" ڈارک روم کوئی ڈارک جگہ نہیں تھی۔ پتہ نہیں اسے ڈارک روم کا نام کیوں دیا گیا تھا۔ کیونکہ وہاں تو بہت روشنی تھی۔ جس شخص کو انہوں نے رسوں سے باندھ رکھا تھا۔ وہ ایک بہترین پرسنالٹی کا آدمی تھا اور اپنے چہرے مہرے سے خاصا تعلیم یافتہ معلوم ہوتا تھا۔ اسے بری طرح رسیوں سے کس دیا گیا تھا لیکن وہ پرسکون بیٹھا ہوا تھا۔ بہر حال تھوڑی دیر کے بعد ڈان فارگوس اس کمرے میں داخل ہو گیا اور چاروں طرف کھڑے ہوئے مسلح افراد مستعد ہو گئے۔ تین آدمی ایک طرف کھڑے ہوئے تھے۔ ڈان فارگوس نے ان میں سے ایک کو دیکھا اور بولا۔

"ہاں..... تو یہ ہے وہ؟"

"یس سر!"

ڈان فارگوس اس آدمی کے پاس پہنچ گیا اور بولا۔

"تمہارے پاس ایک ایسے نوجوان کی تصویر برآمد ہوئی

ہے۔ جو ہمارے لیے بڑی اہمیت کا حامل ہے اور اس کے علاوہ تم ہمارے ایک برانچ آفس کی الماریوں کے لاک کاٹتے ہوئے گرفتار کیے گئے ہو۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ تم کون ہو؟" اور یہ سب کچھ کیوں کر رہے تھے۔ دوسری صورت میں یہ سب کچھ تم سے شدید تشدد کر کے پوچھا جائے گا۔ اگر اس تشدد سے بچنا چاہتے ہو تو مکمل تعاون کرو۔"

"جی سر!" آپ ڈان فارگوس ہیں؟" اس نے کہا اور ڈان فارگوس چونک پڑا۔ پھر بولا۔

"خوب مجھے جانتے ہو؟"

"جی سر! ظاہر ہے۔ اسی فیلڈ سے تعلق رکھتا ہوں۔"

"بتانا پسند کرو گے کہ کس کے لیے کام کرتے ہو۔"

"خانزادی بخت جان کے لیے۔" اس شخص نے جواب دیا اور ڈان فارگوس کے چہرے پر پھر تبدیلی نظر آئی۔ اس نے ایک اشارہ کیا اور ایک کرسی اس کے سامنے لا کر رکھ دی گئی۔ وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔"

"تمہارے اس جواب سے مجھے خوشی ہوئی ہے۔ میں بھی اب ان فرسودہ روایات پر یقین نہیں رکھتا۔ کہ کسی سے کچھ معلومات حاصل کرنے کے لیے اس پر شدید تشدد کیا جائے' تشدد کا دور گزر چکا ہے اب دور دوسرا ہے۔ اگر تم زبان نہ کھولتے تو میرا ایک آدمی تمہیں ایک انجکشن دیتا اور اس انجکشن کے ذریعے تم زبان کھول دیتے۔"

"ضرورت نہیں ہے سر آپ یہ سمجھ لیجیے کہ آپ نے مجھے انجکشن دے دیا۔ اصل میں' میں نے ہر بات پر غور کر لیا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ ڈان فارگوس کے قبضے میں آنے کے بعد اس کی مرضی کے مطابق عمل کیے بغیر زندگی ناممکن ہے۔ پھر بھی مسٹر ڈان فارگوس میں زندگی کی کوئی بھیک نہیں مانگوں گا آپ سے۔ ہمارے اس طرح کے کاموں میں دو ہی صورتیں ہوتی ہیں کامیابی یا موت۔ اتفاق سے مجھے اپنے عمل میں کامیابی حاصل نہیں ہوئی اور میں جانتا ہوں کہ اب موت میرے سامنے ہے۔

"نہیں..... اگر ہمارا مقصد پورا ہو سکتا ہے اور تم خوشی سے ہمیں سب کچھ بتا دیتے ہو تو یہ وعدہ کیا جاتا ہے تم سے کہ تمہاری زندگی نہیں چھینی جائے گی۔"

"شکریہ..... میں نے آغاز کر دیا ہے۔ میں خانزادی کے لیے کام کر رہا ہوں۔"

"کچھ تفصیل بتانا پسند کرو گے۔"

"ہاں..... مجھے صحیح معنوں میں شاہ ور کی تلاش ہے۔ سر! شاید آپ کے علم میں یہ بات نہ ہو کہ یہ نوجوان شاہ ور خان زادی کا پوتا ہے۔ اس کے بیٹے بہرام خان کا بیٹا۔"

"ہاں..... مجھے تھوڑی سی تفصیل معلوم ہو چکی ہے اس بارے میں۔"

"خان زادی صندل وادی کی ایک چھریلی چٹان تھی لیکن سر! اب اس چٹان میں کیڑا لگ چکا ہے اور وہ کیڑا اسے گھن کی طرح کھائے جا رہا ہے شاہ ور کے باپ کو اس نے خود قتل کر کے اس کی بیوی کو سزا کرا دی تھی۔ شاہ ور جیل میں ہی پیدا ہوا اور باہر آنے کے بعد ایک عجیب و غریب زندگی گزارنے لگا۔ ہمارے علم میں یہ بات آئی تھی کہ شاہ ور اس وقت آپ لوگوں کے ساتھ کام کر رہا ہے۔ یعنی ڈان فارگوس کے ساتھ انجلز کارپوریشن کے لیے سر! ہم اسی کا کھوج لگا رہے تھے اور اس بارے میں مزید معلومات حاصل کرنے کے بعد میں آپ کے برانچ آفس تک پہنچا تھا۔ تاکہ وہاں کے کاغذات سے یہ پتہ لگا سکوں کہ شاہ ور ان دنوں کہاں ہے۔ سر! یہ ہے پوری تفصیل خان زادی اصل میں اپنے اس پوتے سے بہت متاثر ہوئی ہے اور وہ اسے اپنے قبضے میں لے کر صندل وادی کا سارا کاروبار اس کے سپرد کرنا چاہتی ہے۔ اس کے دل میں اُس کے لیے محبت پیدا ہو گئی ہے۔"

ڈان فارگوس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات پھیل گئے تھے۔ اس نے خاموشی سے اس شخص کی شکل دیکھی اور بولا۔

"کیا تمہیں معلوم ہے کہ اس وقت شاہ ور کہاں ہے؟"

"نہیں سر! میں نہیں جانتا۔"

"خان زادی کے لیے کب سے کام کر رہے ہو؟"

"تقریباً آٹھ سال سے۔"

"کام کیا ہے؟"

"اس کے ایک چینل کا ممبر ہوں اس نے اس چینل کو ہدایت کی ہے کہ جس طرح بھی ممکن ہو سکے شاہ ور کو تلاش کر کے اس کو اطلاع دی جائے۔ وہ اس کے لیے بے چین ہو رہی ہے۔"

"ٹھیک..... بہر حال تمہارا شکریہ۔ اسے کھول دو اور آرام سے جہاں چاہیے..... جانے دو۔" وہاں موجود کھڑے لوگوں نے حیرت سے ڈان فارگوس کو دیکھا۔ اِدھر وہ شخص جو رسیوں سے بندھا ہوا تھا خود بھی حیران رہ گیا۔ اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات پیدا ہو گئے تھے۔ ڈان فارگوس دروازے تک پہنچا اور پھر مڑ کر بولا۔

"لیکن انجکشن لگانے کے بعد..... مائی ڈیئر کیا نام بتایا تم نے اپنا۔"

"ایڈگر۔"

"مائی ڈیئر ایڈگر تم زندہ رہو گے بالکل ٹھیک ٹھاک تندرست رہو گے لیکن تمہاری ذہنی رو بگڑ جائے گی اور..... اس وقت جو کچھ ہوا ہے۔ تم اسے مکمل طور پر بھول جاؤ گے۔ ہاں تمہیں تمہارا خاندان بھی یاد رہے گا اور تھوڑے سے شناسا بھی..... اوکے۔" وہ واپسی کے لیے مڑا اور باہر نکل گیا۔ جبکہ ایڈگر اسے منہ پھاڑے دیکھتا رہا تھا۔ ڈان فارگوس وہاں سے نکل کر ایک خاص کمرے میں پہنچا یہاں اس نے ایک اور دوسرے ٹرانسمیٹر پر اپنے کسی خاص آدمی کو طلب کیا۔ یہ خاص آدمی ایک لمبے چوڑے بدن کا مکروہ شکل کا آدمی تھا۔ ڈان فارگوس کے سامنے پہنچ کر وہ خوش اخلاقی سے جھکا اور ڈان فارگوس نے اس سے مصافحہ کیا۔

"بیٹھو..... ولین! بیٹھو تم جانتے ہو کہ جب میرے ذہن میں کوئی بات اُلجھ جاتی ہے۔ تو میں تمہیں تکلیف دیتا ہوں۔"

"میں دل و جان سے حاضر ہوں۔" مسٹر ڈان فارگوس اور اس بات پر فخر کرتا ہوں کہ آپ مجھے اتنا بڑا مقام دیتے ہیں۔"

"ایک آدمی گرفتار ہوا تھا۔ اس کے پاس سے شاہ ور کی ایک تصویر برآمد ہوئی شاہ ور کے بارے میں تم جانتے ہو کہ آج کل میں نے اسے کس مشن پر لگایا ہوا ہے۔ اصل میں مائی ڈیئر ولین دنیا کا کامیاب ترین شخص وہ ہے جو سب سے پہلے اپنے بارے میں سوچے اور اس کے بعد کسی اور کے بارے میں۔ ساگان ہری یا ڈینو کا جس مشن پر کام کر رہے ہیں اس کے پس منظر میں بھی بہت کچھ ہے۔ خاص طور سے اس وقت ڈینو کا جس مشن پر کام کر رہا ہے۔ وہ پورنا قبیلے میں موجود اس خزانے کی بابت ہے۔ جسے وہ اس لڑکی کے ذریعے حاصل کرنا چاہتے ہیں اور سنا یہ گیا ہے کہ شاہ ور نے اس لڑکی کو پوری طرح اپنے ٹرانس میں لے لیا ہے اور اس بات کی امید ظاہر کی جا رہی ہے کہ لڑکی کے ذریعے وہ پورنا تک پہنچ سکتے ہیں۔ بے شک اگر پورنا کا خزانہ اس شکل میں حاصل ہو جائے تو اس وقت ایمروگے کی حکومت پر کاری ضرب لگے گی اور بگ ہارڈو ہاتھ ملتا رہ جائے گا۔ بگ ہارڈو کی یہ شکست ہمارے لیے ایک بہت بڑی کامیابی ثابت ہو گی۔ لیکن میں نے ابھی تمہیں یہ بتایا کہ دنیا کا کامیاب ترین شخص وہ ہے جو موقع سے فائدہ اٹھائے وہ شخص جو گرفتار ہوا ہے۔ اس کے پاس سے شاہ ور کی تصویر برآمد ہوئی ہے اور تفصیلات یہ پتہ چلی ہیں کہ اس وقت صندل وادی کی خان زادی جذباتی ہو گئی ہے۔ شاہ ور اس کا پوتا ہے۔ اس نے اپنے ہاتھوں سے اپنے بیٹے کو قتل کیا اس درندہ صفت عورت کے بارے میں تو تمہیں ساری تفصیل معلوم ہے ہی لیکن اس وقت وہ جذباتی ہو کر صندل وادی کا نظام اپنے پوتے کے ہاتھ میں دینا چاہتی ہے۔ اگر ہم ایک ترازو لے کر بیٹھیں اور یہ سوچیں ولین کو پورنا کے خزانے کے حصول سے ہمیں کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے یا ایمروگے میں تبدیلی سے ہمیں کیا مفادات حاصل ہوتے ہیں تو اگر اس کا تخمینہ لگایا جائے تو صندل وادی پر قبضے کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہے۔ سمجھ رہے ہو ناں تم..... میرا مطلب یہ ہے کہ شاہ ور کو اگر ہم حاصل کر کے بخت زادی سے اس کا سودا کریں اور یا شاہ ور کو وہاں تک پہنچاتے ہوئے یا بخت زادی کے حوالے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کرتے ہوئے۔ بخت زادی کا خاتمہ کریں اور شاہ ور کو صندل وادی کا حکمران بنا دیں یا پھر وہ بخت زادی کے ذریعے ہی وہ حکمران بن جائے اور بعد میں ہم بخت زادی کا صفایا کر دیں تو یوں سمجھ لو کہ دنیا کی آدھی دولت ہمارے ہاتھ میں آجائے گی۔ جو اس خزانے سے کروڑوں گنا زیادہ قیمتی ہے۔" ویلن کے مکروہ چہرے پر ایک مکروہ مسکراہٹ نمودار ہوئی اور اس نے کہا۔

"ڈان فارگوس! بلاوجہ ہی انجلز کارپوریشن کا سربراہ نہیں بن بیٹھا ہے۔"

"ہاں..... لیکن ویلن جیسے مشیروں سے مشورے کرنے کے بعد۔ کیا کہتے ہو اس بارے میں۔" ڈان فارگوس نے فاتحانہ انداز میں پوچھا۔

"بالکل ٹھیک ہے۔ چنانچہ بہتر طریقہ یہ ہے کہ شاہ ور کو وہاں سے غائب کر لیا جائے اور خان زادی سے اس کا سودا کیا جائے۔"

"ویری گڈ..... ویری گڈ" گویا تمہیں میرے پروگرام سے اتفاق ہے۔"

"سو فیصدی۔" ڈان فارگوس پراسرار انداز میں مسکرانے لگا تھا۔

☆

حالانکہ سخت خطرہ مول لیا تھا اور اگر راتوں رات یہاں سے دور نکل جانے کی کوشش کرتا تو یہ غلط ہو جاتا آگے جا کے چھپنے کے لیے کوئی محفوظ جگہ ملتی یا نہ ملتی ہے۔ کیونکہ شاہ ور جانتا تھا کہ اگر وہ اس طرح لڑکی کو لے کر غائب ہو گیا تو یوگان تمام پارٹیوں کو اکٹھا کر کے صرف اس کی تلاشی پر لگا دے گا اور ظاہر ہے کہ شاہ ور کی رفتار اتنی تیز نہیں ہوتی کہ وہ ان سب باتوں سے نکل کر بھاگ سکتا۔ اس کے علاوہ اسے سب سے زیادہ خطرہ جو تھا وہ لڑکی سے تھا۔ اگر کسی بھی مرحلے پر اس نے شاہ ور سے تعاون نہ کیا تو خاص مشکل پیش آسکتی تھی۔ جبکہ یہ لمحات اس کے لیے بے حد خطرناک تھے۔ ایک ہلکی سی آواز موت کا پیغام بن جاتی لیکن بہر حال اب جو قدم اٹھا لیا تھا اسے واپس نہیں لیا جا سکتا تھا۔

چنانچہ وہ سفر کرتا رہا اور پھر غار کے نزدیک..... پہنچ گیا۔ لڑکی نے اس کا بھرپور ساتھ دیا تھا اور خاموشی سے یہاں تک آ گئی تھی کہ اسے خود حیرت ہوئی۔ شاہ ور کا خیال تھا کہ وہ تھوڑا بہت دہشت کا اظہار کرے گی لیکن اس نے کافی سمجھ داری کا ثبوت دیا تھا اور ایک طرح سے یوں محسوس ہوتا تھا۔ جیسے کسی بھی مرحلے پر وہ شاہ ور سے اختلاف نہیں کرے گی۔ بہر حال یہ ایک بڑی کامیابی تھی۔ جو شاہ ور کو حاصل ہوئی تھی اور اس کامیابی سے وہ کافی خوش تھا۔ غار کے دہانے پر پہنچ کر اس نے جلدی سے جھاڑیاں ہٹائیں اور سامان سمیت غار کے اندر داخل ہو گیا۔ اس وقت غار کے اندر گہری تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ یہاں تک کہ لڑکی تو ٹٹول ٹٹول کر چل رہی تھی۔ شاہ ور نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود دوبارہ غار کے دہانے پر آ گیا۔ پھر اس نے انتہائی مشقت کر کے ان جھاڑیوں کو دوبارہ غار کے دہانے پر سجا دیا اور اپنی دانست میں غار کا یہ دہانہ پوری طرح بند کر دیا اور اس کے بعد اللہ مالک تھا جو بھی نتیجہ نکلے۔

بہر حال اس کے بعد وہ آگے بڑھا اور لڑکی کے نزدیک پہنچ گیا۔ وہ غار کے درمیان کھڑی ہوئی تھی اور غالباً صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ شاہ ور نے کہا۔

"دیکھو ہم لوگ خطرے میں ہیں۔ ہمیں ان سے بچنا ہے تمہیں مکمل خاموشی اختیار کرنا ہوگی۔ سمجھ رہی ہو ناں۔ بالکل خاموشی سے یہاں بیٹھ جاؤ۔ بلکہ آرام کرو بس اس سے زیادہ ہم اور کچھ نہیں کر سکتے۔ ویسے فکر نہ کرنا میرے پاس کھانے پینے کا سامان موجود ہے۔" شاہ ور نے اسے بازو سے پکڑ کر بٹھایا تو وہ بیٹھ گئی اور روشنی تو تھی نہیں کہ وہ کوئی صحیح جگہ تلاش کر لیتے۔ کچھ دیر تک شاہ ور باہر کان لگائے رہا۔ غار کے اندر ذرا بھی گھٹن نہیں تھی اس لیے وہ آرام سے یہاں وقت گزار سکتا تھا۔ اب اس کے علاوہ اور کیا کیا جا سکتا تھا کہ باقی معاملات تقدیر کے حوالے کر دیے جائیں۔ چنانچہ شاہ ور لیٹ گیا اور اس نے لڑکی سے بھی لیٹنے کے لیے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

...پتہ نہیں اتنے عرصے تک انسانوں کے درمیان رہ کر وہ ...ڑے بہت الفاظ سمجھنے لگی تھی۔ یا پھر یہ صرف فطرت کی ...دی تھی کہ اس نے بھی صرف لیٹنے کے بارے میں سوچا ...جس طرح وہ لیٹی تھی۔ اس نے شاہ ور کے اوسان خطا ...ئے تھے۔ وہ شاہ ور کے بازو پر سر رکھ کر اس سے بالکل ...کر لیٹی تھی۔ اس کے اس طرح لیٹنے سے شاہ ور کے لیے ...نے جذبات پر قابو پانا بڑا مشکل ہو گیا تھا اس کے اپنے دل ...لڑکی کے لیے کافی جگہ پیدا ہو گئی تھی اور اس نے اسے کسی ...طرح ایسی نگاہ سے نہیں دیکھا تھا۔

بہر حال اس نے ان لمحات کو بھی سنبھال لیا اور یوں رات ...ستہ آہستہ بیتنے لگی شاہ ور نے اپنے آپ کو ذہنی طور پر آزاد ...وڑ دیا تھا اور اس طرح اسے تھوڑی دیر بعد ہی نیند آ گئی۔ ...اس کے بعد اس کی آنکھ جب کھلی جب غار کے ...دازے سے چھن چھن کر آنے والی سورج کی کرنیں اس ...ے چہرے پر پڑیں۔ شاہ ور نے چونک کر اِدھر اُدھر دیکھا ...اس نے دیکھا کہ وہ تھوڑے ہی فاصلے پر بیٹھی اسے دیکھ ...ہی ہے۔ شاہ ور مسکرا کر اُٹھ گیا اور اس نے روشنی دیکھ کر یہ ...ازہ لگانے کی کوشش کی کہ دن کا کون سا وقت ہے۔ لیکن ...ی اندازہ نہیں ہو سکتا تھا۔

بہر حال اس نے اسے قریب آنے کا اشارہ کیا اور اسے ...اروں میں بتایا کہ باہر ہمارے لیے خطرہ ہے۔ وہ جیسے شاہ ...ی بات سمجھ گئی تھی۔ شاہ ور نے کھانے پینے کی اشیاء نکالیں ...سارے معاملات کو تو ابھی نظر انداز ہی کرنا تھا۔ لڑکی ...ے اطمینان سے اس کے ساتھ کھانے کے لیے بیٹھ گئی۔ ...اس کو توقع ہو کہ یہ ہی سب کچھ کرنا ہے۔

تھوڑا بہت کھایا پیا اور اس کے بعد وہ جھاڑیوں کے ...یک آ بیٹھا۔ اس نے لڑکی کو دہانے کے دوسری طرف بٹھا ...اور خود ایک طرف بیٹھ گیا ایک لمحے میں صورتحال کا اندازہ ...چکا تھا۔ بڑے محتاط رہنے کی ضرورت تھی کیونکہ قرب و ...ر میں انسانی قدموں کے دوڑنے بھاگنے کی آوازیں ...دے رہی تھیں اور اس کے ساتھ ہی مدھم مدھم بھنبھناہٹیں بھی۔ گویا ان دونوں کی تلاش زور شور سے جاری تھی۔ وقت آہستہ آہستہ گزرتا رہا۔ آوازیں وہاں سے تھوڑی دیر بعد دور ہو گئیں تھیں لیکن شاہ ور نے کسی بے مہری کا مظاہرہ نہیں کیا اور خاموشی کے ساتھ غار کے دہانے پر بیٹھا انتظار کرتا رہا۔ البتہ دل میں ہلکی ہلکی مسرت کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ اس کا مطلب ہے کہ اسے اپنی کوشش میں کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ وہ لوگ اس غار کا اندازہ نہیں لگا سکے تھے اور یہاں سے آگے بڑھ گئے تھے۔ اندازے کے مطابق تقریباً پانچ گھنٹے تک شاہ ور وہاں رکا اور پانچ گھنٹے کے بعد اس نے خطرہ مول لینے کا فیصلہ کر لیا اور آہستہ آہستہ جھاڑیوں میں اپنے لیے تھوڑی سی جگہ بنائی۔ لڑکی اس دوران بالکل خاموش بیٹھی رہی تھی اور اس نے منہ سے ہلکی سی آواز بھی نہیں نکالی تھی۔ جس کا مطلب تھا کہ وہ بھی ساری صورت حال کو اچھی طرح سمجھ رہی تھی۔

جھاڑیوں میں اتنی جگہ بنا کر جہاں سے شاہ ور صرف اپنے جسم کو باہر نکال سکے شاہ ور نے اپنے آپ کو آگے بڑھایا اور وہاں سے باہر نکل آیا چاروں طرف خاموشی اور سناٹے کا راج تھا اور وہ جگہ تھوڑی سی بلندی سے صاف نظر آتی تھی۔ جہاں ان لوگوں نے اپنا کیمپ لگایا ہوا تھا۔ وہاں خوراک کے خالی ڈبے جلی ہوئی لکڑیوں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ لوگ خیمے اکھاڑ کر آگے بڑھ گئے ہیں۔ جو چیزیں شاہ ور نے نشاندہی کے لیے پھینکی تھیں۔ یقینی طور پر وہ انہیں اس تلاشی کے دوران مل گئی ہوں گی اور انہوں نے سوچا ہوگا کہ شاہ ور اس لڑکی کو لے کر اس سمت سے آگے بڑھ گیا ہے۔

لیکن اس کے باوجود اس نے یہ فیصلہ کر لیا تھا۔ کہ وہ ایک دن اور رات یہیں گزارے گا اور انتظار کرے گا۔ ابھی زیادہ بھاگ دوڑ مناسب نہیں تھی۔ لڑکی بھی اس کے ساتھ پرسکون نظر آتی تھی۔ شاہ ور نے اسے دیکھ کر دل میں سوچا کہ اگر یہ بول سکتی یا خود شاہ ور اس کی زبان سمجھ سکتا تو کیا ہی اچھا ہوتا۔ ایک طرح سے ایک ایسی جاندار کو اپنے ساتھ لیے پھر رہا تھا

جسے انسان کہنا ہی مشکل محسوس ہوتا تھا۔ چنانچہ وقت گزرتا رہا۔ شاہ ور کو اندازہ تھا۔ کہ اس کے مدمقابل جنگلی لوگ نہیں تھے بلکہ دنیا کے شاطر ترین لوگ تھے۔ یہ جرائم پیشہ لوگ جو انتہائی طاقتور تھے۔ بہر حال دن گزر گیا۔ رات کا اندھیرا پھیل گیا۔ شاہ ور اب بدستور باہر کان لگائے ہوئے تھا۔ وہ چالاک لوگ یہ بھی کر سکتے تھے۔ کہ وہاں اپنے آدمی تعینات کر دیتے اور یہ اندازہ لگانے کی کوشش کرتے کہ یہ کہیں یہیں تو پوشیدہ نہیں ہیں۔

بہر حال رات ہوگئی۔ لڑکی اسی طرح شاہ ور کے قریب آ گئی تھی اور شاہ ور نے اپنے ذہن کو ہر تصور سے آزاد کر لیا تھا اور یہاں تک کہ نیند آ گئی اور صبح ہوگئی۔ بس اتنا کافی تھا۔ اب اس سے زیادہ احتیاط نہیں کی جا سکتی تھی۔ اس نے اپنا سامان پیک کیا۔ تھوڑی بہت کھانے پینے کی چیزیں کھائیں اور اس کے بعد غار کے دہانے سے جھاڑیاں ہٹا دیں اور پھر لڑکی کو اشارہ کر کے باہر نکل آیا۔ باہر کی فضاء میں آ کر لڑکی گہری گہری سانسیں لے رہی تھی۔ شاہ ور نے ایک جگہ منتخب کی اور دور دور تک کا جائزہ لیا۔ اسے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ جو چیزیں اس نے اپنی نشانی کے طور پر پھینکی تھیں۔ وہ اب وہاں موجود نہیں تھیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یوگان اور باقی لوگ کس طرح آگے کا کام کرتے ہیں۔ انہیں خزانے کی تلاش تھی اور جب کہ شاہ ور کو اس خزانے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اسے صرف یہ احساس تھا کہ اگر لڑکی اپنے قبیلے سے بچھڑی ہوئی ہے تو اس کے قبیلے میں پہنچا دے اور اس کے بعد یہ فیصلہ کرے کہ اس سے آگے کیا کرے۔ وہ آگے بڑھ گیا کافی آگے جا کر ایک گھنے جنگل کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ تھوڑے سے فاصلہ پر میدانی راستے بھی تھے۔ لیکن یہ راستے خطرناک ہو سکتے تھے۔ جب کہ جنگلوں میں چھپ کر سفر کیا جا سکتا تھا۔ یہ نہیں پتہ تھا کہ جنگل میں درندے وغیرہ ہیں یا نہیں۔ بہر حال وہ چلتا رہا۔ لڑکی اس کا بڑی خوش اسلوبی سے ساتھ دے رہی تھی۔ شاہ ور نے ایک جگہ ایک ایسی سیدھی لمبی اور سپاٹ شاخ حاصل کی جسے ہتھیار کے طور استعمال کیا جا سکتا تھا لیکن اسے اس وقت زیادہ دلچسپی ہوئی جب لڑکی نے بھی ایک ایسی شاخ اپنے قبضے میں اسے اس طرح اپنے ہاتھ میں سنبھال لیا۔ جیسے شاہ ور سنبھالا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ جنگل میں رہنا جا ہے۔ اس کی نگاہوں میں مسکراہٹ تھی اور وہ کافی خوش اخلاقی سے شاہ ور کے ساتھ پیش آ رہی تھی۔

تقریباً پورا دن گزر گیا۔ دونوں میدان کے ساتھ ساتھ جنگل کے کنارے کنارے سفر کر رہے تھے۔ آہستہ آہستہ شام جھکتی آ رہی تھی۔ پھر ایک ٹیلے کی آڑ میں ان لوگوں نے پناہ لی۔ جنگل زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ اگر کوئی خطرہ پیش آ تو وہ دوڑ کر جنگل میں روپوش ہو سکتے تھے۔ رات گزر چکی تھی۔ اس وقت تقریباً صبح کے ساڑھے چار کا وقت ہو جب شاہ ور اچانک ہی اچھل پڑا۔ ایک فائر سنائی دیا تھا اس کے بعد دوسرا تیسرا چوتھا اور اس کے بعد تو قیامت ہوگئی۔

درختوں پر پرندے چیخ چیخ کر اڑنے لگے۔ ماحول خاموشی اس طرح ٹوٹی کہ شور قیامت برپا ہوگیا۔ فائر اتنی شدید تھی کہ ٹیلے کی آڑ سے نکل کر حالات کا جائزہ خطرے سے خالی نہیں تھا۔ کوئی بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی چونکہ نیند سے جاگے تھے اس لیے ذہن پوری طر نہیں سنبھلنے پا رہا تھا۔ البتہ لڑکی نے جب ٹیلے کی آڑ بھاگنے کی کوشش کی تو شاہ ور نے اسے دبوچ لیا۔

لڑکی کو فوراً یہ اندازہ ہوگیا کہ شاہ ور اسے بھاگنے سے رو چاہتا ہے۔ چنانچہ وہ فوراً ہی سنبھل کر بیٹھ گئی۔ کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ یہ فائرنگ کون کر رہا ہے۔ کس سے کس جنگ ہوگئی ہے۔ اتنا اندازہ تو ضرور تھا کہ یہ فائرنگ لوگوں پر نہیں کی جا رہی لیکن اس کے باوجود بڑی خوفنا صورت حال تھی۔ شاہ ور نے دوران سفر کسی اور کو اس طر نہیں دیکھا تھا اور فائرنگ سے یہ ہی اندازہ لگایا جا تھا کہ یہ مخالف گروپ کے لوگ ہی ہو سکتے ہیں۔ اس

مطلب ہے کہ دشمن کہیں نہ کہیں موجود ہیں۔ شاہ ور مکمل طور پر خطرہ محسوس کر رہا تھا۔ فائرنگ کچھ دیر کے بعد رک گئی۔ صبح کا اجالا آہستہ آہستہ پھوٹنے لگا تھا۔ اگر وہ قریب ہی ہیں تو ہو سکتا ہے کہ فائرنگ کا نتیجہ دیکھنے کی کوشش کریں۔ اس کوشش میں وہ اس جگہ بھی آ سکتے ہیں۔ چنانچہ یہ جگہ چھوڑ دینا زیادہ مناسب ہے۔

فائرنگ رکتے ہی شاہ ور نے لڑکی کا ہاتھ پکڑا اور جھکا جھکا جنگل کی طرف بڑھنے لگا۔ پھر تھوڑا فاصلہ طے کرنے کے بعد اس نے ایک ایسے موٹے اور گھنے درخت کا انتخاب کیا جہاں وہ اپنے آپ کو پوشیدہ کر سکتا تھا۔ اس نے لڑکی کو درخت پر چڑھنے کا اشارہ کیا۔ تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ پھرتیلی بلی کی طرح درخت سے چپک چپک کر درخت کے اوپر چڑھ گئی اور ایک موٹی شاخ پر جا بیٹھی۔ جبکہ شاہ ور خود اتنی مہارت سے درخت پر نہیں چڑھ سکا تھا اور احتیاطاً اس نے دوسری موٹی اور اونچی شاخوں کو منتخب کیا اور ایک محفوظ پناہ گاہ حاصل کر لی۔ جہاں وہ پتوں کے درمیان چھپ کر بیٹھ گیا لیکن درخت اتنا گھنا تھا کہ وہ اس کے پار دوسری طرف نہیں دیکھ سکتا تھا۔

بہر حال یہ طے کر لیا کہ یہاں کافی وقت گزارہ جا سکتا ہے۔ پھر درخت کی شاخ پر ہی اس نے صبح کی روشنی کا سامنا کیا۔ سورج بلند ہوگیا تھا۔ موسم بھی ایک دم بدلتا جا رہا تھا۔ دونوں خود دن چڑھے تک درخت کے شاخ پر بیٹھے رہے۔ دونوں کے کان آہٹوں پر لگے ہوئے تھے لیکن کوئی آہٹ نہیں سنائی دی اور وہ کافی دیر تک اسی طرح بیٹھا ہوا اس صورت حال پر غور کرتا رہا۔ پھر جب خوب دن چڑھ گیا اور یہ اندازہ ہوگیا کہ اگر کوئی بھی ان پہاڑوں میں موجود ہے تو اسے اس وقت تک یہاں سے آگے بڑھ جانا چاہیے تھا۔ اتنی دیر بے مقصد کسی جگہ رکے رہنا حماقت کی بات ہی تھی۔ وہ دشمن جو یہاں چھپے ہوئے تھے اور جن کے درمیان سے شاہ ور لڑکی کو لے کر فرار ہوا تھا۔ اگر ان کے پیچھے لگے بھی ہوتے تو اب انہیں مایوس ہو کر آگے بڑھ جانا چاہیے تھا۔ پھر وہ آہستہ آہستہ نیچے اترا اور لڑکی کو لیے ہوئے۔ احتیاط کے ساتھ جنگل سے باہر نکل آیا اور ریتیلے میدانوں میں چھوٹے چھوٹے ٹیلوں کی آڑ لیتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ اسی بڑے ٹیلے کی آڑ میں جہاں اس نے رات کو پناہ لی تھی۔ پہنچ کر اس نے لڑکی کے شانے پر ہاتھ رکھ کر نیچے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود ٹیلے پر چڑھنے لگا۔ بلند ٹیلے کے آخری سرے پر پہنچ کر اس نے تھوڑی سی گردن اٹھائی اور ماحول کا جائزہ لینے لگا۔ قرب و جوار میں سناٹا پھیلا ہوا تھا۔ البتہ کوئی سو گز کے فاصلے پر اسے ایک انسانی جسم ایک ٹیلے پر اوندھا نظر آیا۔ اِدھر اُدھر دیکھا تو کچھ اور لاشیں بھی پڑی ہوئی تھیں لیکن یہ اندازہ نہیں ہو سکا تھا کہ یہ کس کی لاشیں ہیں۔

لیکن پھر وہ بہت دیر تک یہاں کسی زندہ انسان کی تلاش میں نگاہیں دوڑاتا رہا۔ لیکن کوئی ایسی چیز نظر نہ آئی۔ غالباً کوئی زخمی تک موجود نہ تھا۔ بلکہ جو ہلاک ہوئے تھے انہیں کی لاشیں یہاں پڑی ہوئی تھیں۔ مردہ خور جانوروں نے ابھی تک ان لاشوں کو نہیں دیکھا تھا۔ ورنہ ابھی تک وہ لاشوں کو نوچ چکے ہوتے۔ بڑی ہمت کر کے شاہ ور ٹیلے سے نیچے اترا صورتحال کو جاننے کی خواہش اس کے دل میں شدید تھی لیکن لڑکی کو بھی ساتھ رکھنا ضروری تھا۔ چنانچہ اس نے اس کا ہاتھ پکڑا اور دوڑتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ پھر وہ اس پہلی لاش کے قریب پہنچا۔ اسے پلٹ کر دیکھا تو پہچان لیا۔ یہ انہیں لوگوں میں سے ایک تھا۔ وہی لوگ جن کے ساتھ شاہ ور کچھ عرصے تک رہا تھا۔

اس نے دوسری لاشوں کا بھی جائزہ لیا اور ایک ٹیلے کی آڑ میں اسے ایک بہت ہی قریبی شخص کا گولیوں سے چھلنی بدن نظر آیا۔ شاہ ور کے دل میں ایک لمحے کے لیے افسوس کی لہریں دوڑ گئیں۔ بہر حال وہ اور لاشوں کا بھی جائزہ لینے لگا۔ پھر اس نے ہیلی کی لاش دیکھ کر اسے بخوبی اندازہ ہوگیا۔ کہ بہت بڑی گڑبڑ ہوئی ہے پتہ نہیں وہ کون تھے جن لوگوں نے انہیں ہلاک کیا۔ آہستہ آہستہ شاہ ور کے دل سے خوف نکلتا جا رہا تھا۔ ان لاشوں میں سے کسی کے پاس اسلحہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نہیں ملا تھا۔ بہت خوفناک صورت حال تھی لیکن بہر حال یہ بات سمجھنے میں اسے دیر نہیں لگی۔ کہ سارا ہنگامہ وخراٹے کی وجہ سے ہی ہوا ہے۔ اچانک اس نے چونک کر لڑکی کی صورت دیکھی نہیں ہے۔ بات صرف خراٹے ہی کی ہو سکتی ہے۔ البتہ اگر ایک دن یہیں گزار لیا جائے تو دشمنوں کے آگے بڑھ جانے کی مکمل امید کی جا سکتی تھی۔ آخر کار انہوں نے ایک جگہ منتخب کی میدان ہی میں ایک ایسا ٹیلا تھا۔ جہاں ایک سائبان نما چٹان ابھری ہوئی تھی اور اس کے نیچے ایک پلیٹ فارم جیسی جگہ بنی ہوئی تھی جہاں وہ لڑکی کے ساتھ قیام کر سکتا تھا۔ کیونکہ جنگل میں درختوں پر بسیرا نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس میں کافی پریشانی ہوتی سو بھی نہیں سکتے تھے۔ لڑکی تو خیر کوئی مشورہ دینے کے قابل ہی نہیں تھی وہ اس کی ہدایت پر عمل کرتی تھی۔ ان لوگوں کی ہلاکت کے بعد صورت حال کافی سنگین ہو گئی تھی۔ سب سے زیادہ پریشان کن بات یہ تھی کہ شاہ ور اس پورنا قبائل کے راستوں کا تعین نہیں کر سکتا تھا۔ جہاں اس لڑکی کو لے کر اسے پہنچنا تھا۔

بہر حال تقدیر پر بھروسہ ہی کیا جا سکتا تھا۔ اس کے علاوہ کچھ بھی ممکن نہیں تھا۔ لڑکی کے چہرے پر ایک ہچکچاہٹ سی تھی۔ جسے شاہ ور نے محسوس کیا اور لڑکی کے شانے کو تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

"تم اگر کہیں آگے جانا چاہتی ہو تو چلی جاؤ۔ کوئی سوچنے کی بات نہیں ہے۔" لڑکی ہر بات سمجھنے لگی تھی۔ وہ جنگل میں داخل ہو گئی اور تھوڑی دیر بعد واپس آ گئی۔ پھر اس وقت سورج آدھا ڈھلوان طے کر چکا تھا جب اچانک ہی گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز سنائی دی اور شاہ ور نے یہ آواز سن کر ایک دم سے اپنے آپ کو سنبھالا۔ انسانی آوازیں بھی ابھر رہی تھیں۔ ان علاقوں میں گھوڑوں کا تصور ذرا مشکل ہوتا ہے۔ یہ قبائلی ہو سکتے تھے لیکن یہ زیادہ خطرناک ہو سکتے تھے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم ان کے ہتھے چڑھ جائیں۔ شاہ ور کے رونگٹے کھڑے ہو گئے لیکن اگر انسان کے اندر تجسس نہ ہو یا انسان تجسس کو رفع کرنے کے بارے میں نہ سوچے تو انسان کو انسان کہنا ہی مشکل ہو جائے۔ شاہ ور دیکھنا چاہتا تھا۔ کہ کیسے لوگوں کے ساتھ اس نے خطرہ مول لیا ہے اور اس کے ساتھ ہی وہ سائبان کے نیچے سے نکل کر اسی چٹان کی چھت پر چڑھ گیا۔ اس پر چھپکلی کی طرح لیٹ کر اس نے گردن اٹھائی اور اسے گھوڑے سوار نظر آ گئے لیکن اچانک ہی وہ گرتے گرتے بچا۔ کیونکہ جو پہلا گھوڑا اسے نظر آیا تھا اسے دیکھ کر اس کا دل اس بری طرح دھڑکا تھا کہ آنکھوں پر یقین نہیں ہوتا تھا۔ وہ یوگان کا ایک خاص ساتھی تھا۔ باقی افراد اسے یاد آ گئے اور وہ گردن اٹھا کر دور دور تک دیکھنے لگا۔

اس نے دیکھا کہ کم از کم پندرہ کھچر ساز و سامان سے لدے ہوئے اور بہت سے گھوڑے سوار ان لاشوں کے گرد بھٹک رہے ہیں جو وہاں پڑی ہوئی تھیں۔ وہ خاموشی سے یہ منظر دیکھتا رہا۔ پھر اس نے خاموشی سے یوگان اور اس کے ساتھی لاک آئزر وغیرہ کو بھی دیکھا اس کی آنکھیں۔ بند ہونے لگیں۔ یہ سب اس کے لیے اس طرح غیر متوقع تھا کہ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ یوگان نے منفرد طریقہ کار اختیار کیا تھا اور وہ بھی ان ہی علاقوں میں بھٹک رہا تھا۔ لیکن واقعی شاہ ور کو ان کے مل جانے کی امید نہیں تھی۔ اب سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ انہیں دیکھتا رہا پھر وہ سب گھوڑوں سے اتر گئے۔ انہوں نے اپنا کیمپ یہاں قائم کر لیا تھا۔ یوگان کے اشارے پر دور دور تک پڑی ہوئی لاشوں کو یکجا کیا جانے لگا۔ ان لوگوں کے ہاتھوں میں رائفلیں دبی ہوئی تھی۔ ہر شخص مستعدی سے اپنا کام کر رہا تھا۔ کچھ افراد رائفلیں تان کر کھڑے ہوئے تھے اور ان کی نگاہیں دور دور تک بھٹک رہی تھیں شاہ ور کو نجانے کیوں ایک عجیب سی خوشی کا احساس ہوا۔ یوگان بہت ہی مستعدی سے اپنا کام سر انجام دے رہا ہے۔

شاہ ور نے اس کے بارے میں غلط فیصلہ کیا تھا کہ وہ سب سے زیادہ ناکام آدمی رہا تھا۔ حالانکہ اب یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ یوگان ہی سب سے زیادہ کامیاب آدمی ہے اور وہ یقینی طور پر مستعدی سے اپنا کام سر انجام دے رہا

ہے۔ جبکہ دوسرے لوگوں مصیبتوں کا شکار ہو گئے ہیں۔

ب ضروری تھا کہ وہ یوگان کے سامنے آ جائے۔ چنانچہ ں نے لڑکی کا ہاتھ پکڑا اور اسے سائبانی چٹان سے اتارا اس کے بعد ٹیلے کی آڑ سے نکل کر اسی نمایاں جگہ آ گئے ھا جہاں سے وہ لوگ اسے دیکھ لیں اور کسی قسم کی بدگمانی شکار ہو کر اس پر حملہ آور نہ ہو جائیں۔ سب سے پہلے شاہ ور کو یوگان نے ہی دیکھا تھا۔ پہلے اس نے چونک کر ھیں پھاڑیں اور اس کے بعد اس کے حلق سے ایک یب سی آواز نکلی۔ پھر وہ برق رفتاری سے شاہ ور کی رف دوڑا۔ اس طرح چیخنے اور دوڑنے سے باقی لوگ ی اس کی طرف متوجہ ہو گئے اور پھر وہ سب ہی شاہ ور کی رف دوڑ پڑے تھے۔ کچھ ہی لمحوں کے بعد یوگان اس ے پاس پہنچ گیا۔ اس نے چیختی ہوئی آواز میں کہا۔

"اوہ..... میرے دوست! کیا واقعی یہ تم ہو۔" وہ دوڑ کر ور سے لپٹ گیا۔ تمام ہی لوگ قریب آ گئے تھے۔ یوگان ب سی نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کی نظریں لڑکی کی طرف اٹھ رہی تھیں۔ جو ایک وس لباس میں پرسکون نظر آ رہی تھی۔ اس کے اندر کوئی طراب نہیں تھا۔

"تم..... تم..... یہاں مل جاؤ گے میں نے خواب میں بھی س سوچا تھا۔ ہمارا خیال تھا کہ ہم تمہیں ہمیشہ کے لیے کھو ے ہیں۔ آؤ..... ادھر آؤ....." خیمے لگائے جا رہے تھے۔ بہر حال شاہ ور وغیرہ خیموں کے پاس پہنچ گئے۔ لاک ر کے علاوہ ایک اور لڑکی نظر آئی تھی۔ جو لمبے قد و قامت ڈول جسم کی مالک تھی۔ لاک آئزر نے کہا۔

"رائفل بردار مستعد ہو جائیں ہم اس وقت کئی گروپوں گرفت میں آ سکتے ہیں۔" تمام رائفل بردار نے رائفلیں لیں۔

میں بھی یہ ہی کہنے والا تھا۔" یوگان نے کرخت لہجے کہا جو لوگ یوگان کے ساتھ نظر آ رہے تھے۔ ان میں شتر شاہ ور کے لیے اجنبی تھے۔ یوگان نے کہا۔

"اگر تم چاہو تو آرام کر سکتے ہو شاہ ور۔ یقیناً تم بری طرح تھک گئے ہو گے۔"

"نہیں میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

"کہاں ٹھیک ہو گے۔ نجانے کیسے کیسے حالات سے نمٹتے رہے ہو گے تم۔ اس طرح مل جاؤ گے یہ سوچا بھی نہیں تھا۔"

"بہت خوشی ہو رہی ہے۔ آپ سے مل کر مسٹر یوگان۔"

"میں نے تمہیں بلاوجہ منتخب نہیں کر لیا تھا۔ ڈینو کا نے تمہارے بارے میں بڑی تعریفیں کی تھیں اور تم قابل تعریف ہو۔ ویسے ہمیں کچھ نئے گروپوں کا سامنا کرنا پڑا ہے اور اس وقت یہاں جو لوگ موجود ہیں۔ یہ بہترین لڑاکے ہیں لیکن نئے لوگ ہیں۔" بہر حال باقی تمام لوگ کام کر رہے تھے۔ تمام لاشوں کو ایک جگہ جمع کر دیا گیا تھا اور کچھ لوگ گڑھا کھودنے میں مصروف تھے۔ گڑھا تو ان چٹانوں میں کیا ہی کھودا جاتا بس اتنی جگہ بنالی تھی کہ مرنے والوں کو پاس پاس لٹایا جا سکے۔ انسانی ہمدردی کی بنا پر انہیں آدم خور جانوروں کا شکار نہیں ہونے دینا چاہتے تھے۔ چنانچہ قرب و جوار سے چھوٹے چھوٹے پتھر حاصل کیے گئے اور ان لاشوں کو ان پتھروں میں چھپا دیا گیا۔ اس طرح ایک اجتماعی قبر تیار کی گئی تھی۔ رائفل بردار بھی مستعد تھے۔

بہر حال تمام کاموں سے فراغت ہو گئی تو پہرے داروں کو مستعدی سے پہرہ دینے کی ہدایت کرنے کے بعد سب لوگ ایک جگہ جمع ہو گئے۔ ان میں کچھ افراد زخمی بھی تھے۔

"یہ لڑکی جس کا نام ڈینش ہے۔ بڑے کام کی لڑکی ہے۔ اس معرکے کی تفصیل تو خیر بعد میں ہی معلوم ہو گی۔ بہر حال یہ اندازہ ہو رہا ہے۔ کہ ہمارے بہت سے ساتھی جان بچا کر پہاڑوں میں جا چھپے ہیں۔ شاید وہ ہمیں دوبارہ کبھی نہ مل سکیں۔ لاک آئزر بھی اپنی بیٹی کا ہاتھ پکڑے وہاں سے بھاگ نکلا تھا لیکن اس کے کئی گولیاں لگی ہیں اور وہ شدید زخمی ہو گیا ہے۔ تم فکر مت کرو ہم یہیں قیام کریں گے اور اگر ہمارے دشمنوں نے واپس آنے کی کوشش بھی کی تو ان کا بھی یہ ہی حشر کریں گے۔ جو انہوں نے ان لوگوں کا کیا ہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جن کی قبر بنائی گئی ہے۔ جبکہ ہم ان کی قبر بھی نہیں بنائیں گے۔" شاہ ور دل ہی دل میں مسکرا دیا۔

بہر حال یہ ساری تفصیلات بڑی عجیب و غریب تھیں اور شاہ ور سوچ رہا تھا کہ کس طرح اسے خزانے کے لیے سرگرداں ہونا پڑا ہے۔ جبکہ اسے کسی خزانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ وہ لڑکی جس کا نام ڈینش بتایا گیا تھا خاصی اسمارٹ نظر آ رہی تھی اور شاہ ور نے محسوس کیا تھا کہ وہ بار بار اس کی جانب متوجہ ہو جاتی ہے۔ شاہ ور کو اس طرح کے واقعات کا اکثر سامنا کرنا پڑ جاتا تھا لیکن صورتحال اب کچھ بھی نہیں تھی۔ یوگان نے کہا۔

"تم اچانک ان کے درمیان سے غائب ہو گئے تھے۔ ہم تو خیران کے ساتھ قیدیوں کی طرح تھے۔ جو ہدایت وہ ہمیں دے رہے تھے ہم ان پر عمل کر رہے تھے۔ تم نے کیا طریقہ کار اختیار کیا کہ راتوں رات اتنی دور نکل گئے۔ بہر حال یہ خوشی ہے کہ ہمارے دشمنوں پر جو جنون سوار تھا۔ ہم اس کا شکار نہیں ہوئے۔ ویسے ایڈمین ایک ہی رٹ لگائے ہوئے تھا۔ کہ جیسے بھی ہو سکے ان دونوں کو تلاش کر کے اس کے حوالے کیا جائے۔"

"ایڈمین کون ہے؟"

"سب سے بڑا گروپ اور یقیناً اسی گروپ نے ان باقی افراد کو قتل کیا ہے۔" شاہ ور خاص سوچ میں ڈوب گیا تھا۔ یوگان نے کہا۔ "اور پھر بھی میں یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ ہم بہت غلط منصوبے کے تحت یہ سفر کر رہے تھے۔ ریڈ مین کے ساتھ ایک عورت بھی ہے۔ جس کا نام سلوگا ہے۔ وہ اس قدر خطرناک عورت ہے کہ تم خوابوں میں بھی نہیں سوچ سکتے۔ انسانی گردن کو دانتوں سے ادھیڑ کر پھینک دیتی ہے۔ بہر حال اس داستان کا مرکز ایک ہی ہے۔ کہ ہم سب کو پورنا قبائل تک پہنچنا ہے۔ دوسرے گروپ وہاں تک جس انداز میں بھی پہنچیں ہماری صورتحال خاص بہتر ہے کیونکہ پورنا قبائل کی ایک لڑکی ہمارے ساتھ موجود ہے۔"

بہر حال وقت گزرتا گیا۔ آخر کار یہاں سے روانگی کا فیصلہ کیا گیا۔ اس وقت شاہ ور اور لڑکی کو بہت اہمیت دی جا رہی تھی اور ہر شخص انہیں زیادہ سے زیادہ آرام پہنچانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایلاسی کو شاہ ور کے ساتھ ہی گھوڑے پر سوار کر دیا گیا اور یہ لوگ پورے اعتماد کے ساتھ آگے بڑھنے لگے۔ مسلح افراد خاص طور سے مستعد کیے گئے تھے۔ پہلی رات کے قیام کے بعد پھر تمام لوگ شاہ ور کے پاس آ گئے اور یہاں باقاعدہ قیام کیا۔ ڈینش ایک عجیب و غریب لڑکی تھی۔ رات کو وہ شاہ ور کے قریب آ گئی اور اس نے اسے آواز دی۔

"مسٹر شاہ ور..... مسٹر شاہ ور۔" شاہ ور چونک کر اسے دیکھنے لگا۔ "ہیلو..... آپ یہاں کیا کر رہے ہیں۔"

"کچھ نہیں مس ڈینش۔"

"ایک سوال میرے دل میں پیدا ہو رہا ہے۔"

"جی کہیے۔"

"کیا آپ اداس ہیں؟"

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔"

"مجھے لگ رہا ہے۔"

"پتہ نہیں آپ کو ایسا کیوں لگ رہا ہے؟"

"بس ایک خیال آیا ہے میرے دل میں۔" ڈینش نے کہا۔

"کیوں؟"

"ہیلی نے مجھے آپ کے بارے میں تفصیلات بتائی تھیں۔"

"ہیلی۔"

"ہاں..... اور وہ مر چکی ہے۔"

"ہاں..... میں سمجھ رہا ہوں۔"

"مگر آپ کہنا کیا چاہتی ہیں۔"

"ان تفصیلات میں تھوڑا سا محبت کا رنگ بھی تھا۔"

"مس ڈینش محبت تو انسانی زندگی کا ایک حصہ ہے۔ کے ساتھ جو بھی موت کا شکار ہیں سب ہی کی موت بہ افسوس ناک ہے۔ اگر آپ کسی اور نقطۂ نظر سے ہیلی

بارے میں مجھ سے سوال کر رہی ہیں تو ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ وہ ایک اچھی لڑکی تھی۔ جو کچھ اس کے ذہن میں تھا۔ افسوس کہ میں اسے اپنے ذہن تک نہیں لا سکا۔"

"میرا خیال تو ہے کہ ہیلی نے آپ پر مکمل طور پر قبضہ جما لیا تھا۔"

"آپ کو صرف ہیلی سے باتیں کر کے یہ خیال آیا ہے۔ تو میں کیا کہہ سکتا ہوں۔"

"گویا آپ اس بات سے منحرف ہیں۔"

"ہاں۔"

"ٹھیک۔"

"کیا مطلب؟"

"نہیں ٹھیک ہے۔ ویسے آپ بہت ہینڈسم ہیں۔"

"تو پھر؟"

"میرا مطلب ہے۔ زندگی سے اتنی دور کیوں بھاگتے ہیں۔"

"آپ کیا کہنا چاہتی ہیں تفصیل بتائیے؟"

"میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ زندگی کے ان لمحات سے کیوں لطف اٹھایا جائے۔ ہم سب موت کی آغوش میں سفر کر رہے ہیں۔ کوئی بھی لمحہ زندگی کے آخری لمحے کی شکل اختیار کر سکتا ہے۔ اس لیے زندگی کا لطف اٹھانا چاہیے۔"

"میں زندگی کے لطف اٹھا رہا ہوں۔"

"میں اپنی بات کر رہی ہوں۔" اس نے کھلم کھلا دعوت دے دی اور شاہ ور مسکرا دیا۔ بہر حال وقت گزرتا رہا اور شاہ ور یہ سوچتا رہا کہ اب اسے کیا کرنا چاہیے۔ پھر ڈینش نے اس پر دوسرا وار کیا۔

"ایک بات بتائیے۔" وہ لڑکی ایلاسی جسے آپ نے بقول کسی کے گود لے لیا ہے۔ اس کی کیا کیفیت ہے؟"

"وہ بالکل ٹھیک ہے۔ آپ کسی کے لیے پریشان نہ ہوں۔" یہ کہہ کر شاہ ور اپنے خیمے کی جانب چل پڑا۔ دوسرے دن صبح سفر کی تیاریاں کی گئیں اور یہ لوگ آگے بڑھنے کے لیے تیار ہو گئے۔ یوگان نے شاہ ور سے کہا۔

"نقشوں کے مطابق ہم بالکل صحیح راستوں پر جا رہے ہیں۔ ہمارے دشمنوں کے پاس بھی نقشے موجود ہیں۔ میری مراد ریڈ مین سے ہے۔"

"یہ ریڈ مین بالکل ہی نیا پیدا ہوا ہے؟"

"نہیں میں اس کے بارے میں اچھی طرح جانتا تھا۔"

"ایک بات بتائیے؟"

"ہاں....."

"ڈینوکا کا مشن تو کچھ اور تھا۔ یہ اچانک ہی پورا مشن تبدیل کیسے ہو گیا ہے اور مجھے اس کے بارے میں تفصیلات بھی نہیں بتائی گئی تھیں۔"

"تم یقین کرو..... ڈینوکا کا مشن یہ ہی تھا۔ ہم لوگ جس شخص کے خلاف کام کر رہے ہیں۔ وہ اتنا ہی خطرناک آدمی ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ریڈ مین خاص طور سے بگ ہارڈ ہی کا آدمی ہو۔ بگ ہارڈ بہر حال پورنا کی طرف سے غافل تو نہیں ہے۔" یوگان نے کہا۔

"میں بہر حال ذہنی طور پر اتنا طاقتور نہیں ہوں۔ کہ ان ساری باتوں پر بھی غور کر سکوں۔"

"بہر حال ہمیں ہوشیار رہنا ہے۔"

سفر شروع ہو گیا۔ گھوڑوں پر سواری کی جا رہی تھی اور تمام انتظامات کر لیے گئے تھے۔ آگے چلنے کے بعد یہ لوگ ایک عجیب سے جنگلات میں داخل ہو گئے کہیں کہیں گھنے درخت تھے اور کہیں کہیں یہ درخت خاصی کھلی جگہوں پر تھے۔ لیکن یہاں اونچے نیچے پہاڑی سلسلے بکھرے ہوئے تھے۔ صحیح معنوں میں اس جگہ کا سفر ایک مشکل سفر تھا۔ جنگل میں چاروں طرف ایک پراسرار خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ بس گھوڑوں ٹاپوں کی آواز اور کبھی کبھی ان کے ہنہنانے کی آوازیں سنائی دے جاتی تھیں۔ یہ لوگ آگے بڑھتے گئے اور بہت دیر تک یہ سفر جاری رہا۔ پھر رات ہو گئی۔ اس رات بھی انہوں نے جنگلوں ہی میں قیام کیا تھا۔ خاصے گھنے علاقے میں تھے اور یہ درخت بھی کچھ اجنبی اجنبی سے لگتے تھی۔ عجیب سی صورت حال کا احساس ہو رہا تھا۔ پھر آسمان

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

برتارے نکل آئے لیکن زمین پر ان کی چھاؤں تک نہیں پہنچی تھی جس کی وجہ سے گہری تاریکیاں چاروں طرف بکھری ہوئی تھی۔ پراسرار ماحول گہری تاریک رات' ذہنوں میں ایک پراسرار سنسناہٹ طاری ہوگئی۔ کوئی محفل نہیں جمی تھی۔ سب اپنے اپنے طور پر آرام کررہے تھے۔ شاہ ور بھی لڑکی کے قریب ہی موجود تھا۔ اچانک اگر کوئی شاہ ور کے خیمے میں گھس آتا جیسے ڈینش وغیرہ تو بڑی عجیب سی پوزیشن میں انہیں دیکھ سکتا تھا۔ کیونکہ اب لڑکی کو شاہ ور کے بازو پر سر رکھ کر سونے کی عادت ہوگئی تھی اور اس کی معصومیت کی وجہ سے شاہ ور بھی اس سے انکار نہیں کرتا تھا۔ بلکہ یہ حقیقت تھی کہ اب اس کا لمس شاہ ور کے ذہن میں کوئی غلط تصور پیدا نہیں کرتا تھا۔ وہ اس وقت نیم غنودگی کی کیفیت میں تھا کہ فضاء میں ایک عجیب سی سرسراہٹ ابھری اور شاہ ور چونک پڑا۔ لڑکی نے ایک دم سر اٹھایا اور فضاء میں کچھ سونگھنے لگی۔ بہت دیر تک وہ اسی کیفیت کا شکار رہی یہ بالکل نیا انداز تھا۔ جس کا شاہ ور کو اندازہ نہیں تھا شاہ ور کو حیرانی کا احساس ہوا۔ کافی دیر تک وہ بلی کی طرح گردن اٹھا کر فضاء میں دیکھتی رہی اور شاہ ور اس کا جائزہ لیتا رہا۔ لڑکی نے دوبارہ شاہ ور کے بازو پر سر رکھ لیا اور خاموش ہوگئی لیکن زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ شاہ ور کو اچانک ہی ایک مدھم سی آواز سنائی دی۔

"شاہ ور!" شاہ ور اچھل پڑا آواز لڑکی نے بھی سن لی تھی اور پھر گردن اٹھائی تھی اس نے۔ شاہ ور نے اسکا سر نیچے رکھ کر اس کے رخسار پر ہلکی سی تھپکی دی اور کہا میں باہر جارہا ہوں تم یہاں آرام سے رکو۔ آواز دوبارہ سنائی دی اور شاہ ور نے پہچان لیا کہ یہ یوگان ہی کی آواز ہے وہ خیمے کے پاس آ گیا اور اس نے کہا۔

"کیا بات ہے۔ مسٹر یوگان!"

"کچھ گڑبڑ لگ رہی ہے۔ شاہ ور۔"

"میں نے انسانی قدموں کی آوازیں سنی ہیں اور وہ ہم میں سے نہیں ہیں۔ بیٹھ جاؤ' دیکھو' سنو میں غلط نہیں کہہ رہا تھا اور یہ دونوں خیمے کے پاس ہی زمین پر بیٹھ گئے۔ انہوں نے دم سادھ لیا تھا۔ پراسرار آوازیں دیر تک گونجتی رہیں۔ وہ ان آوازوں کو بخوبی سن رہے تھے اور اندازہ لگا رہے تھے۔ جیسے چار چار چھے چھے اور آٹھ آٹھ افراد اِدھر سے اُدھر جاتے ہوئے جگہیں تبدیل کررہے ہوں۔ شاہ ور اور یوگان خاموشی سے ان آوازوں کا جائزہ لیتے رہے۔ جو وقفے وقفے سے مسلسل ابھر رہی تھیں اور سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ کیا ہے۔ رات کی تاریکی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر تاریکی میں دیکھا جارہا تھا لیکن کوئی چیز نظر نہیں آرہی تھی۔ شاہ ور نے یوگان سے کہا۔

"کیا ہوسکتا ہے؟"

"دشمن۔"

"کیا مطلب؟"

"وہ پوزیشن بنا رہے ہیں۔"

"مگر وہ کون ہوسکتے ہیں۔"

"کچھ بھی نہیں کہا جاسکتا۔"

"کیا ریڈ مین؟"

"ہوسکتا ہے۔"

"کیا دوسرے لوگوں کو اس کے بارے میں پتہ ہے۔"

"پتہ نہیں۔"

"مطلب یہ کہ مسٹر یوگان ..... آپ ہی میرے پاس آئے ہیں۔"

"ہاں۔"

"تو کیا دوسروں کو ہوشیار کرنا ضروری نہیں ہے۔"

"سمجھ میں نہیں آرہا۔"

"کیوں؟"

"اگر یہ ہمارا وہم نکلا تو؟"

"نہیں..... اب یہ وہم نہیں ہے۔ اس کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں ہے کہ اب آہستہ آہستہ دوسروں کو ہوشیار کردیا جائے اور پھر اسی بات پر عمل کیا گیا۔ ایک ایک شخص کو جگا دیا گیا لیکن اتنی احتیاط کے ساتھ کہ کسی کو یہ اندازہ نہ ہوسکے کہ کسی خیمے میں کوئی جاگ رہا ہے۔ صورتحال خاصی مشکل

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھی۔ یہ لوگ رائفلیں سنبھالے دشمن کی طرف سے کسی عمل کا انتظار کررہے تھے لیکن رات آہستہ آہستہ گزرتی چلی گئی پھر آہستہ آہستہ صبح کی روشنی نمودار ہونے لگی۔ بہرحال رات میں کوئی کارروائی نہیں کی گئی حالانکہ وہ اچھی خاصی کیفیت میں تھے۔ اگر وہ خیموں پر گولیاں برسانا شروع کردیتے۔ تو یقینی طور پر یوگان کے ساتھیوں کو نقصان اٹھانا پڑتا روشنی پھیل گئی۔ دور دور تک دیکھا جاسکتا تھا لیکن حیرت ہوئی کہ قرب وجوار میں کچھ بھی نہیں ہے۔ یہ بڑی حیران کن بات تھی۔ یوگان نے کہا۔

"لگتا ہے جنگل کے بھوت ہمارے گرد چکر لگا رہے تھے اور ہم نے انہیں کی آوازیں سنی تھیں۔"

"مگر یہ ہوا کیا؟" اگر وہ آئے تھے تو فرار کیوں ہوگئے کسی نے اس سلسلے میں کچھ نہ کہا۔ اندازہ یہ ہورہا تھا کہ کوئی گہری سازش کی جارہی ہے۔ اس کے بعد برق رفتاری سے تیاریاں کی گئیں اور ایک ایک قدم وہاں سے آگے بڑھایا جانے لگا۔ درخت کافی گھنے ہورہے تھے۔ یہ درخت ویسے بھی عجیب وغریب کہے جاسکتے تھے۔ کیونکہ ان کی صورت اور شکل بڑی اجنبی سی تھی۔ جوں جوں یہ لوگ آگے بڑھتے رہے۔ جنگل گھنا ہوتا گیا اور اس وقت دن کے ساڑھے گیارہ یا پونے بارہ بجے تھے۔ کہ اچانک فائرنگ کی آواز سے گہرا سناٹا ٹوٹ گیا۔ گولیاں اولوں کی طرح سے برستی ہوئی ان کے سروں پر سے گزرنے لگیں اور شاخیں اور تنے چھلنی ہونے لگے۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی فوج نے حملہ کردیا ہو۔ ایک لمحے کے لیے سب اپنی جگہ رک گئے اور پھر دوڑ دوڑ کر درختوں کی آڑ لینے لگے اور اب انہوں نے ان گھوڑوں کو بھی ان گولیوں سے بچانے کی کوشش کی تھی۔ اگر ذرا بھی تاخیر ہو جاتی تو ان کے لیے بڑے نقصان کا پیش خیمہ ثابت ہوتی کم از کم گھوڑے تو بچ نہیں پاتے۔ سب کے رونگٹے دہشت سے کھڑے ہوگئے تھے۔ یہ اندازہ ہورہا تھا کہ انہیں بڑی دانشمندی کے ساتھ گھیر کر ان پر حملہ کیا گیا ہے۔ گولیاں مسلسل چل رہی تھیں اور ان کے اُوپر نیچے دائیں بائیں سے گزر رہی تھیں۔ درختوں کے پتے اور شاخیں ٹوٹ ٹوٹ سے کر گر رہے تھے اور کچھ ہی دیر بعد ٹوٹی ہوئی شاخوں اور پتوں کا انبار ان کے پاس جمع ہوگیا۔

ان کے بدن بھی ان کی آڑ میں چھپ گئے تھے۔ شاہ ور نے اس ڈھیر میں سے گردن اٹھائی اور حملہ آوروں کا جائزہ لینے کی کوشش کرنے لگا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے فائرنگ کرنے والے مسلسل آگے بڑھ رہے ہیں اور ان کے گرد حلقہ قائم کررہے ہیں آہستہ آہستہ گولیاں چلنا بند ہوگئیں اور پھر ان لوگوں نے دیکھا اور دوسرے ہی لمحے یوگان نے کہا۔

"یہ ریڈ مین کے آدمی نہیں ہیں۔ کیا مصیبت ہے ذرا دیکھو ان کی تعداد کیا ہے؟" چاروں طرف سے ٹنڈی دل لوگ نمودار ہوتے جارہے تھے۔ درختوں کے درمیان جدھر بھی دیکھا جاسکتا تھا۔ انہیں وہی نظر آرہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں اور وہ آگے بڑھ رہے تھے۔ دفعتہً ہی یوگان نے کہا۔

"یوگان! یہ پورنا قبائل کے لوگ ہیں۔" ان کی تعداد اتنی تھی کہ اگر یہ لوگ اپنا پورا مشن بھی ختم کردیتے تو ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے۔ ان سب کے چہرے ان کی طرف اٹھے ہوئے تھے اور رائفلوں کی نالیں سیدھی ان کی جانب تھیں۔ وہ مستعدی سے ایک ایک قدم آگے بڑھ رہے تھے۔ ایک دراز قامت شخص کو انہوں نے دیکھا۔ جو سب سے آگے چل رہا تھا۔ پھر ان سے کافی فاصلے پر آکر وہ سب رُک گئے۔ اس شخص نے نامعلوم زبان میں کچھ کہا۔ اس کے ساتھ ہی اشارہ بھی کیا۔ جس کو ان لوگوں نے سمجھ لیا۔ انہوں نے اس کے اشارے پر جگہیں چھوڑ دیں اور ایک جگہ جمع ہونے لگے۔ شاخوں اور پتوں میں سے ایک ایک شخص باہر نکل آیا تھا۔ پھر اس نے دوسرا اشارہ کیا۔ جو انتہائی کرخت آواز میں تھا۔ یوگان بولا۔

"یقیناً یہ لوگ ہمیں ہتھیار پھینکنے کا اشارہ کررہے ہیں۔ جتنے لوگ بھی یہاں موجود ہیں۔ اگر وہ لوگ ہم پر پیدل بھی یلغار کردیں تو ہمارے بدن پس کر رہ جائیں گے۔ اس لیے

فوراً ہتھیار پھینک دو۔" شاہ ور بھی اس کی اس بات سے متفق تھا۔ چنانچہ فوراً ہی ہتھیار پھینک دیئے گئے اور اس عمل نے انہیں کافی حد تک مطمئن کر دیا۔ اس شخص نے پیچھے ہاتھ کر کے اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا اور وہ آہستہ آہستہ ان کی جانب بڑھنے لگے اور ان کے بالکل قریب پہنچ گئے۔ آنے والوں نے ان کی تلاشی لینا شروع کر دی اور جو کچھ ان کے پاس تھا۔ ایک طرف ڈھیر کر دیا گیا۔ اس ڈھیر میں ان کے قبیلے اور ان تھیلوں میں ان کا کھانے پینے کا سامان تھا۔ ہر چیز جیب سے نکال لی گئی تھی اور وہ سب لوگ ان تمام چیزوں کو ایک جگہ جمع کرنے میں مصروف ہو گئے تھے۔ پھر انہوں نے دوسرا عمل کیا۔ رسیوں کے گچھے انہوں نے اپنے لباس سے نکالے اور ان سب کے ہاتھ ان کی پشت سے کس دیئے گئے۔ یہاں تک کہ لڑکیوں کو بھی نہیں چھوڑا گیا تھا۔ شاہ ور نے خاص طور پر ایک بات کا جائزہ لیا کہ ان لڑکیوں کو ان سے خطرہ تو نہیں ہے۔ لیکن ظاہر یہ ہی کیا گیا تھا جیسے وہ ان لڑکیوں پر توجہ بھی نہ دے رہے ہوں۔

البتہ لڑکیاں بری طرح خوفزدہ تھیں۔ پھر وہ شخص پیچھے ہٹ گیا۔ انہیں ایک جگہ جمع کیا گیا۔ اس دوران میں خاص طور سے یہ محسوس کیا گیا تھا۔ کہ ان میں سے کسی نے اپنے قبیلے کی لڑکی کو نہیں پہچانا تھا اور اس کے ساتھ بھی وہی سلوک کیا تھا جو دوسروں کے ساتھ کیا تھا۔ گھنے جنگلوں میں سے گزر کر وہ آخر کار ایک دریا کے قریب پہنچ گئے۔ ٹھنڈی ہوا کے فرحت بخش جھونکوں اور درختوں کے خوشگوار سایوں نے ان کا استقبال کیا۔ دریا کے پار دوسری طرف ایک عجیب سی چھوٹی سی بستی نظر آ رہی تھی۔ کچے پکے مخصوص طرز کے مکانات یہاں بکھرے ہوئے تھے۔ ان کے وحشی نگہبانوں نے انہیں دریا پر پانی پینے اور منہ دھونے کی اجازت دے دی۔ یہ لوگ دریا پار کرنے کے لیے ایک طرف چل پڑے۔ جدھر لکڑی کا ایک بہت بڑا پل بنایا گیا تھا۔ وہ اس پل سے گزرنے لگے اور اس کو عبور کر کے دوسری جانب پہنچ گئے۔ انوکھی سی بستی آباد تھی۔ ان کی تعداد چونکہ بہت زیادہ نہیں تھی۔ اس لیے انہیں ایک بڑے سے احاطے میں پہنچا دیا گیا۔ پھر اس بڑے اور لمبے قد کے آدمی نے اپنی زبان میں کچھ کہا لیکن کسی کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ سکی۔

ایلاسی کو بھی دوسری عورتوں کے ساتھ الگ کر دیا گیا تھا۔ پتہ نہیں کیا صورتحال تھی۔ اچانک ہی یوگان نے کہا۔

"یہ لوگ پورنا قبائل کے لوگ ہی ہیں۔ ہم دعوے سے یہ بات نہیں کہہ سکتے کیونکہ انہوں نے ایلاسی کو بھی دیکھا ہے۔ بے شک ایلاسی ہمارے سامنے نہیں ہے اور ہمیں کچھ نہیں معلوم کہ کیا صورتحال پیش آئے گی۔ ہو سکتا ہے کہ یہ پورنا کے لوگ نہ ہوں، بہر حال کیا کیا جا سکتا ہے۔" اس کے بعد ان لوگوں کو کھانے پینے کی چیزیں بھی دی گئیں اور رات اسی احاطے میں گزاری گئی اور دوسرے دن صبح سورج کی روشنی نے انہیں جگایا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب یہ لوگ کیا کریں۔ اب ذرا تھوڑی سی تبدیلی کی گئی تھی۔ لڑکیاں زیادہ فاصلے پر نہیں تھیں۔ شاہ ور آہستہ آہستہ لڑکی کی طرف کھسکنے لگا۔ ایلاسی کافی پریشان نظر آ رہی تھی۔ اس طرح وقت گزر گیا۔ ایلاسی اتنے فاصلے پر تھی کہ شاہ ور اشارے سے بھی اس سے کوئی بات نہیں کہہ سکا تھا۔

بہر حال وقت کافی گزرتا گیا۔ اب یہ اندازہ لگانا ضروری تھا کہ باہر کی صورتحال کا جائزہ لیا جائے۔ ان لوگوں نے قیدیوں کے ہاتھ کھول دیئے تھے۔ غالباً پورے دن کی صورتحال سے انہوں نے یہ اندازہ لگایا تھا۔ کہ قیدی خطرناک نہیں ہیں لیکن دوپہر کے بعد جب سورج ڈھل رہا تھا۔ کچھ افراتفری مچی اور اس کے بعد گولیاں چلنے کی آواز سنائی دینے لگی۔ سب چونک پڑے تھے۔ کہیں شور مچ رہا تھا۔ آبادی کے لوگ اِدھر اُدھر بھاگتے پھر رہے تھے۔ خدا ہی بہتر جانتا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے لیکن یہ لوگ خوفزدہ نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہے تھے۔ لوگ برق رفتاری سے اِدھر سے اُدھر بھاگ رہے تھے ایک لمحے کے لیے شاہ ور کے ذہن میں ایک تصور پیدا ہوا۔ وہ یہ محسوس کر رہا تھا کہ جو پہرے دار ان پر پہرہ دے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

رہے ہیں۔ وہ اس افراتفری کا شکار ہو گئے ہیں اور اس وقت کچھ کیا جا سکتا ہے شاہ ور آہستہ آہستہ اُٹھ کر اس احاطے کے آخری حصے کی طرف پہنچ گیا۔ یوگان اور دوسرے لوگوں نے حیرت سے اُسے دیکھا لیکن کوئی فیصلہ نہیں کرنے پائے۔ لیکن اچانک ہی یوگان نے کہا۔

"کیا کرنے جا رہے ہو۔"

"میرا ساتھ دیجیے مسٹر یوگان!"

"کیا مطلب؟"

"میں فرار کا راستہ تلاش کرنا چاہتا ہوں۔"

"پھر بھی..... ذرا؟"

"نہیں مسٹر یوگان..... کیا آپ لوگ اس احاطے میں زندگی گزارنے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر اس سنسنی خیز صورتحال میں نقصان پہنچ سکتا ہے۔"

"تو پھر..... جیسا تم کہو۔" اچانک ہی شاہ ور نے مدھم سی ایک مسکراہٹ کے ساتھ انہیں دیکھا اور اس کے بعد احاطے سے دوسری طرف کود گیا۔ بڑی خطرناک صورتحال تھی لیکن پتہ تو چلے کہ فرار کا کوئی راستہ ہے یا نہیں۔ بہر حال وہ احاطے سے باہر نکل آیا۔ ایک طرف سے آگ کے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ اس نے دیکھا کہ وہ لوگ اسی سمت جا رہے ہیں اور نجانے کس پر گولیاں برسا رہے ہیں۔ بہر حال وہ بھی انہیں کے انداز میں بھاگنے لگا۔ وہ ایک صحیح عمل تھا۔ اگر وہ اسے تنہا بھاگتے ہوئے دیکھتے تو کوئی بھی گولی اس کے بدن کو چاٹ سکتی تھی اور اس کے پاس تو کوئی ہتھیار نام کی چیز بھی نہیں تھی۔ وہ اس جگہ پہنچ گیا۔ جہاں وہ لوگ بری طرح چیخ رہے تھے اور گولیاں برسا رہے تھے اور پھر اس نے ایک سنسنی خیز منظر دیکھا۔ یہ لوگ بھی یقینی طور پر کسی گروپ کے لوگ تھے۔ شاید ریڈ مین اور سلوگا کی ٹیم تھی۔ نجانے وہ لوگ کس طرح یہاں پر پہنچے تھے۔ بہر حال وہ لوگ اس وقت مستعدی سے مقابلہ کر رہے تھے اور آبادی کے لوگ شاید انہیں قابو میں نہیں کر پا رہے تھے۔ شاہ ور چند لمحے تک سوچتا تھا۔ پھر اچانک ہی اس نے ایک طرف دوڑنا شروع کر دیا۔ وہ ان لوگوں کو نکالنے کے لیے کوئی راستہ تلاش کرنا چاہتا تھا۔ کچھ گولیاں اس کے آس پاس سے بھی گزریں۔ اچانک ہی اس نے دہشت بھری نگاہوں سے ان لوگوں کی طرف دیکھا۔ قبائلیوں میں سے دس بارہ افراد اس کی جانب دوڑے چلے آ رہے تھے۔ انہوں نے اسے دیکھ لیا تھا اور شاید اس کا پیچھا نہیں چھوڑنے والے تھے۔ چنانچہ وہ برق رفتاری سے دوڑنے لگا۔ وہ لوگ مسلسل گولیاں چلا رہے تھے اور کوئی بھی لمحہ ایسا ہو سکتا تھا کہ کوئی گولی شاہ ور کے بدن کو چھوتی ہوئی گزر جاتی یہ بھی صرف تقدیر کی خوبی تھی کہ ان لوگوں کی چلائی ہوئی گولیوں سے وہ بچ رہا تھا۔ اب اسے اس بات کا کچھ اندازہ نہیں تھا کہ وہ کدھر جا رہا ہے۔ وہ بس دوڑ رہا تھا۔ وہ لوگ بھی دیوانوں کی طرح بس اس کا پیچھا کر رہے تھے۔ کچھ دیر کے بعد وہ جنگل میں داخل ہو گیا۔ لیکن ان کی چلائی ہوئی گولیوں سے یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کسی بھی قیمت پر اسے نظر انداز نہیں کریں گے اور یہ گولیاں درختوں کے تنوں میں لگ رہی تھیں۔ شاخیں ٹوٹ رہی تھیں۔ اچانک ہی اس کے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی اور اس نے آنکھیں بند کر لیں کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کہاں جا رہا تھا۔ بہر حال کوئی پانچ فٹ نیچے گرا تھا اور اس کے پیروں کے نیچے نرم اور گیلی زمین آ گئی تھی۔ یہ غالباً خشک جوہڑ تھا جس میں وہ گرا تھا۔ اسے گھاس نے ڈھکا ہوا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ابھی چند لمحوں کے بعد وہ لوگ بھی یہاں پر پہنچ جائیں گے۔ بلکہ ممکن ہے کہ دوڑتے ہوئے وہ بھی جوہڑ ہی میں آ کودیں لیکن بہر حال اس نے اپنے آپ کو سمیٹ لیا اور آنے والے وقت کا انتظار کرنے لگا۔ اس کے کان آنے والی آوازوں پر لگے ہوئے تھے۔ اسے محسوس ہوا جیسے وہ اس جوہڑ کے اُوپر کے حصے سے گزر رہے ہوں وہ مسلسل گولیاں برسا رہے تھے اور آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ شاید انہیں اس جوہڑ کا کوئی اندازہ نہیں ہوا تھا اور وہ اصل صورتحال کو سمجھ نہیں پائے تھے۔

اچانک ہی شاہ ور کے منہ سے ایک ہلکی سی چیخ نکل گئی اور اس کا ہاتھ اس جگہ جا لگا جہاں اسے ہلکی سی چبھن کا احساس ہوا تھا۔ اس نے اندازہ لگانے کے لیے کہ یہ چبھن کیسی ہے۔ اپنی پنڈلی کے اس حصے کو ٹٹولا۔ تو اس کے حلق سے ایک کریہہ آواز نکل گئی۔ وہ دو دو تین تین انچ لمبی جونکیں تھیں۔ جو بدن کے کھلے ہوئے حصوں پر حملہ آور ہو گئیں تھیں۔ شاہ ور کی پنڈلی اس کے علاوہ گردن اور کلائیوں پر بھی دو تین جونکیں لپٹ گئیں تھیں۔ اس نے دیوانوں کی طرح ان جونکوں کو اپنے بدن سے جدا کرنے کی کوشش کی مگر وہ اس طرح جسم میں پیوست ہو گئیں تھیں کہ بیان نہیں کیا جا سکتا۔ جب بھی وہ انہیں کھینچتا وہ ربڑ کی طرح لمبی ہو جاتیں لیکن کھال سے الگ نہ ہوتیں۔ جونکوں کے بارے میں اسے معلوم تھا کہ وہ خون چوستی ہیں۔ اس کی کوئی بھی کوشش جونکوں کو جسم سے ہٹانے میں کارگر ثابت نہ ہوئی اور وہ خوفزدہ نگاہوں سے انہیں دیکھتا رہا۔ اُوپر سے مسلسل گولیاں برس رہی تھیں اور اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ پھر جونکوں نے اتنا خون پی لیا کہ وہ خود بخود جسم سے جدا ہو گئیں لیکن اس گڑھے میں نجانے کتنی جونکیں اور ہوں گی۔

یہ تو لمحوں میں شاہ ور کے جسم کا سارا خون نچوڑ لیں گی۔ چنانچہ یہاں سے نکلنا ضروری تھا اور شاہ ور نے گڑھے سے نکلنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ موٹی گھاس کی جڑوں نے اس کی مدد کی ورنہ اس گھڑے سے نکلنا بھی آسان نہیں ہوتا۔ بمشکل تمام وہ اس میں سے نکل آیا۔ باہر بھی خطرہ تھا اور نیچے بھی لیکن نیچے کا خطرہ زیادہ ہولناک تھا۔ اگر موت بھی آئے تو کم از کم ایسی گندی جگہ تو نہ آئے۔ چنانچہ وہ وہاں سے آگے بڑھنے لگا۔ کچھ فاصلے پر جھاڑیاں بکھری ہوئی تھیں۔ وہ ان جھاڑیوں میں سے جگہ بناتا ہوا آگے بڑھتا رہا اور کافی فاصلہ اس طرح طے کر لیا۔ یہاں تک کہ اس کی دائیں جانب ایک بلند ٹیلوں کا سلسلہ نظر آنے لگا۔ اس وقت یہ ٹیلے بہت غنیمت تھے۔ چنانچہ وہ آگے بڑھنے لگا۔ اتنا حوصلہ بڑا مشکل تھا کہ اپنی زندگی داؤ پر لگا دی جائے۔ اگر وہ واپسی کا سفر طے کرتا تو کیا صورتحال پیش آتی۔ لوگ شاہ ور سے بچھڑ گئے تھے اور اب تو وہ لڑکی بھی اس کے ساتھ نہیں تھی لیکن وہ جانتا تھا کہ اگر واپس کا سفر طے کیا تو زندگی اور موت کے درمیان زیادہ فاصلہ نہیں رہے گا۔

چنانچہ وہ آگے بڑھتا رہا۔ اس کا ذہن خواب کی سی کیفیت کا شکار ہو گیا تھا اور اب بہت کچھ بوجھل ہو گیا تھا۔ ایک تو بھوک نقاہت دوسری کمبخت جونکیں اتنا خون پی گئیں تھیں کہ بدن میں ایک سنسنی کا سا احساس ہو رہا تھا۔ اسی کیفیت میں نجانے کتنی دور نکل آیا۔ اب اس کے اطراف میں گھنا جنگل تھا۔ یہ جنگل بہت زیادہ گھنا تھا۔ درخت ایک دوسرے میں پیوست تھے۔ ان کی شاخیں آپس میں اس طرح جڑی ہوئی تھیں کہ دن کی روشنی بڑی مشکل سے جنگل کی طرف پہنچ پا رہی تھی اور اچھا خاصا اندھیرا محسوس ہو رہا تھا۔ فاصلے طے ہوتے رہے مختلف مقامات پر جانوروں کی گلی سڑی ہڈیاں اور آنتیں پڑی نظر آ رہی تھیں۔ دن کا وقت تھا لیکن مچھر اتنے تھے کہ خدا کی پناہ۔ مرطوب آب و ہوا کی وجہ سے ان کے بادل کے بادل ایک جگہ سے اڑتے اور دوسری جگہ پر جاتے دکھائی دیتے۔ نجانے کتنا فاصلہ اسی طرح طے ہوا اور پھر فضاء میں تبدیلی رونما ہونے لگی۔ جنگل کی سمت دشوار گزار اور گھنے حصے سے باہر نکلنے کے لیے اب تھوڑا سا فاصلہ درکار تھا۔ ہوا میں نمی تھی۔ جس سے یہ اندازہ لگانے میں بالکل دشواری نہیں ہو رہی تھی کہ کوئی دریا جنگل کے بالکل قریب ہے۔

پھر آہستہ آہستہ آگے بڑھ کر جنگل کا سلسلہ ختم ہوا اور کھلا میدان دکھائی دیا جس کے دوسری جانب سرمئی پہاڑوں کا ایک طویل سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ جو شمال سے جنوب تک تا حد نگاہ پھیل گیا تھا۔ سرمئی پہاڑوں کے اس سلسلے کو دیکھ کر اس کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ اگر یہاں تک پہنچ جائے تو شاید زندگی کی کوئی امید بن جائے۔

.....(جاری ہے).....

Courtesy www.pdfbooksfree.pk